پروفیسر ڈاکٹر ریاض مجید کی علمی و ادبی خدمات

مقالہ برائے: پی ایچ ڈی (اُردو)

مقالہ نگار

محمد ناصر آفریدی

رجسٹریشن نمبر:SU-16-02-136-001

نگران

پروفیسر ڈاکٹر محمد احسان الحق

شعبۂ اُردو

سرحد یونیورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی پشاور

2021ء

شعبۂ اُردُو، سرحد یونی ورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، پشاور

پروفیسر ڈاکٹر محمد احسان الحق

تاریخ:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ محمد ناصر آفریدی نے اپنا پی ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ بہ عنوان "پروفیسر ڈاکٹر ریاض مجید کی علمی وادبی خدمات" میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔مقالہ نگار نے یہ مقالہ تحریر کرتے ہوئے ہائر ایجوکیشن کمیشن،پاکستان کے مروّجہ قوانین و ضوابط کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔اب یہ مقالہ بیرونی ممتحنین کو بھجوانے کی سفارش کی جاتی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد احسان الحق

سخنِ گفتنی

عملِ تحقیق و جستجو بہتے پانیوں کی طرح تر و تازہ تبھی رہتا ہے، جب اُس کے نتیجے میں پیش کیا جانے والا کام واقعی ایک مِعیار اور اعتبار رکھتا ہو۔ یہ بات اِس امر کی دلیل ہے کہ اس کے درپردہ تحصیلِ علم کا جنون کار فرما ہو۔ یہی تحقیق و جستجو انسان کو تکمیل کے مراحل سے گزارتے ہوئے انسانی شعور اور لاشعور کی آگہی اور پرکھ عطا کرتے ہیں۔ علم جب تحقیق کے سانچے میں ڈھلتا ہے، تو محقق پر دنیا کے اِسرار و رُموز اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ کھلنا شروع ہوتے ہیں۔ ایسے منظر نامے میں علم کے متلاشی اپنی مثبت صلاحیّتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے، نئے نئے امکانات اور انکشافات کی رو میں کمر بستہ ہوتے ہیں۔ گویا ایک خاص قسم کی ترتیب اور تربیت کے ساتھ انسان ایک نئی دنیا میں مثبت نتائج کی جستجو میں گامزن ہوتا ہے۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ راقم بھی اِنھی جذبوں کے ساتھ تحقیق و جستجو کی پُر خطر وادی میں کامیابی سے کُچھ نہ کُچھ نتائج مُرتّب کرنے میں کامران ہُوا ہے۔ راقم کی یہ خوش بختی تھی کہ ڈاکٹر ریاض مجید جیسے نابغۂ رُوز گار شاعر، محقق اور نقاد کی شخصیت اور فن پر پی ایچ۔ڈی کی اعلیٰ سطحی سندی تحقیق کے لیے موضوعِ تحقیق عنایت ہُوا۔ ڈاکٹر ریاض مجید کے ساتھ دلی موانست اور قلبی تعلق کا یہ ثمر ہے کہ اُن پر قلم اٹھانا راقم کے لیے کسی دوسرے کام کے مقابلے میں کہیں زیادہ سود مند ثابت ہُوا۔ اِس موضوع پر تحقیق کرتے ہوئے راقم پر بہت سے نئے امکانات روشن ہوئے اور تحقیقی گورکھ دھندے میں کئی در وا ہوئے، جو آنے والے وقتوں میں کسی بھی نوع کے کام میں مدد و معاون ثابت ہوں گے۔ اِس ضمن میں راقم ربّ العزّت کا خصوصی شکر گزار ہے۔

ڈاکٹر ریاض مجید ایک معتبر شاعر اور متوازن سوچ کی حامل شخصیت کا نام ہے۔ راقم کی خوش بختی یہ بھی تھی کہ ڈاکٹر ریاض مجید سے ایم فل کی سطح پر براہِ راست شاگردی کا شرف حاصل رہا ہے، لہٰذا راقم کے اِسی رشتۂ تلمُّذ کی بدولت اُنھوں نے مواد کی جمع آوری سے مقالے کی تسوید تک کے جُملہ مراحل میں، جہاں کہیں اُن کی ضرورت در پیش رہی، مشفقانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے، اُستادانہ مہارت کا ثبوت دیا۔ اِس حوالے سے وہ میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ دوسری خوش بختی یہ تھی کہ میرے نگرانِ کار جنابِ ڈاکٹر محمد احسان الحق، جنابِ ڈاکٹر ریاض مجید کے انتہائی قریبی دوستوں میں سے تھے۔ اُنھوں نے بھی تحقیق کے اِسرار و رُموز سے لے کر تحقیقی بیانیے اور نتائج مُرتّب کرنے اور مقالے کی تسوید تک کے جُملہ مراحل میں اُستادنہ شفقت کا مظاہرہ کیا۔ اِس خصوص میں وہ بھی میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ریاض مجید کا فن اِس قدر کشادہ دست ہے کہ اُس پر کام کرتے ہوئے، اختصار جیسے فن سے کام لینا دشوار ہے۔ لہٰذا یہ مقالہ باوجود اختصار پسندی کے روبہ طوالت ہے۔ اِس کے بغیر ریاض مجید جیسے شاعر کی شاعرانہ کرامات کو حیطۂ تحریر میں لانا یقیناً محال تھا۔

باب اوّل ڈاکٹر ریاض مجید کی سوانح، شخصیت اور خاندانی پس منظر پر مشتمل ہے۔اِس باب میں ڈاکٹر ریاض مجید کی ولادت، تعلیم و تربیت، خاندانی پس منظر، عائلی زندگی اوراولاد، ادبی مشاغل، ملازمت کی انجام دہی، ادبی انجمنوں اور تنظیموں سے وابستگی، ادبی خدمات کے صلے میں ملنے والے اعزازات و اعترافات، ملکی اور غیر ملکی اسفاراور تحقیقی مقالات کی نگرانی کے حوالے سے مفید بحث کی گئی ہے۔

باب دوم ڈاکٹر ریاض مجید کی غزل گوئی پر مشتمل ہے۔وہ غزلیہ شاعری کے باب میں جدید شعرا میں اہم مقام رکھتے ہیں۔اِس باب میں اُن کی شاعری کا فکری و فنی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں اُن کے غزلیات کے مجموعے ''پس منظر، گزرے وقتوں کی عبارت، ڈوبتے بدن کا ہاتھ'' اور ''خاک'' کی غزلیات کا تنقیدی اور تجزیاتی جائزہ لیا گیاہے۔ نیز ڈاکٹر ریاض مجید کی غزل کے پسندیدہ موضوعات اور اُن کے شعری اُسلوب کا بھی مطالعہ کیا گیاہے۔

باب سوم ڈاکٹر ریاض مجید کی نظم نگاری کا احاطہ کرتا ہے۔اِس درجے پر اُن کی نظم کے باب میں تخلیقی جہت کا جائزہ لیا گیاہے۔ خصوصاً اُن کی نظموں کے مجموعے '' اِنتساب'' پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔اِس حوالے سے ڈاکٹر ریاض مجید کے موضوعات اور اُسلوب کا بھی تجزیاتی مطالعہ کیا گیاہے۔

باب چہارم ڈاکٹر ریاض مجید کی نعت گوئی پر مشتمل ہے۔بلاشبہ ڈاکٹر ریاض مجید عصرِ حاضر کے ایک مستند اور نامی گرامی نعتیہ شاعر ہیں۔اُن کا سب سے زیادہ کلام نعت پر مشتمل ہے۔چناں چہ اِس باب میں اُن کے نعتیہ مجموعوں ''اللھم صلِ علیٰ محمد□''، ''اللھم بارک علیٰ محمد□''، ''سیّدنا محمد □''، ''سیّدنا احمد □''، ''سیّدنا رحیم □''، سیّدنا کریم □'' اور ''حی علیٰ الثناأ'' (پنجابی ہائیکو) میں پیش کردہ نعتیہ کلام پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ نیز ڈاکٹر ریاض مجید کے نعتیہ موضوعات اور اُسلوب کا تجزیہ بھی اِس باب میں شامل ہے۔

باب پنجم ڈاکٹر ریاض مجید کی قطعہ نگاری پر مشتمل ہے۔اُن کا ایک معتبر حوالہ قطعہ نگاری بھی ہے، لہٰذا یہاں اُن کے مجموعہ ہائے قطعات '' خبر اخبار'' اور ''ذکر اذکار '' کے قطعات کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ڈاکٹر ریاض مجید نے یہ قطعات تاریخ وار مُرتّب کیے ہیں، اِس لیے اُن کا موضوعات وار جائزہ اِس باب میں شامل ہے۔

باب ششم ڈاکٹر ریاض مجید کی نثم نگاری (نثری نظم) پر مشتمل ہے ۔اِس باب میں ڈاکٹر ریاض مجید کی نثموں کے اُسلوب اور جدّتِ اظہار کے ساتھ موضوعی مطالعے پر اکتفا کیا گیاہے۔

باب ہفتم ڈاکٹر ریاض مجید کی نثری خدمات پر مشتمل ہے۔اِس باب میں اُن کی نثری خدمات پر بحث کی گئی ہے۔یہاں اُن کے پی ایچ۔ڈی کے تحقیقی مقالے بہ عنوان ''اُردو میں نعت گوئی'' کا بھی تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ڈاکٹر ریاض مجید کی نثری خدمات میں پنجابی نثر بھی اہمیت رکھتی ہے، جس پر زیرِ نظر باب میں مفصل بحث کی گئی ہے۔

باب ہشتم حاصلِ تحقیق پر مشتمل ہے، جس میں گزشتہ ابواب میں کیے جانے والے جُملہ مباحث کا ملخّص بیان کیا گیا ہے، جو موضوعِ تحقیق پر حاصل شدہ تحقیقی نتائج پر مبنی ہے۔

وہ تمام ہستیاں جنھوں نے راقم کی، جس درجے پر، جیسی بھی معاونت کی ہے، وہ سب خصوصی شکریے کی مستحق ہیں۔اِن سب پر مستزاد راقم کے والدین ہیں، جن کی محنت اور دعاؤں کا ثمر تمام تر کامیابیاں ہیں۔اللہ تعالیٰ تادیر اُن کی دعاؤں کا سایہ ہم سب کے سروں پر قائم رکھے، آمین!اِس تحقیقی کام کے دشوار گزار اور کٹھن مراحل سے گزرنے میں راقم کے والدین کا بڑا ہاتھ ہے۔اُنھوں نے گھر بار کی مصروفیات میں راقم کا خصوصی ہاتھ بٹایا اور وقت جیسی اَنمول نعمت عطا کرنے میں ذمّے داریوں سے آزاد رکھا، جس کی وجہ سے یہ کام آسانی سے روبہ تکمیل ہُوا۔اپنے بڑے بھائی محمد فیصل آفریدی، جن کی شفقت اور محبّت میں ہمیشہ باپ کا احساس پایا، اُنھوں نے بھی کاروباری مصروفیات میں راقم کے حصّے کی ذمّے داریوں کو پورا کیا اور ساتھ ہی دست بدعا رہے۔اُن کے احسانات کے بوجھ کو اُٹھایا نہیں جا سکتا، اُن کا شکریہ ادا کرنا بھی راقم پر واجب ہے۔اپنے دوسرے بھائیوں محمد یاسر آفریدی، محمد عادل آفریدی، محمد جاسم آفریدی کی حوصلہ افزائی اور نیک تمنّاؤں کے لیے بھی شکر گزار ہوں۔

اِس تحقیقی کام کی انجام دہی کے درپردہ، جن اساتذۂ کرام کی قیمتی آرا اور دعائیں کارفرما رہی ہیں، اُن میں جنابِ پروفیسر ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان، جنابِ ڈاکٹر محمد امتیاز شعبۂ اُردو جامعہ سرحد، پشاور، جنابہ ڈاکٹر غنچہ بیگم، جنابہ ڈاکٹر تحسین بی بی اور جنابہ سمیر اسواتی کا شکر گزار ہُوں کہ اُن کی بدولت کام کی انجام دہی میں معاونت ہُوئی۔اس کے ساتھ ساتھ ٹائپ کمپوزنگ کے لیے مبشرہ فریاد اور عتیق الرحمان جلالیؔ کا شکریہ بھی مجھ پر لازم ہے۔اُنھوں نے کتابت کی اغلاط کی درستی میں اہم کردار ادا کیا۔اپنے دوست احباب میں نزاکت حسین نزاکتؔ، عبدالباسط، ظہور الاسلام، عبدالسلام عارف، بابر انجم، ملک واجد اور معز بھی شکریے کے مستحق ہیں، جنھوں نے بساط بھر راقم کی ہر سطح پر اعانت کی۔ڈاکٹر ریاض مجید جیسی نابغۂ رُوزگار ہستی کی گراں قدر ادبی خدمات کا تحقیقی مطالعہ اپنی جگہ پُر معنی شے ہے۔راقم نے اِس ضمن میں مقدور بھر کوشش کی ہے۔یہ تحقیقی کاوش کس حد تک قابلِ اعتبار ہے، اِس کا جائزہ ممتحنین کی ماہرانہ رائے کا متقاضی ہے۔کوئی بھی کام سہو و خطا سے مبرّا نہیں ہو سکتا، لہٰذا اِس سلسلے میں پیش آمدہ اغلاط کو پیشگی قبول کرتا ہوں۔آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ میری اِس تحقیقی کاوش کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور میری زُبان و قلم کو مزید روانی عطا فرمائے۔آمین!

محمد ناصر آفریدی

حُسن ترتیب

بابِ اوّل:

سوانحی حالات

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات اور احسن المخلوقات بنا کر اِس دنیا میں دیگر تمام مخلوقات حتیٰ کہ جنوں اور فرشتوں پر بھی فضیلت اور برتری عطا کر رکھی ہے۔ یہ اِس امر کی دلیل ہے کہ انسان فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کی چنیدہ مخلوق ہے۔ دنیا میں انسان اِس بزرگی اور اعلیٰ پن کا پیکر مثالی کردار اور اعلیٰ خاندانی اقدار سے ہی بن سکتا ہے، لہٰذا انسانی شخصیت سازی میں خاندانی وجاہت اور پس منظر اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ فن کی اہمیت اِس حوالے سے خاندانی وابستگی کے بھی طفیل ہے اور فنون کی حدود و قیود اتنی وسیع ہیں کہ اکتسابِ فن سے تعلق رکھتی ہیں۔ کوئی بھی فن کار کسی نہ کسی طور پر خاندانی رویّوں سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔

ریاض مجید کا تعلق بھی ایک دینی گھرانے سے ہے۔ آپ کا خاندان علمی و ادبی حوالے سے بھی ایک وقار رکھتا ہے۔ ریاض مجید کے آباؤ اجداد کا تعلق دہلی کے ایک علمی و دینی خاندان سے تھا۔ معلوم خاندانی تاریخ کے مطابق یہ خاندان سترھویں صدی کے آخر میں محلّہ دریا گنج میں موجود ایک پرانی مسجد (جس کا نام 'زینت المساجد' ہے) میں علمی، دینی اور تدریسی خدمات پر مامور تھا۔ مولانا محمد محسن اور مولانا محمد عبد الرحمن کے نام کا حوالہ اسی خاندان کے بعد کی چوتھی پشت کے شاعر محمد منیر کمال مسلم کے شعری مجموعہ "سیلِ رواں" (مطبوعہ ۱۹۷۰ء) کے دیباچے میں، جن الفاظ میں ملتا ہے۔ ان میں سلیمان سیمابی کے والد مولانا محمد عبد الرحیمؒ کا ذکر بھی ہے۔ منیر کمال لکھتے ہیں:

> "حسب و نسب کے لحاظ سے میرے بزرگ حضرت محمد محسن رحمتہ اللہ علیہ دہلی کے محلہ دریا گنج میں مقیم تھے۔ یہ دو صدیوں سے بھی پُرانی بات ہے، آپ کے فرزند حضرت محمد عظیم رحمتہ اللہ سلطنتِ مغلیہ میں لُدھیانہ کے علاقہ میں قاضی القضاۃ متعین رہے، جن کے پسر حضرت مولوی محمد مسلم رحمتہ علیہ جالندھر کے مضافات میں آکر آباد ہو گئے ۔۔۔ بزرگوں میں سے مولوی ڈاکٹر عبد الستار، حضرت مولوی عبد الحق اور حضرت مولوی محمد عبد الغفور سلیمان اویسی بقیدِ حیات ہیں۔ نوجوان افراد میں مولوی حمید مسلم صاحب، میاں نذیر مسلم، ایڈوکیٹ، شمس الحق حسنی اور اکرام الحق کے علاوہ اور بہت سی مقتدر ہستیاں موجود ہیں ۔۔۔۔ دہلی سے پہلے کے حالات اور واقعات کی فی الحال تحقیق نہیں ہو سکی۔" (۱)

خاندان مغلیہ کے زوال کے آثار اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے وقت پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس زمانے تک مولانا محمد محسن (اور ان کے والد مولانا عبد الرحمن) کا تعلق دہلی کے محلہ دریا گنج ہی سے بتایا جاتا ہے۔ 'مولوی محمد مسلم: حیاتی، فکر تے فن' کے عنوان سے اپنے تحقیقی مقالہ برائے ایم اے پنجابی۔ پنجاب یونی ورسٹی، لاہور ۱۹۸۹ء کی معلومات کے مطابق ان بزرگوں کا تعلق علمی و دینی گھرانے سے تھا۔ اپنی علمی حیثیت اور ذکاوت کی وجہ سے یہ بزرگ مغلیہ دربار میں مؤقر عہدوں پر فائز رہے۔ درس و تدریس اور اشاعت و تبلیغ اس خاندان کی گھٹی میں شامل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں یہ خاندان پُر وجاہت شناخت رکھتے ہوئے عزت و تکریم کا مالک ہے۔

دریاگنج میں جس مسجد کے ساتھ اس خاندان کے انسلاک کی روایت بتائی جاتی ہے۔ یہ پرانی دلّی (جسے شاہجہاں آباد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) کی معروف مسجد 'زینت المساجد' ہے سابقہ روایات کے مطابق یہ مسجد دریائے جمنا خیراتی گھاٹ کے پاس واقع تھی۔ شاہ جہاں آباد کی جامع مسجد کے بعد یہ مسجد اولیت کی مستحق رہی ہے۔ جغرافیائی مناسبت سے یہ مسجد اپنے موقع و محل میں یقیناً عدیم المثال ہے۔ بقول مصنف دارالحکومت دہلی:

"یہ مسجد جمنا کے جنوبی کنارے پر ایسے مرتفع مقام پر بنائی گئی ہے کہ جمنا کے اس پار سے، جو عمارت شہر کا عجیب و غریب نظارہ ہوتا ہے، اس میں سب سے پیش پیش یہی دل کش عمارت ہے۔ اس کے لال لال منارے دُور دُور سے دکھائی دیتے ہیں اور یہ مسجد کوسوں دور سے نظر آتی ہے۔ یہ مسجد فصیلِ شہر سے کوئی تیس گز کے فاصلہ سے دریا کی طرف سطح ارض سے چودھافٹ بُلند ہے، مگر شہر کی طرف سڑک کے برابر ہے۔"(۲)

مذکورہ بالا کتاب میں اس تاریخی مسجد "زینت المساجد" جسے عرف عام میں جمنا دریا کے کنارے پر واقع ہونے کے سبب عرف عام میں گھاٹ مسجد یا گھڑا مسجد بھی کہتے تھے، مسجد کا بڑا خوب صورت نقشہ پیش کیا ہے۔ اس مسجد کے نقشے کے مطابق اس کی برجیاں، سنگ سرخ اور سنگ مرمر کے کام، مینار، حجرے سنگیں، چوکھٹ کی کوٹھری، شاندار چوبی دروازے، وسیع و عریض صحن (۱۱۴×۱۹۵فٹ) مستطیل عرض (۴۳×۳۳فٹ) چار فٹ گہرا گنبد کو جاتا در (۴۲فٹ بُلند، ۳۵فٹ چوڑا) ہشت پہلو بُرجیاں، اسی طرح کا قطعہ مسجد کی دوسری جانب جنوب و مغرب میں بھی بنا ہوا ہے۔ یہ مکان غالباً امام، موذن یا دیگر خدام مسجد کے لیے بنائے گئے تھے۔ غالباً اسی قلعہ مسجد میں مولانا محمد محسن اور ان کے بیٹے مولانا عبد الرحمن یعنی سلیمان سیمابی کے معلوم بزرگوں کی سکونت تھی۔

سلیمان سیمابی کے خاندانی حالات کے ذیل میں اس تاریخی مسجد کا حوالہ اس لیے اہم ہے کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس مسجد سے وابستہ مدرس علمی مرتبے کے حامل تھے۔ یہ مسجد ۱۱۱۹ھ (۱۷۰۷ء) میں زینت النسا بیگم بنت بادشاہ محی الدین محمد عالمگیر غازی نے حُصُول خیر و برکت کے لیے بنائی۔ اس کے پتھر پر اس کے نام کے الفاظ اُمیدوارِ حسنِ خاتمہ فاطمہ زینت النسا بیگم بنت بادشاہ محی الدین محمد عالمگیر غازی کے ساتھ ۱۱۲۲ھ کی تاریخ کندہ ہے۔ یہ مسجد غالباً ۱۱۱۹ھ سے ۱۱۲۲ھ تین سال میں مکمل ہوئی۔ کیوں کہ یہ دونوں تاریخیں "واقعات دارالحکومت دہلی" میں صفحہ ۱۲۷ اور ۱۳۲ پر درج ہیں۔

سلیمان سیمابی کے خاندانی پس منظر کی تلاش میں معلوم دست یاب میں مولانا عبد الرحمن کا نام ملتا ہے۔ جن کا تعلق دریاگنج کے علاقے سے تھا اور خاندانی روایات اور قیاس کے مطابق یہی وہ مسجد تھی جن میں اس خاندان کے اکابرین مولانا عبد الرحمن اور ان کے بیٹے مولانا محمد محسن درس و تدریس اور قاضی کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کے بیٹے مولوی محمد عظیم نے پنجابی میں ایک کتاب 'علی نامہ' لکھی یہ منظوم کتاب ان دنوں کی یادگار لگتی ہے، جب یہ خاندان دہلی چھوڑ کر شاہ شجاع کے زمانے میں لدھیانہ میں آکر آباد ہو گیا۔

مولوی محمد مسلم (۱۸۰۸- ۱۸۸۰ء) اور مولوی محمد اسماعیل، مولوی محمد عظیم کے بیٹے تھے، جو خود پنجابی معروف شاعر تھے انہوں نے کئی کتابیں لکھیں، جن میں سے ایک 'علی نامہ' کا تذکرہ پنجابی ادب کی تاریخوں میں ملتا ہے۔ سلیمان سیمابی کے سلسلہ نسب کی ایک جھلک اس شجرہ میں دیکھیے ،جو ان کے خاندان کے حوالے سے ملنے والی دستاویزات سے تیّار کیا گیا ہے اور آگے آرہا ہے۔

مولوی عبدالغفور سلیمان اویسی سیمابی کا تعلق گڑھا (ویندان) جالندھر مشرقی پنجاب (انڈیا) کے مولوی خاندان سے تھا جیسا کہ ماقبل ذکر ہوا ہے کہ ان کے خاندان کے بڑے شاعر ،جو پنجابی میں کئی کتابوں کے مصنف تھے، مولوی محمد مسلم تھے، جن سے اس خاندان کی شناخت مولوی خاندان کے نام سے ہوئی۔ اس خاندان کے بارے میں معلومات کے کُچھ ماخذ درج ذیل ہیں:

۱۔ پنجابی شاعراں دا تذکرہ: مولا بخش کشتہ

۲۔ تاریخ آرایاں: چوہدری محمد اصغر، علمی کتب خانہ لاہور

۳۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک وہند: پنجاب یونی ورسٹی ۱۳ویں جلد

۴۔ سیلِ رواں: محمد منیر مسلم، مجموعہ شاعری (یہ مولوی محمد مسلم کے پڑپوتے ہیں)

۵۔ تصانیف مولوی محمد مسلم میں موجود داخلی شہادتیں، جن میں اُنہوں نے اپنے اشعار میں کُچھ واقعاتی اشارے منظوم کیے ہیں۔

۶۔ مولوی محمد مسلم حیاتی، فکر تے فن: تنقیدی و تحقیقی مقالہ برائے ایم اے پنجابی،

مقالہ نگار: محمد امین شہزاد

نگران: ڈاکٹر اسلم رانا ۱۹۸۹ء پنجاب یونی ورسٹی لاہور

۷۔ میں اور میری تحقیق: ڈاکٹر ریاض مجید۔ دستاویزی فلم برائے پاکستان ٹیلی ویژن لاہور سنٹر

دورانیہ ۴۵ منٹ۔ ۱۹۹۵ء

شرکا (ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر حفیظ تائب، ڈاکٹر اسحق قریشی،

ڈاکٹر ریاض احمد ریاض، ڈاکٹر شبیر احمد قادری، حافظ لدھیانوی،

ڈاکٹر خالد سعید بٹ، ظہیر قریشی اور کئی دوسرے اسکالرز، صحافی اور اہل قلم

۸۔ متعدد اخباری مضامین مثلاً: مولوی محمد مسلم، پروفیسر ایم اشرف، روزنامہ امروز لاہور ۱۱ اگست، ۱۹۷۳ء

۹۔ پنجابی ادبی دی کہانی: عبدالغفور قریشی

۱۰۔ پنجابی ادب دی مختصر تاریخ: احمد حسین قادری

۱۱۔ پنجابی ادب دی مختصر تاریخ: موہن سنگھ دیوانہ

۱۲۔ پنجابی ادب دی مختصر تاریخ: حمید اللہ ہاشمی

۱۳۔ پنجابی ادب دی مختصر تاریخ: سلیم چوہدری

ان مآخذات کا تعلق سلیمان سیمابی کے خاندانی پس منظر سے ہے۔ ان سے ملنے والی معلومات کے مطابق سلیمان سیمابی کا پس منظر علم و ادب کی روایت سے جڑا ہوا ہے۔ تاریخ ارائیاں کے مصنف کے مطابق یہ خاندان دینی تعلیم، درس و تدریس اور مذہبی مشاغل و تصانیف کے حوالے سے محترم تھا۔ ارائیں برادری سے تعلق والی اس شاخ کا معلوم شجرہ نسب، جو مطبوعہ مواد اور خاندانی روایت کی روشنی میں مُرتّب ہوتا ہے کُچھ یوں ہے:
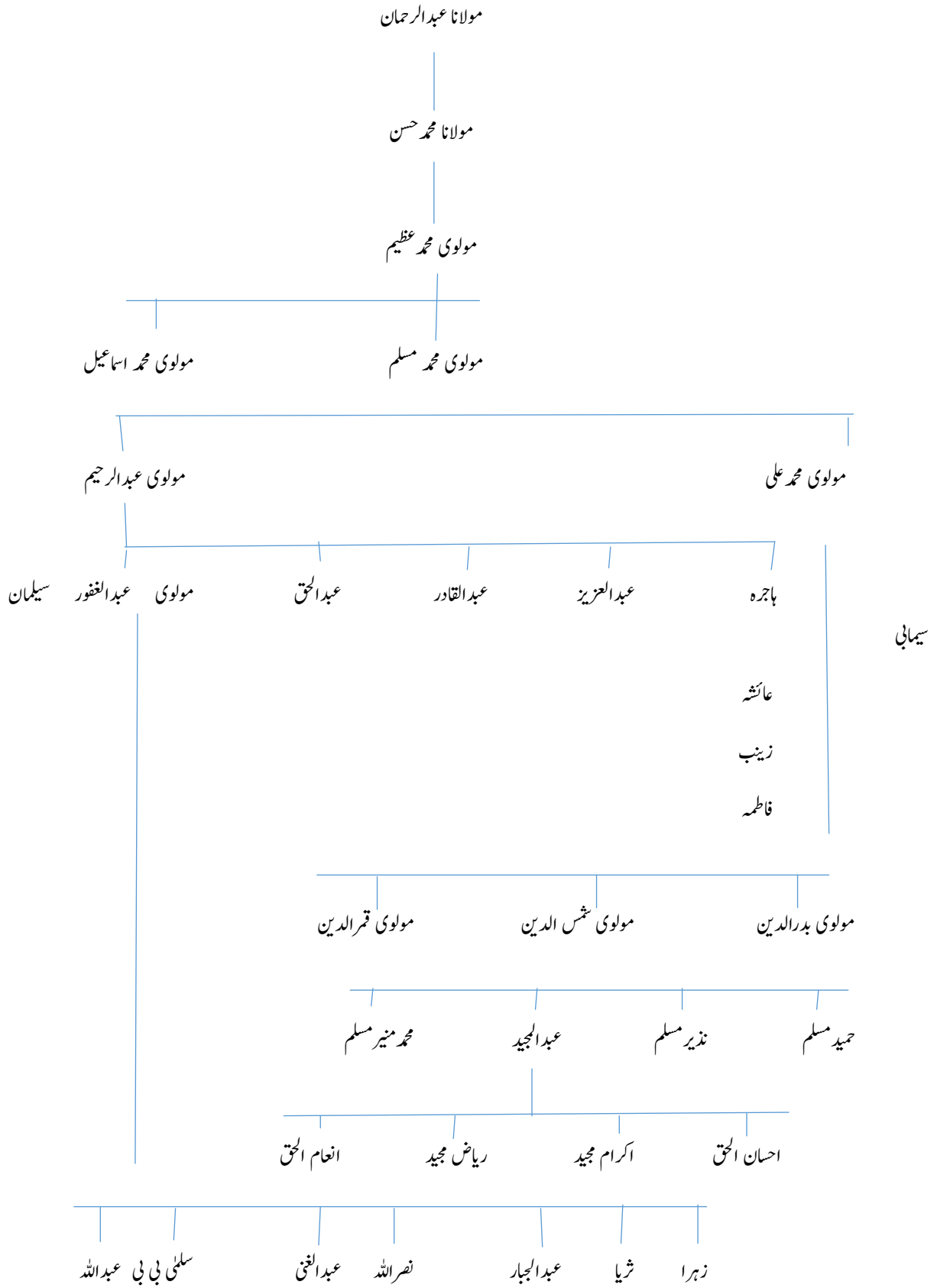
اس شجرہ کا بڑا حِصّہ مولوی محمد مسلم پر لکھے گئے مقالے سے لیا گیا ہے، جس کا حوالہ اُوپر ماخذات میں درج ہے اور ، جسے محمد امین شہزاد نے شعبہ پنجابی ، پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے ایم اے پنجابی کے لیے لکھا۔کُچھ حِصّہ پنجابی شاعروں کا

تذکرہ: مولا بخش کشتہ و تاریخ ارائیاں: اصغر علی چودھری سے لیا ہے اور کُچھ معلومات محمد منیر مسلم کی تصانیف (دیباچوں) سے حاصل کی گئی ہیں۔

مولوی عبدالرحیم کی بڑی بیٹی سردار بی بی کی شادی مولوی شمس الدین سے ہوئی تھی۔ سردار بی بی کی وفات کے بعد مولوی عبدالرحیم کی دوسری بیٹی فاطمہ کی شادی بھی مولوی شمس الدین سے ہوئی۔ مولوی شمس الدین کی ساری اولاد مولوی عبدالرحیم کی بڑی بیٹی سردار بی بی سے ہے۔ یوں جالندھر ہی میں مولوی محمد مسلم اور مولوی محمد اسماعیل کی شاخیں پھر ہم شجرہ ہو جاتی ہیں۔ دست یاب شجروں میں خواتین کا ذکر نہیں۔ یہ شجرہ قریب قریب تین صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔

سلیمان سیمابی کے شجرے میں معلوم پہلے بزرگوں مولانا محمد محسن اور مولانا محمد عبدالرحمن کا تعلق دہلی سے تھا اٹھارویں صدی کے پہلے ربع میں یہ محلہ دریا گنج (دہلی) کی معروف مسجد زینت المساجد، جسے عرف عام میں گھاٹ مسجد بھی کہا جاتا ہے میں درس و تدریس سے وابستہ تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دنوں میں دلّی میں معاشرتی افراتفری کے سبب مولانا عبدالرحمن نے لدھیانہ کی طرف ہجرت کی۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب مغلیہ خاندان کے کئی چشم و چراغ بھی دہلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے اور اُنھوں نے لدھیانہ میں اپنا مرکز بنالیا تھا۔ ان میں سے ایک نام شاہ شجاع کا بھی بتایا جاتا ہے۔ مولوی محمد عظیم، جو مولانا محمد محسن کے بیٹے تھے۔ شاہ شجاع کے اتالیق ہونے کے ساتھ ساتھ قاضی القضا بھی تھے۔ مولوی عظیم عربی فارسی کے عالم ہونے کے ساتھ پنجابی کے شاعر بھی تھے، 'علی نامہ' ان کی یادگار تصنیف ہے۔ اُنھوں نے لدھیانہ میں علمی و دینی خدمات کے علاوہ فلاحی کاموں میں بھی حِصّہ لیا۔ بقول محمد امین شہزاد:

> "ایسے کئی کنویں بیسویں صدی کے وسط تک لدھیانہ میں موجود تھے، جن کی تعمیر مولوی محمد عظیم نے کرائی اور جن پر ان کا نام کندہ تھا۔"(۳)

مولوی محمد مسلم اور مولوی اسماعیل کے والد مولوی محمد عظیم لدھیانہ میں کافی مشہور تھے اور اُن کی علمی برتری کی وجہ سے اُن کو قاضی القضا کے عہدے پر فائز کیا گیا تھا جس کی تفصیل یوں ہے:

> "مولوی محمد مسلم اور مولوی محمد اسماعیل کے والد مولوی محمد عظیم لدھیانہ میں قاضی القضا کے عہدے پر فائز تھے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء اور سکھوں کی دست برد کے واقعات اور حالات کے تحت مولوی محمد مسلم اور مولوی محمد اسماعیل لدھیانہ سے نقلِ مکانی پر مجبور ہو کر موضع گڑھا متصل جالندھر چھاؤنی میں سکونت اختیار کی۔" (۴)

گڑھا آرائیں برادری کا پرانا گاؤں تھا یہاں کی قریب قریب ساری آبادی مسلمان تھی۔ مولوی صاحب کی ہجرت کا سب سے بڑا سبب یہی تھا۔ تاریخی اوراق میں آپ کے خانوادے کا شمار جیّد علماء و صوفیہ میں ہوتا تھا۔ یہ صوفی منش درویش خدامست ہجرتوں اور جہاں گشت طبیعتوں کی وجہ سے دور از کار شہرت یافتہ تھے۔ یوں مولوی صاحب نے دلی سے لدھیانے

ہجرت کی۔ بعد ازاں جالندھر نقل مکانی ہوئی۔ یہ خاندان اُسی علاقے میں "مولوی خاندان" کے نام سے شہرت اور نام وری رکھتا تھا۔ چناں چہ اس خاندان میں یکے بعد دیگرے مولوی محمد مسلم، مولوی محمد اسماعیل، مولوی محمد علی، مولوی بدرالدین اور حضرت مولانا عبد الرحیم ایسے معتبر نام مشہور ہیں۔

مولوی محمد مسلم کی شادی جالندھر کے بالکل نزدیک قریباً تین میل دور گاؤں گڑھا میں ہوئی۔ اس گاؤں کا پورا نام گڑھا ویندا ں ہے۔ ویندا کی وجہ ہے کہ کسی زمانے میں یہاں کوئی دریا نالہ گزرتا تھا۔ یہ پورا گاؤں مسلم آبادی پر مشتمل تھا۔(اس میں صرف ایک گھر ہندوؤں کا تھا)۔بقول پروفیسر ایم اشرف:

"مولوی محمد مسلم دا) ویاہ اک ارائیں گھرانے وچ ہویا سسرال اوہناں نوں جالندھر توں دو میل دے فاصلے تے پنڈ گڑھا وچ لے آئے۔ ۲۵ سال دی عمر وچ مولوی صاحب ایتھے اچھّی خاصی زمین لے کے واہی بیجی دا کم شروع کیتا۔"(۵)

ایک خاندانی روایت کے مطابق مولوی محمد عظیم نے پہلے حفاظت کے لیے اپنے دونوں بیٹے اور خاندان کے دوسرے افراد گڑھا یعنی جالندھر بھیج دینے کے بعد میں، جب لدھیانہ کے حالات زیادہ خراب ہو گئے، تو آپ بھی ہجرت کر کے گڑھا(جالندھر چھاؤنی) آ گئے۔

ریاض مجید کی پیدائش جالندھر کے مولوی خاندان میں ہوئی، جو گذشتہ تین صدیوں سے درس و تدریس سے منسلک رہا ہے۔ خاندانِ مغلیہ کے زمانے میں اس خاندان کے دو بڑے عالم مولانا عبد الرحمٰن اور مولانا محمد محسن قاضی القضات کے درجے پر فائز تھے۔ مولوی محمد عظیم، مصنف "علی نامہ" سے اس خاندان کی ادبی حیثیت کا ریکارڈ دستیاب ہوتا ہے۔ ان کے بیٹے مولوی محمد مسلم(۱۸۰۵ء تا ۱۸۸۰ء) مصنف "گلزارِ آدم"، "گلزارِ سکندری"، "گلزارِ موسیٰ"، "گلزارِ محمدی" نے قصص الانبیا کو منظوم کیا۔ "گلزارِ محمدی" پنجابی زُبان میں منظوم سیرت کی پہلی کتاب ہے۔ اس خاندان کا ابتدائی سراغ محلّہ دریا گنج دہلی کی تاریخی مسجد جسے عرفِ عام میں "گھٹا مسجد"۔ مغلیہ حکومت کے زوال اور اس کے آخری حکمرانوں کی نااہلی کی وجہ سے دہلی سازشوں کا اکھاڑا بن گیا تھا اور اس سیاسی افراتفری کی وجہ سے تمام خاندان دہلی سے ہندوستان کے دوسرے شہروں اور قصبوں میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح مولوی خاندان بھی نقل مکانی کر کے لدھیانہ (مشرقی پنجاب) آ گیا۔

محمد عظیم، مولانا عبد الرحمٰن کے بیٹے تھے۔ لدھیانہ میں وہ شاہ شجاع کے اُستاد ہونے کے ساتھ ساتھ قاضی القضا کے عہدے پر فائز تھے۔ مولوی محمد عظیم عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔ دین اور فقہ کے مسئلوں اور باریکیوں پر وہ گہری نظر رکھتے تھے۔ اُنھوں نے لدھیانہ میں اپنے خاندانی ورثہ کی نا صرف دیکھ بھال کی بل کہ اُنھوں نے اس کام کو اور آگے بڑھایا اور اس میں قابلِ فخر اضافے کیے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ قادرالکلام شاعر بھی تھے۔ ان کی ایک بڑی شعری تصنیف "ولی

نامہ'' ہے۔ یہ ۱۸۷۱ء میں شایع ہوئی۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے ایک ''بارہ ماہ'' بھی لکھا اور لدھیانہ میں عوام کی فلاح و بہبود کے لیے بہت سے کام کیے۔

مولوی محمد عظیم کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام محمد مسلم اور چھوٹے بیٹے کا نام محمد اسماعیل تھا۔ ۱۸۳۰ء میں مولوی محمد مسلم جالندھر کے قریب گڑھا (جہاں آج کل ایک جالندھر چھاؤنی ہے) آکر آباد ہوگئے اور دین اسلام کی تبلیغ میں مصروف رہے۔ مولوی محمد مسلم نے متعدد پنجابی کتب تصنیف کیں، جن میں ''تقویت اسلام، تاثر الصلوۃ، ابراہیم ارہم، خطبات مسلم اور عجائب القصص'' بہت معروف ہوئیں۔

درس و تبلیغ اور تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ مولوی محمد مسلم سے ان کے پسر مولوی محمد علی اور پھر ان کے پسر مولوی شمس الدین تک منتقل ہوا۔ ان کی تصانیف چند قِصّوں اور کتابچوں تک محدود ہیں۔ مولوی شمس الدین کے بیٹے عبدالمجید تھے۔ ریاض مجید اِنھی کی اولاد میں سے ہیں۔

ریاض مجید ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء بروز سوموار گڑھا ویزاں گاؤں (موجودہ جالندھر چھاؤنی) میں پیدا ہوئے۔ اسلامی مہینے کی تاریخ کے مطابق یکم شوال عیدالفطر کا دن تھا۔ گڑھا گاؤں جالندھر سے دو اڑھائی میل کے فاصلے پر تھا۔ اس گاؤں کی اکثریت مسلمان اور ارایں برادری پر مشتمل تھی اور اِنھی میں سے ایک گھر اُن کا تھا۔ یوں ریاض مجید کا تعلق بھی ارائیں خاندان سے بنتا ہے۔

ریاض مجید کے والد عبدالمجید ''گڑھا گاؤں'' جالندھر میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے، پڑھے لکھے شخص تھے۔ خاندانی روایت کے مطابق مذہبی تعلیم بھی حاصل کی۔ اپنے والد مولوی شمس الدین کے ساتھ کاروبار کرنے لگے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کے بعد ہجرت کرکے پاکستان آئے۔ یہاں آکر فیصل آباد میں قیام پذیر ہوگئے۔ یہاں پر قیام کے چھے سال بعد (دو یا تین سال بیمار رہنے کے بعد) وفات پاگئے۔

ریاض مجید کے والد عبدالمجید اکتوبر ۱۹۵۳ء میں فوت ہوئے، جب کہ وہ چھٹی جماعت میں زیرِ تعلیم تھے۔ ان کی پرورش ان کی والدہ عزیز بیگم (،جو اپریل ۲۰۰۲ء میں نوّے سال کی عمر میں فوت ہوئیں) نے کی۔ ریاض مجید کی تعلیم کی ذِمّے داری، ان کے بڑے بھائیوں احسان الحق اور اکرام مجید (مصنف ''تتنے دا روگ''، ''نویاں زیناں'' (پنجابی غزل) ''صفت ثنا'' (پنجابی نعت) صدارتی سیرت ایوارڈ یافتہ) نے سنبھالی۔ بچپن میں اُنھی مطالعہ اور کرکٹ کا زیادہ شوق تھا۔ ان کے ماموں حمید جالندھری مصنف ''شامِ صحرا'' اور مالک مکتبہ کاروان لاہور کی طرف سے مطالعے کے لیے تازہ بہ تازہ کتابیں مل جاتی تھیں اور یوں یہ شوق پروان چڑھتا گیا۔

ریاض مجید کی والدہ عزیز بیگم جن کو سب بی بی جی کے نام سے پکارتے تھے۔ بہت نیک اور عبادت گذار خاتون تھیں۔ اپنا زیادہ وقت جائے نماز پر گذارتی تھیں اور اپنے پروردگار کے حضور سر بہ سجود رہتیں۔ اُنھوں نے اپنے خاوند کی وفات کے بعد اپنے بچّوں کی تعلیم و تربیت بہت ہی اچھّے طریقے سے کی۔

ریاض مجید چار بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے دو بھائی بہت چھوٹی عمر میں وفات پا گئے تھے۔ سب سے بڑے عبد اللطیف، جو ڈیڑھ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ اس کے بعد دو بہنیں ہیں۔ ایک کشور سلطانہ، جو شادی شدہ ہیں اور فیصل آباد میں ہی رہایش پذیر ہیں۔ دوسری شفقت سلطانہ، وہ بھی شادی شدہ ہیں اور فیصل آباد میں ہی مقیم ہیں۔

ریاض مجید کے بڑے بھائی احسان الحق ہیں۔ اُنھوں نے ایف۔ اے تک تعلیم حاصل کی اور بعد میں کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ اکرام مجید احسان الحق سے چھوٹے ہیں، جو آج کل کاروبار سے منسلک ہیں۔ اُردو اور پنجابی کے بہت بڑے شاعر اور ادیب بھی ہیں۔ ان کے بعد ریاض مجید ہیں۔ انعام مجید سب سے چھوٹے ہیں۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے بڑے بھائیوں سے مل کر کاروبار کر رہے ہیں۔

اس طرح اس خاندان کا شمار فیصل آباد کے چند معروف کاروباری گھرانوں میں ہوتا ہے۔ جب پاکستان بنا، تو ریاض مجید کی عمر ساڑھے چار سال تھی۔ یہ کشت و خون کا زمانہ تھا۔ جب بے سر و سامانی کے عالم میں ان کا خاندان ہجرت کر کے فیصل آباد آیا اور یہاں آ کر ڈگلس پورہ میں آباد ہوا۔ یہاں آ کر ریاض مجید کی تعلیم کا آغاز ہوتا ہے۔

تعلیمی زندگی:

ریاض مجید کی ابتدائی تعلیم ڈگلس پورہ میں ہوئی۔ چناں چہ آپ کو میونسپل بورڈ کے قائم کردہ میونسپل ایم بی اسکول میں مارچ ۱۹۴۸ء میں داخل کیا گیا۔ ریاض مجید نے اِس مادرِ علمی سے بنیادی تعلیم کے چار سال مکمل کیے۔ درجہ چہارم کے سال میں حکومت نے درجہ پنجم کو بھی پہلی بار پرائمری درجے کی تعلیم میں شامل کرتے ہوئے اوّل تا پنجم کی تعلیم پرائمری اسکول میں پڑھنے کے احکامات صادر کیے اور پرائمری اسکولوں کو الگ سے اسکولوں کا درجہ دیا گیا، لیکن ریاض مجید کی بہتر تعلیمی کارکردگی اور ذوق کی بِنا پر اُنھیں مسلم ہائی اسکول میں درجہ پنجم کی تعلیم کے حُصُول کے لیے داخل کیا گیا۔ چناں چہ اِسی تعلیمی ادارے سے ریاض مجید نے میٹرک تک کی تعلیم کے جُملہ مدارج طے کیے۔

ریاض مجید نے مسلم ہائی اسکول سے ۱۹۵۸ء میں میٹرک کی سند حاصل کی، اُس زمانے میں ریاض مجید نے احسن زیدی اور مقبول شاہ جیسے شفیق اساتذہ سے اکتسابِ فیض کیا۔

ریاض مجید کے اسکول کا دور آج کے زمانے سے بالکل مختلف تھا۔ اساتذہ خوب محنت سے بچّوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ گویا تدریس، تدریس نہیں تھی ایک خاص طرح کی عبادت تھی۔ اُس دور میں معلمی کا پیشہ پیغمبرانہ دکھائی دیتا تھا۔ ویسے تو مجھے اپنے سب اساتذہ سے ایک قلبی تعلق ہے، لیکن اُن کے دو اساتذہ ایسے تھے، جنھوں نے جان مار کر تدریسی فرائض انجام دیے۔ اُن میں سے ایک احسن صاحب تھے اور دوسرے مقبول شاہ صاحب تھے، جن کا تعلق بندہ نواز گیسو دراز سے بنتا تھا۔ یہ دونوں ہستیاں خوش خُلقی اور ملنساری کا نمونہ تھیں۔ اُن اساتذہ کے بارِ احسان تلے شاگرد ہمیشہ دبے رہتے تھے اور یہ طلبہ کو خاص کریڈٹ جاتا ہے کہ اساتذہ کی عزت میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتے تھے۔

اسکول کی زندگی کے بعد ریاض مجید نے کالج میں داخلہ لیا اور ایف اے کی سند حاصل کی۔ ریاض مجید نے گورنمنٹ کالج، فیصل آباد سے سہ سالہ آنرزان لینگوایجز (اُردو) ۱۹۶۳ء میں کیا اس کے بعد ایم اے کی تکمیل کے لیے اُنھوں نے یونی ورسٹی اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ ایم اے کے پرچے چوں کہ بی اے آنرز کے تیسرے سال میں ہو چکے تھے، اُنھیں یہاں ایک سال میں ایم اے کی تکمیل کرنی تھی۔ اورینٹل کالج میں ان کے دیرینہ ہم جماعت احسان الحق اختر اور یعقوب مظہر گل کے علاوہ ان کے نئے ہم جماعتوں میں تبسم کاشمیری، صدیق جاوید، اکرام چغتائی، فیضان دانش، ریاض حسین چوہدری وغیرہ شامل تھے اِنھی سالوں میں، میں گوہر نوشاہی، ممتاز منگلوری، محمد عارف تھے۔

گورنمنٹ کالج، لائل پور سے اگلے سال یونی ورسٹی اورنٹل کالج میں بھی سہ سالہ آنرز کا اجرا ہو چکا تھا یہاں اُردو میں مسرور ابدایونی اور عربی میں ضیا شاہد تھے۔ اِنھی سالوں میں یہاں اورینٹل کالج میں ریاض مجید کا تعلق ولید میر سے ہوا، جس نے تین چار سالوں کے بعد لاہور سے کتابیات کے اشاعتی ادارے کا آغاز کیا اور ریاض مجید کو اس میں شرکت کی دعوت دی۔

پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، لاہور میں ریاض مجید کو اُس وقت کے مایہ ناز اساتذہ سے اکتسابِ فیض کا موقع ملا۔ یہ گراں قدر ہستیاں تدریس کے ساتھ ساتھ طلبہ کی شخصیت سازی پر بھی خصوصی توجّہ دیتی تھیں۔ اُن اساتذہ کا نام آج بھی علمی و ادبی دنیا میں بڑی عقیدت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ اُن میں سے ہر اُستاد اپنی ذات میں انجمن کی حیثیت رکھتا تھا۔

یونی ورسٹی اورینٹل کالج میں انھیں ڈاکٹر سیّد عبداللہ، پروفیسر سیّد وقار عظیم، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر غلام حسن ذوالفقار، پروفیسر سجاد باقر رضوی ایسے اساتذہ ملے۔ ان دنوں وائس چانسلر پنجاب یونی ورسٹی پروفیسر حمید احمد خاں یعنی ایم اے فائنل کو مغربی تنقید پڑھانے کے لیے ہفتہ میں ایک دو دن کے لیے اورینٹل کالج آیا کرتے تھے۔ اُنھوں نے یہاں ان سے مغربی تنقید خصوصاً بوطیقا (ارسطو) کے بارے میں بہت استفادہ کیا۔

اورینٹل کالج کی علمی و ادبی فضا سے ریاض مجید نے بہت کُچھ سیکھا۔ یہاں اُردو، فارسی، عربی کے شعبوں میں آئے دن کوئی نہ کوئی تقریب ہوتی لاہور اور معروف لاہور سے اہل قلم، شاعر اور ادیب یہاں تشریف لائے اور اساتذہ ملتے طلبہ کو

بھی ان سے ملنے کا موقع ملتا۔ انتظار حسین جیلانی کامران، شہزاد احمد، انجم رومانی، شہرت بخاری، قیوم نظر، وزیر آغا، شورش کاشمیری، احسان دانش سے لے کر جگن ناتھ آزاد اور عبدالعزیز میمنی جیسی شخصیت کو اس عظیم درس گاہ میں آتے دیکھا۔ ان میں سے بہتوں کے خطبات اور لیکچر سنے، بالمشافہ ملاقاتیں کیں، شاعری سنی۔

معاصر ادبی شخصیات کی ایک طویل فہرست ہے، جنھیں دیکھنے اور ملنے کا موقعہ اس فضا میں ہوا۔ سبھی نام اور چہرے اُنھیں یاد نہیں اتنا اُن کے ذہن میں ہے کہ ان دنوں لاہور کی شائد ہی ایسی کوئی معروف ادبی شخصیت، ہو جسے اس درس گاہ میں نہ دیکھا ہو۔ بعض لیکچرر، زُبانی امتحانات کے لیے طے شدہ پروگراموں کے مطابق آتے، بعض ادیب اور شاعر چلتے پھرتے ادھر سے گزرتے، تو کالج میں بھی آجاتے۔ سیّد صاحب کے کمرے میں تو اُنھیں بے تکلف جانے کی ہمت اور اجازت نہ تھی، جب یہ خبر ملتی کہ کوئی بڑی ادبی شخصیت ان سے ملاقات کے لیے آئی ہوئی ہے، تو ان کے باہر نکلنے کا انتظار کرتے اور کالج لان میں ان سے مل لیتے، البتہ سجاد باقر رضوی کے کمرے میں اکثر جدید شاعروں سے ملاقات کا موقع مل جاتا، جو اُن کے لیے بڑی خوشی کی بات ہوئی اِنھی دنوں معروف سیاسی لیڈر اور پنجاب اسمبلی کے رکن باقی بلوچ بھی ایک بار سیّد صاحب کو ملنے آئے، پتا چلا کہ پنجاب اسمبلی میں اُردو زُبان کے حوالے سے کوئی مسئلہ زیر بحث آرہا ہے اور وہ سیّد صاحب سے اس بارے میں ضروری معلومات حاصل کرنے آئے ہیں۔ گورنمنٹ کالج، لاہور اور اسلامیہ کالج، سول لائینز کی ادبی نقاریب میں شرکت کے مواقع بھی اُنھیں دنوں کی یادگار ہیں، جن میں فیض احمد فیض، بیگم انیس فیض، غلام رسُول مہر، عبید عابد علی عابد اور دوسرے کئی مشاہیر کو دیکھنے، ان کی گفت گو سننے اور اُنھیں ملنے کا موقع ملا۔

ریاض مجید نے ۱۹۶۴ء میں پنجاب یونی ورسٹی (کے اورینٹل کالج) سے ایم اے اُردو کا امتحان پاس کیا۔ ایم اے فائنل میں ان کی سیکنڈ ڈویژن آئی۔ پہلے اُن کا خیال تھا کہ بی اے سہ سالہ آنرز دیے گئے۔ ایم اے کے پرچوں میں حاصل کئے جانے والے نمبر فائنل کے پرچوں میں حاصل ہونے والے نمبروں کے ساتھ ملا کر ایم اے کا حتمی نتیجہ مُرتّب کیا جا سکے، مگر ایسا نہ ہو سکا ایسا ہوتا، تو بہ حیثیت مجموعی ان کی فرسٹ ڈویژن بن جاتی، لیکن بقول اُن کے:

> ”کوئی فرق نہیں پڑا پنجاب سروس کمیشن میں انٹرویو کے بعد پہلی بار ہی آسانی کے ساتھ لیکچر شپ کی ملازمت مل گئی اور پھر وقت کے ساتھ اٹھاویں اور انیسویں گریڈ میں ترقّی بھی ہوتی گئی۔ بیسیوں کے لیے پھر کمیشن میں پہلی بار ہی سیکشن ہو گئی اور یوں اللہ تعالیٰ کے فضل سے ریٹائرمنٹ تک ملازمت بخیر و خوبی چلتی گئی۔ (۶)

ریاض مجید نے پی ایچ۔ڈی بھی پنجاب یونی ورسٹی سے کی۔ اس کے لیے تگ و دو گورنمنٹ کالج، لائل پور آئے (فروری ۱۹۷۳ء) کے بعد ہوئی۔ یہاں چند سالوں ہی میں شعبہ اُردو کے دوسرے اساتذہ کو بھی اس کی تحریک ہوئی۔ اس ضمن

میں کئی بار لاہور آنا پڑا، ایک بار انور سدید کی ہم راہی تھی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، خواجہ محمد ذکریا، ڈاکٹر وحید قریشی سے ملاقاتوں کے بعد 'اُردُو نعت' کے عنوان سے خاکہ تیّار کیا۔ انور محمود خالد نے اُردُو نثر میں سیرت رسُول ﷺ کے موضوع پر خاکہ بنایا۔ ریاض مجید کے نگران ڈاکٹر وحید قریشی اور خالد صاحب کے نگران ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا مقرر ہوئے۔

اس زمانے میں کمپوزنگ کی سہولیات نہیں اُردُو ٹائپ رائٹر پر یا ہاتھ سے خاکے لکھے جاتے تھے۔ ۱۹۷۴ء کی سردیوں کے دن تھے میں اور خالد صاحب دن کو لاہور کی لائبریری میں بیٹھ کر مواد اکٹھا کرتے اور رات کو (حمید جالندھری مکتبہ کارواں) میرے ماموں کو کوٹھی (میں جہاں ہم ٹھہرے تھے) میں بیٹھ کر اس مواد کو خاکے کی شکل دیتے۔ لاہور ہی میں ہم نے خاکے ٹائپ کر کے اورینٹل کالج کے متعلقہ دفتر میں ۱۹۷۵ء کے اوائل میں جمع کرادیے کہ بورڈ آف سٹڈیز کے کسی قریب اجلاس میں منظوری کے لیے پیش کر دیے جائیں۔ وحید قریشی صاحب ان دنوں صدرِ شعبہ تھے، اُنھوں نے اپنے دفتر ہی میں خاکے کی ضروری تصحیح کے بارے میں مشورہ دیا۔ ہم دونوں نے بورڈ اف سٹڈیز کی ہدایت کے مطابق اپنے اپنے خاکوں میں ضروری ترامیم کے بعد اُنھیں دوبارہ جمع کرادیا۔ مئی ۱۹۷۵ء میں خاکوں کی منظوری کی باضابطہ اجازت مل گئی۔ ان پھیلے ہوئے موضوعات پر اپنے کام کی تکمیل کے لیے پانچ سال کا وقت دیا گیا۔ حسن اتفاق سے ممتحن صاحبان کی تسلی بخش رپورٹس ملنے کے بعد زُبانی امتحان ہو گیا۔ اس امتحان کے لیے جامشورو سندھ یونی ورسٹی سے معروف سکالر ڈاکٹر انجم الاسلام تشریف لائے تھے۔ یہ زُبانی امتحان ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کے کمرے میں (اورینٹل کالج) میں ہوا سوال جواب بڑی تسلی بخش تھا اور اطمینان کے ماحول میں ہوئے۔ اُنھوں نے ریاض مجید کو مبارک باد دے کر ان کی کامیابی کا اعلان کر دیا۔ اسی دن سہ پہر کو پنجاب یونی ورسٹی نے ریاض مجید کی کامیابی کا باضابطہ نوٹیفکیشن بھی جاری کر دیا۔

گورنمنٹ کالج، فیصل آباد میں ہمارے رفیق کار پروفیسر شاکر ان دنوں بورڈ آف سٹڈیز کے رکن تھے۔ ان کے تعاون سے نوٹیفکیشن کا اجرا جلد ممکن ہُوا۔ ان کے اساتذہ میں مرزا محمد منوّر، سجاد باقر رضوی، حمید احمد خان (سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی)، وقار عظیم، ڈاکٹر وحید قریشی اور سیّد عبداللہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ سجاد باقر رضوی صاحب سے دوستانہ انداز میں زمانۂ تعلیم کے بعد بھی متعدد صحبتیں رہیں۔ اسی طرح مرزا محمد منور اور سیّد عبداللہ سے بھی آخرِ وقت تک نیاز مندی کا سلسلہ جاری رہا۔ ریاض مجید فارغ اوقات میں مذہب سے متعلقہ کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ نیم کلاسیکی موسیقی شوق سے سنتے ہیں۔ کالج کے زمانے میں (کالج میگزین) ''بیکن'' کے انچارج تھے۔ بعد میں اُنھوں نے بیکن کا نام تبدیل کر کے '' روشنی'' رکھا۔

ریاض مجید کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز کالج کے زمانے سے ہوتا ہے۔ اُنھوں نے کالج کے زمانے میں بہت سے مشاعرے پڑھے اور انعامات، ٹرافیاں حاصل کیں۔ مشاعروں کے سلسلہ میں پنڈی، اسلام آباد، ایبٹ آباد، سرگودھا، جھنگ

وغیرہ جاتے رہے ہیں۔ ریاض مجید نے اپنے پہلے مشاعرہ، جو کہ جگر مرادآبادی کی وفات پر مقامی ٹاؤن ہال، فیصل آباد میں منعقد ہوا تھا، میں ایک غزل پڑھی تھی، جس کا مطلع کچھ یوں ہے:

بڑے اُداس بڑے سوگوار گزرے ہیں
ترے بغیر جو لیل و نہار گزرے ہیں
تمہاری صورت زیبا تو ہم نہ دیکھ سکے
تمہارے کوچے سے ہم بار بار گزرے ہیں (۷)

کالج کے زمانے میں ریاض مجید نے بے شمار نظمیں اور غزلیں کہیں۔ اس زمانے میں ریاض مجید کے شعری ذوق کو بڑھانے میں تین چار دوستوں کا ہاتھ نمایاں ہے۔ ان میں حفیظ احمد، جو حفیظ نیّر کے نام سے لکھتے۔ دوسرے عدیم ہاشمی، سلیم بے تاب اور اقبال سروش نمایاں ہیں۔ ان لوگوں میں ریاض مجید کے بڑے بھائی اکرام مجید بھی ہیں۔ اُنھوں نے کم کہا اور خوب کہا۔ شاعری کا ذکر کرتے ہوئے، ریاض مجید نے کہا کہ وہ شروع سے ہی منیر نیازی سے متاثر ہیں۔ کالج کے زمانے میں مشاعروں میں وہ کالج کی نمایندگی کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ اورینٹل کالج کی طرف سے میں نمایندگی کر رہا تھا اور اس مشاعرے میں احسن زیدی ایک منصف کی حیثیت سے موجود تھے۔ (یہ وہی احسن زیدی ہیں، جو ریاض مجید کے پرائمری میں مشفق اُستاد رہ چکے تھے)۔ انھوں نے ایک نظم ''آبِ رواں'' پڑھی۔ زمانہ طالب علمی میں اس طرح کی نظم لکھنا بہت بڑی بات ہے، جس کی عموماً توقع نہیں ہوتی۔ مشاعرے میں خوب داد سمیٹی اور احسن زیدی صاحب نے مشاعرے کے بعد اُسی مشفقانہ انداز میں میرے حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد ریاض مجید تعلیم مکمل کر کے ملازمت میں آ گئے، لیکن شاعری بھی ساتھ ساتھ جاری و ساری رہی۔ اُن کا شعری سفر اُس وقت سے آج تک انفرادیت کے ساتھ چلتا آ رہا ہے۔

ملازمت:

ریاض مجید نے ملازمت کا آغاز ۱۹۶۵ء میں فیملی پلاننگ ڈیپارٹمنٹ میں سپر وائزر کے طور پر کُچھ مہینوں کے لیے کیا پاکستان میں یہ محکمہ بیرونی امداد کے ذریعے قائم کیا گیا اس میں سپر وائزر کا سکیل اس زمانے کے لیکچرر کے برابر تھا یعنی ۳۵۱/ روپے ماہوار، فیصل آباد (تب لائل پور میں اس محکمے کی ۶۰/ ۷۰ کے قریب اسامیاں آئیں ایم اے کی ڈگری اور انٹرویو اس کے بنیادی تقاضے تھے جنھیں پورے کرنے میں کوئی دِقّت محسوس نہیں ہوئی ڈائریکٹر صِحّت، فیصل آباد اور کُچھ مقامی انتظامیہ سے متعلق شخصیات ڈی سی وغیرہ نے انٹرویو لیا۔ سلیکشن کے بعد اُنھیں عباس ہور (نزد ائیر پورٹ) کے بلدیاتی نظام کے دفتر میں مجھے جگہ دے دی گئی۔ اُنھوں نے فروری ۱۹۶۶ء تک قریباً ساڑھے سات ماہ یہاں کام کیا پھر اُنھیں گورنمنٹ کالج لائل پور کے شعبہ اُردو میں لیکچر شپ (اُردو) کی عارضی تقرری کی مل گئی۔ اُنھوں نے ایک مہینے کی تنخواہ جمع کرا کے (حسب ضابطہ) ۲۴

گھنٹوں کے نوٹس پر اس محکمے سے استعفیٰ دیا اور دوسرے دن (فروری ۱۹۶۶ء) میں جی سی، لائل پور میں، جوائننگ رپورٹ دے دی۔ یہاں ان دنوں کرامت حسین جعفری پرنسپل، ڈاکٹر اکبر حسین قریشی، صدرِ شعبہ اور پروفیسر شہزادہ حسن، خالد محمود انور، عصمت اللہ مظفر مفتی اور دوسرے کئی اساتذہ، جن سے پہلے دیرینہ احباب جیسی واقفیت تھی، کی قربت ملی۔ دوسرے شعبوں کے اکثر اساتذہ اور کالج کا ماحول بھی میرا دیکھا بھالا تھا۔ یہاں گزشتہ سالوں میں ایم اے اُردو کا آغاز (۱۹۶۴ء) میں ہو چکا تھا۔ خط میں ایم اے کی تدریس کے لیے مانگی گئی پوسٹوں کا حوالہ درج تھا۔ اس کی وجہ غالباً میرے سہ سال آنرز ان لینگوایجز کا تخصص تھا۔ یہاں ریاض مجید کو لسانیات کی تدریسی ذمّے داریاں دی گئیں۔

فیملی پلاننگ کے شعبہ میں ریاض مجید کی کارکردگی کم ہوئی۔ اس کی وجہ سے ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ تھی، جس کا آغاز ستمبر میں ہُوا، مگر اس کے اثرات آنے والے کئی مہینوں تک رہے۔ اس محکمے میں ان کے دیرینہ ہم جماعت یعقوب مظہر گل کے علاوہ شہر کے کُچھ اور دوست احباب بھی شامل تھے۔ یہ وقت زیادہ تر اس شعبے کے اُصول وضوابط طریق کار، لٹریچر کے ترجمہ و اشاعت میں گزرا، فیصل آباد میں شعبہ کی انچارج ڈاکٹر زینت آرا اور دوسری سپروائزر کیوان بخت، اعجاز بتول نے ان دونوں جی سی لاہور سے نفسیات میں ایم اے کیا تھا۔ مختار بیگم، شمائلہ، انیس فاطمہ صدیقی، رضیہ اور نعیم چوہدری (یہ جسٹس کی صاحب زادی تھی) شہر کی مختلف یونین کونسلوں میں تعینات تھیں محکمے کا مرکزی دفتر پیپلز کالونی کا شہر کے سپروائزر کا زیادہ کام تنظیمی نوعیت کا تھا اور انہیں فیلڈ میں کم جانا پڑتا جنگ ستمبر کی وجہ سے ان کی نوعیت کار بھی کُچھ تبدیل ہو گئے تھے۔

گورنمنٹ کالج میں ریاض مجید نے ستمبر ۱۹۶۶ء تک تدریسی ذمّے داریاں انجام دیں۔ اِنھی دنوں ویسٹ پاکستان پبلک سروس نے بہت سی اسامیوں کا اشتہار دیا۔ ان میں بیالیس کے قریب اُردو کی اسامیاں بھی دیں۔ انٹرویوز میں کامیابی کے بعد، ریاض مجید نے اپنی مستقل ملازمت کا آغاز ۱۵/ نومبر ۱۹۶۹ء میں کیا۔ کمیشن کے اس بیچ میں ان کے دوست ریاض احمد ریاض (اُردُو) اور سرور کامران (ریاضی) کی اسامیوں کے لیے چنے گئے ان دونوں نے گورئمنٹ کالج چکوال اور یاض مجید نے گورنمنٹ کالج، بوچھال کلاں سے اپنی مستقل ملازمت کا آغاز کیا بوچھال کلاں خوشاب سے چکوال جانے والی سڑک پر کلر کہار کے قریب واقع ہے، یہاں ریاض مجید قریباً سوا دو سال تک رہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ، جب اپنے اپنے شہروں کے نواح کے کالجوں میں پیدا ہوتی گئی، تو اُن تینوں نے بھی ان جگہوں کو خیر باد کہا۔ ریاض احمد ریاض گورنمنٹ کالج، گوجرہ، سرور کامران، گورنمنٹ کالج، اصغر مال راول پنڈی اور ریاض مجید گورنمنٹ کالج، جڑانوالہ آ گئے، یہاں رشید گوریجہ تھے، جو اُن کے گورنمنٹ کالج لائل پور کے پرانے کالج فیلو تھے۔ خواجہ سعید الدین یہاں پرنسپل تھے پھر کُچھ عرصے بعد اعوان آ گئے، جو اُن کے زمانہ طالب علمی میں گورنمنٹ کالج لائل پور کے

شعبہ معاشیات کے اُستاد تھے، ریاض مجید نے مجھے کالج میگزین اور سٹوڈنٹس یونین کے انچارج کی ذمّے داری تفویض کی۔ اس کالج میں چار چھے پروفیسر روزانہ لائل پور سے جاتے تھے۔ ریاض مجید کی رہائش چوں کہ پیپلز کالونی میں تھی۔ یہ کالج بھی جڑانوالہ سے دو تین میل باہر لائل پور کی طرف آنے والی سڑک پر واقعہ ہے، لہٰذا اُنھیں جڑانوالہ آنے جانے میں کُچھ اور آسانی مل گئی اور اُن کے لیے گھر سے کا کالج کا راستہ تیس چالیس منٹ رہ گیا۔

گورنمنٹ کالج، جڑانوالہ سے ریاض مجید فروری ۱۹۷۱ء میں گورنمنٹ کالج، لائل پور آ گئے۔ یہاں وہ ریٹائرمنٹ (اکتوبر ۲۰۰۲ء) تک رہے ان طویل دورانیے میں مئی ۱۹۸۱ء سے ستمبر ۱۹۸۱ء تک چار مہینوں کے لیے ان کا تبادلہ حلقہ احباب ذوق فیصل آباد میں ایک مشاعرے کی صدارت پر صدر ضیاالحق کے مارشل لاء میں کاروائی کے طور پر گورنمنٹ کالج، کہوٹہ کر دیا گیا۔

ان دنوں حلقۂ اربابِ ذوق کے سیکرٹری زاہد فخری تھے۔ اُنھوں نے اس اجلاس کی صدارت کے لیے (جو ایک مشاعرہ پر مشتمل تھا)، فیاض تحسین کا نام ان کی اجازت سے طے کر رکھا تھا۔ فیاض تحسین ان دنوں فیصل آباد کی انتظامیہ میں غالباً اے سی تھے۔ کسی منصبی ضرورت سے وہ تشریف نہ لا سکے۔ زاہد فخری نے یہ صدارت ریاض مجید کے سپرد کر دی۔ اس میں کُچھ بھرپور سیاسی نظمیں پڑھیں گئیں۔ واضح ہو کہ یہ وہ وقت تھا جب بھٹو صاحب کی پھانسی کے بعد پیپلز پارٹی سے وابستہ یا ان سے کُچھ تعلق رکھنے والے اہلِ قلم، جہاں موقع ملتے حکومت کے حوالے سے اپنے مخالفانہ روّیے کا اظہار کرتے رہتے تھے۔

یہ پوری غزل تب بھی اور آج بھی اپنے تلازماتی مفہوم میں بڑی خوب صورت غزل ہے۔ اس کی رپورٹنگ ہال میں موجود حکومتی کارندوں نے کُچھ اس انداز میں کی کہ اسے پیپلز کالونی کے اجلاس سے تعبیر کیا اور اجلاس کے بعد ''جلوس بھٹو زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے گھنٹہ گھر تک آئے'' جیسے فقرات سے FIR کو اور تشویش ناک بنا دیا، جو بالکل خلاف واقعہ اور صریحاً جھوٹ تھا۔ حلقہ کے اجلاسوں میں ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں ہر طرح کے فکری اختلاف کا، جو اب بھی حلقے ہی کے لوگ دیتے رہتے ہیں اُنھوں نے اپنے طور پر ہر صدارتی گفت گو اور اپنے کلام میں حلقے کی سیاسی فضا کو متوازن کرنے کی کوشش کی تھی، مگر دس بیس دنوں بعد، جو انکوائری کا سلسلہ چلا اس کا نتیجہ یوں نکلا کہ حلقہ اربابِ ذوق کے مئی ۱۹۷۲ء سے جاری اجلاس ختم ہو گئے انتظامیہ کا خاموشی مسّودہ تھا یا اراکین حلقہ کی خود ساختہ پابندی، پھر پانچ چھے مہینوں تک حلقے کے اجلاس نہیں ہوتے۔ اجلاس میں شامل تین سرکاری ملازمین کے فوری تبادلے کے احکامات صادر کر دیے گئے۔ ارشد جاوید ان دنوں جی ٹی ایس میں تھے۔ ریاض مجید کے احکامات تبادلہ پہلے گورنمنٹ کالج، فتح جنگ کے ہوئے وہاں اُردُو کی کوئی پوسٹ نہیں تھی۔ پھر گورنمنٹ کالج کہوٹہ میں اکنامکس کی ایک خالی پوسٹ پر وہاں بھجوا دیا گیا اتفاقات سے یہ کالجوں میں تعلیمی سرگرمیوں کا وقت نہیں ہوتا اِنھی دنوں میں اپنا پی ایچ۔ڈی کا مقالہ مکمل کر رہا تھا، جون، جولائی میں گرمیوں کی تعطیلات ہو جاتی ہیں، لہٰذا اُنھیں

تبادلے سے زیادہ مشکل پیش نہیں آئی وہ راولپنڈی میں اپنے دیرینہ دوست نذیر عامر (پروڈیوسر پی ٹی وی) کے ہاں کُچھ دن مقیم رہے وہاں سے کہوٹہ جا کر دوپہر کو واپس آجاتے اور مقالے کو مکمل کرتے۔

گورنمنٹ کالج کہوٹہ سے ریاض مجید کا تبادلہ حکومتی کارندوں، محکمۂ تعلیم اور مقامی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے سٹاف کی وضاحتوں کے بعد واپس ہوگیا اور ریاض مجید نے ۱؍ اکتوبر ۱۹۸۱ء میں اپنی خالی سیٹ پر دوبارہ، جوائن کر لیا۔ ان دنوں میں مقالے کی تکمیل ہوئی واضح ہو کہ پنجاب یونی ورسٹی کے ناظم امتحانات میں جمع کرائے گئے مقالے کے خاکہ پر ریاض مجید کا پتا اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کہوٹہ درج ہے۔ اس کی نشان دہی کرتے ہوئے ریاض مجید کہتے ہیں:

> ''کہوٹہ درج کرنے کی ضرورت تو نہیں تھی۔ یہ ایک غصہ اور مُحبّت کا ملا جلا ردّ عمل تھا۔ غصہ حکومتی، خفیہ ایجنسیوں کی عدم واقفیت اور حماقتوں کا جن کے پاس میرے افکار و خیالات کے بارے میں صحیح معلومات نہیں ان دنوں میری زُبان پر ایک فقرہ بار بار آتا کہ مجھے اپنے تبادلے کا تو کوئی دکھ نہیں۔ مغربی پاکستان کی بنیاد پر میری باز پرس ہوئی تھی اور حسبِ ضابطہ میری کہیں بھی تبادلہ ہو سکتا ہے۔ دکھ اس بات کا ہے کہ حکومت غلط معلومات پر کیسے چل رہی ہے اور ادیبوں پر کیسے ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہوئے اور اُنھیں القابات کیسے دے رہی ہے۔'' (۸)

انتظامیہ کے خیالات کو بدلنے میں فیاض تحسین (اے سی) اور زاہد سرفراز مسلم لیگ کے مقامی رہ نمانے بڑی کوششیں کیں۔ انور محمود خالد اور زاہد فخری میرے ساتھ تھے۔ یہ میں نے اس لیے کہا تھا کہ مجھے دفتری خط کتابت اور انکوائری نما خطوں کا ایک تلخ تجربہ تھا، جب لائل پور میں بھٹو صاحب کی حکومت نے وقت صحافیوں اور اہل قلم کو ایک حکومتی پالیسی کے تحت آسان قسطوں پر پلاٹ دیے گئے، تو میں نے اپنے ملنے والے پلاٹ کو تحریری طور پر یہ لکھ کر واپس کر دیا تھا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں یہ کسی اور ضرورت مند ادیب کو دے دیا جائے۔ میرے اس خط کو کسی نے پڑھا یا نہیں یا ایف ڈی اے کے متعلقہ کلرک یا افسر نے اس کی کیسی تفہیم کی کہ مجھے کئی مہینوں تک خط و کتابت کا سامنا کرنا پڑا وہ کئی سالوں تک مجھے پوچھتے رہے کہ آپ نے اپنی پہلی قسط جمع نہیں کرائی۔ آپ فلاں رسید لے کر حاضر دفتر ہوں ایک چھپا ہوا حکم نامہ دوسروں کے ساتھ مجھے بھی سہواً بھیج دیا جاتا ہے۔

گورنمنٹ کالج سے وابستگی:

ریاض مجید کو درس و تدریس کے علاوہ کالج کے دیگر تفویضی اُمور اور علمی و ادبی سرگرمیوں سے خصوصی شغف رہا ہے۔ وہ ادبی حوالے سے اسٹیج کے آدمی تھے اور قدرت نے اُنھیں بے پناہ صلاحیّتوں سے نواز رکھا تھا۔ آپ اعلیٰ انتظامی صلاحیّتوں میں بھی مشاق تھے۔ موقع و محل کے عین مطابق حکمتِ عملیاں مُرتّب کرنا اور اپنی منشا کے مطابق نتائج مُرتّب کرنا ریاض مجید کے بائیں ہاتھ کا کھیل رہا ہے۔ گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں ملازمت۔ اساتذہ سے تعلق، علمی و ادبی پروگراموں میں

اپنی مشارکت اور انعامات پانے کے ساتھ کالج کے ادبی مجلے کی ایک طویل عرصے ادارت جیسی گراں قدر علمی و ادبی خدمات انجام دیں۔

گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں ریاض مجید مدت ملازمت تیس سال کے قریب رہی طالب علمی کے پانچ سال اور ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ عرصے کی کنٹریکٹ کی ملازمت کا مجموعہ عرصہ قریباً چھتیس سال کا ہے۔ اس دوران میں آنے والے سبھی پرنسپل اور اساتذہ سے اُن کی بڑی اچھی یادیں رہیں۔ کالج کے زمانہ میں بین الکلیّاتی مشاعروں میں شرکت کے لیے اُنھوں نے لاہور سے ملتان اور جہلم سے ایبٹ آباد تک متعدد شہروں کا سفر کیا کالج کے لیے کئی انعامات جیتے اور ٹرافیاں وصول کیں ۱۹۶۲ء میں بیس کالج میگزین کی ادارت سنبھالی۔ بیکن کے اُردو حِصّہ کا نام روشنی رکھا۔ بہ حیثیت اُستاد یہاں روشنی کا پچاس سالہ اِنتخاب نمبر شایع کیا۔ کالج کے حوالے سے یہ ایک اہم دستاویز ہے، جو کالج میگزین کے پہلے شمارے سے اس وقت تک شایع ہونے والے شماروں کی تحریروں کے اِنتخاب پر مشتمل ہے۔ کالج کی کئی بزم ادب، حلقۂ ادب، اعزازی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن شعبہ آثار کالج وغیرہ۔

شادی اور اولاد:

ریاض مجید کی شادی رخسانہ سے قرار پائی۔ اپنی ملازمت اور علمی و ادبی خدمات کی انجام دہی کے بعد اُن کے پاس وقت کی کمی ہوتی تھی۔ چناں چہ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اُن کی تمام تر گھریلوں ذمے داریوں کا بار اُن کی اہلیہ کے سر رہا، جسے اُنھوں نے بہ طریقِ احسن انجام دیا۔ ریاض مجید کی شادی ۲۰ / فروری ۱۹۷۰ء میں اپنی ہی برادری میں رخسانہ سے ہوئی۔ اُنھیں اللہ تعالیٰ نے تین بیٹیوں رمیضہ، عائشہ، حمیرا اور دو بچّوں محمد مسلم مجید اور محمد علی مجید سے نوازا۔ اُنھیں فرائضِ منصبی کی ادائی اور دیگر علمی اور ادبی سرگرمیوں اور دیگر مشاغل کی وجہ سے گھریلو اُمور کی انجام دہی کے بہت کم وقت ملتا تھا، لہٰذا بچّوں کی ابتدائی تربیت اور تعلیمی مراحل میں اُن کی اہلیہ نے بڑی مدد کی گھر کے مسائل میں اہل خانہ نے بڑی سلیقہ شعاری سے کام لیا۔ بچیوں کی تعلیم ان کی شادی کے مراحل بھی بخیر و خوبی مکمل کرنے میں اُن کا بڑا ہاتھ ہے۔ سب بچیوں کی شادی ان کی تعلیم کے دوران جیسے جیسے طے پائی گئی، کر دی گئی۔ رمیضہ جی سی فیصل آباد میں ایم اے کی طالبہ تھی، جب ان کی شادی ہوئی۔ عائشہ کی شادی بی اے کی تکمیل پر ہوئی۔ حمیرا نے گورنمنٹ کالج برائے خواتین سے ایم۔ اے اسلامیات کا امتحان پاس کیا، تو اس کی شادی کر دی گئی۔ تینوں کے آگے اولاد ہوئی اور اپنے گھروں میں خوش و خرم ہیں۔ رمیضہ کی بڑی بیٹی روحہ کی بھی شادی ہو چکی ہے جس کا ایک بیٹا محیط بھی ہے یوں اس خاندان کی اگلی نسل بھی صاحب اولاد ہے۔ عائشہ ان دنوں اپنے میاں کے ساتھ امریکہ میں ہے، اس نے میٹرک کے امتحان میں اپنے گروپ (طالبات) میں بورڈ میں امتیازی پوزیشن حاصل کی۔ تینوں بچیوں نے اسلامیات

کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ نفسیات کے مضامین پڑھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ نفسیات میں ایم ایس سی کریں، مگر اس زمانے میں فیصل آباد کے کسی ادارے میں نفسیات کی کلاسوں کا اجرا نہیں ہوا تھا۔

ریاض مجید کے بڑے بیٹے محمد مسلم مجید نے ہم درد یونی ورسٹی فیصل آباد کیمپس سے بی اے آنرز میں کیا اور عین اس وقت جب وہ اسی یونی ورسٹی میں ایم بی اے کے داخلے کے لیے یونی ورسٹی جانے کے لیے تیّار ہو رہا تھا کہ اچانک فوت ہو گیا۔ یہ جواں مرگی پورے خاندان کے لیے ایک اہم واقعہ تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے Amblyism ایک ایسی بیماری سے تعبیر کیا جس میں دورانِ خون میں کسی بلبلے (Bulbble) کے آنے سے دماغ کے کہیں حصّے کو آکسیجن کی سپلائی منقطع ہونے سے آدمی کی فوری موت واقعہ ہو جاتی ہے۔ یوں مسلم ۲۸/ دسمبر ۲۰۰۳ء کو قریباً سوا بائیس سال کے عمر میں فوت ہو گیا۔ ریاض مجید اپنے جواں سال بیٹے کی وفات پر کی جانے والی تعزیت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ’’اہلِ خانہ کے علاوہ دوستوں نے بھی، جواں سال، ذہین اور سعادت مند بیٹے کا سوگ منایا۔ مقامی اخبارات میں اس کی خبر شایع ہوئی۔ یونی ورسٹی، مقامی ادبی حلقوں نے مسلم کے لیے تعزیتی اجلاس منعقد کیے۔ احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، حفیظ تائب، شہزاد احمد، ظفر اقبال، مرتضیٰ برلاس اور دوسرے شاعروں اور ادیبوں نے مکاتیب، شاعری اور بالمشافہ ملاقاتوں سے اپنے خزینہ تاثرات کا اظہار کیا۔‘‘(۹)

ریاض مجید سے کی جانے والی تعزیت اور شعری خراج کی ایک بڑی وجہ، اُن کے ادب دوستو ں کی مسلم سے محبّت تھی۔ بڑا بیٹا ہونے کے ناطے گھر میں آنے والے مہمانوں کی خاطر مدارت میں وہی پیش پیش ہوتا، لہٰذا ریاض مجید کے سارے احباب اس سے مانوس تھے۔ ریاض مجید کے فرزندِ دل بند سے اُن کے دوست احباب کی دل مونست تھی، جو اُن سے تعزیت اور شعری خراج کا باعث بنی۔ کیوں کہ اُس بچّے سے ریاض مجید کے دوست احباب کی ہونے والی گاہے گاہے ملاقاتیں، اُس کی خدمت گزاری اور سعادت آثاری اس بات کی متقاضی تھی کہ اُن کی جدائی میں آنسو بہائے جائیں۔ واضح رہے کہ مسلم کا نام ریاض مجید نے اپنے خاندان کے ایک بزرگ مولوی محمد مسلم (۱۸۰۸۔۱۸۸۱) کے نام کی مناسبت سے محمد مسلم رکھا تھا۔

ریاض مجید کے دوسرے بیٹے محمد علی مجید کے پنجاب گروپ آف کالجز سے ایم بی اے کرنے کے بعد شادی ہوئی۔ علی مجید کی اہلیہ کا نام وردہ ہے۔ ان کے دو بچے انیبہ اور طٰہٰ ہیں۔ وہ فیصل آباد کے ایک معروف صنعتی ادارے انٹرلوپ میں ملازم ہیں اور ریاض مجید کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔

ریاض مجید اپنی ازدواجی زندگی سے بہت مطمئن ہیں۔ پاکستان ٹیلی ویژن لاہور سے تیّار ہونے والی دستاویزی ’قلم‘ میں اور میری تحقیق ’۱۹۹۵ء پروڈیوسر عالی میں (جو پچپن منٹ پر مشتمل ہے) میں ان کے بچوں، بچیوں اور اہلیہ کے تاثرات میں اس اطمینان کا اظہار ہوتا ہے۔ ریاض مجید اپنی عائلی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میں نے پر سکون اور آسودہ حال زندگی گزاری ہے۔اِس کی بنیادی وجہ رخسانہ کا خصوصی کردار ہے، جس نے بڑی مہارت اور شائستگی سے سلیقہ مندی کا ثبوت دیا۔مجھے خبر تک نہیں ہوتی تھی کہ کس معاملہ فہمی سے وہ گھر چلا رہی ہیں۔دوسری اہم بات یہ ہے کہ میری سادہ مزاجی اور ایک خاص وقت میں خلوت گزینی بھی اُس احترام کا تقاضا کرتی تھی،،جو مجھے میری اہلیہ سے ہمیشہ حاصل رہا ہے۔"(۱۰)

ریاض مجید سادہ طبع کے مالک ہیں۔ان سے ملاقات کے لیے آنے والا کوئی بھی اجنبی شخص پہلی نظر میں اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا کہ وہ جس شخص سے ملاقات کر رہا ہے وہ برصغیر پاک و ہند کی اہم ترین ادبی شخصیات میں سے ایک ہے۔ریاض مجید نہایت ملنسار اور مہمان نواز انسان ہیں۔ان کی خوش خلقی کے باعث لوگ پہلی ہی ملاقات میں ان کے دیوانے ہو جاتے ہیں۔ایثار،عاجزی اور تواضع،ریاض مجید کی شخصیت کے نمایاں اوصاف ہیں۔

ان کے حوالے سے ایک اہم بات (جس کا ذکر بے جا نہ ہو گا) یہ بھی ہے کہ وہ انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو بخوبی سمجھتے ہیں۔اکثر لوگ اپنے مفادات کی خاطر ان کے قریب آنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن وہ سب کُچھ جانتے ہوئے بھی مہربانی اور شفقت کی روش ترک نہیں کرتے۔یہ ان کی انسان دوستی کی دلیل ہے۔اگرچہ بہت سے لوگوں کو اس بات میں اختلاف کے کُچھ پہلو بھی نظر آئیں گے، لیکن ملنساری اور عاجزی ریاض مجید کی ذات کی وہ نمایاں خصوصیات ہیں، جن سے اُن کے کسی جاننے والے فرد کو کوئی انکار نہیں ہے۔نفسا نفسی کے اس دور میں ایسی روشن روایات کا زندہ رہنا انسانیت کے تابناک مستقبل کی نوید ہے۔

ریاض مجید نے اپنی زندگی میں جہاں کہیں اپنے اساتذہ سے کسبِ فیض کیا ہے،وہاں وہ اپنے دوست احباب کے بھی معترف ہیں۔اُن کا خاندان ایک علمی و ادبی سلسلہ رکھتا تھا۔چناں چہ وہ اپنے ننھال اور دھدھیال میں سے چند قابلِ تقلید ہستوں کے ہمیشہ سے معترف رہے ہیں۔

ریاض مجید کی زندگی پر جن اہم شخصیات کا اثر ہے۔ان میں کُچھ دوست،اساتذہ اور اس کے علاوہ چند ایک خاندانی شخصیات ہیں۔ان لوگوں میں اُن کے ماموں حمید جالندھری،جو اُردُو کے شاعر ہیں اور مکتبہ کاروں کے مالک ہیں۔ایک اور اہم شخصیت اُن کے والد عبدالمجید کے ماموں سلیمان سیمابی تھے۔شانِ غزل کے نام سے ان کی کتاب چھپ چکی ہے۔سلیمان سیمابی ،سیماب اکبر آبادی کے شاگرد تھے ان کا اصل نام عبدالغفور سلیمان سیمابی ہے۔علاوہ ازیں اُن کے میرے ماموں عبدالحمید کے ماموں عبداللہ غازی رحمت اللہ باکمال شاعر گذرے ہیں۔وہ مولانا گرامی حفیظ جالندھری کے دوست تھے۔اے رحیم میرے ایک اور ماموں ہیں، جن کا ثقافتی و سماجی ادب کا گہرا مطالعہ ہے۔ان کا ادارہ نیشنل پبلشنگ ہاؤس پنڈی میں کام کر تارہا ہے۔ان سب کے اثرات اُن پر گہرے ہیں۔اس طرح ان شخصیات کی وجہ سے ایک ادبی فضا بنتی تھی۔

ریاض مجید تصنّع اور بناوٹ سے عاری زندگی پر دل و جان سے فریفتہ ہیں۔ وہ سادہ لباس پہنتے ہیں اور سادہ خوراک کے شوقین ہیں۔ شلوار قمیص ان کا پسندیدہ لباس ہے۔ بدلتے موسم میں قمیص کے اُوپر واسکٹ اور سردیوں میں کوٹ اور مفلر زیب تن کرتے ہیں۔ اگر کوئی نیاز مند اُن کی دعوت کرنا چاہے تو اپنے دستر خوان پر چپاتی کے ساتھ پودینے کی چٹنی رکھ لے اور اگر زیادہ تواضع مقصود ہو تو کدو کے رائتے کا اضافہ کر لے۔ ریاض مجید کو مرغن غذاؤں سے زیادہ رغبت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسی دعوت میں، جو خالصتاً ان کے اعزاز میں منعقد کی گئی ہو ایسے تکلفات کی ممانعت کرتے ہیں۔

ریاض مجید کی زندگی میں جن شخصیات کا عمل دخل رہا ان میں ان کے دوست بھی شامل ہیں۔ ریاض مجید ایک عرصے تک تقریباً ہر شام فیصل آباد کے ''محفل ہوٹل'' میں گزارتے رہے ہیں۔ اس طرح ارم ہوٹل اور محفل ہوٹل میں تقریبات منعقد ہوتی رہی ہیں۔ ان تمام تقریبات کا منعقد کروانا اِنھی کا کام ہوتا تھا۔ ریاض مجید میں بہتر انتظامی صلاحیتیں بھی موجود ہیں۔ وہ اچھّے منتظم بھی ہیں۔ اس بارے میں ریاض مجید کے ایک سابقہ شاگرد شبیر احمد قادری، جو اب گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں لیکچرار تعینات ہیں نے بات کرتے ہوئے کہا:

> '' اُستاد محترم ریاض مجید بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں سے بھی مالا مال ہیں۔ فیصل آباد میں علمی و ادبی سرگرمیاں اِنھی کے دم قدم سے ہیں۔'' (۱۱)

ریاض مجید مجلس اقبال اور ''حلقہ ارباب ذوق'' کے کارکن کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ رائٹرز گلڈ اور انجمن افکار اسلامی سے وابستہ ہیں اور بہت سی علمی و ادبی، ثقافتی اور مذہبی تنظیموں میں شرکت کرتے رہے ہیں۔

ریاض مجید نے اپنی عائلی زندگی کا آغاز ۱۹۷۰ء میں کیا۔ ان کی شریک سفر کا نام رخسانہ ہے۔ وہ ایک سلجھی ہوئی خاتون ہیں۔ اپنے بچّوں کی تعلیم و تربیت میں ان کا نمایاں ہاتھ ہے۔ اس کا ثبوت بچّوں کے شان دار تعلیمی ریکارڈز ہیں۔

ریاض مجید سکول کے زمانے سے شعر کہتے آرہے ہیں، لیکن ان کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز کالج کے زمانے سے ہوتا ہے۔ کالج کے زمانے میں تھرڈ ایئر میں باقاعدہ غزل کہنا شروع کی۔ کالج کے مشاعروں کی نمایندگی کرتے تھے اور اس سلسلے میں انعامات بھی حاصل کئے ہیں۔ اس زمانے میں اُنھوں نے بہت سی غزلیں اور کُچھ نظمیں کہیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ شعری ذوق بھی بڑھتا گیا اور آخر کار ان کا پہلا مجموعہ ''پس منظر'' ۲۰ فروری ۱۹۷۳ء کو چھپا۔ ریاض مجید کی شاعری اس روشنی کی مانند ہے، جو دل کے اندھیرے کو منور کر دیتی ہے۔ یہ روشنی ہی انسان کے لیے کھوئے ہوؤں کی جستجو میں معاونت کرتی ہے۔ وہ اُن لمحوں کی تلاش میں آج بھی شاعری میں سراغ رسانی میں سرگرداں دکھائی دیتے ہیں۔

اس ادبی فضا کے ساتھ ساتھ بہت سے بیرونی سفر بھی کر چکے ہیں۔ پہلا سفر خواجہ نظام الدین اوّلیاء کے عرس کے موقع پر ۱۹۶۴ء میں انڈیا کا کیا۔ اس کے بعد امیر خسرو کے عرس پر دوبارہ انڈیا گئے۔ اس وقت ریاض مجید کے ساتھ ڈاکٹر ریاض

احمد ریاض بھی موجود تھے۔اس سفر کے بارے میں ریاض احمد ریاض نے بات کرتے ہوئے کہا کہ ریاض مجید سفر کے بہت اچھّے ساتھی ہیں۔

ریاض احمد نے اپنی کتاب ''بر سبیل سفر'' میں ریاض مجید کا ذکر بڑے اچھّے الفاظ میں کیا ہے۔ریاض مجید چار بار سعودی عرب جا چکے ہیں۔پہلی بار ۱۹۷۳ء میں عمرے کے لیے گئے اور دوسری بار اپنی بیوی رخسانہ کے ساتھ ۱۹۸۴ء میں حج بیت اللہ کی سعادت کے لیے تشریف لے گئے۔۱۹۸۷ء میں تھائی لینڈ اور بنگلہ دیش گئے۔اس کے علاوہ ۱۹۸۸ء میں ایک بار پھر عمرے کے لیے سعودی عرب گئے۔اس سفر میں ان کے ساتھ حافظ لدھیانوی اور حفیظ تائب تھے۔۲۰۰۱ء میں اُنھیں حج کی دوبارہ سعادت نصیب ہوئی۔اُنھوں نے گزشتہ سالوں میں ،جولائی،اگست میں روس (تاشقند، سمر قند اور بخارا وغیرہ) کے دورے بھی کیے۔

ریاض مجید کو جہاں تخلیق کا شوق رہا وہاں اس کے ساتھ ساتھ ادبی کتب کی اشاعت کا شوق بھی رہا ہے۔اس شوق کی تکمیل کے لیے اُنھوں نے دوستوں کی وساطت سے ایک اشاعتی ادارہ ''قرطاس پبلشرز'' کے نام سے شروع کیا اور وہ اس ادارے کے تحت اب تک تقریباََ دو سے زائد کتابیں چھاپ چکے ہیں۔اس کے علاوہ '' نعت اکادمی'' ان کے زیرِ نگرانی کام کر رہی ہے اور ''مسلم پنجابی مجلس''،جو اُنھوں نے اپنے بزرگ مولوی محمد مسلم کے نام پر قائم کی ہے،کام کر رہی ہے۔

ریاض مجید کو ادب سے گہرا لگاؤ ہے اور وہ ایسے تمام افراد کی بھرپور مدد کرتے ہیں،جو تخلیقی یا تحقیقی حوالے سے ان کے پاس رہ نمائی کے لیے آتے ہیں۔ریاض مجید کے پاس آنے والا ہر نوجوان طالب علم اپنی توقعات سے زیادہ تعاون اور رہ نمائی حاصل کرتا ہے۔ان کی ذاتی لائبریری کے دروازے ایسے طالب علموں کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں،جو کوئی نہ کوئی نئی بات سیکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔نو،جوان نسل کے لیے ریاض مجید کی باتیں سبق آموز ہیں۔ایسی دانائی کی باتوں کے پس منظر میں طویل عمر کے تجربات اور مشاہدات پوشیدہ ہیں۔

ریاض مجید ایسے محققوں کی بھی دل کھول کر مدد کرتے ہیں، جن کے تحقیقی مقالوں پر بطور نگران کسی اور شخص کا نام ہوتا ہے۔اکثر اوقات وہ ایسے طالب علموں کے تحقیقی نگران کی تمام تر ذمّے داریاں نبھاتے ہیں اور خاکے کی تشکیل سے لے کر مقالے کی تکمیل تک کے تمام مراحل ایک خاموش، لیکن مکمل ذمّے داری کے ساتھ طے ہو جاتے ہیں۔یعنی ''نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا'' کا مصرع ریاض مجید کے لیے ہی کہا گیا تھا۔اکرام مجید، ریاض مجید سے لیے جانے والے ایک انٹرویو میں لکھتے ہیں:

> ''جو مہمان اُن کے پاس چند لمحوں کے لیے آتا ہے،اُسے یہ چند دن ٹھہراتے ہیں اور ،جو چند دنوں کے لیے آتا ہے،اُسے چند ماہ ضرور ٹھہراتے ہیں۔ریاض مجید کی شخصیت میں ایک کھچاؤ ہے۔ہر کوئی اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' (۱۲)

ریاض مجید شعر و ادب سے لگاؤ رکھنے والے نوجوانوں میں شعر گوئی کا ایسا شوق پیدا کر دیتے ہیں کہ پھر وہ فرد کاغذ قلم کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ریاض مجید کو کلاسیکی میوزک سننے کا بہت شوق ہے۔ ان کے پاس کلاسیکی ریکارڈز بھی موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے فوٹو گرافی کا شوق بھی پال رکھا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے پاس مختلف کیمرے اور لینز کافی تعداد میں موجود ہیں، وہ ان کے ذریعے سفر کے دوران اپنی یادوں کو محفوظ کر لیتے ہیں۔

ریاض مجید اظہار خیال پر فن کارانہ قدرت رکھنے والے شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے فن کی ان بُلندیوں کو چھوا ہے جن تک رسائی کے لیے بعض بزرگ شعرا ہنوز دشتِ امکاں میں اپنا پہلا نقش پا بھی ثبت نہیں کر پائے۔ ان کی شاعری میں شاعر ماضی کے خوابناک واقعات میں پناہ ڈھونڈتا نظر آتا ہے۔ وہ مستقبل کے اُفق پر بتدریج تحلیل ہوتی ہوئی دھند کا مشاہدہ تو کرتا ہے، لیکن صبح کے اجالے کی طرف مضبوط قدموں کے ساتھ بڑھنے کی بجائے پیچھے مڑ کر اپنے جلاوطن ماضی کو یاد کرنے لگتا ہے۔ اُن کی غزلیہ شاعری اپنی ایک الگ تھلگ شناخت رکھتی ہے۔ اُن کی غزل کے بارے میں احمد ندیم قاسمی تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ریاض مجید کی غزل کا محور وہ کرب ہے، جس میں نہ صرف اُس کی ذات اسیر ہے، بل کہ وہ پوری کائنات کو اِس کرب کی شدت میں اینٹھتا اور کراہتا ہوا محسوس کرتا ہے۔۔۔ یہ کرب احساسِ شکست اور اِس کے نتیجے میں بے بسی اور بے دلی کا اظہار ہے، تو اسے منفیت کے سوا اور کُچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ریاض مجید کی غزل مثبت کرب کا اظہار ہے کیوں کہ وہ اس شعور سے مسلح ہے، جس کے بغیر انسان سفاک عناصر اور بے رحم انسانوں کی اس دنیا میں ہتھیار ڈال کر بیٹھ جاتا ہے۔ ریاض مجید نے کسی مرحلے پر بھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ موضوع سے قطع نظر، اگر وہ غزل کی خوب صورت روایت سے بھی بغاوت کرتا تو یہ نفسیاتی نکتہ ہاتھ لگ سکتا تھا کہ وہ تخریب کاری پر اتر آیا ہے، مگر اُس کی غزل روایت سے صرف اُس حد تک بغاوت کرتی ہے، جس حد تک عصرِ حاضر کے غزل گو کو بہ ہر صورت کرنی چاہیے۔" (۱۳)

غزل کے ساتھ ساتھ ریاض مجید نے بہت خوب صورت نظمیں بھی کہی ہیں۔ اس کے بعد ان کا اگلا قدم نعت کی طرف اٹھتا ہے۔ اُنھوں نے بہت خوب صورت نعت کہی ہے اور اس صنف میں بے پناہ وسعت اور اضافے کئے ہیں۔، جو ان کے رچے ہوئے ذہنی شعور کو ظاہر کرتے ہیں۔ ریاض مجید جب ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ مستقبل سے مایوس ہیں بل کہ پُر اُمّید نظر آتے ہیں اور یہی چیز ان کے لب و لہجہ کو بُلند آہنگ، پر وقار اور رجائیت آمیز بنا دیتی ہے اور وہ کس اعتماد کے ساتھ آنے والے دنوں کی بشارت دے رہے ہیں۔ ریاض مجید نے زندگی کے ہر رُخ کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔ اُنھوں نے مرکزیت قائم رکھتے ہوئے اپنے اطراف وجوانب پر خوب خامہ فرسائی کی ہے۔ ریاض مجید نے بلا تردّد اپنے داخل اور خارج کی موضوعاتی آویزش کو برقرار رکھا ہے۔ وہ اس حوالے سے کامران رہے ہیں۔ اُن کے موضوعات کے بارے میں شہزاد احمد کی رائے ہے:

"ریاض مجید اپنے موضوعات کے لحاظ سے جدید تر نسل کا سب سے متنوع شاعر ہے۔ وہ دقیق مسائل سے لے کر سامنے کی چیزوں تک تمام اجزا کو اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہے۔ بچّے کی طرح وہ سانپ سے کھیلتا ہے اور آگ سے بھی۔"(۱۴)

شخصیت ایسا پر معنی لفظ ہے، جس میں انسان کا ظاہر و باطن شامل ہوتا ہے۔ ریاض مجید خلوص و محبّت کا پیکر، تصنُّع اور ریاکاری سے نفرت، ظاہر و باطن میں یکساں، پابند صوم و صلوٰۃ، ذہین و فطین، اُصولوں پر سختی سے کاربند، اختیارات کے ناجائز استعمال سے گریزاں، مگر تعریف کرنے والے شخص کی حوصلہ شکنی کو بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ادب اور ملازمت میں حدود کا پوری طرح خیال رکھتے ہیں۔ گفت گو میں اُردو کے خوب صورت الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔

ان کے پاس ایک وسیع حلقہ یاراں ہے۔ دوستی کے معاملے میں کسی ادبی جماعت کا لحاظ نہیں رکھتے۔ ہر اچھّے انسان سے دوستی کرتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے زمانے میں اگر کوئی ہم جماعت یا دوست اُصولوں سے ہٹ کر کوئی بات کرتا یا نظریہ اسلام کے خلاف بات کرتا تو ایسی باتوں پر ریاض مجید احتجاج کرتے۔ اس کی وجہ شاید بی بی جی (والدہ) جیسی عبادت گذار خاتون کی تربیت تھی۔ ان کے گھر والے بتاتے ہیں کہ ریاض بڑوں کا کہا کبھی نہیں ٹالتے تھے۔ بزرگوں کا بہت ادب کرتے تھے۔ والد کی وفات کے بعد ابھی بچّے تھے، لیکن اس کمی کو بہت محسوس کیا اور، جوں جوں بڑے ہوئے یہ احساس شدت پکڑتا گیا۔ اُنھوں نے اس دکھ کو محسوس کیا اور شاعری کی نذر کر دیا۔

ریاض مجید تعلیمی میدان میں نمایاں رہے اور اُردو ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس زمانے میں اُنھوں نے کُچھ غزلیں اور نظمیں کہیں۔ اُنھیں نعت لکھنے کا شوق بھی اسی زمانے میں ہوا اور دو نعتیں کہیں ایک فارسی میں اور دوسری اُردو میں۔ ریاض مجید بڑی دھیمی شخصیت رکھتے ہیں اور درویشانہ رکھ رکھاؤ کے مالک ہیں۔

ڈاکٹر ریاض مجید کی شخصیت تضادات کا شکار نہیں۔ وہ، جو کہتے ہیں اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے فیصل آباد میں ایک علمی و ادبی فضا اور ماحول قائم ہوا ہے۔ ان کے بارے میں ہمیشہ لوگ اچھّی بات کہتے ہیں۔

ریاض مجید فیصل آباد کی ادبی و نظریاتی عمارت کا اہم ستون ہیں۔ ریاض مجید نے اپنے ادبی سرمائے کو نہ صرف اپنے ذہن تک محدود رکھا بل کہ اوروں تک پہنچانا اپنا فرض اوّلین سمجھا۔ اس کا ثبوت ان کی ادبی محفلیں ہیں، جو ذہنی تربیت کا باعث بنتی ہیں۔

ریاض مجید ادبی محفلوں کی جان ہیں۔ ادبی محفل جماتے ہیں تو خوب جماتے ہیں۔ بہت سے لوگ ان کے حوالے سے شاعر اور ادیب بنے۔ ریاض مجید کا تعلق چوں کہ ایک مولوی خاندان سے ہے۔ ان کے بزرگ اپنے زمانے میں بڑے عالم

فاضل گزرے ہیں۔ اس لیے ریاض مجید بھی مذہب کو زندگی میں ضروری تصوّر کرتے ہیں۔ نمازِ پنجگانہ کی پابندی کرتے ہیں۔ ہر وقت درود کا ورد کرتے رہتے ہیں:

جائے گا نہ رائیگاں کوئی حرفِ دُرود
دیے خیر کی فصل یہ قرینے کی زمین (۱۵)

صلِّ علیٰ نبینا ، صلِّ علیٰ محمدٍ
اک ہی ورد ہے کہ جو رکھتا ہے رُوح مطمئن (۱۶)

ریاض مجید پانچ وقت کی نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ کیسی بھی مذاق کی محفل ہو، مشاعرہ ہو یا کوئی اور اہم تقریب ہو ان کی زُبان پر درود کا ورد جاری رہتا ہے اور اس کی تاکید بھی کرتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر ریاض مجید نے قرآن و حدیث کے مطالعہ سے بھی اپنی فکر کی شمع کو روشن کیا ہے۔ اس مقدس فکر کی روشنی اُنھیں حدود و ادب سے باہر نہیں جانے دیتی۔ ایک اہم پہلو جس کی طرف بہت کم شعرا نے توجُّہ کی ہے وہ نعت نگار کے لیے بہت اہم ہے وہ کردار سازی ہے۔ اگر شاعر کی زندگی اسوہ حسنہ کی تقلید سے عاری ہے اور نعت گو حضور کی تعلیمات پر عمل پیرا نہیں ہوتا تو نعت گوئی اور نعت نگاری کا آخرت میں کوئی فائدہ اور مقام نہیں۔ اگر عقیدت مندانہ اظہار کردار میں نظر نہیں آتا تو دینوی شہرت اور جلب منفعت کے اس کا کوئی مقصد نہیں رہ جاتا۔ ریاض مجید کا یہ پہلو بہت تابناک ہے۔ وہ ارکانِ دین کی اتباع میں سرگرم عمل رہتے ہیں۔ نعت کا رنگ ان کے افکار و کردار میں جلوہ ریز ہوتا ہے اور نعت میں خصوصی کیفیت کا سبب بنتا ہے۔ سچے نعت گو کی یہی نشانی ہوتی ہے۔ باعمل نعت گو شاعر کے کلام سے اس کی خُوش بُو آتی ہے اور سامعین کے دلوں میں رقت اور سوز کی شمعیں روشن کرتی ہے۔ یہ کیفیت ساری محفل کو گھیر لیتی ہے۔ ریاض مجید ان لوگوں میں سے ہیں ، جو ہر وقت ہر کسی کی مدد کو تیار رہتے ہیں۔ ایک ہاتھ دے اور دوسرے ہاتھ کو پتا نہ چلے والے اُصول کو اپنائے ہوئے اپنے کام میں مصروف نظر آتے ہیں۔

ریاض مجید کی زندگی میں انصاف کا پہلو نمایاں رہا ہے۔ اُنھوں نے کسی شعبے میں بھی خواہ ملازمت کا شعبہ ہو گھر ہو یا کوئی اور ذمّے داری ہو انصاف کے پہلو کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ریاض مجید نے اپنی شاعری کے موضوعات زندگی سے لیے ہیں۔ ان کے دل نے غربا کی غربت کو بھی محسوس کیا اور کشمیریوں کی مظلومیت کو بھی درد دل بنایا اور ان کو شعروں میں پرو دیا۔

ریاض مجید کی ایک خاص پہچان اُن کی نعتیہ شاعری ہے۔ ریاض مجید کی نعتیہ شاعری میں ایک خاص سوز و ساز کی خلش پنہاں ہے، جو اضطرابِ درونِ قلب پیدا کرتی ہے، جس کے درپردہ اُن کا جذبۂ عشق کار فرما ہے۔ یہ جذبہ کسی اور کی جلوہ گاہ کی جانب دامنِ خیال کی رہبری کرتا ہے۔ اُن کا ذوق سحر آفرینی، سپردگی اور سرشاری کا سامان کرتا ہے۔ ڈاکٹر عزیز احسن ریاض مجید کی نعت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ”ریاض مجید صاحب کے کلام میں اُن کی کیفیتِ استغراق، تہجد کے ہنگامِ دل پر وارد ہونے والی واردات، مراقبات میں کائناتِ خیال میں نمود در ہونے والے مناظر اور ہمہ وقت طبیعت پر چھا جانے والی سرشاری نے اُن کے کلام کو سرّ جاں اور رازِ دل کا کشاف بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں معنیاتی بو قلمونی، فکری ضوریزی، اظہاری کشش اور ادب نگاری اور اسالیب جمع ہو گئے ہیں۔“ (۱۷)

ڈاکٹر ریاض مجید کے وسعت مطالعہ پر حیرت ہوتی ہے۔ ان کے روز و شب نوادراتِ علمی کے دوران گزرتے ہیں۔ کتابوں کی ہم نشینی اُنھیں خوب راس آتی ہے۔ ان کی یادداشت قابلِ رشک ہے۔ اُردو فارسی کے اَن گنت اشعار اُن کی نوکِ زباں پر رہتے ہیں، حالیؔ کا قول یاد آتا ہے کہ شاعری کے لیے قدما کے ہزاروں اشعار کا حفظ ہونا لازمی ہے۔ اقبالؔ کے اشعار کا ایک ذخیرہ اُن کے ذہن میں محفوظ ہے۔

شاعری میں نظم کو مغرب میں فروغ حاصل ہوا، جب کہ غزل مشرق کے ادب کی پہچان ہے۔ ادب چوں کہ انسان کی داخلی و خارجی دونوں تجربات و احساسات کو نچوڑ ہوتا ہے، لہٰذا اس کے رویے بھی اس معاشرے یا عہد کے رویّوں سے الگ نہیں ہوتے۔ تہذیب کی پختگی جس قدر مضبوط اور وسیع ہو اسی قدر اس معاشرے کے لکھنے والوں کے ہاں اجتماعیت کا عنصر نمایاں نظر آئے گا۔

آزاد نظم کے اس مختصر سفر میں جہاں پر ہمیں مسافر شاملِ سفر ہوتے نظر آتے ہیں، وہاں اپنی ذات میں انجمن ڈاکٹر ریاض مجید کا نام آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جن کی علمی و ادبی خدمات سے ایک زمانہ آشنا ہے۔ فیصل آباد کا نام سنتے ہی اُردو ادب کے حوالے سے چند مشہور ادبا شعرا کے نام اور ڈاکٹر ریاض مجید کے نام فوراً ذہن کے اُفق پر نمودار ہو کر چمکنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر ریاض مجید فیصل آباد کی زرخیز زمین کا وہ زرخیز ذہن ہے، جس کی علمیت و قابلیت پر کوئی شک نہیں اور جس کی ادب پرور شخصیت، پُر بہار طبیعت خوب صورت گفت گو، برجستہ فقروں اور برمحل لطائف کا ایک عالم مداح ہے۔

ریاض مجید ایک اچھّے تمثال کار ہیں،، جو لفظ اور خیال کے رشتے سے اچھّی طرح واقف ہیں اور اُن کا فن اس کمال سے وہ صوتی و فکری آہنگ پیدا کرتا ہے کہ لفظوں سے تصویر کو ہمارے حواس کا حِصّہ بنانے میں کامران رہے ہیں۔ دہلی کے معروف دانش ور ڈاکٹر عنوان چشتی کہتے ہیں:

> ”پیکر کے دو مفہوم عام ہیں ایک نفسیاتی و تحریری ہے، جس میں پیکر کو تصوّر، عکس اور ذہنی شبیہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ پیکر کا پہلا مفہوم نفسیات اور دوسرا ادب سے زیادہ قریب ہے، لیکن پیکر کی جامع تعریف ان دونوں تصوّرات کے امتزاج کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔ نفسیاتی پیکر مادی ادراک کی تخلیق جدید ہے، جو جذباتی لمحات میں ذہن میں ابھرتا ہے۔“ (۱۸)

ڈاکٹر ریاض مجید کی کئی نظموں میں واضع اور پُر تاثیر تمثال کاری کی مثالیں موجود ہیں۔ آنکھ میں آج بھی جم چکے ایک منظر کی خاموش تصویر لٹکی ہوئی ہے۔ چاند کی گیارہویں رات کا ایک بجا تھا۔ میں اس گھر کی بالائی منزل کی تاریک کمرے میں بستر پہ لیٹا ہوا ادھ کھلے دَر سے اس کی طرف دیکھتا تھا وہ باہر کھلی چھت پہ پھیلی ہوتی ملگجی چاندنی میں نہائی ہوئی (تیز بوڈی کلن، موتیے اور گلابوں کی خُوش بُو میں مہکی ہوئی) چارپائی سے کُچھ دور ہٹ کر، کسی آتے ڈر سے لرزتی ہوئی۔ سیڑھیوں کے برابر کے دیوار کے ساتھ چمٹّی کھڑی تھی۔

شعر میں ریاض مجید ہر صنف میں اپنی جولائی طبع کا برملا اور نپا تلا بلیغ اظہار کرتے ہیں، اس نے جاپانی صنفِ سخن ہائیکو کو پنجابی نعتیہ انداز میں اس خوب صورتی سے ڈھالا ہے کہ وہ پنجاب کی بولیوں کی طرح ایک اور اور یجنل (Original) صنف بن گئی ہے۔ ہائیکو کو اپنی اصل میں یک جذبی (Monopolar) ہے، یعنی وہ فطرت کے کسی ایک پہلو، واقعہ یا واردات کو بیان کرتی ہے،، لیکن ریاض مجید کے قلم نے اسے آفاقی رنگ عطا کیا ہے۔ ''حی علی الثنا'' اس کا پنجابی ہائیکو مجموعہ ہے، جس پر اسے قومی سیرت ایوارڈ بھی تفویض کیا گیا۔

ریاض مجید نے قصّے کہانیوں سے گریز کر کے نعت نگاری کو اپنی تحقیق و موضوع قرار دیا اور ایک گراں قدر کام کیا۔ غالباً پاکستان میں اس موضوع پر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کرنے والے وہ پہلے شخص ہیں، ان کی تصنیف کتاب حوالہ کے طور پر برِّصغیر میں تبریک سمجھ کر پڑھی جاتی ہے۔ مطالعہ نے اُنھیں نظر و خبر کی کشادگی بخشی۔ سخن شناسی سے وہ سخنوری کی طرف مائل ہوئے۔ رہ روانِ شوق کا نعت سے حمد کی طرف راغب ہونا فطری عمل تھا، شکر ہے کہ توحید و رسالت کی خوش بیانی سے ان کے روز و شب کی تپش اور گداز ریشۂ دل میں تحلیل ہو گئے ہیں۔ حمد کے اشعار کائنات کی کارکشائی میں معاون اور عرفان کے لیے بشارت ہیں۔ ثنائے رب کی تکریم نے شعری تخلیق کو پاکیزگی کی اعلیٰ ترین رفعتوں سے ہم کنار کیا ہے۔ قاری کے قلب و نظر میں نوری و حضوری کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ دعائیہ اشعار میں اپنی لغزشوں پر ندامت اور خالقِ کون و مکاں سے مغفرت کی طلب کا عنصر بہت پُر سوز ہے۔ جگہ جگہ عندیت کا اظہار فطرتِ انسانی کی کم مائیگی کا مظہر ہے، متن کے الفاظ کی موزوں ترین صورت موثرات سے معمور ہے۔ زُبان کی سادگی میں مفہوم کی پاکیزگی کا نزول ڈاکٹر ریاض مجید کا خاص مزاج ہے۔، جو اُن کی شعری اسالیب کا امتیاز بھی ہے، وہ ذولسان شاعر ہیں اور زُبانوں کے رازداں بھی، دل میں مچلتے جذبات کو شعر کے مُرقّعوں میں منتقل کرنے میں اُنھیں عبور حاصل ہے۔ کاروانِ خیال زُبان و بیان کے خس و خاشاک کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے نرم رو دریا کی طرح سکوت کے ساتھ رواں ہے۔ موضوع اور اسالیبِ بیان کی ہم آہنگی میں ڈاکٹر ریاض مجید کو خاص شرف حاصل ہے۔

ریاض مجید کو اُن کے اوّلین نعتیہ مجموعے ''اللھم صلی علیٰ محمد ﷺ'' پر بھی قومی صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ قبل ازیں، اُردو میں سیرت نگاری پر ہجرہ ایوارڈ مل چکا ہے، پنجابی میں اُنھیں مسعود کھدر پوش ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

حسان اکیڈیمی کراچی کی طرف سے بھی اُنھیں ایوارڈ مل چکا ہے، پنجابی زُبان میں غیر ممالک میں رہنے والے پنجابی بچّوں کیلیے ”پڑھ بسم اللہ“ ایک منظوم کتاب بھی لکھی ہے۔

ریاض مجید کا ایک اور نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے عجمی الاصل رباعی کو اپنی، جودَت طبع سے عظمت اور انفرادیت بخشی ہے، رباعی اخرب واخرم کے چوبیس اوزان پر متفرع ہے اُنھوں نے بقول صوفی افضل فقیر: اسے انوکھے انداز میں اپنایاہے۔ وہ یوں کہ چوبیس اوزان میں سے ہر وزن پر ایسی رباعیات کہی ہیں، جن کے چاروں مصرعوں میں ایک خاص وزن کا اہتمام ہے۔

ریاض مجید کے ”اللّٰھم صلی علی محمد ﷺ“ کے علاوہ نعت کے چھ سات مجموعے چھپ چکے ہیں۔ فی الوقت ریاض مجید کی مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ تصانیف و تالیفات کی تعداد بیس سے متجاوز ہے، نعت گوئی میں اس کا معاملہ اقبال کی طرح ہے، جس کے دل پہ اشعار ڈھلے ڈھلائے وارد ہوتے ہیں، اس گہرائی بے ساختگی، وارفتگی، تخلیقیت اور وجدان کا انداز اس کے بے شمار نعتیہ اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

شیخ علی حزیں کا قول ہے، ”تصوُّف برائے شعر گفتن خواب است، لیکن ریاض مجید کا معاملہ مختلف ہے، وہ اویسی سلسلے میں بیعت ہے اور بحالت بیداری باوضو درود شریف پڑھتا رہتا ہے، کثرت سے درود خواں کو بقدر ظرف حضور اکرمؐ کی طرف سے بہت کُچھ عطا ہوتا ہے، ایک ایسا مرحلہ بھی آتا ہے کہ درود پاک قلبی واردات بن جاتا ہے، اور دردوخواں جانِ عالمؐ کے دربار اقدس آثار تک رسائی حاصل کر لیتا ہے، ریاض مجید کی بہت سی نعتوں میں درود پاک کی برکات اور بقول اقبال 'بینندۂمافی الصدور' اپنے اُوپر درود بھیجنے والے پر خصوصی توجُّہ فرماتے ہیں، صوفی افضل فقیر اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں۔

ہماری ادبی ثقافت کی روح نعتِ پاک کی تخلیق سے معنبر ہے۔ پیغمبر اعظم و آخرؐ کی شان میں ادبی صنف کا یہ عظمت و جلال اور دل کشی ورعنائی دنیا کی ساری ادبیات میں موجود نہیں ہے۔ تقریباً ہر زُبان کا ادب اپنے مخصوص مذہبی پیشواؤں کا کسی نہ کسی طرح ترجمانی کر رہا ہے ، مگر آں حضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی پر مسلمانوں جیسی دل گداز عقیدت عالمی ادب میں موجود نہیں ہے۔ یہ ایک صنفِ ادب کو سب سے زیادہ مقبولیت اور شہرت ملی ہے۔ ریاض مجید نعت گوئی میں سب سے جدا اور سب سے الگ ایک ممتاز مقام کے مالک ہیں۔

ریاض مجید نے اپنی پسند کی زمینوں میں نعتیں لکھی ہیں اس نے شاید ہی کسی شاعر کا تتبع کیا ہے، فن عروض میں کامل مہارت کی وجہ سے اس نے اپنے بڑے بھائی اکرام مجید کے پنجابی غزل کے مجموعے ”نویاں زمیناں“، جو اڑتالیس اوزان پر مشتمل ہے، سے متاثر ہو کر ریاض مجید نے مذکورہ اڑتالیس اوزان میں نعتیں لکھنے کے بعد ان دیگر اوزان کا اضافہ شدہ اوزان کی تعداد کم وبیش ایک سو پچاس ہے، بقول صوفی محمد افضل فقیر ”ارتقائے نعت کے سلسلے میں بھی ریاض مجید کی خدمات گراں قدر

ہیں۔ اس نے نعتیہ مضامین میں رفعت فکر، پاکیزگی ارادت اور گدازِ جاں کو شامل کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پیکر الفاظ کو بُلند معنی سے نوازا ہے، اور ان کو بُلندی فن سے ہم نوا کرنے کیلیے ترکیب سازی کی ہے ، مگر ترکیب سازی میں ان الفاظ کا استعمال کیا ہے ، ،جو اسلامی تہذیب و ثقافت کے امین اور شعائر الٰہیہ کے علمبردار ہیں۔ جیسے جبریل لفظ، ثمر اشتیاق، اشکِ نصیب، گریہ مقدر، خیال عرش پیما، گداز آثار آنکھیں، خاکِ اقدس آثار، احترام آباد طیبہ، دل آئینۂ آثار، ہجرت نصیب، مدحت خصال، غارذات، لب قرآن سرا، بہشت خواب، نور پاش، نہاد نعت۔

ریاض مجید کے ہر شعر میں باطن کی ایک کیفیت پنہاں ہے، جس میں فرحت و انبساط کے ساتھ نشاطِ زیست کی لذّت محسوس ہوتی ہے۔ اُنھوں نے نعت گوئی میں ایک حکیمانہ نکتہ بیان کیا ہے۔ جسے بنی نوعِ انسان کی فلاح کا نغمۂ نشاط کہا جا سکتا ہے۔ بارگاہِ خیر الانامؐ میں ہدیہ و استغاثہ کے علاوہ مدینہ منورہ، گنبدِ خضریٰ، اطراف مدینہ ہو اور فضائے مدینہ کا اظہار والہانہ اور بو قلموں انداز میں ملتا ہی نہیں بل کہ جھلکتا ہے۔ ریاض مجید کا کلام لائق ستائش عشق نبویؐ سے مملو ہے، حقیقت یہ ہے کہ ایک ناقد کیلیے ان کے شعروں کا اِنتخاب مشکل ہو جاتا ہے، کرشمہ دامن دل می کشد کی جاں ایں جا است والی کیفیت اور کش مکش کی صورت پیدا ہو جاتی ہے، ابھی ریاض مجید کی نعت کے پرت کھلنے والے ہیں، حیرتوں، مشاہدوں اور برکتوں کی ایک نئی دنیا سامنے آنے والی ہے۔ فکر و فن کے مزید اچھوتے نمونے اہل سخن کے روبرو ہونگے اور ریاض مجید واقعتا ریاض رسُول ﷺ کا ایک چہکتا ہوا بلبل نظر آئے گا۔

ریاض مجید نے اسلامی ادبی ثقافت کو نعتیہ شاعری کے دامن میں سمو کر بڑی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ اُن کی نعت میں ایک خاص رعنائی اور دل کشی موج زن ہے۔ وہ حضورِ اکرم ﷺ کی عقیدت میں اشک فشاں دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی نعت دوسرے نعت گو شعرا میں الگ تھلگ پہچان رکھتی ہے۔ نعت سے اُن کی نسبت آفرینی اُن کے عشقِ رسُول ﷺ کی کامل دلیل ہے۔ ندرتِ خیال اور پاکیزگیِ بیاں اُن کے نعتیہ کلام ہی کا وصفِ خاص نہیں بل کہ دیگر اصناف میں بھی وہ ایک خاص تہذیبی شعور اور رچاؤ کا خیال رکھتے ہیں۔ اُن کے کلام اور مزاج میں ناپختہ کاری اور فراریت کے عناصر ایّام ،جوانی میں بھی نظر نہیں آئے ہیں۔ اِن ساری چیزوں کے پیچھے اُن کا رچا بسا مذاق کار گر رہا ہے۔

ریاض مجید کی نعت پسندی کا منھ بولتا ثبوت یہ ہے کہ وہ نعت اکادمی فیصل آباد سے ایک خاص وابستگی اور ممبر شپ ہے۔ اِس ادارے سے برصغیر پاک و ہند کی گراں قدر ہستیاں نعتیہ حوالے سے منسلک رہی ہیں۔ نعت اکادمی کے علاوہ اور بھی بہت سے ادارے ہیں، ،جو فروغِ نعت میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں، لیکن اِس ادارے کی خصوصیت یہ ہے کہ حمد، نعت اور منقبت سے متعلقہ تنقید اور چھپائی کا کام بھی بہ طریقِ احسن ہو تا ہے۔ اِس ضمن میں شایع ہونے والی نعتیہ کتب میں کہیں نہ کہیں ریاض مجید ہمیں نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اِس ادارے کو بین الاقوامی سطح پر پذیرائی ملی ہے۔ مانچسٹر کے ایک ادارے ”

کاروانِ ادب" نے ریاض مجید کو "لائف اچیومنٹ ایوارڈ" ملا اور اِسی حوالے سے، اُنھیں "احسان بینک" نے اُنھیں انعام سے بھی نواز رکھا ہے۔ نعت اکادمی سے شایع کردہ کتب میں ڈاکٹر ریاض مجید کی کتب "حیَّ علی الثنا" اور "سیّدنا رحیم ﷺ" کو انعامات سے نوازا جاچکا ہے۔ اِس ادارے کے ذریعے سے ریاض مجید نے نعت کے حوالے سے بکھرے ہوئے کام کو بھی اکٹھا کیا ہے، جو نعت کے میدان میں ایک اہم ادبی کارنامہ تو ہے ہی، لیکن ساتھ دینی حوالے سے ایک بہت بڑا کارِ خیر بھی ہے۔

ریاض مجید متوازن طبع کے آدمی اور اُصول پرست واقع ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں ایک متوازن سوچ سے نواز رکھا ہے۔ اُن سے علمی بغض رکھنے والے حضرات بھی اِس حوالے سے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ یہ اُن کی متوازن سوچ کا اعجاز ہے کہ وہ نعت اور دوسروں کی معاونت میں کھلے دل سے دوسروں کی رہبری کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اور "نہ ستایش کی تمنّا نہ صلے کی پرواہ" کے اُصول پر کاربند دکھائی دیتے ہیں۔ اکثر و بیش تر اُن کے قریبی احباب نے اُنھیں دوسروں کی بے لوث مدد کرتے دیکھا ہے۔ ریاض مجید ایک اُصول پرستی کا نام بھی ہے۔ وہ اُصولوں کے مقابلے میں دوسروں کے سامنے سنجیدگی سے کھڑے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ وہ دوستوں کے معاملے میں خود کفیل ہیں، مگر سفارش کے سلسلہ میں ان کا رویّہ بہت سخت ہوتا ہے۔ ناگواری کا اظہار برملا کرتے ہیں۔ بعض اوقات خوشامدی اور سفارشی دوست سے ناتا بھی توڑ لیتے ہیں۔ مگر ذاتی زندگی میں انتہائی شفیق اور مخلص انسان ہیں۔ دوستوں اور گھر کے افراد سے ان کا رویّہ بے حد نرم ہوتا ہے اور ایسے لوگوں سے بالکل تعلق پسند نہیں کرتے، جن میں تصنُّع ہو۔ ریاض مجید سچ کہنے والے شخص کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ بے شک یہ سچ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ خود بھی سچ بولتے ہیں اور دوسروں سے بھی اس کی توقع کرتے ہیں۔

اُنھیں حلقہ اربابِ ذوق فیصل آباد کے دو سال، جوائنٹ سیکرٹری اور دو سال سیکرٹری رہنے کا اعزاز بھی حاصل رہا ہے، اس ساری مدت میں اُنھوں نے مختلف تقریبات کے انتظامات کے سلسلہ میں نہایت گرم، جوشی اور مستعدی سے کام کیا۔ کئی مشاعرے ایسے تھے، جو انتہائی کم وقت کے نوٹس پر کرنا پڑے، مگر ریاض مجید نے حد درجہ حسن انتظام اور سلیقہ پسندی کا مظاہرہ کیا۔ جس سے نا صرف نئے لوگوں کو حوصلہ ملتا بل کہ دیکھنے سننے والوں کی غیر محسوس طور پر تربیت بھی ہوتی رہتی۔

ریاض مجید پختہ گو شاعر ہی نہیں بدیہہ گو بھی ہیں۔ ریاض مجید باتیں بھی مصرعوں اور شعروں میں کرتے ہیں۔ احباب کے ساتھ دورانِ گفت گو میں ریاض مجید اِنھی باتوں کی نظمیں اور غزلیں ایسے خوب صورت الفاظ میں ترتیب دیتے ہیں کہ سب حیران رہ جاتے ہیں۔ ریاض مجید کے بارے میں پروفیسر عارف رضا رقم طراز ہیں:

> "ریاض مجید کی مبدا فیض سے بہت ہی صلاحیّتیں ودیعت ہوئی ہیں، وہ اُردو اور پنجابی کا ایک قادرالکلام نعت گو ہی نہیں بل کہ اُردو غزل اور نظم کا ایک جدید تر شاعر بھی ہے، اسے نثر لکھنے پر بھی پوری قدرت حاصل ہے۔ وہ سیرت نگاری کا ایک نامُور محقق بھی ہے، معروف نعت گو اور ناقد صوفی افضل فقیر لکھتے ہیں "کہ ریاض کو نعت سے باطنی ادارت اور نعت گو حضرات سے دلی انس ہے۔"" شعر میں ریاض مجید ہر صنف میں اپنی، جولائی طبع کا برملا اور نپا تلا بلیغ اظہار کرتے ہیں، اس

نے جاپانی صنفِ سخن ہائیکو کو پنجابی نعتیہ انداز میں اس خوب صورتی سے ڈھالا ہے کہ وہ پنجاب کی بولیوں کی طرح ایک اوراور یجنل(Original)صنف بن گئی ہے۔"(۱۹)

ریاض مجید کی بدیہہ گوئی کا ایک زمانہ معترف ہے۔ متعدد مشاعروں اور نجی نشستوں میں اُنھوں نے بیٹھے بٹھائے غزل اور نظم لکھ دی۔ یکم جنوری ۱۹۹۲ء کو سرینا ہوٹل فیصل آباد میں ایک مشاعرہ تھا۔ جس میں عاصی کرنالی، حسین سحر، سید قمر زیدی اور ڈاکٹر خورشید خاور امروہوی بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر خورشید خاور امروہوی قادرالکلام شاعر ہیں۔ اس مشاعرے میں اُنھوں نے ،جو غزل سنائی وہ بڑی اُستادانہ غزل تھی ۔ اِدھر ڈاکٹر خورشید غزل سنا رہے تھے، اُدھر ریاض مجید اسی بحر اور قافیہ میں نئی غزل لکھتے جارہے تھے اور خورشید خاور امروہوی کے بعد صاحب صدر کی اجازت سے اپنی فی البدیہہ غزل سنائی اور بے حد داد پائی۔ اس پر ڈاکٹر خورشید خاور خوش بھی ہوئے اور حیران بھی۔ اِس اضافی خوبی کے علاوہ ریاض مجید بسیار نویس بھی واقعے ہوئے ہیں، لیکن اُن کی بسیار نویسی روبہ اِنتخاب ہے۔ ہم چاہیں بھی تو اُن کے کلام میں سے کسی بھی چیز پر صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ اُن کی اِسی مہارت اور کامل دست گاہ کے بارے میں شازیہ اکبر لکھتی ہیں:

" ڈاکٹر ریاض مجید اُردُو اور پنجابی دونوں زُبانوں میں یکساں مہارت رکھتے ہیں اور ان کی ادبی خدمات میں ان کے شعری مجموعوں کی ایک طویل فہرست جس میں مختلف اصناف شاعری مثلاً اُردُو غزل، پنجابی غزل، نعتیہ کلام، ہائیکوز، بچّوں کے لیے نظمیں، حمدئی دیوان، نعتیہ رباعیات، بولیاں، تحقیق و تنقیدی مقالات، لغاتِ نعت و لغاتِ قوافی آزادو پابند نظموں کے ساتھ ساتھ نعتیہ ہائیکو، نظمیں اور تراجم بھی شامل ہیں۔ جس طرح ان کی شاعری میں بھی زندگی کے انسانی رویّوں کے، جذبوں کے، فکر و حسن کے منفرد رنگ جلوے نظر آتے ہیں۔" (۲۰)

ریاض مجید نے بہت سے بیرونی ممالک کے سفر کئے اور شاعری میں خصوصاً نعت اُنھوں نے دورانِ سفر کہی ہے۔ ریاض مجید کو، جہاں بہت سی ادبی کتابیں پڑھنے اور لکھنے کا شوق ہے وہاں اُنھیں ادبی کتابیں جمع کرنے کا شوق بھی ہے۔ اس کا ثبوت ان کے گھر کی لائبریری ہے، جس میں ترتیب سے رکھی ہوئی کتابیں ان کے ادبی ذوق کی پہچان ہیں۔ ریاض مجید کے بارے میں پروفیسر عبدالحق لکھتے ہیں:

"پروفیسر ریاض مجید ارضِ پاک کے ساتویں سیارے ہیں، جن کی نگارشات پر اپنے تاثرات لکھنے کے لیے راقم کو یہ موقع میسر آیا ہے کہ ان کو آفریں باد کہوں اور تہنیت پیش کروں۔ پروفیسر ریاض مجید میرے محترم عزیز دوست اور شفقت و شرافت کے پیکر ہیں، ان سیاروں میں ان کا یہ خاص امتیاز ہے کہ وہ تدریس کے ساتھ شعری تخلیق سے بھی سرفراز ہیں۔ تدریسی اقدار کی نگہبانی کے ساتھ تخلیق کی تقدیس ہی ان کا موضوعِ سخن ہے۔ دوسرے اصناف سے گریز ان کے حرمتِ فکر اور صریرِ خامہ کی صحّت مندی کی مثال ہے۔"(۲۱)

ریاض مجید کی شخصیت کا یہ روشن پر تو بہر طور ناز آفریں ہے، جس پر اُن کے نیاز مندانہ اظہارات ملتے ہیں۔ وہ ناموسِ رسالت کے پیامی و حامی شاعر کے روپ میں ہمارے سامنے جھلکتے ہیں۔ اس حوالے سے ریاض مجید منفرد ہیں۔ اُنھوں نے اپنے وجود کو ذکرِ رسالت مآب ﷺ کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اس تناظر میں اُنھوں نے دانش و بینش کے پھول اپنے دامن میں سمیٹے ہیں۔

ڈاکٹر ریاض مجید ہر حلقے میں مقبول ہیں۔ وہ حلقہ بڑوں کا ہو، بچّوں کا یا بوڑھوں کا۔ خاص و عام کا خیال رکھنے والے شخص ہیں۔ ریاض مجید کی شاعری یک رخی شاعری نہیں ہے۔ اس میں ہر طرح کی رہ نمائی اور پیغام ہے۔ اِس حوالے سے اُن کی نظموں کو خاص اہمیت حاصل ہے کیوں کہ دورِ حاضر کے شعرا کی نظموں میں کہیں نہ کہیں کمی کا شائبہ ہوتا ہے۔ چناں چہ شازیہ اکبر ریاض مجید کی نظموں میں پائی جانے والی نغمگی، ترنم اور روانی کی بابت رقم طراز ہیں:

> "نظموں کی نغمگی، ترنم، روانی اپنی جگہ ایک خاص لطف دیتی ہے اور قاری اچھّی شاعری پڑھنے خط اٹھاتے ہوئے شاعر کی فکری سطح تک با آسانی پہنچ جاتا ہے۔ یہاں محض لفاظی نہیں ہے۔ احساس کی آنچ بھی ہے۔ یہاں صرف تسکین نہیں ہے چبھن بھی ہے یہاں محض لطف نہیں ہے کرب بھی ہے اور یہاں محض انفرادی سوچ کا حسن نہیں اجتماعیت کا ہم گیر احساس بھی ہے، جو قاری کو نفسِ مضمون سے قلبی طور پر قریب تر لے جاتا ہے۔ کہیں مَحبّت کی آنچ میں پگھلے دنوں کا ترانہ ہے تو کہیں گزرتے لمحوں کی کھوئی ہوئی مہک اچانک سے چھو کر گزر جاتی ہے اور "چاند کی گیارہویں" سے وابستہ چاندنی میں بھگو دیتی ہے"۔ (۲۲)

ڈاکٹر ریاض مجید بہت سی ادبی تنظیموں سے بھی وابستہ ہیں۔ جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے اور ان کے ذریعے شعرا اور ادبا کے لیے، جو کُچھ ہو سکتا تھا اُنھوں نے کیا ہے اور ادبی حلقوں کو وسیع کیا ہے۔

اُنھیں اپنے ہر تجربے اور مشاہدے کو شعری قالب میں ڈھالنے پر قدرت حاصل ہے۔ نو، جوان نسل کے لیے ان کا وجود ادبی اور نظریاتی ہر دو حوالوں سے بابرکت ہے۔

کالج کے طلبا و طالبات میں ادب سے شیفتگی اور لگاؤ پیدا کرنے کے لیے اُنھوں نے باقاعدگی سے سیمی نارز منعقد کرانے کی مستحکم روایت قائم کی۔ فیصل آباد میں بیرونِ شہر یا بیرونِ ملک سے، جو بھی شاعر یا ادیب ڈاکٹر ریاض مجید سے ملاقات کے لیے آتے اُنھیں اپنے کالج میں دعوت دیتے اور طالب علموں سے براہِ راست گفت گو کا موقع دیتے۔ غور کیا جائے تو یہ سب باتیں دراصل فروغِ ادب کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں، جس کے لیے ڈاکٹر صاحب نے اپنی عمرِ عزیز کے روشن دنوں کے سُکھ چین کی قربانی دی ہے۔ نا صرف فیصل آباد سے باہر کے بل کہ مقامی شاعروں اور ادیبوں کے تعارف اور ان کے فن کے ناقدانہ جائزہ کے سلسلہ میں بھی سیمی نارز کا یہ سلسلہ نہایت مفید و معاون ثابت ہُوا۔

بحیثیت اُستاد وہ ایک شفیق اور مہربان شخصیت کے مالک ہیں۔ دورانِ لیکچر ان کا انداز انتہائی دوستانہ اور غیر روایتی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلبا و طالبات ان کی گفت گو کے سحر میں گرفتار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ریاض مجید جس موضوع پر ایک مُرتّبہ تفصیلی گفت گو فرمادیں پھر اس کے سمجھنے میں کسی قسم کی دِقّت یا پریشانی کا سامنا نہیں ہوتا۔ اسے ان کے وسیع مطالعہ اور ماہرانہ اندازِ گفت گو کا ثمر کہیے یا نعمتِ خداوندی، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ کمرۂ جماعت میں ان کا سامع کبھی بھی بوریت کا شکار نہیں ہوتا۔

شہر کی ادبی سرگرمیاں ریاض مجید کی شرکت اور رائے کے بغیر ادھوری سی رہتی ہیں۔ کسی کتاب کی تقریبِ رونمائی ہو یا کسی شخصیت کی ادبی و فنی خدمات کا جائزہ، ریاض مجید اپنی دیانت دارانہ رائے کو پوری ذمّے داری کے ساتھ سب کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ بعض اوقات لوگوں کو یہ شکایت بھی ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب تخلیق کے منفی پہلوؤں کو منظرِ عام پر کیوں لا رہے ہیں، لیکن وہ ایک دیانت دار اور غیر جانبدار ناقد کی طرح فن پارے کے دونوں رخ سامعین کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔

ریاض مجید سے ملنے والا کوئی بھی نووارد خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا۔ علم و دانائی کی باتیں سیکھنے کے ساتھ ساتھ وہ ریاض مجید کی جانب سے اپنے ہم راہ کئی خوب صورت کتب کا تحفہ ضرور لے کر جاتا ہے۔

ریاض مجید کی کوشش ہوتی ہے کہ دورانِ تعلیم نو، جوانوں شعر گوئی پر زیادہ وقت صرف نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نو، جوانوں کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ اپنے تعلیمی سلسلہ کی تکمیل کے بعد شعر گوئی کی طرف توجُّہ دیں کیوں کہ یہ جان، جوکھوں کا کام ہے اور تخلیق کار سے خونِ جگر مانگتا ہے، جب کہ زندگی میں کسی مقام کے حُصُول کے لیے تعلیم بھی نہایت ضروری ہے۔ چناں چہ ان کی اوّلین نصیحت یہی ہوتی ہے کہ نو، جوان اپنے والدین کا پیسہ اور اپنا وقت برباد کرنے کی بجاے عملی زندگی کی کامیابیوں پر توجُّہ دیں اور پھر کسی مقام کے حُصُول کے بعد شعر گوئی کو مستقلاً اپنالیں۔

غرض ریاض مجید کا تعلق بھی ایک دینی گھرانے سے ہے۔ آپ کا خاندان علمی و ادبی حوالے سے بھی ایک وقار رکھتا ہے۔ ریاض مجید کے آباؤ اجداد کا تعلق دہلی کے ایک علمی و دینی خاندان سے تھا۔ معلوم خاندانی تاریخ کے مطابق یہ خاندان سترھویں صدی کے آخر میں محلّہ دریاگنج میں موجود ایک پرانی مسجد (جس کا نام 'زینت المساجد' ہے) میں علمی، دینی اور تدریسی خدمات پر مامور تھا۔

سلیمان سیمابی کے خاندانی پس منظر کی تلاش میں معلوم دست یاب میں مولانا عبد الرحمن کا نام ملتا ہے۔ جن کا تعلق دریاگنج کے علاقے سے تھا اور خاندانی روایات اور قیاس کے مطابق یہی وہ مسجد تھی، جن میں اس خاندان کے اکابرین مولانا عبد الرحمن اور ان کے بیٹے مولانا محمد محسن درس و تدریس اور قاضی کے عہدے پر فائز تھے ان کے بیٹے مولوی محمد عظیم نے

پنجابی میں ایک کتاب 'علی نامہ' لکھی یہ منظوم کتاب ان دنوں کی یادگار لگتی ہے، جب یہ خاندان دہلی چھوڑ کر شاہ شجاع کے زمانے میں لدھیانہ میں آکر آباد ہو گیا۔

مولوی محمد مسلم (۱۸۰۸- ۱۸۸۰ء) اور مولوی محمد اسماعیل، مولوی محمد عظیم کے بیٹے تھے، جو خود پنجابی کے معروف شاعر تھے اُنھوں نے کئی کتابیں لکھیں، جن میں سے ایک 'علی نامہ' کا تذکرہ پنجابی ادب کی تاریخوں میں ملتا ہے۔ مولوی عبدالغفور سلیمان اویسی سیمابی کا تعلق گڑھا (ویندان) جالندھر مشرقی پنجاب (انڈیا) کے مولوی خاندان سے تھا۔ ان کے خاندان کے بڑے شاعر، جو پنجابی میں کئی کتابوں کے مصنف تھے مولوی محمد مسلم تھے۔

سلیمان سیمابی کے خاندانی پس منظر کے مطابق سلیمان سیمابی کا پس منظر علم و ادب کی روایت سے جڑا ہوا ہے۔ تاریخ ارائیاں کے مصنف کے مطابق یہ خاندان دینی تعلیم، درس و تدریس اور مذہبی مشاغل و تصانیف کے حوالے سے محترم تھا۔ مولوی محمد مسلم اور مولوی اسماعیل کے والد مولوی محمد عظیم لدھیانہ میں کافی مشہور تھے اور اُن کی علمی برتری کی وجہ سے اُن کو قاضی القضا کے عہدے پر فائز کیا گیا تھا مولوی محمد مسلم کی شادی جالندھر کے بالکل نزدیک قریباً تین میل دور گاؤں گڑھا میں ہوئی۔ ایک خاندانی روایت کے مطابق مولوی محمد عظیم نے پہلے حفاظت کے لیے اپنے دونوں بیٹے اور خاندان کے دوسرے افراد گڑھا یعنی جالندھر بھیج دینے کے بعد میں جب لدھیانہ کے حالات زیادہ خراب ہو گئے تو آپ بھی ہجرت کر کے گڑھا (جالندھر چھاؤنی) آ گئے۔

ریاض مجید کی پیدائش جالندھر کے مولوی خاندان میں ہوئی، جو گذشتہ تین صدیوں سے درس و تدریس سے متعلق رہا ہے۔ خاندانِ مغلیہ کے زمانے میں اس خاندان کے دو بڑے عالم مولانا عبدالرحمٰن اور مولانا محمد محسن قاضی القضات کے درجے پر فائز تھے۔۔ اس خاندان کا ابتدائی سراغ محلّہ دریا گنج دہلی کی تاریخی مسجد جسے عرفِ عام میں "گھٹا مسجد" ۔ مغلیہ حکومت کے زوال اور اس کے آخری حکمرانوں کی نااہلی کی وجہ سے دہلی سازشوں کا اکھاڑا بن گیا تھا اور اس سیاسی افراتفری کی وجہ سے تمام خاندان دہلی سے ہندوستان کے دوسرے شہروں اور قصبوں میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح مولوی خاندان بھی نقل مکانی کر کے لدھیانہ (مشرقی پنجاب) آ گیا۔

مولوی محمد عظیم کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام محمد مسلم اور چھوٹے بیٹے کا نام محمد اسماعیل تھا۔ ۱۸۳۰ء میں مولوی محمد مسلم جالندھر کے قریب گڑھا (جہاں آج کل ایک جالندھر چھاؤنی ہے) آکر آباد ہو گئے اور دین اسلام کی تبلیغ میں مصروف رہے۔ مولوی محمد مسلم نے متعدد پنجابی کتب تصنیف کیں۔ درس و تبلیغ اور تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ مولوی محمد مسلم سے ان کے پسر مولوی محمد علی اور پھر ان کے پسر مولوی شمس الدین تک منتقل ہوا۔ ان کی تصانیف چند قصّوں اور کتابچوں تک محدود ہیں۔ مولوی شمس الدین کے بیٹے عبدالمجید تھے۔ ریاض مجید اِنھی کی اولاد میں سے ہیں۔

ریاض مجید کے والد عبدالمجید "گڑھا گاؤں" جالندھر میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد مولوی شمس الدین کے ساتھ کاروبار کرنے لگے۔ ۱۹۴۷ء میں میں پاکستان بننے کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ یہاں آکر فیصل آباد میں قیام پذیر ہو گئے۔ یہاں پر قیام کے چھے سال بعد (دو یا تین سال بیمار رہنے کے بعد) وفات پا گئے۔

ریاض مجید ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء بروز سوموار گڑھا ویز اں گاؤں (موجودہ جالندھر چھاؤنی) میں پیدا ہوئے۔ اسلامی مہینے کی تاریخ کے مطابق یکم شوال عید الفطر کا دن تھا۔ گڑھا گاؤں جالندھر سے دو اڑھائی میل کے فاصلے پر تھا۔ اس گاؤں کی اکثریت مسلمان اور ارایں برادری پر مشتمل تھی اور اِنھی میں سے ایک گھر اُن کا تھا۔ یوں ریاض مجید کا تعلق بھی ارائیں خاندان سے بنتا ہے۔

ریاض مجید کے والد عبدالمجید اکتوبر ۱۹۵۳ء میں فوت ہوئے، جب کہ وہ چھٹی جماعت میں زیرِ تعلیم تھے۔ ان کی پرورش ان کی والدہ عزیز بیگم (، جو اپریل ۲۰۰۲ء میں نوّے سال کی عمر میں فوت ہوئیں) نے کی۔ ریاض مجید کی تعلیم کی ذمّے داری ان کے بڑے بھائیوں احسان الحق اور اکرام مجید نے سنبھالی۔ بچپن میں اُنھیں مطالعہ اور کرکٹ کا زیادہ شوق تھا۔ ان کے ماموں حمید جالندھری (مالک مکتبہ کاروان لاہور) سے مطالعے کے لیے تازہ بہ تازہ کتابیں مل جاتی تھیں اور یوں یہ شوق پروان چڑھتا گیا۔

ریاض مجید کی والدہ عزیز بیگم جن کو سب بی بی جی کے نام سے پکارتے تھے۔ بہت نیک اور عبادت گذار خاتون تھیں۔ اپنا زیادہ وقت جائے نماز پر گذارتی تھیں اور اپنے پروردگار کے حضور سربہ سجود رہتیں۔ اُنھوں نے اپنے خاوند کی وفات کے بعد اپنے بچّوں کی تعلیم و تربیت بہت ہی اچھّے طریقے سے کی۔

ریاض مجید چار بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ ان کے دو بھائی بہت چھوٹی عمر میں وفات پا گئے تھے۔ اس کے بعد دو بہنیں ہیں ایک کشور سلطانہ، جو شادی شدہ ہیں اور فیصل آباد میں ہی رہائش پذیر ہیں۔ دوسری شفقت سلطانہ بھی شادی شدہ ہیں اور فیصل آباد میں ہی مقیم ہیں۔ ریاض مجید کے بڑے بھائی احسان الحق ہیں۔ اکرام مجید احسان الحق سے چھوٹے ہیں۔ ان کے بعد ریاض مجید ہیں۔ انعام مجید سب سے چھوٹے ہیں، جب پاکستان بنا تو ریاض مجید کی عمر ساڑھے چار سال تھی۔ یہ کشت و خون کا زمانہ تھا۔ جب بے سروسامانی کے عالم میں ان کا خاندان ہجرت کر کے فیصل آباد آیا اور یہاں آکر ڈگلس پورہ میں آباد ہوا۔ یہیں آکر ریاض مجید کی تعلیم کا آغاز ہوتا ہے۔

ریاض مجید کی ابتدائی تعلیم ڈگلس پورہ میں ہوئی۔ چناں چہ آپ کو میونسپل بورڈ کے قائم کردہ میونسپل ایم بی اسکول میں مارچ ۱۹۴۸ء میں داخل کیا گیا۔ ریاض مجید نے اِس مادرِ علمی سے بنیادی تعلیم کے چار سال مکمل کیے۔ اُنھیں مسلم ہائی اسکول میں درجہ پنجم کی تعلیم کے حصُول کے لیے داخل کیا گیا۔ ریاض مجید نے مسلم ہائی اسکول سے ۱۹۵۸ء میں میٹرک کی سند حاصل

کی، گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے سہ سالہ آنرزان لینگوایجز(اُردُو)۱۹۶۳ء میں کیا اس کے بعد ایم اے کی تکمیل کے لیے اُنھوں نے یونی ورسٹی اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ ایم اے کے پرچے چوں کہ بی اے آنرز کے تیسرے سال میں ہو چکے تھے، لہٰذا اُنھیں یہاں ایک سال میں ایم اے کی تکمیل کرنی تھی۔ اورینٹل کالج میں ان کے دیرینہ ہم جماعت احسان الحق اختر اور یعقوب مظہر گل کے علاوہ ان کے نئے ہمہ جماعتوں میں تبسم کاشمیری، صدیق جاوید، اکرام چغتائی، فیضان دانش، ریاض حسین چوہدری وغیرہ شامل تھے اِنھی سالوں میں، میں گوہر نوشاہی، ممتاز منگلوری، محمد عارف تھے۔

پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج،لاہور میں ریاض مجید کو اُس وقت کے مایہ ناز اساتذہ سے اکتسابِ فیض کا موقع ملا۔ بقول ریاض مجید یونی ورسٹی اور ئنٹل کالج میں ہمیں ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر سید وقار عظیم، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر غلام حسن ذوالفقار، پروفیسر سجاد باقر رضوی ایسے اساتذہ ملے۔ ان دنوں وائس چانسلر پنجاب یونی ورسٹی پروفیسر حمید احمد خاں یعنی ایم اے فائنل کو مغربی تنقید پڑھانے کے لیے ہفتہ میں ایک دو دن کے لیے اورینٹل کالج آیا کرتے تھے۔ ہم نے یہاں ان سے مغربی تنقید خصوصاً بوطیقا(ارسطو) کے بارے میں بہت استفادہ کیا۔

اورینٹل کالج کی علمی و ادبی فضا سے ریاض مجید نے بہت کُچھ سیکھا یہاں اُردُو، فارسی، عربی کے شعبوں میں آئے دن کوئی نہ کوئی تقریب ہوتی، لاہور اور معروف لاہور سے اہلِ قلم، شاعر اور ادیب یہاں تشریف لائے اور اساتذہ سے ملتے طلبہ کو بھی ان سے ملنے کا موقع ملتا۔ انتظار حسین جیلانی کامران، شہزاد احمد، انجم رومانی، شہرت بخاری، قیوم نظر، وزیر آغا، شورش کاشمیری، احسان دانش سے لے کر جگن ناتھ آزاد اور عبدالعزیز میمنی جیسی شخصیت کو اس عظیم درس گاہ میں آتے دیکھا، ان میں سے بہتوں کے خطبات اور لیکچر سنے، بالمشافہ ملاقاتیں کیں، شاعری سنی۔

گورنمنٹ کالج لاہور اور اسلامیہ کالج سول لائینز کی ادبی نقاریب میں شرکت کے مواقع بھی اُنھیں دنوں کی یادگار ہیں، جن میں فیض احمد فیض، بیگم انیس فیض، غلام رسُول مہر، عبید عابد علی عابد اور دوسرے کئی مشاہیر کو دیکھنے، ان کی گفت گو سننے اور اُنھیں ملنے کا موقع ملا۔

ریاض مجید نے ۱۹۶۴ء میں پنجاب یونی ورسٹی کے (اورینٹل کالج) سے ایم اے اُردُو کا امتحان پاس کیا۔ ریاض مجید نے پی ایچ۔ ڈی بھی پنجاب یونی ورسٹی سے کی اس کے لیے تگ ودو گورنمنٹ کالج لائل پور آئے۔ ان کے اساتذہ میں مرزا محمد منوّر، سجاد باقر رضوی، حمید احمد خان(سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی)، وقار عظیم، ڈاکٹر وحید قریشی اور سیّد عبداللہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ سجاد باقر رضوی صاحب سے دوستانہ انداز میں زمانۂ تعلیم کے بعد بھی متعدد صحبتیں رہیں۔ اسی طرح مرزا محمد منور اور سیّد عبداللہ سے بھی آخرِ وقت تک نیاز مندی کا سلسلہ جاری رہا۔

ریاض مجید کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز کالج کے زمانے سے ہوتا ہے۔اُنھوں نے کالج کے زمانے میں بہت سے مشاعرے پڑھے اور انعامات،ٹرافیاں حاصل کیں۔مشاعروں کے سلسلہ میں پنڈی، اسلام آباد، ایبٹ آباد، سرگودھا، جھنگ وغیرہ جاتے رہے ہیں۔

ریاض مجید نے ملازمت کا آغاز ۱۹۶۵ء میں فیملی پلاننگ ڈیپارٹمنٹ میں سپروائزر کے طور پر کُچھ مہینوں کے لیے کیا پاکستان میں یہ محکمہ بیرونی امداد کے ذریعے قائم کیا گیااس میں سپروائزر کا سکیل اس زمانے کے لیکچرر کے برابر تھا۔ گورنمنٹ کالج میں ریاض مجید نے ستمبر ۱۹۶۶ء تک تدریسی ذمّے داریاں سرانجام دیں، اِنھی دنوں ویسٹ پاکستان پبلک سروس نے بہت سی اسامیوں کا اشتہار دیا۔ ان میں بیالیس کے قریب اُردُو کی اسامیاں بھی دیں انٹرویوز میں کامیابی کے بعد، ریاض مجید نے اپنی مستقل ملازمت کا آغاز ۱۵/نومبر ۱۹۶۹ء میں کیا۔ ریاض مجید نے گورنمنٹ کالج بوچھال کلاں سے اپنی مستقل ملازمت کا آغاز کیا بوچھال کلاں خوشاب سے چکوال جانے والی سڑک پر کلر کہار کے قریب واقع ہے، یہاں ریاض مجید قریباً سوا دو سال رہے۔

ریاض مجید کو درس و تدریس کے علاوہ کالج کے دیگر تفویضی اُمور اور علمی و ادبی سرگرمیوں سے خصوصی شغف رہا ہے۔وہ ادبی حوالے سے اسٹیج کے آدمی تھے اور قدرت نے اُنھیں بے پناہ صلاحیّتوں سے نواز رکھا تھا۔ آپ اعلیٰ انتظامی صلاحیّتوں میں بھی مشاق تھے۔ موقع و محل کے عین مطابق حکمتِ عملیاں مُرتّب کرنا اور اپنی منشا کے مطابق نتائج مُرتّب کرنا ریاض مجید کے بائیں ہاتھ کا کھیل رہا ہے۔ گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں ملازمت۔ اساتذہ سے تعلق، علمی و ادبی پروگراموں میں اپنی مشارکت اور انعامات پانے کے ساتھ کالج کے ادبی مجلے کی ایک طویل عرصے ادارت جیسی گراں قدر علمی و ادبی خدمات انجام دیں۔

ریاض مجید کی شادی رخسانہ سے قرار پائی۔ اپنی ملازمت اور علمی و ادبی خدمات کی انجام دہی کے بعد اُن کے پاس وقت کی کمی ہوتی تھی۔ چناں چہ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اُن کی تمام تر گھریلوں ذمے داریوں کا بار اُن کی اہلیہ کے سر رہا، جسے اُنھوں نے بہ طریقِ احسن انجام دیا۔ ریاض مجید اپنی شادی خانہ آبادی، اولاد، اُن کی تعلیم و تربیت میں اپنی اہلیہ کے کردار اور اولاد کی شادیوں کے بارے ہمیشہ مطمئن رہے ہیں۔

ریاض مجید کے بڑے بیٹے محمد مسلم مجید نے ہمدرد یونی ورسٹی فیصل آباد کیمپس سے بی اے آنرز کیا اور عین اس وقت ،جب وہ اسی یونی ورسٹی میں ایم بی اے کے داخلے کے لیے یونی ورسٹی جانے کے لیے تیّار ہو رہا تھا، کہ اچانک فوت ہو گیا۔ یہ جواں مرگی پورے خاندان کے لیے ایک اہم واقعہ تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے Amblyism ایک ایسی بیماری سے تعبیر کیا، جس میں دورانِ خون میں کسی بلبلے (Bulbble) کے آنے سے دماغ کے کہیں حصّے کو آکسیجن کی سپلائی منقطع ہونے سے آدمی کی فوری موت واقعہ ہو جاتی ہے۔ یوں مسلم ۲۸/دسمبر ۲۰۰۳ء کو قریباً سوا بائیس سال کے عمر میں فوت ہو گیا۔

ریاض مجید کے دوسرے بیٹے محمد علی مجید نے پنجاب گروپ آف کالجز سے ایم بی اے کیا۔ پھر ان کی شادی ہوئی۔ علی کی اہلیہ کا نام وردہ ہے۔ ان کے دو بچے انیبہ اور طٰہٰ ہیں۔ وہ فیصل آباد کے ایک معروف صنعتی ادارے انٹرلوپ میں ملازم ہیں اور ریاض مجید کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔

ریاض مجید اپنی ازدواجی زندگی سے بہت مطمئن ہیں۔ پاکستان ٹیلی ویژن لاہور سے تیّار ہونے والی دستاویزی قلم 'میں اور میری تحقیق' ۱۹۹۵ء پروڈیوسر عالی میں (، جو پچپن منٹ پر مشتمل ہے) میں ان کے بچّوں، بچیوں اور اہلیہ کے تاثرات میں اس اطمینان کا اظہار ہوتا ہے۔

ریاض مجید سادہ طبع کے مالک ہیں۔ ان سے ملاقات کے لیے آنے والا کوئی بھی اجنبی شخص پہلی نظر میں اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا کہ وہ جس شخص سے ملاقات کر رہا ہے وہ برّصغیر پاک و ہند کی اہم ترین ادبی شخصیات میں سے ایک ہیں۔ ریاض مجید نہایت ملنسار اور مہمان نواز انسان ہیں۔ ان کی خوش خلقی کے باعث لوگ پہلی ہی ملاقات میں ان کے دیوانے ہو جاتے ہیں۔ ایثار، عاجزی اور تواضع، ریاض مجید کی شخصیت کے نمایاں اوصاف ہیں۔

ریاض مجید نے اپنی زندگی میں جہاں کہیں اپنے اساتذہ سے کسبِ فیض کیا ہے، وہاں وہ اپنے دوست احباب کے بھی معترف ہیں۔ اُن کا خاندان ایک علمی و ادبی سلسلہ رکھتا تھا۔ چناں چہ وہ اپنے ننھال اور ددھیال میں سے چند قابلِ تقلید ہستوں کے ہمیشہ سے معترف رہے ہیں۔

ریاض مجید تصنُّع اور بناوٹ سے عاری زندگی پر دل و جان سے فریفتہ ہیں۔ وہ سادہ لباس پہنتے ہیں اور سادہ خوراک کے شوقین ہیں۔ شلوار قمیص ان کا پسندیدہ لباس ہے۔ بدلتے موسم میں قمیص کے اُوپر واسکٹ اور سردیوں میں کوٹ اور مفلر زیب تن کرتے ہیں۔ اگر کوئی نیاز مند اُن کی دعوت کرنا چاہے تو اپنے دستر خوان پر چپاتی کے ساتھ پودینے کی چٹنی رکھ لے اور اگر زیادہ تواضع مقصود ہو تو کدو کے رائتے کا اضافہ کر لے۔ ریاض مجید کو مرغن غذاؤں سے زیادہ رغبت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسی دعوت میں، جو الصتاً ان کے اعزاز میں منعقد کی گئی ہو ایسے تکلفات کی ممانعت کرتے ہیں۔

ریاض مجید مجلس اقبال اور ''حلقہ ارباب ذوق'' کے کارکن کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ رائٹرز گلڈ اور انجمن افکار اسلامی سے وابستہ ہیں اور بہت سی علمی و ادبی، ثقافتی اور مذہبی تنظیموں میں شرکت کرتے رہے ہیں۔ ریاض مجید سکول کے زمانے سے شعر کہتے آ رہے ہیں، لیکن ان کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز کالج کے زمانے سے ہوتا ہے۔ کالج کے زمانے میں تھرڈ ایئر میں باقاعدہ غزل کہنا شروع کی۔ کالج کے مشاعروں کی نمایندگی کرتے تھے اور اس سلسلے میں انعامات بھی حاصل کئے ہیں۔ اس زمانے میں اُنھوں نے بہت سی غزلیں اور کُچھ نظمیں کہیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ شعری ذوق بھی بڑھتا گیا اور آخر کار ان کا پہلا مجموعہ ''پس منظر'' ۲۰ فروری ۱۹۷۳ء کو چھپا۔ اس ادبی فضا کے ساتھ ساتھ بہت سے بیرونی سفر بھی کر چکے

ہیں۔ پہلا سفر خواجہ نظام الدین اولیا کے عرس کے موقع پر ۱۹۶۴ء میں انڈیا کا کیا۔ اس کے بعد امیر خسرو کے عرس پر دوبارہ انڈیا گئے۔

ریاض مجید کو، جہاں تخلیق کا شوق رہا وہاں اس کے ساتھ ساتھ ادبی کتب کی اشاعت کا شوق بھی رہا ہے۔ اس شوق کی تکمیل کے لیے اُنھوں نے دوستوں کی وساطت سے ایک اشاعتی ادارہ ''قرطاس پبلشرز'' کے نام سے شروع کیا اور وہ اس ادارے کے تحت اب تک تقریباً دو سے زائد کتابیں چھاپ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ '' نعت اکادمی'' ان کے زیرِ نگرانی کام کر رہی ہے اور ''مسلم پنجابی مجلس''، جو اُنھوں نے اپنے بزرگ مولوی محمد مسلم کے نام پر قائم کی ہے، کام کر رہی ہے۔

ریاض مجید کو ادب سے گہرا لگاؤ ہے اور وہ ایسے تمام افراد کی بھرپور مدد کرتے ہیں، جو تخلیقی یا تحقیقی حوالے سے ان کے پاس رہ نمائی کے لیے آتے ہیں۔ ریاض مجید کے پاس آنے والا ہر نو، جوان طالب علم اپنی توقعات سے زیادہ تعاون اور رہ نمائی حاصل کرتا ہے۔ ان کی ذاتی لائبریری کے دروازے ایسے طالب علموں کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں، جو کوئی نہ کوئی نئ بات سیکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ نو، جوان نسل کے لیے ریاض مجید کی باتیں سبق آموز ہیں۔ ایسی دانائی کی باتوں کے پس منظر میں طویل عمر کے تجربات اور مشاہدات پوشیدہ ہیں۔

ریاض مجید شعر و ادب سے لگاؤ رکھنے والے نو، جوانوں میں شعر گوئی کا ایسا شوق پیدا کر دیتے ہیں کہ پھر وہ فرد کاغذ قلم کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ریاض مجید کو کلاسیکی میوزک سننے کا بہت شوق ہے۔ ان کے پاس کلاسکی ریکارڈز بھی موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے فوٹو گرافی کا شوق بھی پال رکھا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے پاس مختلف کیمرے اور لینز کافی تعداد میں موجود ہیں وہ ان کے ذریعے سفر کے دوران اپنی یادوں کو محفوظ کر لیتے ہیں۔

ریاض مجید کی شخصیت تضادات کا شکار نہیں۔ وہ جو کہتے ہیں اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے فیصل آباد میں ایک علمی و ادبی فضا اور ماحول قائم ہوا ہے۔ ان کے بارے میں ہمیشہ لوگ اچھّی بات کہتے ہیں۔ ریاض مجید فیصل آباد کی ادبی و نظریاتی عمارت کا اہم ستون ہیں۔ اُنھوں نے اپنے ادبی سرمایے کو نہ صرف اپنے ذہن تک محدود رکھا بل کہ اوروں تک پہنچانا اپنا فرض اوّلین سمجھا۔ اس کا ثبوت ان کی ادبی محفلیں ہیں، جو ذہنی تربیت کا باعث بنتی ہیں۔

ریاض مجید ادبی محفلوں کی جان ہیں۔ ادبی محفل جماتے ہیں تو خوب جماتے ہیں۔ بہت سے لوگ ان کے حوالے سے شاعر اور ادیب بنے۔ ریاض مجید کا تعلق چوں کہ ایک مولوی خاندان سے ہے۔ ان کے بزرگ اپنے زمانے میں بڑے عالم فاضل گزرے ہیں۔ اس لیے ریاض مجید بھی مذہب کو زندگی میں ضروری تصوُّر کرتے ہیں۔ نمازِ پنجگانہ کی پابندی کرتے ہیں۔ ہر وقت درود کا ورد کرتے رہتے ہیں۔

خواہ کیسی بھی مذاق کی محفل ہو،مشاعرہ ہو یا کوئی اور اہم تقریب ہو ان کی زُبان پر درود کا ورد جاری رہتا ہے اور اس کی تاکید بھی کرتے رہتے ہیں۔اُنھوں نے قرآن و حدیث کے مطالعہ سے بھی اپنی فکر کی شمع کو روشن کیا ہے۔اس مقدس فکر کی روشنی اُنھیں حدودِ ادب سے باہر نہیں جانے دیتی۔

ریاض مجید تعلیمی میدان میں نمایاں رہے اور اُردو ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔اس زمانے میں اُنھوں نے کُچھ غزلیں اور نظمیں کہیں۔اُنھیں نعت لکھنے کا شوق بھی اسی زمانے میں ہوا اور دو نعتیں کہیں ایک فارسی میں اور دوسری اُردو میں۔ریاض مجید بڑی دھیمی شخصیت رکھتے ہیں اور درویشانہ رکھ رکھاؤ کے مالک ہیں۔

ریاض مجید کی ایک خاص پہچان اُن کی نعتیہ شاعری ہے۔ریاض مجید کی نعتیہ شاعری میں ایک خاص سوزوساز کی خلش پنہاں ہے،جو اضطرابِ درونِ قلب پیدا کرتی ہے،جس کے درپردہ اُن کا جذبۂ عشق کارفرما ہے۔ریاض مجید کی نعت پسندی کا منہ بولتا ثبوت نعت اکادمی فیصل آباد سے ایک خاص وابستگی اور ممبر شپ ہے۔اِس ادارے کی خصوصیت یہ ہے کہ حمد،نعت اور منقبت سے متعلقہ تنقید اور چھپائی کا کام بھی بہ طریقِ احسن ہوتا ہے۔اِس ضمن میں شایع ہونے والی نعتیہ کتب میں کہیں نہ کہیں ریاض مجید ہمیں نظر آتے ہیں۔اِس ادارے کو بین سطح پر پذیرائی ملی ہے۔مانچسٹر کے ایک ادارے ”کاروانِ ادب“ نے ریاض مجید کو ”لائف اچیومنٹ ایوارڈ“ ملا اور اَسی حوالے سے اُنھیں ”احسان بینک“ نے اُنھیں انعام سے بھی نواز رکھا ہے۔نعت اکادمی سے شایع کردہ کتب میں ریاض مجید کی کتب ”حیَّ علی الثنا“ اور ” سیّدنا رحیم ﷺ “ کو انعامات سے نوازا جا چکا ہے۔اِس ادارے میں ریاض مجید نے نعت کے حوالے سے بکھرے ہوئے کام کو بھی اکٹھا کیا ہے،،جو نعت کے میدان میں ایک اہم ادبی کارنامہ تو ہے ہی،لیکن ساتھ دینی حوالے سے ایک بہت بڑا کارِ خیر بھی ہے۔

ریاض مجید متوازن سوچ کے مالک اور اُصول پسند انسان ہیں۔دوستوں اور گھر کے افراد سے ان کا رویّہ بے حد نرم ہوتا ہے اور ایسے لوگوں سے بالکل تعلق پسند نہیں کرتے جن میں تصنُّع ہو۔ریاض مجید سچ کہنے والے شخص کو بے حد پسند کرتے ہیں۔بے شک یہ سچ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو۔خود بھی سچ بولتے ہیں اور دوسروں سے بھی اس کی توقع کرتے ہیں۔

ریاض مجید کو حلقۂ اربابِ ذوق فیصل آباد کے دو سال،جوائنٹ سیکرٹری اور دو سال سیکرٹری رہنے کا اعزاز بھی حاصل رہا ہے۔اس دوران میں اُنھوں نے مختلف تقریبات کے انتظامات کے سلسلہ میں نہایت گرم،جوشی اور مستعدی سے کام کیا۔کئی مشاعرے ایسے تھے،جو انتہائی کم وقت کے نوٹس پر کرنا پڑے،مگر ریاض مجید نے حد درجہ حسن انتظام اور سلیقہ پسندی کا مظاہرہ کیا۔وہ بدیہہ گو شاعر ہی نہیں بدیہہ گو بھی ہیں۔ریاض مجید باتیں بھی مصرعوں اور شعروں میں کرتے ہیں۔احباب کے ساتھ دورانِ گفت گو میں ریاض مجید اِنھی باتوں کی نظمیں اور غزلیں ایسے خوب صورت الفاظ میں ترتیب دیتے ہیں کہ سب حیران رہ جاتے ہیں۔اُن کی بدیہہ گوئی کا ایک زمانہ معترف ہے۔

ریاض مجید کو جہاں بہت سی ادبی کتابیں پڑھنے اور لکھنے کا شوق ہے وہاں اُنھیں ادبی کتابیں جمع کرنے کا شوق بھی ہے۔ ان کے گھر کی لائبریری ہے، جس میں ترتیب سے رکھی ہوئی کتابیں ان کے ادبی ذوق کی پہچان ہیں۔ کالج کے طلبہ میں ادب سے شیفتگی اور لگاؤ پیدا کرنے کے لیے اُنھوں نے باقاعدگی سے سیمی نارز منعقد کرانے کی مستحکم روایت قائم کی۔ بحیثیت اُستاد وہ ایک شفیق اور مہربان شخصیت کے مالک ہیں۔ دورانِ لیکچر ان کا انداز انتہائی دوستانہ اور غیر روایتی ہوتا ہے۔ ان کے وسیع مطالعہ اور ماہرانہ اندازِ گفت گو کا ثمر کیے یا نعمتِ خداوندی، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ کمرۂ جماعت میں ان کا سامع کبھی بھی بوریت کا شکار نہیں ہوتا۔

شہر کی ادبی سرگرمیاں ریاض مجید کی شرکت اور رائے کے بغیر ادھوری سی رہتی ہیں۔ کسی کتاب کی تقریبِ رُونمائی ہو یا کسی شخصیت کی ادبی و فنی خدمات کا جائزہ، ریاض مجید اپنی دیانت دارانہ رائے کو پوری ذمّے داری کے ساتھ سب کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اُن سے ملنے والا کوئی بھی نووارد خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا۔ علم و دانائی کی باتیں سیکھنے کے ساتھ ساتھ وہ اُن کی جانب سے اپنے ہم راہ کئی خوب صورت کتب کا تحفہ ضرور لے کر جاتا ہے۔ ریاض مجید کی کوشش ہوتی ہے کہ دورانِ تعلیم نو،جوانوں شعر گوئی پر زیادہ وقت صرف نہ کریں۔ وہ طلبہ کو عملی زندگی کی کامیابیوں پر توجُّہ دینے اور کسی مقام کے حُصُول کے بعد شعر گوئی کو مستقلاً اپنانے کا درس دیتے ہیں۔ وہ بہت کم لوگوں کو باقاعدہ شاگردی میں لیتے ہیں البتہ شعر گوئی کے حوالے سے سب کی فراخ دلی کے ساتھ رہ نمائی فرماتے ہیں۔ ریاض مجید اپنے فن سے گہری وابستگی رکھنے کے باعث کئی اصناف ادب کے ماہر ہیں۔ ان کی شخصیت اور فن میں ایک ہم آہنگی اور توازن کی کیفیت موجود ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ محمد منیر کمال، سیلِ رواں، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص

۲۔ واقعات دارالحکومت، دہلی، ص ۳۶

۳۔ محمد امین شہزاد، تاریخِ ارائیاں، لاہور، س ن، ص ۳۶

۴۔ ایضاً، ص ۷۹۷

۵۔ ایم اشرف، روزنامہ امروز، لاہور، ۱۹۷۴ء

۶۔ ڈاکٹر ریاض مجید، قلمی بیاض نمبر ا، غیر مطبوعہ، ص ۸۴

۷۔ ایضاً، ص ۹۵

۸۔ ایضاً، ص ۱۲۵

۹۔ ایضاً، ص ۱۳۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۳۴

۱۱۔ انٹرویو از شبیر احمد قادری، بتاریخ ۱۷ر جنوری ۲۰۱۹ء، بمقام گورنمنٹ کالج، فیصل آباد

۱۲۔ انٹرویو از اکرام مجید، بتاریخ ۲۹ر اکتوبر ۲۰۱۹ء، بمقام رہایش گاہ، اکرام مجید، پیپلز کالونی نمبر ا، فیصل آباد

۱۳۔ احمد ندیم قاسمی، فلیپ پشتِ ورق شیرازہ بند، گزرے وقتوں کی عبارت، قرطاس پبلشرز، لائل پور، ۱۹۷۳ء

۱۴۔ شہزاد احمد، فلیپ اندرونی ورق شیرازہ بند، گزرے وقتوں کی عبارت

۱۵۔ ریاض مجید، سیّدنا محمد ﷺ، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۴۷۸

۱۶۔ ایضاً، ص ۴۸۰

۱۷۔ ڈاکٹر عزیز احسن، ریاض مجید کا ریاضِ نعت، مشمولہ: کُلیّاتِ نعت، از ریاض مجید، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء، ص ۱۷

۱۸۔ ڈاکٹر عنوان چشتی، اُردو شاعری میں جدیدیت کی روایت، دہلی، ۱۹۷۷ء، ص ۲۴۶

۱۹۔ پروفیسر عارف رضا، ریاض مجید، ایک ہمہ جہتی سخن ور، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء، ص ۵۰

۲۰۔ شازیہ اکبر، ڈاکٹر ریاض مجید: نایافت کے سفر نامہ کا مسافر، ۳۱/، جولائی ۲۰۱۷ء، اسلام آباد

۲۱۔ پروفیسر عبدالحق، ایمرطس، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

۲۲۔ شازیہ اکبر، ڈاکٹر ریاض مجید: نایافت کے سفر نامہ کا مسافر، محولہ بالا

باب دوم:

ریاض مجید کی غزل کا مطالعہ

اُردُو کے عام شاعروں کی طرح ریاض مجید نے بھی اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا، جیسا کہ ہم ان کے سوانحی حالات میں لکھ آئے ہیں۔ اُنھوں نے ابتدائی غزلیں کالج نے زمانے میں (۱۹۵۸ سے ۱۹۶۰تک) میں اس وقت لکھیں، جب وہ گورنمنٹ کالج فیصل آباد (تب لائل پور) میں زیر تعلیم تھے۔ اُردو ادب کی یہ دیرینہ روایت رہی ہے کہ جب بھی کسی نو آموز شاعر نے آغاز شاعری کیا ہے، تو اُس کو غزل گوئی نے ہی سہارا دیا ہے۔ اِس کی بنیادی وجہ غزل کا ایک خاص مزاج اور اعجاز ہے۔ اِس ضمن میں محمد شمس الحق نے درست لکھا ہے:

''اُردو شاعری میں جتنی بھی اصنافِ سخن ہیں، اُن میں غزل سب سے زیادہ ہر دل عزیز رہی ہے۔ دو مصرعوں میں کسی بات کو بیان کرنا آسان کام نہیں۔ نئے خیال کو نئے انداز سے مختصر انداز میں قلم بند کرنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ غزل میں اچھّا شعر نکالنا نہایت مشکل کام ہے۔ اس میں طبع آزمائی کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ چونکا دینے والا شعر تو خال خال ہی شعرا کے ہاں ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں سیکڑوں شعرا میں صرف چند کو قبولِ عام کی سند ملی ہے۔ بہ ظاہر غزل ایک آسان صنفِ سخن معلوم ہوتی ہے، مگر شاعر، جب شعر کہنے لگتا ہے، تب اُسے اصلیت کا پتا چلتا ہے۔'' (۱)

ریاض مجید کا شمار بھی اُنھی معدودے چند شعرا میں ہوتا ہے کہ جنھوں نے غزل کا انتخاب اسی اختصاری کیفیت کے پیشِ نظر کیا ہے، اُن کی ابتدائی شاعری محض قافیہ پیمائی اور تک بندی نہیں تھی۔ وقت نے ثابت کیا کہ اُنھوں نے اُفقِ شاعری پر ایسے اَن مٹ نقوش چھوڑے ہیں، جو رہتی دنیا تک اُن کی انفرادیت برقرار رکھیں گے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ اس زمانے میں کالجوں میں ٹیوٹوریل گروپ کا نظام بڑا سخت تھا۔ ہفتہ میں ایک پیریڈ ایسا تھا، جس میں کالج کے مختلف ڈسپلنوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ اکٹھے ہوتے اس میں ایف اے، ایف ایس سی میڈیکل اور پری انجنیئرنگ گروپ کے، جونیئر اور سنئیر سالِ اوّل، دوم، سوم اور چہارم کے طلبہ مختلف گروپوں میں اس طرح جمع ہوتے کہ ایک گروپ کے کل طلبہ کی تعداد پچیس تیس سے نہ بڑھتی خوش قسمتی سے ریاض مجید کو، جو گروپ ملا اس کے انچارج پروفیسر مرزا محمد منور تھے، جو شاعر، معروف اہل قلم اور اقبال شناس تھے (بعد میں وہ گورنمنٹ کالج لاہور اور پھر اقبال کادمی لاہور کے چیئرمین بنے)۔ ریاض مجید نے اپنا ابتدائی کلام ٹیوٹوریل گروپ کی مختلف نشتوں میں پڑھا۔ اسی زمانے میں اُردُو کے معروف شاعر جگر مراد آبادی کی رحلت پر ٹاؤن ہال میں ایک مقامی مشاعرہ ہوا، جسے جگر مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا، اس کی صدارت چوہدری منظور احمد منظور نے کی، جب کہ اس کے سٹیج سیکرٹری خلیق قریشی تھے۔ شہری سطح پر پہلی بار اس مشاعرے میں ریاض مجید نے اپنا کلام ایک قطعہ اور ایک غزل کی صورت میں پیش کیا۔

قطعہ یوں ہے:

چمن چمن کو خود اپنے لہو سے سینچا ہے
روش روش پہ چراغ جگر چلاتے ہیں
پر اے ریاض گلیوں کو تو چھوڑ کانٹے بھی
ہمارے ہو نہ سکے آج تک پرائے میں (۲)

ریاض مجید نے اسی زمانے میں بین الکلّیاتی مشاعروں میں بھی بہت سی غزلیں (نظموں کے ساتھ) پڑھیں اور حاضرین سے خوب داد سمیٹی۔ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد کے مشاعرے میں اُنھوں نے معروف شاعر ''شہزاد احمد'' کے طرح مصرع "رواں دواں ہی رہا قافلہ بہاروں کا" پر غزل لکھ کر اوّل انعام حاصل کیا، ان کی اس طرح کی غزلیں، ان کے کالج کے زمانے کی شاعری ''شروعات'' میں موجود ہیں۔

ریاض مجید کی غزلوں کے اب تک چھے مجموعے چھپے ہیں:

(۱) پس منظر

(۲) گزرے وقتوں کی عبارت

(۳)ڈوبتے بدن کا ہاتھ

(۴) خاک

(۵) کہیں اور

(۶) مدار سے نکلے ہوئے

ریاض مجید کے غزلیہ مجموعے ''پس منظر'' کا تجزیاتی مطالعہ:

اُن کا شعری مجموعہ '' پس منظر'' ایک خاص کرب اور تنہائی کی دستاویز ہے۔اِس مجموعے کے مطالعہ سے ،جو تاثر شدّت اور وسعت سے نہایت نمایاں اور عیاں نظر آتا ہے، وہ آشوبِ تنہائی ہے۔یہی آشوبِ تنہائی ریاض مجید کے کرب کو دو آتشہ کرتا ہے ''پس منظر'' کی کوئی بھی غزل ایسی نہیں، جہاں کربِ تنہائی کسی نہ کسی صورت میں موجود نہ ہو۔''پس منظر'' کا شاعر اپنے اس المیے سے بخوبی آگاہ ہے،اس تاثر کے پیشِ نظر ''پس منظر'' کو بجا طور پر دستاویزِ آشوب تنہائی کا نام دیا جاسکتا ہے:

ریاض ہے میرا آشوب بھی اکیلے کا
کہ اپنی ذات میں گم اک مِرا خدا ہی نہیں! (۳)

تنہائی کے اس ہمہ گیر اور شدید ترین احساس کے عوامل تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیادی اور سب سے بڑی وجہ شاعر کا المیہ محبّت ہے، محبّت کا موضوع ہر چند نیا اور اچھوتا موضوع نہیں ہے بل کہ یہ تخلیقِ آدم کے وقت سے چلا آرہا ہے، لیکن ریاض مجید کے ہاں اِس ازلی و ابدی جذبہ نے، جس فطری پن، معصومیت، نزاکت اور پہلوداری کے ساتھ جگہ پائی ہے۔ اس کی مثال بہت کم شعرا کے ہاں عیاں ہوتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے ریاض مجید کی شاعری کے اسی پہلو کو قدرے وضاحت سے بیان کیا ہے:

> "ریاض مجید کی غزل کا مرکز و محور وہ کرب ہے، جس میں نہ صرف اُس کی ذات اسیر ہے، بل کہ وہ پوری کائنات کو اِس کرب کی شدت میں اینٹھتا اور کراہتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ شاعر کا یہ کرب اگر سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی شعور کی پیداوار ہو تو اس کرب کے فن کارانہ اظہار سے شاعر اس صورت حالات کو مثبت انداز میں منقلب کر دینے کی تمناؤں کو نطق دیتا ہے، لیکن اگر یہ کرب احساسِ شکست اور اس کے نتیجے میں بے بسی اور بے دلی کا اظہار ہے، تو اسے منفیت کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" (۴)

ریاض مجید کے اِس شعری مجموعے کے مطالعے سے شاعر کی حیاتِ محبّت کا مفصل باب تحریر کیا جا سکتا ہے۔ چناں چہ آغاز و انجامِ محبّت کے حیات افراز یا جان لیوا تجربات سے مملو "پس منظر" کے اوراق ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ شاعر نے محبّت کے حوالے سے، جو اشعار کہے ہیں وہ اُردو ادب کی روائتی عشقیہ شاعری سے کچھ مختلف اور منفرد ہیں ، لہٰذا ریاض مجید نے محبّت کو "برائے شعر گفتن خواب است" کے طور پر نہیں لیا، بل کہ محبّت نے شاعر کے رگ وپے، ریشے ریشے اور جسم کی نص نص کو اس طرح آتشیں رکھا ہے کہ اس کی آنچ سے ان کے اشعار تمازت حاصل کرتے ہیں، جو اُن کی جسمانی کرب ناکی سے کہیں زیادہ روحانی اذیت کا باعث بنتے ہیں۔

ریاض مجید کی محبّت شدت، خلوص، معصومیت اور ایثار کی آئینہ دار ہے۔ اُنھوں نے محبوب سے جذبِ محبّت کے ،جواب میں اپنی کل کائنات لٹا دینے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ ، لیکن اُن کی محبّت کی یہ آبرومندی اُن کے ایثار، خلوص اور معصومیت کا گنجِ قارون کو لامتناہی اُداسیوں اور بیکراں تنہائیوں کے سپرد کرتی چلی جاتی ہے ،، جو شاعر کی تنہائی کا سامان کرتے ہیں۔ اب ان کے پاس ماضی کی یادوں کے البم رہ گئے ہیں اور ریاض مجید جب بہت اُداسی اور تنہائی محسوس کرتے ہیں، تو ان البموں کو کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اِس ضمن میں ریاض مجید کا تلخ اظہاریہ دیدنی ہے:

ٹکٹکی باندھ کے اب اُن کو کھڑا تکتا ہوں
جن دریچوں کی طرف میں کبھی آیا بھی نہ تھا (۵)

ریاض مجید کی یادوں کا البم اتنا طویل ہے اور اس کی مکمل ورق گردانی اس نوع کے کام میں محال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ریاض مجید کی اُداسیوں، تنہائیوں اور کرب آمیز کیفیتوں کی، جو الم ناک تصویریں ''پس منظر'' کے صفحات پر بہ کثرت بکھری پڑی ہیں، ان کا درپردہ محرک وہ المیہ محبّت ہے، جو اُن کے جسمانی اور ذہنی انتشار کا باعث بنا اور پھر وہ سکونِ دل کی خاطر ماضی کے جھروکوں میں گوشۂ عافیت تلاش کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس ماضی کی آغوش میں اُنھی کا وہ پیار دفن ملتا ہے،، جو اُن کی زندگی کا ایک قوی اور حساس تجربہ تھا، جس کے لیے آپ نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا، یوں عشق میں ناکام ہونا ان کے جذبات و احساسات میں ایک متلاطم تاثر پیدا کرنے کا امکان اختیار کر جاتا ہے۔ اِس ضمن میں ریاض مجید کے چند اشعار بہ طورِ مثال ملاحظہ ہوں:

مشغلے سارے چھڑا کر کھوکھلا سا کر دیا
تیرے غم نے تو مجھے بالکل اکیلا کر دیا! (۶)

تُو میرے خوں میں رچا تھا اُداسیاں بن کر
بچھڑنے والے میں کیسے تجھے بُھلا دیتا (۷)

ریاض مجید کے احساسِ تنہائی کو زیرِ نظر شعری مجموعے نے خوب سہارا دیا ہے۔ گویا اُس دور میں کی جانے والی شاعری عاشقانہ تنہائیوں کی پیداوار ہے، جس میں اُن کا عشقیہ کرب واضح طور پر لپٹا دکھائی دیتا ہے۔ جہاں تک بارِ آگہی کا تعلق ہے، اس کے لیے اُنھیں ''گزرے وقتوں کی عبارت'' اور ''ڈوبتے بدن کا ہاتھ'' کا انتظار رہا ہے۔ المیہ صرف یہ نہیں کہ ریاض مجید کی محبّت اُنھیں اُداسیوں اور تنہائیوں کے مسلسل اور مستقل عذاب میں مبتلا کر گئی بل کہ اصل شخصی زیاں یہ ہے کہ محبّت کے المناک انجام نے شاعر کی پوری نفسیاتی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں، اور پھر اُسے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے اُسے بھرے بازار میں ننگا کر کے تنہا جینے پر مجبور کر دیا گیا ہو اور ہر نگاہ بس اُسی کے سقوطِ محبّت کے لیے تازیانہ ثابت ہو رہی ہو۔ اِس صورتِ احوال میں ریاض مجید کی ذہنی اذیت اور روحانی کوفت کا اندازہ لگانے کے لیے شعر دیکھیے، سنگ پاشی کا یہ عمل اگر محض اُن کی ذات تک ہی محدود رہتا، تو پھر بھی ایک حد تک امکان تھا،، لیکن جب وہ جسے چاہا گیا وہی سنگ باری کا متعامل ٹھہرا، تو ریاض مجید کو ذہنی کوفت سے کیوں کر چھٹکارا مل سکتا تھا۔ درج ذیل اشعار اِنھی داخلی کیفیات کے آئینہ دار ہیں:

وہ ہاتھ جس نے کہ میری کلاہ اتاری تھی
مزہ تو جب تھا مرے سر کو بھی قلم کرتا (۸)

یہ ایک انسانی فطرت کا کلیدی پہلو ہے کہ جب بھی شاعر کی محبّت کا آغاز ہوتا ہے، تو ہمیں اُس کے شعری قرینے مطلع کرتے ہیں کہ لیجیے، وہ شخص، جو شاعر کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا، وہی اب اس کی لوحِ دل پر اپنے نقش ثبت کرنے لگا

ہے۔اب شاعر مکمل طور پر اُس کی مَحبّت کا شکار ہو چکا ہے اور مَحبّت بے تکلفّانہ چھیڑ چھاڑ تک پہنچ رہی ہے اور یہی اُس کے لیے ایک گونہ تمانیت ہے۔

شاعر کا خدشہ درست ثابت ہوتا ہے اور محبوب بے رُخی کو شِعار کرتا نظر آتا ہے۔ ایسے الم ناک لمحے میں محبوب نے محب کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا ضروری خیال نہ کیا اور وہ محض تفننِ طبع کے لیے شاعر سے منسلک رہا۔ اِس خوش گمانی کا نتیجہ دیدنی تھا، جو ایک بہت بڑے حادثے کا پیش خیمہ ثابت ہوا، جس نے رُتوں کو یک سر بدل ڈالا۔ یہی رُتوں کی تبدیلی شاعر کے زمان ومکان کی کیفیات کو منقلب کرنے کا پیش منظر ثابت ہوئی۔ یوں جذبات کے وفور کا ایک محشر تھا، جس نے شاعر کی زندگی میں اک قیامت خیز طوفان لا کھڑا کیا۔ اب اُسے کھوئے ہوئے کی جستجو کہاں کہاں بے سرو پا لیے پھرتی ہے۔ اِن ساری کیفیات اور واردات کا سزاوار ہمیں، جو شاعر شعری اُفق پر تنہائیوں کے راگ الاپتا نظر آتا ہے، وہ کوئی اور نہیں، بل کہ خود ریاض مجید ہیں، جن کا ہر بلکتا ہو لفظ داستانِ مَحبّت سنا رہا ہے۔ کیوں کہ مقدر نے اُن کے لیے، جس کو اُن کے لیے گُم کر دیا، وہ تو شاید اُنھیں کبھی نہ مل سکے گا، ہاں اس لعل کی گمشدگی اور نایابی کے کم تاثرات کُچھ یوں مرتسم ہوں گے کہ ریاض مجید یوں معرضِ اظہار ہوں گے:

وقت نے کس طرح دونوں کا اڑایا ہے مذاق
تُو مِرے قابل نہ تھا یا میں ترے قابل نہ تھا؟ (۹)

درج بالا پس منظری مطالعے اور اُن کے ردِّ عمل کے طور پر کی جانے والی ریاض مجید کی شاعری اور داخلی جذبات کی ترجمانی اِس بات کی متقاضی ہے کہ ریاض مجید کو بلا مبالغہ شاعرانہ تجربات کا سمندر قرار دیا جائے اور اُن کی شاعری کو ایک ایسے عظیم الشان شعری مرقّع قرار دیا جائے، جس میں جذبے سے لے کر اخلاص تک ہر شے اپنا ذاتی وجود رکھتی ہے۔ اِس شذرے میں ریاض مجید کی شاعری کے ایک مخصوص، لیکن نمایاں پہلو مَحبّت اور احساسِ تنہائی کے محرکات کی سراغ رسانی کی گئی ہے۔ یہ الگ بات کہ معنوی سطح پر یہاں ایسی تہہ دار موجود ہے، جو ہر قاری کی لیے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اپنے اندر ایک جہانِ معنی کا اہتمام کرتی ہے۔ یوں اس قطرے میں بھی کئی دجلے موجود ہیں، جو صرف دیکھنے والوں کو ہی نظر آئیں گے۔

"پس منظر" کے مطالعہ سے، جو تاثر اپنی شدت اور وسعت کے اعتبار سے نہایت نمایاں اور قوی نظر آتا ہے وہ آشوب تنہائی ہے۔ پس منظر کی کوئی بھی غزل ایسی نہ ہوگی، جس میں کرب تنہائی کسی نہ کسی صورت میں موج زن نہ ہو۔ اسی طرح زیرِ نظر مجموعے میں، قدم قدم پر یادوں کے پھول کھلے نظر آتے ہیں، جن سے یادوں کا یہ چمن بھی دراصل آشوبِ تنہائی ہی کا شاخانہ ہے۔ لہٰذا پس منظر کو بجا طور پر "آشوبِ تنہائی کی دستاویز" اور "یادوں کی البم" کہا جائے، تو بے جا نہ ہوگا:

ریاض ہے میرا آشوب بھی اکیلے کا
کہ اپنی ذات میں گم اک مرا خدا ہی نہیں (۱۰)

تنہائی کے اس ہمہ گیر اور شدید ترین احساس کے عوامل کا اگر تجزیہ کیا جائے، تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اس کی بنیادی اور سب سے بڑی وجہ شاعر کا المیہ محبّت ہے۔ اگرچہ محبّت کا موضوع، کوئی نیا یا اچھوتا موضوع نہیں ہے بل کہ یہ تخلیقِ آدم کے وقت سے چلا آرہاہے اور ہر دور کے شعرا نے اس موضوع دل پذیر پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ایک ریاض مجید کے یہاں اس ازلی و ادبی جذبہ نے جس فطری پن، معصومیت، نزاکت اور ایک خاص رازداری کے ساتھ جگہ پائی ہے، اس کی مثال بہت کم شاعروں کے یہاں نظر آئے گی۔ ریاض مجید کا محبوب یہاں ہر کسی کی خاص توجّہ کا مرکز بن جاتا ہے کہ ایسا کون سا بے رحم شخص ہے، جس نے شاعر کی زندگی میں ایسا ہنگامہ برپا کیا ہے کہ ہمیں اُس کی عطا یعنی داخلی کرب نے ایسی شاعری عطا کی ہے کہ اُن برے حالات میں تخلیق ہونے والی اچھّی شاعری شاید کسی اور طرح ہم تک کسی طرح نہ پہنچ پاتی۔ ریاض مجید کو محبّت میں ناکامی نے نامراد ہرگز نہیں ہونے دیا، بل کہ ایک ایسے فن کار کے روپ میں ہمارے سامنے لایا ہے، جس کے تخلیق کردہ فن کو یقیناداد دینی پڑتی ہے۔

درج بالا مباحث سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ ''پس منظر'' کے مطالعہ سے شاعری کی ''کم یاب محبّت'' کا ایک مفصّل باب قلم بند ہو سکتا ہے۔ گویا ریاض مجید آغازِ محبّت سے لے کر انجامِ محبّت تک جن جن زندگی بخش یا جان لیوا تجربات سے گزرا ہے، اس کی نہایت روشن اور فطری تصویریں ''پس منظر'' کے اوراق پر بکھری پڑی ہیں۔

اس ضمن میں قابلِ تحسین بات یہ ہے، شاعر نے محبّت کے موضوع پر جن اشعار کو تخلیق کیا ہے، وہ روایتی عشقیہ شاعری سے بہت مختلف ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ریاض نے محبّت کو ''برائے شعر گفتن خوب است'' کے طور پر نہیں اپنایا بل کہ محبّت نے شاعر کے بدن کے رگ وپے اور روح تک کو گوے آتشیں بنا دیا ہے، جس کی آنچ سے ''پس منظر'' کے اشعار حرارت افروز ہوتے ہیں۔ بدن کی تمازت تو در کنار۔ ''پس منظر'' میں تو شاعر کی روح تک تڑپ اُٹھتی ہے۔

ریاض مجید کی محبّت میں انتہا کی شدّت، خلوص، معصومیت اور ایثار ہے اس میں محبوب سے کُچھ لینے کے لیے نہیں، بل کہ اپنا سب کُچھ اس پر لٹا دینے کا جذبہ نظر آتا ہے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ایثار، خلوص اور معصومیت کا یہ گنجِ قارون بھی، شاعر کو لامتناہی اُداسیوں اور تنہائیوں کے خارزار میں دھکیلتا چلا جاتا ہے اور ''پس منظر'' کا شاعر اس وسیع و عریض کائنات میں بالکل اکیلا رہ گیا، اب اس کے پاس ماضی کی یادوں کے البم میں رہ گئے ہیں اور شاعر شدید تنہائی اور اُداسی کے لمحات میں ان البموں کو کھول کہ بیٹھ جاتا ہے۔ ریاض مجید کی البموں کے چند اوراق دیکھتے چلیں، جہاں صفحۂ اوّل پر دیباچہ کے طور پر یہ امیجر ریاض مجید کے اشعار میں ہمیں ایک نئی اور انوکھی دنیا آباد نظر آتی ہے۔ ایسی اَن دیکھی موہنی صورت، جس کے بارے میں شاعر کو گمان تک نہیں تھا دھیرے دھیرے اُن کے دل کے نگر میں بستی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ شاعر کا اظہارِ جذبۂ شوق دیدنی ہے۔ اظہارِ عشق اور اعتراف محبّت کے بعد رہ و رسمِ محبّت کے آغاز کا انداز اپنے اندر سادگی، خلوص اور صداقت کے ساتھ ایک خاص طرح

کی سپردگی کی کیفیت بھی رکھتی ہے، جس کے باعث شاعر محبوب کو اس نئے سرشار کُن جذبہ کی وسعتوں سے روشناس کرانے کی کوشش کرتا نظر آتا ہے:

وہ جس کا کیف تو نے نہ دیکھا چکھا کبھی
آ میرے پاس بیٹھ! میں تجھ کو وہ پیار دوں! (۱۱)

"پس منظر" میں پیش آمدہ ایک اور انوکھا انداز ملاحظہ ہو، جہاں ایک خاص نوع کی تمثال کاری سے شاعر جذبۂ شوق کا ایک بانک پن پیدا کرتا ہے، جو ایک خاص شرارتی انداز میں محبوب سے چھیڑ چھاڑ کی بے تکلفانہ فضا عکس بند کرتا ہے۔ ریاض مجید نے محبوب کی بے حسی کے، جس خدشے کا اظہار کیا ہے۔ وہ حقیقت کا روپ دھارتا نظر آرہا ہے، جو محبوب کی فرار پسند طبیعت کا ایک خاص عندیہ دے رہا ہے۔ اِس ضمن میں درج ذیل دل خراش اظہاریہ ملاحظہ ہو، جہاں شاعر سیدھے سادے اندا ز میں حقیقتِ حال بیان کرتا ہے:

تعلقات بڑھاتا تھا کس توقع پر
اگر وہ مجھ سے کوئی چیز چاہتا بھی نہ تھا (۱۲)

جس دل خراش منظر اور کرب آمیز حادثے کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا، وہ سچ مچ وقوع پذیر ہو چکا ہے۔ اب رُتیں بدل گئی ہیں اور اس تبدیلی نے شاعر کے زمان و مکان کو کیمو فلاژ کر کے رکھ دیا ہے۔ اب شاعر کی جذباتی زندگی میں قیامت کا سانحہ رونما ہو چکا ہے۔ اب البم میں لہو رنگ تصویروں کے کارواں آغازِ سفر کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ شاعر بھی کھوئے ہواؤں کی جستجو میں سرگرداں ہے:

ڈھونڈتا پھرتا ہوں سڑکوں پہ وہ پیلا چہرہ
جانے کس بھیڑ سے وہ برگِ خزانی نکلے (۱۳)

عزیزِ گم گشتہ کی مجنونانہ جستجو ایک فطری امر ہے، جس کی ناکامی بھی بسا اوقات انسان کے لیے سکون آمیز ہوتی ہے۔ ریاض مجید محبوب کو گلی کوچوں میں کھو کر دل کے کہسار میں تلاش کر رہے ہیں۔ منطقی طور پر یہ تلاش کارِ بے کاراں کی سوا کُچھ بھی نہیں، لیکن اِس تگ و تاز نے ریاض مجید کی شاعرانہ یافت میں، جو اضافے کیے ہیں، وہ قابلِ صد آفرین ہیں۔

ریاض مجید کی یادوں کے البم سے پیچھا چھڑانا اُن کے لیے کسی طور پر ممکن نہیں ہے۔ یہی "پس منظر" کے اس "الم ناک پس منظر" کی سب سے بڑی خوبی ہے، جسے جانے بغیر ہم ریاض مجید کی اُن اُداسیوں، تنہائیوں اور بے کیفیوں کا صحیح معنوں میں ادارک نہیں کر سکتے۔ ایک زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے، تو اُن کی یہ الم ناک یادیں ہی، اُن کے لیے سرمایۂ حیات کی حیثیت رکھتی ہیں:

چند یادیں ہیں در و دیوار میں بکھری ہوئی
اُڑ چکے لمحوں کے کُچھ ، ٹوٹے ہوئے پَر رہ گئے (۱۴)

پس منظر میں ریاض مجید کا دکھائی دینے والا المیہ ٔ مَحبّت ایک ایسا آتش فشاں پہاڑ ہے، جس کے آتش گیر مادے سے اُن کے جسم وجاں سُلگتے نظر آتے ہیں۔ اِس سے کس کو جرأتِ انکار ہے کہ اُن کے اِس جذبے کا آتش فشاں لمحہ بہ لمحہ لاوا پھینکتا چلا جاتا ہے، جس میں وہ خود بھی جل رہے ہیں اور اُن کا گردو پیش بھی مکمل طور پر اُس کی زد میں ہے۔ اُن کا کمالِ فن دیکھیے کہ وہ بڑی مہارت اور ہنر وری سے اُس کی تمازت اور سلگتا پن دھیرے دھیرے قاری کو بھی محسوس کرواتے ہیں۔ اِس آتشیں ماحول میں وہ رہ رہ کر ماضی کے مرغزاروں کی طرف پلٹتے ہیں، کیوں کہ یہ ماضی کا ریگ زار ہی اُن کی ناکام مَحبّت کا دفینہ ہے۔ ریاض مجید اِس کو اپنی حیاتِ مستعار کا قوی متلاطم بحر اور بیش بہا اثاثہ جانتے ہوئے دلی موانست رکھتے ہیں۔ اِس بازی کے مات ہونے کا اُنھیں شدّت سے احساس ہے، جو اُن کے زیرِ نظر شعری مجموعے میں بالخصوص اور دیگر مجموعہ ہاے کلام میں بالعموم دیکھا جا سکتا ہے۔

ریاض مجید کو نہ صرف مَحبّت میں ہونے والا ناقابلِ تلّافی نقصان اُداسیوں اور تنہائیوں کے دائمی عذاب میں مبتلا کر گیا بل کہ اصل شخصی زیاں یہ ہوا کہ اِس المیے نے اُن کی پوری زندگی کا رخ ہی بدل ڈالا ہے۔ وہ خود کو اِس بھری پُری دنیا میں تنہا محسوس کرتے ہیں، جو رہ رہ کر اُن کے احساسِ تنہائی میں اضافوں کا باعث بن رہا ہے۔ ہمارا بے رحم سماج بسا اوقات اِس پر نشتر زنی سے بھی گریزپا نہیں ہوتا۔ نتیجتاً اِس سب کا بار اُنھیں خود اُٹھانا پڑ رہا ہے۔ اِس نشتر زنی اور سنگ باری کا ہدف اگر محض شاعر کی اپنی ہی ذات ہوتی تو بھی ایک حد تک قابلِ برداشت بات تھی، لیکن معاشرے کی بے مہری اور نخوت کا یہ عالم ہے کہ شاعر کے محبوب کو بھی نہیں بخشا گیا، جو شاعر کے کرب میں انتہائی اضافے کا باعث ہے۔ اِنھی جذبات کا اظہار ریاض مجید یوں کرتے ہیں:

بے مزہ تنہائیاں پاؤ گے استقبال کو
قربتوں کی بھیک لینے کو جو در در جاؤ گے
کون بانٹے گا ریاضؔ احساسِ تنہائی کا دُکھ
اب کہاں پر آگہی کا بوجھ لے کر جاؤ گے (۱۵)

ریاض مجید کے غزلیہ مجموعے ”گزرے وقتوں کی عبارت“ کا تجزیاتی مطالعہ:

شعر و ادب انسانی زندگی اور انسانی رویّوں کا عکاس رہا ہے۔ اِس حوالے سے انسانی جذبات و احساسات کی، جس قدر بہترین ترجمانی شاعری کے ذریعے سے ہوتی ہے، کوئی دوسرا وسیلہ اِس قدر معنی خیز ثابت نہیں ہو سکا۔ زندگی لمحات موجود کو عمل کے پیمانے سے ناپتے جانے کا نام ہے۔ یہ ایک مسلسل اور تدریجی عمل ہے۔ وقتِ مقررہ پر مادی عمل کے ذریعے سے مادہ کی

تسخیر عام انسانی عمل ہے مگر فن کار، جو زندگی سے اتنا قریبی رشتہ رکھتا ہے۔ زندگی کی مادی نوازشوں سے صرف اس بات سے محروم رہ جاتا ہے کہ اس کے محسوسات کی سطح کسی طرح یک تہی نہیں ہوتی۔ وہ مادی عمل کے بجاے اکثر محسوساتی عمل کے فریضے کی بجا آوری کا فریضہ انجام دیتا ہے۔

یہ بھی ایک عمومی رویّہ ہے کہ انسان حال کے قدم پر چلنے کے شوق میں ماضی کے ان اعمال کی نئی تشکیل بھی کر گزرتا ہے۔ یہ ایک ایسی سیال کیفیت ہے، جس میں بہت سوں کو عمرِ عزیز تمام کرتے دیکھا گیا ہے۔ یوں ایسے تمام افراد ریاض مجید کی طرح گزرتے وقتوں کی عبارت ہیں کیوں کہ اُن کا رابطہ ماضی کے ننگ اور جدا نہیں ہو پاتا۔ فی الحقیقت ہر انسان کا اِس دنیا میں یہی حال ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ریاض مجید نے اُن گزرتے وقتوں کے ساتھ تخلیقِ فن کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ گویا اُن کا ماضی ایک ایسی دستاویز بن چکا ہے، جس میں ہر اُن کی قلبی واردات اور اُس کے تجربات کا سراغ رساں ہے۔ لہٰذا ریاض مجید ذاتی طور پر معاشرے کے مسلسل سوال نامے سے تنگ بھی آ چکے ہیں۔ اِس لیے اپنے داخل میں پناہ گزیں ہیں:

اے گلی کوچوں کے شوروغل مرے پیچھے نہ آ
اپنے اندر کی صدا پر کان دھرنے دے مجھے (۱۶)

ریاض مجید زمانے کی تحقیقی فاعلیت کا حِصّہ ہیں، جس سے اُنھیں کبھی انکار نہیں رہا ہے۔ حال کے لمحات سے گریز پائی اُنھیں براہ راست اُسی ماضی کی کڑی سے منسلک کرتی ہے، جو حال سے ہو کر استقبال تک مربوط ہے۔ ماضی کے افعال کی ذِمّے داری بھی ایسے ہی کڑے حوصلوں والے رکھتے ہیں ، جو اپنے حال کو بدلنے کی جرأت سے بہرہ رکھتے ہوں۔ اس عمل میں ذِمّے داری کی شناخت ایک اہم مقام ہے۔ ریاض مجید اِس حوالے سے بامراد رہے ہیں۔

افعال کی اجتماعی ذِمّے داری قبول کیے بغیر بات نہیں بنتی۔ ریاض مجید گہرا تنقیدی شعور رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی تنقیدی نگاہ اُن افعال اور نتائج کا جائزہ بھی لیتی ہے۔ ریاض مجید کی اِسی کیفیت کے بارے میں احمد ندیم قاسمی نے ''گزرے وقتوں کی عبارت'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ریاض مجید کی غزل مثبت کرب کا اظہار ہے، کیوں کہ وہ اُس شعور سے مسلّح ہے، جس کے بغیر انسان سفاک عناصر اور بے رحم انسانوں کی اِس دنیا میں ہتھیار ڈال کر بیٹھ جاتا ہے۔ ریاض مجید نے کسی مرحلے پر بھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ موضوع سے قطع نظر، اگر وہ غزل کی خوب صورت روایت سے بھی بغاوت کرتا ہے، تو یہ نفسیاتی نکتہ ہاتھ لگ سکتا تھا کہ وہ تخریب کاری پر اُتر آیا ہے، مگر اُس کی غزل روایت سے صرف اِس حد تک بغاوت کرتی ہے، جس حد تک عصرِ حاضر کے غزل گو کو بہر صورت کرنی چاہیے۔''(۱۷)

ریاض مجید ایک ایسے باشعور فن کار ہیں کہ اُن کے تخلیقی تجربے شاعرانہ اُسلُوب میں تاریخی عمرانی پس منظر میں ایک اجتماعی جائزہ پیش کرتے ہیں:

جو سوچتے ہیں خود اس پر عمل نہیں کرتے
خود اپنے فکر تک بھی نہیں حلقۂ اثر اپنا (۱۸)

اوروں کے بارے میں یہ تجزیہ ریاض مجید کی اپنی شخصیت کے تجزیے کو بھی خود ہی سمیٹے ہوئے ہے اور ساتھ ہی بات اُسی صداقت کی تائید تک پہنچ جاتی ہے، جہاں ہمارا عمل ہماری اپنی ذات سے کے حوالے سے دیر سے کیا ہوا اقدام ہے۔ فن سے مربوط عمل گزرے وقتوں کی بازیافت سے مربوط ہو کر کھوئے ہوؤں کی جستجو بھی بنتا ہے اور آتشِ رفتہ کی سراغ رسانی بھی کرتے ہوئے، ماضی کو استقبال کے دروازے پر دستک دینے کی توفیق مہیا بخشتا ہے۔ ''حال'' اِسی حوالے سے بامعنی شے بنتا ہے۔ یہ عمل کسی مادہ پرست فرد کے لیے بے زاری کا باعث تو بن سکتا ہے، لیکن عام رویّہ رکھنے والے انسان کے لیے کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ ایک عمومی شعری رویّے میں بھی ایک شاعر کا تو منصب ہی اور ہے۔ ماضی اُس کے لیے ثقافت کی ساخت کے حوالے سے بھی حال میں ساری اور موجودات پر کاری مظہر کا نام ہے۔ اپنی ثقافتی وابستگی کا عمل اپنے وجود کی سطح کی شناخت ہے۔ ماضی سے تعلق فن کار کے ان زندہ حوالوں کے ساتھ سفر کرنے کی علامت ہے، جنھیں وقت نے پرکھا اور کسا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاض مجید کی ماضی پسندی رُجعت پسندی نہیں، ماضی کی توسیع نہیں، بل کہ مجموعی طور ہر اُس کی ''میں'' کے توانا لہجے کے روپ میں ڈھلتی ہے۔ درج ذیل شعری تمثیلات کو اپنی ذات اور انانیت کے حولے سے دیکھیے، تو ایک اور معنوی سطح بھی کھل کر عیاں ہوتی ہے:

''میں ''سے ''ہم'' تک کا سفر کیا کہیے، کیسے طے کیا؟
عکس جو دل میں تھے ،کب لوگوں کے آئینو ں میں تھے؟ (۱۹)

ریاض مجید کے ہاں ذاتی حوالوں اور ''میں'' کی نگاہ سے دنیا کو دیکھنے کا عمل کسی سابقہ ''میں'' کی اوّلیت سے نہیں پھوٹا۔ یہ اُس کے ذوقی مشاہدے کی رُوداد ہے۔ ورنہ اپنی ''انا'' پر یہ اصرار بے معنی بھی ہوتا اور شعر میں لطف کا باعث بھی نہ بنتا، جس نے یہاں ایک عجب طرح کا رنگ جمایا ہے:

تجھ کو اتنا کچھ بنانے میں مرا بھی ہاتھ ہے
میری جانب دیکھ! میں بھی تیرے پس منظر میں ہوں (۲۰)

ریاض مجید کا واحد متکلم تخلیقی بنت میں اپنے تمام حوالوں سے موجود ہے۔ یہ انانیت اُن کے خارجی عناصر اور اُن کی ذات کی شناخت بھی ہے، جو اُن کے معمارِ قوم ہونے سے بھی مختص ہے اور آنے والوں تک میراث فکر پہنچانے کی ذِمّے داری سے بھی عبارت ہے۔ لہٰذا اُس کی ایک صورت ریاض مجید کی خود کلامی بھی ہے، جہاں وہ دنیاومافیہا سے بے خبر خود سے ہر وہ بات کرتے ہیں، جو عام ماحول میں باو، جوہ نہیں کہی جاسکتی۔ یایوں سمجھ لیجیے کہ خارج اُس کو سننے کی ہمت نہیں رکھتا اور معنوی اعتبار سے تشکیک کا باعث بن سکتا ہے۔

ریاض مجید اپنے منفرد رویّے، اظہاری قوت اور مشاہدے کی تازگی کی بدولت الگ تھلگ پہچان رکھتے ہیں۔ ایسے معدودے چند غزل گو ہوں گے، جن کے ہاں اپنے احوال اپنی روز مرّہ کی زندگی مکمل سطحوں کے ساتھ اپنی تمام تبدیلیوں کو لیے ہوئے غزل میں نمایاں ہوتی رہی ہو۔ اِس حوالے سے ریاض مجید اپنی غزل میں ہر جگہ موجود دکھائی دیتے ہیں۔ یہ شکایت بجا سہی کہ ریاض مجید مشاہدے اور تجربے کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر پاتے اور اُس کے فنّی اظہار میں جلد باز واقع ہوئے ہیں۔ یہ کہنا بے جا ہو گا کہ ریاض مجید تازہ عہد کے اور ہر تازہ لہر کے ساتھ زندہ رہنے کا ہنر نہیں جانتے۔ یہاں اُن کی سیماب پا طبیعت اُنھیں پرانی روایت کی ڈگر پر ایک ہی طرح کا راگ الاپنے سے ضرور بچا نکلی ہے۔ یہاں ہماری ایک اور ریاض مجید سے ملاقات ہوتی ہے ، جسے پرانی البمیں چھونے کی بھی فرصت نہیں۔ حال آں کہ اُن کی ماضی کی جمع شدہ یادوں کے ذخائر اُن کی شاعری اور زندگی کا قیمتی اثاثہ ہیں۔

ریاض مجید ایک خاص تہذیبی مزاج اور رچاؤ کے ساتھ زندہ ہیں، یہی اُن کا اندازِ تفاخر ہے۔ یہ لذّتِ طمانیت اس لے رکھتے ہیں کہ وہ ایک تہذیب کی بقا کے لاشعوری عمل میں ہمیشہ سے شریک رہے ہیں۔ اُن کا تخلیقی اُبج اُن قوتوں کی داستان ہے، جو حال کی چوکھٹ میں نہیں سماتے یا وہ دکھی لوگ، جو عام سطح پر غیر متناسب نظر آتے ہیں۔

ریاض مجید کا دلِ دردمند شخصی سے قومی سطح پر ۱۹۷۱ء کے سانحہ پر وہ خوب اشک فشاں ہوا اور اس کے اسباب بھی تلاش کرتا سرگرداں رہا ہے۔ وہ ایسی دل خراش کیفیتوں کا اظہار کرنے میں بھی بے باک رہے ہیں:

بدن کی خاک بکھیریں تو ہو زمیں زرخیز
لہو گرائیں تو ہوں کھیتیاں ہری اب کے
کُچھ اور پر لگے اپنی کلاہِ منصب میں
کُچھ اور بڑھ گیا احساسِ کمتری اب کے (۲۱)

”ڈوبتے بدن کا ہاتھ“ کا تجزیاتی مطالعہ:

ریاض مجید ایک ایسے حساس طبع شاعر ہیں، جن کے نوکِ قلم سے متعدد شعری مجموعے معرضِ اظہار میں آئے ہیں۔ اُن کا شعری مجموعہ ”ڈوبتے بدن کا ہاتھ“ ایک ذہین، حساس اور پڑھے لکھے شاعر کے سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے خیالات و تفکرات کا دلآویز اور خوب صورت مُرقّع ہے۔ یہ شعری مجموعہ اپنے دامن میں بہت کُچھ سمیٹے ہوئے ہے۔ مثلاً: ابدی انسانی المیے کا، بالتفصیل تجزیہ، حرصِ زیست کے محرّکات، غمِ انسانی کی پُر اسراریت، ہمارے لمحاتی خوف و دہشت کے سالوں کی عقدہ کشائی، نفس روح سے آگہی، واقعات کے اسباب و محرّکات کی دریافتیں، فکری ارتقا کے کرشمات، مرکزیت کا انسانی زندگی میں عمل دخل اور اس کی اہمیت، گہری سوچوں کی جلتی دہکتی آگ کے شرارے، بدی اور تہذیبی ترقّی کا نازک تعلّق، تلاشِ ذات کی

کاوشِ پیہم، یکسانیت کی اذّیت، تصوُّف کی نکتہ آفرینیاں، اُن کی ہوس ناکی اور انتشار کے صحرائے بیکراں میں امن وسکون اور اپنے ارمانوں کی جنتِ گُم گشتہ کی تلاش وغیرہ وہ بنیادی موضوعات اور مسائل ہیں، جن پر شاعر کے فکرِ جلیل نے متذکرہ موضوعات پر شعر کہتے ہوئے چونکا دینے والے افکار تخلیق کیے ہیں۔ ریاض مجید ایک متوازن دانش ور ہیں، اُن کے اکثر وبیشتر اشعار اپنے دھڑکتے، سانس لیتے لفظوں میں ایک حقیقی روحانی انقلاب کی بُوباس رکھتے ہیں:

جو رچ سکے نہ لہو میں ، ہے ننگ وہ تحریک
رہیں جو نعروں تک اُن ولولوں کو کیا کرنا (۲۲)

زیرِ نظر شعری مجموعہ اوّل تا آخر پورے شعری اظہار میں ایک عجب نزاکتِ احساس کا پیغام دیتا ہے۔ ایسے ہی شعری قرینے ''ڈوبتے بدن کا ہاتھ'' کے ایک منفرد حسن کو دیگر مجموعہ ہائے کلام سے ممتاز کرتے ہیں:

سپردِ فن کیا خود پر جو لمحہ لمحہ گزرا تھا
جہاں کو تجربہ اپنا ، یونہی بے دام دے ڈالا (۲۳)

درج بالا موضوعات کے بہ نظرِ غائر مطالعے سے ریاض مجید کی شاعری کو موضوعی اعتبار سے تین واضح رجحانات میں بانٹا جاسکتا ہے، یعنی وجودیت، تصوُّریت اور فکری جبریت۔ اِنھی رجحانات کی تثلیث سے ریاض مجید اپنی تصوُّراتی تجسیم سے ہم کلام ہو کر زندگی کے مخفی طرزِ عمل کی پیدا کاریوں اور زندگی کی پُر اسرار حقیقتوں سے آگاہ ہونے کا عزم رکھتے ہیں۔ '' ڈوبتے بدن کا ہاتھ'' سانحہ آدم کی تمثیل کے حوالے سے سمجھا جائے، تو اوّل تا آخر ایک مسلسل اور پُر سوز داستانِ غم سے مملو ہے۔ یہاں دکھائی دینے والے ریاض مجید فلسفیانہ تفکر کے حامل ہیں، جو زندگی کے فلسفہ اور حقیقتوں کا ادراک کرنے کی بھر پور کوشش کرتے گلِ مراد کی تلاش میں محو ہیں۔ وہ جبر وقدر، خیر وشر اور خوف وآگہی جیسے بڑے مسائل کو پوری بے باکی سے ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ریاض مجید کا یہ کمال ہے کہ وہ اُن مسائل کے، جواب تلاش کرتے ہوئے قاری کو بھی اپنے ساتھ پہلو بہ پہلو لا کھڑا کرتے ہیں۔ اِس لحاظ سے دیکھا جائے، تو ریاض مجید ہمیں ڈریکولا(Dracula) اور فاؤسٹ(Faust) سے مماثل نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ اُن عظیم کرداروں کے لیے بھی اپنی ذات اور کائنات کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل تھی۔ اپنی ذات ایک عظیم استفہامیہ تھا اور پھر اس کی تسخیر ایک بہت ہی پیچیدہ گُتھی، جو ہر اعتبار سے سلجھاؤ کی متقاضی ہے

ریاض مجید کی مکمل شاعری ایک خواب بیداری کا شعری اظہار محسوس ہوتی ہے۔ یہی اُن کی منفرد رومانویت کا اصل سرچشمہ ہے، کیوں کہ بیداری کے خوابوں سے ایک فرحت وانبساط کی کیفیت ختم ہوتی ہے، جن سے ہمارے سپنوں میں بھی اپنے جیتے جاگتے پُر خوف خوابوں کی پر چھائیں کا عکس پڑتا ہے۔ جن سے ہم اپنی جذباتی غیر ہمواریوں کو ایک متحرک معنویت کا رنگ دے سکتے ہیں۔ اِس ضمن میں پروفیسر خالد عباس بابر ریاض مجید کے بارے میں رقم طراز ہیں:

" ریاض مجید ہمارے سامنے انسان کی ازلی خوف و دہشت پسندی کی جبلّت کو موضوعِ فکر بناتا ہے۔ ریاضؔ مجید کی یہ دریافت کہ ہم اپنی ذات میں مغائرت کا شکار ہیں اور یہ کہ کوئی اجنبی دشمن ہم پر انے پُر ہول پر پھیلائے بیٹھا ہے۔۔۔اس حقیقت کا اکثر حالتوں میں، اسے شعور بھی نہیں۔ چوں کہ ایسی صورتِ حال ممکن ہی نہیں۔ اس لیے اس کا اپنی ذات سے تخالف یا ذہنی کرب غیر فطری بات بھی نہیں۔"(۲۴)

ریاض مجید کی درج بالا کیفیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب کے درمیان رہتے ہوئے بھی خود کو سب سے الگ تھلگ تصوّر کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ریاض مجید اپنے اور متذکرہ پیدا شدہ ماحول کے درمیان مصالحت کی صورت پیدا ہونے کے امکانات سے عاری ہیں۔ یہی رویّہ ریاض مجید کے اِس منفرد شعری مجموعے کی تخلیق کا باعث بنا ہے۔ ریاض مجید نے اپنے شعری پیکروں میں جابجا اُس انسانی گریز اور ناقابل مزاحمت حالات کو جُملہ مکروعات کے ساتھ علامتی انداز میں بیان کیا ہے، جن میں انسانی انانیت کو سخت مجروح ہوتی ہے۔ ایسے عناصر سے اُن کی دامن کُشائی عین ممکن تھی، لیکن اُن دبے جذبوں، خواہشوں اور آدرشوں کا بڑی جاذبیت اور بھرپور توانائی سے اظہار کیا ہے۔ جن سے پوری انسانی زندگی عبارت ہے۔ چناں چہ اُنھوں نے، جو کُچھ دیکھا، محسوس کیا، برملا انداز میں معرضِ اظہار میں لایا ہے۔ پروفیسر خالد عباس بابر ریاض مجید کی غزل میں پائی جانے والی ایسی ہی کیفیتوں پر یوں رائے زنی کرتے ہیں:

"ریاض مجید کی اپنی ہی ذات میں کربناک کش مکش کا ٹھنڈ میٹھا احساس دلفریب غزلوں کے رُوپ میں ابھرا ہے۔ اس اہم شعری کاوش کا سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں اظہار کُچھ اور خوب صورت ہو گیا ہے۔ کیوں کہ انفرادی سطح پر آویزش ملی سطح پر ایسے سے، اہم آہنگ ہی نہیں ہوئی اسے مزید واضح خدوخال میں پیش کرنے میں مدد ہوئی ہے۔ انجانے، انوکھے سنسان بیابانوں اور صحراؤں کے طویل و تاریک سفر ریاض مجید کے تخلیقی ادراکت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں، جو ہماری نسلِ انسانی کے تاریخی سانحہ کو جانچنے پرکھنے میں رہ نمائی کرتے ہیں۔" (۲۵)

ریاض مجید کے ایسے شعری اظہارات ہمیں متحیّر کرتے ہیں کہ وہ کیسے کرب آمیز اور پر ملال انداز میں وہ بغیر پیچھے پلٹے ایک ہم، جو راہ نورد کی طرح بیکروں یخ بستہ وسعتوں اور طوفان زدہ ساحلوں پر سیر کرتے ہوئے تھکے ماندے اپنے سفر سے مراجعت اختیار کرتے ہیں۔ ریاض مجید ایک ایسے سمندر کی مانند ہیں، جو اپنی حدود میں سمیٹا رہتا ہے اور دوسرے اُس کی پنہائیوں اور وسعتوں کا نظّارہ تو کر سکتے ہیں، تاہم اُس میں غوطہ زن ہوئے بغیر اُس کی گہرائیوں کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

اِن تمام تر تلخ حقائق کے باوجود زندگی کو دائرے سے خطِ مستقیم کی صورت اختیار کرنی چاہیئے۔ کیو ں کہ اسی میں انسان کے لیے رہِ نجات ہے، جو انسانی مسائل کے حل کے راستے ہموار کرتی ہے۔ غرض "ڈوبتے بدن کا ہاتھ" عرفانِ حقیقت کے اشاریے کے طور پر ایک قابلِ ستایش شعری کاوش ہے، جسے ایک متوازن سوچ کا حامل نقاد ہمیشہ جدید اُردو شاعری میں ایک سنگِ میل کی حیثیت سے دیکھے گا۔

ریاض مجید کا سائنسی شعور:

ریاض مجید کا شعری سفر قیامِ پاکستان کے بعد دوسری دہائی میں آغاز پذیر ہوتا ہے۔اِس اعتبار سے وہ بیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی میں ابھرتے ہیں۔ ریاض مجید کی غزلیات کا پہلا مجموعہ ’’ پس منظر‘‘ ۲۰؍فروری ۱۹۷۳ء میں منظر عام پر آیا۔اِس مجموعے میں شامل ۹۰ غزلیات کا عرصۂ تخلیق ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۶ء ہے۔ ریاض مجید کی طبع رسا آغازِ جوانی میں زوروں پر تھی اور فکر کی تازہ کاریوں کے نمونے بھی روزافزوں تھے۔یہی وجہ ہے کہ صرف تین ماہ کے اندر اُن کی غزلیات کا دوسرا مجموعہ ’’گزرتے وقتوں کی عبارت‘‘ ۱۷؍مئی ۱۹۷۳ء میں شایع ہوا۔ ۵۹ غزلیات پر مشتمل اِس مجموعے میں ۱۹۶۷ء تا ۱۹۶۹ء کا کلام شامل ہے۔ ۱۰۱ غزلیات پر مشتمل تیسرا مجموعہ کلام ’’ڈوبتے بدن کا ہاتھ‘‘ ۱۹۷۴ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ اِن غزلیات کا عرصۂ تخلیق ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۳ء ہے۔

درج بالا مجموعہ ہائے کلام میں شامل غزلیات کے مطالعے سے، جہاں ریاض مجید کے تخلیقی وفور اور قادرالکلامی کی داد دینی پڑتی ہے، وہاں موضوعاتی تنوع سے ایک خوش گوار تجربے کے اظہار کا احساس ہوتا ہے۔ ریاض مجید کی شاعری میں کلاسیکی اظہاریت اور عصری حسیّت کا بھرپور احساس ملتا ہے۔ اُن کی شاعری کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ اُس کے اندر تنوّع اور رنگا رنگ پائی جاتی ہے۔ ریاض مجید کی شعری آرایش کا اعتراف ایک زمانہ کرتا ہے۔اُن کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے مسعود مختار لکھتے ہیں کہ:

> ’’ ریاض مجید جدید نسل کے ایک اہم شاعر ہیں۔اُنھوں نے لائل پور شہر میں جدید شاعری کے فروغ کے لیے بہت نمایاں رول ادا کیا ہے۔ بہت متنوع شاعر ہیں۔ شاعری میں موضوعات کی سطح پر جتنے تجربے ریاض مجید نے کیے ہیں، بہت کم لوگوں کو اس کا موقع ملا ہو گا۔‘‘(۲۶)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی ریاض مجید کے معاصر اور ہم جماعت رہے ہیں۔اُنھوں نے ریاض مجید کو ہر حوالے سے انتہائی قریب سے دیکھا ہے۔ چناں چہ وہ ریاض مجید کے تعارف میں لکھتے ہیں کہ اِس قدر پُر گو شاعر کی مثال اپنے معاصرین میں تلاش کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ علاوہ ازیں وہ نظم و غزل میں ریاض مجید کے اُسلوب اور تازہ آہنگ کی کیفیت کو سراہتے ہوئے عمومی تبصرہ کرتے ہیں:

> ’’نئی نظموں سے مقابلہ کرنے کے لیے غزل گو شاعروں نے شعور اور تفکر کا، جو رنگ اپنایا ہے۔ اس سے غزل کی وہ خصوصیت، جو اس کا رشتہ غزال اور تغزل سے ملاتی تھی یا ’’بازناں گفت گو کردن‘‘ کا مفہوم دیتی تھی، بالکل مفقود ہو گئی ہے حال آں کہ زندگی سے ان چیزوں کی اہمیت ابھی رخصت نہیں ہوئی۔‘‘(۲۷)

ریاض مجید کی غزل ایک ایسا ادبی منشور ہے، جس سے چھن کر نکلنے والی متنوع روشنیاں ایک عجب شعری قندیل روشن کرتی ہیں، جہاں ریاض مجید معاصر شعری ادب میں اپنی الگ تھلگ شناخت رکھتے ہیں۔ اُن کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت ،جو اُنھیں اپنے معاصرین میں ایک منفرد اور ممتاز مقام عطا کرتی ہے، اُن کا سائنسی شعور ہے۔ اُن کی غزلیات کے تینوں مجموعے، اُن کی سائنسی فکر کے مظہر ہیں۔ ریاض مجید کے طیفِ غزل میں جدید سائنسی علوم کے بیش تر رنگ دیکھے جاسکتے ہیں۔ اِن اشعار کے غائر مطالعے سے اُن کی سائنسی علوم سے گہری دل چسپی اور سائنسی شعور اور مزاج کا ثبوت ملتا ہے۔ اُن کا وسیع مطالعہ بھی اِس امر کی دلیل ہے کہ وہ سائنس اور اُس سے پیدا شدہ امکانات اور نقصانات کا مکمل ادراک رکھتے ہیں۔ ریاض مجید کے قالب میں شاعر کا دل اور سائنس دان کا دماغ ہے، بنابریں اُن کی شاعری میں شعر و سخن کی دیوی منروا اور فطرت کی دیوی میڈونا گلے ملتی نظر آتی ہیں۔ یہی کرداری آمیحنت اُن کی شاعری میں ایسا جادوئی عنصر پیدا کرتی ہے، جس کی بدولت سائنس اور ادب یک جان و دو قالب ہو جاتے ہیں۔

اِن سب پر مستزاد ریاض مجید کا تاریخی شعور ہے، جو نہایت سلیقہ مندی سے شعری قالب میں ڈھل جایا ہے۔ ہبوطِ آدم سے عروج آدم تک بنی نوع انسان نے ارتقا کی، جو منازل طے کی ہیں اور انسانی شعور نے بتدریج، جو ترقّی کی ہے، اُسے اجتماعی دانش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ریاض مجید کے اشعار میں بشریات اور قدیمیات کے کئی اشارات ملتے ہیں۔ اِس ضمن میں وہ معاصر شعری ادب میں سب سے منفرد دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب کُچھ ریاض مجید کے وسیع مطالعے اور قوتِ مشاہدے کے طفیل ممکن ہوا ہے۔ اُن کی فکرِ رسا جس چیز کا احاطہ کر جاتی ہے، شاید بہت سے شعرا اُس کی ہوا کے بھی متعامل نہیں ہو سکتے۔ اُن کے مطالعے اور استفادی پہلوؤں کے برملا اظہار کے لیے یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

ملے ہیں کتنے ہی دریا مرے سمندر میں
میں کیا بتاؤں کہ کس کس کا خوشہ چیں ہوں میں (۲۸)

ریاض مجید نے شاعرانہ انکسار اور مہذبانہ اعتراف کی لطافت کے ساتھ ساتھ تاریخی ژرف نگاہی کا ثبوت بھی دیا ہے۔ اُن کی ذہانت میں گزشتہ نسلوں کا تجربہ بھی شامل ہے۔ اُن کا یہ خاصہ ہے کہ وہ تحریر و تقریر کے دروان میں اسلاف کی خوشہ چینی اور اُس کے بغیر بھی بہت کُچھ کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ لفظی صوت گری اور معنی آفرینی ریاض مجید کے کلام کی ایسی خوبی ہے، جس نے اُنھیں ادب کے مقتدر حلقے میں ایک خاص اعتبار عطا کر رکھا ہے۔

ریاض مجید کے مضامین ''مصنف کی موت'' اور ''لکھت لکھتی ہے لکھاری نہیں لکھتا'' میں اُن کے گہرے سماجی اور عمرانی شعور کی جھلک ملتی ہے۔ ریاض مجید کے یہاں پائے جانے والے ژونگ کے نخست مثالی روّیوں اور تاریخی شعور کی غمازی کے لیے یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

جو مجھ میں بولتا تھا وہ میرا ہی "میں" نہ تھا
احباب کی صدائیں بھی میری صدا میں تھیں (۲۹)

ریاض مجید جدید ذہن و فکر کے عکاس ہونے کے باوجود روایت سے اپنا گہرا رشتہ اُستوار رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مٹّی قدروں کا نوحہ خواں ہیں۔ بسا اوقات یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی گم شدہ تہذیب کے بھٹکے ہوئے راہی ہیں، جو صدیوں کی مسافت طے کر کے عہدِ حاضر میں آنکلے ہیں۔ اُن کی شاعری میں کھنڈروں اور غاروں کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ نوسٹلجیا اُن کے مزاج کا حِصّہ ہے، تو تاریخی شعور کی عتیقیات سے گہری دل چسپی کا مظہر ہے۔ یہی روایت اور جدّت کا انضمام ریاض مجید کو پچھلی دنیا کے مسافر اور جدید دنیا کے راہی ہونے کا ثبات دیتا ہے۔ ورنہ ایسے مسافر زندگی کے اور چوراہے پر آن کھڑے ہوتے ہیں، جنھیں نہ منزل کا تعیّن ہوتا ہے اور نہ ہی راستے کی سراغ رسانی ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں سے ہٹ کر اپنے لیے نئی راہیں تلاش کرنا ریاض مجید جیسے فن کار کا ہی ہنر ہو سکتا ہے:

وقت کی کالی اجنتا میں ہیں اب تک ان پڑھے
اس نے ہم کو کیسی ان دیکھی جگہوں پر لکھ دیا (۳۰)

ریاض مجید کی زندگی ماضی اور حال کے ساتھ استقبال کا آئینہ ہے۔ وہ اپنے گہرے شعور اور سائنسی ذہن کے بل پر زندگی کی دشوار گزار گھاٹیوں سے بہ آسانی نکلنے میں بامراد رہے ہیں۔ یہ اُن کی زندگی کا ایک عجیب اور حیرت انگیز پہلو ہے۔

"آثارِ قدیمہ سے دل چسپی رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ اجنتا کے غار اپنے اندر کیسے کیسے محیر العقول عجائبات رکھتے ہیں ۔۲۹ غاروں کا یہ سلسلہ دوسری صدی قبل مسیح میں بڑی بڑی چٹانوں کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ ان غاروں کے اندر جہاں تک کہانیوں پر مشتمل تصویریں اور مورتیاں بنائی گئی ہیں۔ اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں واقع اُن غاروں کا شمار عالمی ورثے کی جگہوں میں ہوتا ہے۔ اِس طرح کے دیگر غاروں کے سلسلے، ایلورا (اورنگ آباد)، بارابار (جہان آباد) اور ہاتھی غار (ممبئی) بھی عجائبات میں شمار ہوتے ہیں۔"(۳۱)

ریاض مجید لمحۂ حال کو ماضی کے تسلسل میں دیکھتے ہیں۔ اُنھیں رمزیات اور علم العجائب سے بھی دل چسپی ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ زندگی کے حقائق کو اِس شعور کے بغیر اصل روپ میں دیکھنا کس قدر محال ہے، اِس کا ادراک وہی کر سکتا ہے، جس نے زمانے کے ساتھ چلنے اور زمانی قدروں سے بہت کُچھ سیکھا رکھا ہو، جسے زندگی کی کھلی کتاب نے بہت کُچھ سیکھا رکھا ہو۔ ریاض مجید نے درست کہا ہے:

خود میں جھانکا تو عجب منظر نظر آیا مجھے
اپنا اندر بھی عجائب گھر نظر آیا مجھے (۳۲)

ریاض مجید سماجی علوم میں عمرانیات سے خصوصی شغف رکھتے ہیں ۔ عمرانیات میں ''تاریخِ خاندان'' ایک اہم موضوع ہے۔ ابتدا میں سب انسان اکٹھے رہتے تھے۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ انسان شعوب و قبائل میں بٹ گئے۔ ایک ہی خاندان کے افراد رفتہ رفتہ کئی کنبوں، قبیلوں، قوموں اور معاشروں میں تقسیم ہوتے گئے۔ اس ضمن میں ریاض مجید کا یہ شعر کتنی خوب صورت عمرانی حقیقت کی عکاسی کرتا ہے:

بچپن میں سارے بہن بھائی ایک جان تھے
جب ہو گئے جواں کئی کنبوں میں بٹ گئے (۳۳)

علمِ معاشیات کا شمار بھی سماجی علوم میں ہوتا ہے۔ بظاہر معاشی نظریات اور قوانین کا شعر و سخن سے دور کا بھی واسطہ نہیں، لیکن بنظرِ غائر دیکھیں تو معاشیات نے ادبیات کو بھی بے حد متاثر کیا ہے۔ شاعر ہو یا معاشرے کا کوئی بھی فرد روٹی، کپڑا اور مکان، تو بہر طور انسان کی بنیادی ضروریات میں سے ہیں۔ ریاض مجید کی شاعری میں اقتصادیات کے چند اُصول و نظریات کی جھلک انسانی ضروریات اور جذبات واحساسات کے زیر اثر دکھائی دیتی ہے، جو اُن کے سماجی شعور اور بین العلومی مطالعے کی دلیل ہے۔ معاشیات کا عام اُصول ہے کہ کسی شے کی طلب کم ہو جائے، تو اس کی قیمت گر جاتی ہے۔ اِس طرح افراطِ زر کی صورت میں معمولی چیزوں کے بھاؤ بھی بڑھ جاتے ہیں۔ تخفیفِ زر اور افراطِ زر کے مذکورہ بالا اُصول ریاض مجید کے درج ذیل شعر میں کس خُوب صُورتی سے عکس ریز ہوئے ہیں۔ فکر کی گہرائی اور جذبے کی گہرائی نے معاشی نظریات کو کس قدر دل کش شعری پیکر عطا کر دیا ہے۔

ریاض مجید خوب جانتے ہیں کہ جب زمانے بدلتے ہیں تو پیمانے بھی بدلنے لگتے ہیں۔ پرانی قدریں کلیشے بن کر اپنی قدر کھو دیتی ہیں، تو پرانے ثمنِ اعتباری محض کاغذ کے ٹکڑے رہ جاتے ہیں۔ وقت کے بے رحم ہاتھوں سے کون دامن کشاں ہو سکا ہے۔ دنیا کی ہر شے سیلِ وقت کی دست برد کا شکار ہو کر رہتی ہے۔ ریاض مجید نے وقت کی اِس زبردست قوتِ متغیرہ کو معاشیات کی اصطلاحات میں بیان کر کے انسان کی بے وقعتی اور بے توقیری کو بڑی خوش اُسلوبی سے ظاہر کیا ہے۔ اِس حوالے سے درج ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے:

کھوٹے سکّوں کی طرح ہم ہو چکے ہیں نا قبول
اب نیا ہی دور ہے اپنے زمانے ہو چکے (۳۴)

ہم موتی تھے ،لیکن ہم کو گُن کا گاہک مل نہ سکا
بازاروں میں پڑے پڑے ہم اپنے آپ کو رول چکے (۳۵)

ریاض مجید کے ہمہ گیر اور سائنسی و سماجی علوم سے شناسائی کے بے شمار دلائل ہیں، جو اُن کے وسیع اور بین العلومی مطالعے کا بیّن ثبوت ہیں۔ سماجی علوم میں نفسیات کا شمار بھی جدید حیاتیاتی علوم میں ہوتا ہے۔ انسان بیک وقت آفاق و انفس میں

رہتا ہے۔ وہ صرف خارجی کائنات کی تسخیر ہی سے سروکار نہیں رکھتا بل کہ ایک داخلی دنیا سے بھی واسطہ رکھتا ہے۔ اگر خارجی کائنات عالمِ اکبر ہے، تو ہر انسان اپنی پیچیدہ نفسیات کے اعتبار سے داخلی دنیا بھی عالمِ اصغر کہلاتا ہے۔ انسان کی اس داخلی دنیا کا مرکز دماغ ہے۔ یہی منبع شعور بھی ہے۔ شعور، لاشعور اور تحت الشّعور کی دریافت کا کارنامہ کسی برِّاعظم کی دریافت سے کم نہیں۔ فرائڈ، ژونگ اور ایڈلر جیسے نفسیات دانوں نے انسانی تحلیلِ نفسی کے ذریعے سے نہ صرف نفسیات کے میدان میں تہلکہ مچادیا بل کہ شعر و ادب کی تحقیق و تنقید اور تفہیم کے لیے بھی ایک نیا زاویۂ نگاہ اور نفسیاتی بنیاد فراہم کیے ہیں۔ اِسی کے زیرِ اثر ادب کے ایوانوں میں نفسیاتی دبستانِ نقد اور شعرا و ادبا کا حاسۂ انتقاد بحث طلب اور قابلِ عمل شے قرار پائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا نے بھی انسانی نفسیات کی بوالعجبیوں کا ذکر بڑے دل نشیں پیرایے میں کیا ہے۔ ریاض مجید کی غزل میں انسانی نفسیات کا ادراک، اُن کی ژرف نگاہی کا ثبوت ہے۔ ماہرینِ نفسیات اِس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جذباتی حالت میں دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے اور ادراک کا اثر دورانِ خون پر پڑتا ہے۔ ماہرینِ نفسیات کے مطابق ہمارے دماغ کا بیشتر حِصّہ لاشعور پر مشتمل ہے۔ لاشعور کی مثال برف کے تودے کی سی ہے، جو سطحِ آب کے اُوپر کم دکھائی دیتا ہے اور اُس کا بیشتر حِصّہ سطحِ آب کے نیچے ہوتا ہے۔

ریاض مجید نے لاشعور کو کتنی خوب صورتی سے اجاگر کیا ہے:

جو ذہن میں تھا وہ سب لا شعور کو سونپا
چنیں جو سطح سے چیزیں تہوں میں چھوڑ آئے (۳۶)

ریاض مجید کی غزل میں صرف سماجی علوم کے حوالے نہیں ملتے بل کہ حیاتیاتی علوم سے بھی اپنی گہری وابستگی کا ثبوت ملتا ہے۔ حیاتیاتی علوم کی ذیل میں جرثومیات ایک نہایت اہم علم ہے۔ ریاض مجید نے اپنی غزل میں حیات کے مختلف پہلوؤں کو ایسے دل نشین انداز میں حیطۂ تحریر میں لیا ہے کہ اُن کی شاعری فن کے ساتھ سائنس کی ایک گیلری بن گئی ہے۔ یہاں بھی اُن کا انوکھا اور اچھوتا انداز دیدنی ہے۔ ریاض مجید کی ایک غزل کا مقطع ملاحظہ کیجیے:

جی رہا ہوں میں مثالِ کرمکِ سنگ اے ریاضؔ
زیست کی تنظیم کا خاموش کارندہ ہوں میں (۳۷)

ریاض مجید کی غزل اُن کے نفسی و ذہنی رجحانات اور داخلی کیفیات کی عکاس ہوتی ہے۔ وہ معاشرتی احساسِ یگانگت کے لیے ہر ممکن طور پر کوشاں رہے ہیں۔ درج بالا شعر کی بنت میں ریاض مجید نے معاشرے میں اپنی کم مائیگی اور عدم شناخت کے لیے، جو مثال پیش کی ہے، اس کی داد دینا پڑے گی۔ لفظ 'کرم' چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کافِ تصغیر نے اس لفظ میں مزید چھوٹائی کا مفہوم پیدا کر دیا ہے۔ گویا ایسے حقیر اور چھوٹے کیڑے جنھیں چشم عریاں سے دیکھنا ناممکن ہے۔ ان کیڑوں کو صرف طاقت ور خردبین کی ضرورت ہوتی ہے۔ کرمکِ سنگ تلاش معاش کے لیے جتنے، جوکھم اٹھاتا ہے اس

کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ بے شک رازقِ حقیقی پتھر کے کیڑے کو بھی رزق پہنچاتا ہے۔ بیکٹیریا اور اس نوع کے دیگر خردبینی جان داروں کے لیے 'خاموش کارندے' کی ترکیب انسب ہے اور شاعر کے عمیق مشاہدے اور زبردست سائنسی شعور کی غمازی کرتی ہے۔ بیکٹیریا حیاتیاتی چکر میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں، لفظ بیکٹریا یونانی الاصل ہے۔ یونانی لفظ بیکٹیرین کے معنی 'کسی تنظیم کے کارندے' یا ہی کے ہیں۔ اگرچہ شاعر نے لفظ بیکٹریا یا جرثومہ استعمال نہیں کیا، لیکن 'کرمک سنگ' اور دیگر حشرات الارض نامیاتی مادوں کی شکست و ریخت میں، جو کردار ادا کرتے ہیں، وہ بیکٹیریا اور دیگر خردبینی جراثیم سے مماثلت رکھتا ہے، اس لیے 'کرمکِ سنگ' کے لیے 'حیات کی تنظیم کا خاموش کارندہ' کی ترکیب نا صرف لغوی اعتبار سے درست ہے، بل کہ سائنسی نکتہ نظر سے بھی قابل تعریف ہے۔

آج کل ماحولیاتی آلودگی عالمی سطح پر ایک سنگین مسئلہ بن چکی ہے۔ شہروں میں ٹریفک کے بے ہنگم شور اور فیکٹریوں اور ملّوں کے کثیف دھویں اور زہریلے کیمیائی اجزا سے آلودہ پانی کے باعث ہزاروں بیماریاں جنم لے رہی ہیں۔ اوزون کی تہہ میں شگاف پڑنے سے سورج کی تاب کار شعاعیں زمینی حیات کے لیے شدید خطرہ ثابت ہو رہی ہیں۔ آج کی سائنس اور ماہرین ماحولیات اِس مصیبت سے گُلو خلاصی کے لیے دن رات سر، جوڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں تاکہ کوئی نہ کوئی ممکنہ حل تلاش کرتے ہوئے دینا کو اِس تباہی سے بچایا جا سکے۔ گلوبل وارمنگ تھیوری، کے مطابق سمندروں کی سطح بلند ہو رہی ہے۔ اس عمل سے سونامی سے بھی بڑے اور تباہ کُن سیلاب آسکتے ہیں۔ اس نوع کے بہت سے مسائل ریاض مجید کی شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں، جو ماحولیات سے ان کی واقفیت اور گہرے شعور کا ثبوت ہیں۔ صرف ایک شعر بطورِ مثال ملاحظہ کیجیے:

دھواں اگلتی ملیں کھا گئیں اسے بھی ریاضؔ
رہا ہی کیا ہے جو اَب اپنے گاؤں میں دیکھوں (۳۸)

ریاض مجید کی شاعری اپنے اندر ایک بوٹینیکل گارڈن کا بھی حوالہ رکھتی ہے۔ نباتات سے گہری وابستگی اور اُن کی حیاتیاتی شناخت کے باعث وہ خود کو درختوں اور پودوں وغیرہ سے تشبیہ دیتے ہیں اور کبھی ایسے بلیغ استعارے تخلیق کرتے ہیں، جن سے ایک طرف اُن کی فطرت پسندی کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ انسانی حیات کی ناقدری اور نباتاتی حیا کی وقعت پذیری کا المیہ بھی بیان کر جاتے ہیں۔ ایسے اشعار میں تشبیہات کے روایتی مفاہیم کے علاوہ جدید سائنسی فکر کی آمیزش بھی صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔ وہ لفظ معنی کے ادراک کے بھی شناور ہیں اِس لیے اُن کے کلام میں لفظوں کی معانوی تہہ داری شعر کی قدر و قیمت کو کئی گنا بڑھا دیتی ہے۔ اِس حوالے سے ریاض مجید کی فکرِ رسا کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔

علمِ نباتیات میں طفیلی پودوں کے ذیل میں آکاس بیل کا ذکر عام ملتا ہے۔ آکاس بیل ایک ایسا طفیلی پودہ ہے، جو دوسرے پودوں یا درختوں پر زندہ رہتا ہے اور میزبان پودے کی تمام خوراک استعمال کر کے اسے نیم جان یا مردہ کر دیتا ہے۔

ریاض مجید نے ہمارے سماج کے ایسے طفیلیوں کا، جہاں معاشرے پر غیر ضروری بوجھ ہونے کا برملا اظہار کیا ہے، وہاں اُنھوں نے اس نباتیاتی حقیقت کو اپنی ذات پر بھی منبطق کیا ہے، اُن کی فکرِ رسا کا مظہر درج ذیل شعر ملاحظہ ہو:

چمٹ گیا تھا میں آکاس بیل سا خود کو
اَنا بڑھی ہے تو جاں کو زوال آیا ہے (۳۹)

ریاض مجید نے بڑے فکر انگیز انداز میں اپنی جاں کو شجر قرار دے کر ان کو آکاس بیل سے تشبیہ دی ہے۔ اس شعر سے نا صرف 'تنے کا روگ' ظاہر ہوتا ہے بل کہ جان کا ہیدگی کی اصل وجہ بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ ایک اور شعر میں 'زیر آب پودوں' کا ذکر یوں کرتے ہیں:

زیست گزری اپنی زیر آب پودوں کی طرح
پھل لگے ہم پر تو ہم کُچھ اور نیچے ہو گئے (۴۰)

ریاض مجید کی شاعری میں طبّی علوم سے گہرے شغف کا اظہار ملتا ہے۔ 'رحم مادر' گائناکالوجی (کی ایک عام اصطلاح ہے۔ انسانی بچّہ پیدائش سے قبل رحم مادر میں پرورش پاتا ہے۔ رحم مادر حفاظتی غلافوں میں ملفوف ہوتا ہے۔ پیدایش کے وقتِ مقررہ سے پہلے بچّہ ان حفاظتی غلافوں کو پھاڑنے کی صلاحیّت نہیں رکھتا۔ ریاض مجید نے ایمبریالوجی کے اس نکتے کو اپنے ایک شعر میں اس طرح برتا ہے کہ قاری اُن کی دِقّت نظری کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ 'رحم مادر' کی طرز پر 'رحم فضا' کی ترکیب سے شعر آفرینی کا کمال ملاحظہ کیجیے:

رہا ہوں میں سدا رحمِ فضا کا زندانی
کہ مجھ سے بھی یہ غلافِ ہوا نہ پھاڑ ہوا (۴۱)

ریاض مجید کی فکرِ رسا کا انوکھا انداز قابلِ تحسین ہے کہ جس طرح بچّہ رحم مادر میں مقید ہوتا ہے بالکل اُسی طرح انسان زمین پر رحم فضا میں محبوس ہے۔ ہماری زمین کو کرۂ ہوائی نے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ زمین پر بسنے والا ہر انسان ہوا کے سمندر اور زبردست فضائی دباؤ میں سانس لے رہا ہے۔ اس لیے انسان کو ہوا کی مچھلی بھی کہا جاتا ہے۔ کرۂ ہوائی زمین کے چاروں طرف کلر میٹر تک پھیلا ہوا ہے۔ سطح زمین سے کرۂ ہوائی کے محیط تک کی جگہ کو فضا کہتے ہیں، جب کہ کرۂ ہوائی سے باہر کے علاقے کو خلا سے موسوم کیا جاتا ہے۔ خلانورد خلائی جہازوں کے ذریعے اس ہوائی سمندر کے پار جاتے ہیں۔ فضاے بسیط کو چیر کر دوسرے جہانوں تک پہنچنا عام انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ ریاض مجید نے کس مہارت اور سہولت سے ایک ہی شعر میں دو مختلف سائنسز کو یک جا کر دیا ہے اور شعر کی جمالیاتی صورتوں کو مجروح بھی نہیں ہونے دیا۔

ریاض مجید کی شاعری میں دل و دماغ کی قوتیں متحد نظر آتی ہیں۔ خصوصاً دل سے متعلق ان کے اشعار میں ایک خاص جدّت جھلکتی ہے۔ عام طور پر دل کو شاعری کا اور دماغ کو سائنس کا منبع قرار دیا جاتا ہے، لیکن ریاض مجید کی قلبی واردات میں

بھی علمی ریاضت ضرور جھلکتی نظر آتی ہے۔ ریاض مجید کی غزلوں سے چند اشعار پیش خدمت ہیں، جن میں دل کی مختلف حالتوں اور فشارِ خون کا ذکر موجود ہے۔ ایک بات تو یقینی ہے کہ ریاض مجید تمام تر علوم سے کامل شناسائی کے بعد معنوی سطح پر اُن علوم اور اصطلاحات کو اپنی فکر سر باہم آمیحت کر کے نئے طرح کے نتائج مرتّب کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔

یہ بات وضاحت طلب ہے کہ دل کی دھڑکن ہی سازِ ہستی کا نغمہ ہے۔ دل ہی کی بدولت خون پورے جسم میں گردش کرتا ہے۔ مشہور رومی طبیب جالینوس کا خیال تھا کہ خون جسم میں دورہ نہیں کرتا بل کہ مدّو جزر کی حالت میں رہتا ہے۔ بعد ازاں ابن نفیس نے ثابت کیا کہ خون گردش کرتا ہے اور دل خون کی گردش میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ ریاض مجید سائنس دان نہیں ہیں اور نہ سائنسی حقائق کی وضاحت اور بیان اُن کا مقصود ہے۔ وہ ایک شاعر ہیں، جو اپنے گردو پیش پر گہری نظر رکھتے ہیں وہ ایک ادیب اور فن کار ہیں، جو سائنسی شعور رکھتے ہیں اور مختلف اشیا کو اپنے شعری ابلاغ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ ایک طبّی حقیقت ہے کہ ایک شخص کا دل کسی دوسرے شخص کے سینے میں دھڑک سکتا ہے۔ میڈیکل ہسٹری میں انسانی تبدیلیِ قلب کا پہلا کامیاب آپریشن ۳/ دسمبر ۱۹۶۷ء کو جنوبی افریقہ کے ڈاکٹر کرسچین برنارڈ نے کیا۔ ڈاکٹر برنارڈ نے ۲۴ سالہ ڈینس ڈارول کا دل لوئی واشکینسکی کے سینے میں لگا دیا، لوئی کو دو دفعہ ہارٹ اٹیک ہو چکا تھا اور اس کے دل کی حالت بہت مخدوش تھی۔

ریاض مجید کی شاعری میں اُن کے مخصوص فکری نظام کے ابلاغ کے لیے ریاضی اور جیومیٹری کی اصطلاحات بھی ملتی ہیں۔ اِن اصطلاحات کے پیشِ نظر بھی وہ شعری تفہیم کو دو آتشہ کرتے ہیں۔ اُن کا مخصوص انداز ملاحظہ ہو:

میری کاوش نا مکمل میری گردش بے جہت
اپنے محور سے اکھڑ کر ڈولتی پُرکار ہوں (۴۲)

اب میں پھیلاؤ نہیں سمٹاؤ کی منزل میں ہوں
سیدھے خط سی زندگی اب دائرہ ہونے کو ہے (۴۳)

ریاض مجید کے اظہار کا کمال دیکھیے، سیدھے خط کی مناسبت سے پھیلاؤ اور دائرے کی مناسبت سے سمٹاؤ سے نا صرف لف و نشر مرتّب کی خوبی پیدا ہو گئی ہے بل کہ حیاتیاتی چکر کی ریاضیاتی تشریح سے معانی کے آفاق مزید پھیل گئے ہیں۔

زمین ایک بہت بڑے مقناطیس کی مانند ہے۔ اِسی کششِ ثقل کے باعث روے زمین پر تمام اشیا قیام پذیر ہیں۔ ریاض مجید کی شاعری میں طبیعیات کے مسائل و مضامین کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ انعکاسِ نوراور حرکتِ اضافی اور فریب نظر جیسے مظاہر کی جھلک ان اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے۔ واضح رہے کہ ریاض مجید نے اِن سب سائنسی اُصولوں اور قوانین کو شعری جہات کے تابع کرتے ہوئے انوکھی اور حیرت انگیز معنوی اُپج پیدا کی ہے:

سفر ہے بس کا کہ جنگل ہَوا کے دوش پہ ہے
ہمارے ساتھ درختوں کا بھاگنا کیسا؟ (۴۴)

آواز کے خواص کا مطالعہ طبیعیات کی ایک اہم شاخ ہے۔ چوں کہ آواز بھی توانائی کی ایک قسم ہے اس لیے قانون بقاے توانائی کے مطابق آواز کی لہریں کبھی فنا نہیں ہوتیں صرف شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ فضا میں علم آوازوں کا ریکارڈ سدا موجود رہتا ہے۔ آئنو فون جیسے آلات کی مدد سے پلازمہ میں آواز کی لہروں سے پیدا ہونے والے ارتعاشات کو برقی اشارات میں تبدیلی کیا جاسکتا ہے اور برقّی اشارات کو واپس آواز کی لہروں میں بدلا جاسکتا ہے۔ آواز کی ان خواص کے پیشِ نظر ریاض مجید نے، جو شعر آفرینی کی ہے وہ قابلِ داد ہے۔ آج کے انسان کے ہاتھوں پیدا ہونے والی تباہ کاریاں، جو لمحہ بھر میں دنیا کو تہہ و بالا کرنے کا سامان دوسروں کے خلاف اپنے دفاع کے نام پر پیدا کر رکھے ہیں، ایک خبر دار کرنے والی کڑی حقیقت ہے، جس کا ریاض مجید ادراک رکھتے ہیں۔ چناں چہ ابتداے آفرینش سے متعلق نظریات میں ایک مقبول عام سائنسی نظریہ عظیم دھماکے کا ہے۔ انجامِ کائنات سے متعلق بھی مختلف نظریات ہیں۔ ایک مہیب چنگھاڑ یا ایک اور عظیم دھماکہ۔ انسان کے ہاتھوں ہونے والی ایسی تباہ کاریاں اوران کی گونج ریاض مجید کے اس شعر میں ملاحظہ ہو:

ہوشیار و ہوشیار و ہوشیار و ہوشیار
اِک دھماکے سے یہ ڈھانچہ ناگہاں گرنے کو ہے (۴۵)

انسانی زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو اور علم کا دائرۂ کار ہوگا، جہاں ریاض مجید اپنے مخصوص انداز میں فکر نو کے جہانِ تازہ تخلیق کرتے دکھائی نہ دیتے ہوں۔ علم فلکیات اور علمِ نجوم و ہیٔت کے مضامین کے بیان سے ہماری کلاسیکی شاعری مالا مال ہے۔ ریاض مجید کی متنوع فکر میں بھی سورج اور دیگر اجرامِ فلکی کا ذکر ملتا ہے۔ ریاض مجید کے ان اشعار میں ایک نئی شان اور تازہ فکر کا احساس ملتا ہے۔

غزل کے مزید اشعار میں تھکا ہوا سورج، پگھلتا سورج، ٹھنڈا سورج اور کھولتا ہوا سورج جیسے اشارات محض شعری تراکیب نہیں بل کہ واقعتاً سورج کی مختلف صفات ہیں۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ سورج بڑی تیزی سے توانائی خارج کر رہا ہے اور ایک دن یہ جلتا ہوا سورج بجھ کر ختم ہو جائے گا۔ سر جیمز جینز کا مشہور مضمون ''مرتا ہوا سورج'' سورج کے احتراق کے اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سورج سے آنے والی بالائے بنفشی شعاعیں زمین پر بسنے والے تمام جانداروں کے لیے مہلک ثابت ہوسکتی ہیں۔ زمین کے گرد اوزان کی حفاظتی تہہ ان شعاعوں سے زمین کو محفوظ رکھتی ہے۔ فضائی آلودگی کے باعث اس حفاظتی تہہ میں شگاف پڑ رہے ہیں، جس کے نتیجے میں زمین پر زندگی سخت خطرات سے دوچار ہو جائے گی۔

'سرد دھرتی' اور 'ٹھنڈا سورج' کے اشارات بھی بہت دل چسپ ہیں۔ زمین کی آفرینش سے متعلق یہ نظریہ بہت عام ہے کہ یہ پہلے سورج ہی کا ایک حِصّہ تھی۔ ایک زبردست دھماکے کے باعث سورج کا یہ حِصّہ بہت دور جا پڑا اور رفتہ رفتہ سرد

ہو گیا۔ ' ٹھنڈا سورج ' کی ترکیب اسی عمل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اسی طرح 'کھولتے خورشید ' کی ترکیب بھی معنی خیز ہے۔ سورج ہیلیم اور دیگر گرم گیسوں کا گولہ ہے۔ سورج میں بروقت مسلسل آتش فشانی کا عمل ہوتا رہتا ہے، سورج سے روشنی اور حرارت شمسی توانائی کی صورت میں زمین پر پہنچتی ہے، لیکن عمل احتراق سے پیدا ہونے والے دھماکوں کی آواز خلا سے نہیں گزر سکتی۔ اس لیے ہمیں وہ آواز سنائی نہیں دیتی۔

ریاض مجید کی شاعری میں علم کائنات کے بہت سے اشارات اُن کے ہر شعبے میں مطالعے کا بیّن ثبوت ہیں۔ وہ جب کسی موضوع پر بات کرتے ہیں، تو ایسا لگتا ہے کہ یہ شخص اِسی شعبۂ زندگی کے متعلق کئی سالوں سے خدمات انجام دیتا رہا ہے، لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ یہ اُن کا وسیع مطالعہ ہے، جو اُن سے جا بجا ایک مخصوص نقطۂ نظر میں شعر کہلواتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں پیش آمدہ اندھے خلاؤں اور تیرہ گپھاؤں جیسے اشارات اُن کے کائناتی شعور کی دلیل ہیں۔ یہ شعر بہ طورِ مثال دیکھیے:

آنکھ تک جھک آئی ہے اندھے خلا کی تیرگی
اپنے سر پہ اب روائے آسماں تک بھی نہیں (۴۶)

زمیں کی کشش، گردشِ سیّارگاں، خلا کی بیکراں وسعت اور اس نوع کے بیسیوں اشارات ریاض مجید کی شعری کائنات کا حِصّہ ہیں۔ اس طبیعی کائنات میں ہر شے تغیّر پذیر ہے، سوائے روشنی کی رفتار کے۔ روشنی کی رفتار ہی ہے۔ بظاہر قریب قریب نظر آنے والے ستارے اور دیگر اجرامِ فلکی حقیقت میں ایک دوسرے سے بہت دور ہوتے ہیں۔ ان اجسام کے مابین فاصلے کو کلومیٹروں میں ماپنا قریباً ناممکن ہے۔ اس لیے ستاروں کے مابین فاصلے کو نوری سالوں سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ روشنی کی رفتار ہے۔ نوری سال وہ فاصلہ ہے، جو روشنی ایک سال میں طے کرتی ہے۔ ریاض مجید کی شاعری میں 'روشنی کی رفتار' اور 'نوری سالوں' کا ذکر متعدد اشعار میں موجود ہے:

نور کی رفتار سے بھاگوں تو ہاتھ آئے نہ وہ
جا چکا ہے دور ، اتنی دور ، وہ کھویا ہوا (۴۷)

کائنات میں تیز ترین رفتار روشنی کی ہے۔ بعض ستارے صدیوں پہلے جل بجھے ہیں، لیکن ان کی روشنی ابھی تک زمین پر نہیں پہنچی۔ جن ستاروں کو ہم اِمشنب فروزاں دیکھتے ہیں ان کی روشنی صدیوں پہلے عازمِ سفر ہوئی تھی، جو آج ہم تک پہنچ رہی ہے۔ اس روشن حقیقت کو ریاض مجید نے شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ زمان و مکان اور نور کے ارتکاز کے اس نظریے کی جھلک ریاض مجید کے اس شعر میں ملاحظہ کیجیے:

مکاں کو پھیلتے دیکھ اور ”زماں“ کو بڑھتے ریاضؔ
کبھی نہ تھکتے سدا روشنی کو چلتے دیکھ (۴۸)

یہ ایک سائنسی حقیقت ہے کہ زمین سورج کے گرد اپنے مدار میں گردش کرتی ہے اور اپنے محور کے گرد بھی گھومتی رہتی ہے۔ زمین خلاے بیکراں میں، جس طرح حرکت کر رہی ہے، قرآن مجید نے اسے 'جھولے' سے تشبیہ دی ہے۔

ریاض مجید نے اس قرآنی حقیقت کو جسے سائنس بھی تسلیم کر چکی ہے۔ بڑے لطیف پیرایے میں بیان کیا ہے۔ ایک غزل کا شعر ملاحظہ کیجیے:

زمیں کے تختے سے چمٹے تلاش ساحل میں
مجھے خلا کے سیہ پانیوں پہ چلتے دیکھ (۴۹)

مصوّری اور تصویر سازی اور فلم سازی کا شمار سائنسی فنون میں ہوتا ہے۔ ریاض مجید نے 'آب کیمیا' اور 'سلولائیڈ' جیسی اصطلاحوں کو بڑی مہارت سے شعری صورت میں پیش کیا ہے۔ 'قیدِ حیات وبندِ غم' کا مضمون اُردُو شاعری کا ایک سکّہ بند موضوع ہے۔ شعرا نے اس مضمون میں بڑی نکتہ آفرینیاں اور جدّت طرازیاں کی ہیں۔ خصوصاً مرزا غالب نے اِس حوالے سے نہایت فکر انگیز باتیں کی ہیں، لیکن جو خوبی ریاض مجید کے اس شعر میں موجود ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ گویا مٹّی کے پتلے کو جب غم کے آب کیمیا میں ڈبویا گیا، تو اس کے خد و خال ابھر آئے۔ یہ معمولی سے غیر معمولی بن گیا۔ علمِ کیمیا کی رو سے لوہے اور چاندی جیسی کمتر دھاتوں کے سونے جیسی برتر دھات میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ شاعر نے غم کے پانی کی کیمیا گری کو بھی ملحوظِ خاطر کھا ہے اور ڈارک روم میں تصویر کے نیگیٹو کو سلو نائٹریٹ کے محلول میں ڈالنے پر شبیہ سازی کے عمل کو بھی پیش نظر کھا ہے۔

اس طرح یہ شعر بیک وقت شعری جمالیات اور سائنسی شعور کا بہترین نمونہ قرار پاتا ہے۔ ریاض مجید کے متنوع اور ہمہ گیر مطالعے کے ضمن میں ہونے والا درج بالا بین العلومی مطالعہ یقیناً اُنھیں معاصر شعری ادب میں ایک وقعت اور اعتبار عطا کرتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ریاض مجید نے سائنسی اور سماجی علوم کے مطالعے سے کشید شدہ اصطلاحات اور معلومات کو اپنے مربوط فکری نظام اور انسانی زندگی کے مسائل کی پیش کش کے لیے استعمال کرتے ہوئے ایک جہانِ معنی تخلیق کیا ہے، تو بے جا نہ ہوگا۔ اُن کی شاعری کا یہ اجمالی جائزہ صرف غزلیات کے ابتدائی تینوں مجموعوں پر محیط ہے۔ یہ مجموعہ ہاے غزل زمانی اعتبار سے ریاض مجید کی شاعری کا اوّلین دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ نصف صدی سے زائد عشرے قبل کی غزلیات کے ان اشعار سے ریاض مجید کی تخلیقی اٹھان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تادمِ تحریر ریاض مجید پہلے سے زیادہ فنی پختگی اور گہرے سائنسی شعور کے ساتھ عروسِ غزل کی مشاطگی میں اپنا پر مغز کردار ادا کر رہے ہیں۔ بلاشبہ ریاض مجید اُردو شاعری کے معاصر منظر نامے میں ایک

نابغۂ روز گار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے اُس عہد میں غزل کو، جو فکری اعتبار عطا کیا ہے، آگے چل کر وہ اِس حوالے سے ہمیں بامِ عوج پر دکھائی دیتے ہیں۔

ریاض مجید کی غزل گوئی کے تجزیے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے کلام کے ابتدائی نمونوں سے اُن کی حالیہ غزل گوئی تک میں ایک بتدریجی ارتقاہے 'پس منظر ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ تھا، جو رومانی شاعری سے عبارت ہے۔ اس میں آغاز شباب کے وہ شعری مجموعہ تھا، جو رومانی شاعری سے عبارت ہے اس میں آغاز شباب کے وہ شعری تجربے ہیں، جنھیں کلاسیکی غزل کے حوالے سے 'غمِ جاناں' سے تعبیر کیا جاتا ہے 'گزرے وقتوں کی عبادت' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کھوئے ہوؤں کی جستجو اور رفتگاں کی سرگزشت کے فکری عناصر رکھتا ہے جب کہ 'ڈوبتے بدن کے ہاتھ' ملکی، قومی اور ملیّ مسائل سے بھرپور تجربوں کا عکاس نظر آتا ہے۔ یہ غزل گوئی کا وہ اندازہ ہے، جسے 'غمِ درواں' سے تعبیر کیا جاتا ہے، یوں ریاض مجید کی غزل 'غمِ جاناں' سے 'غمِ درواں' کی طرف سفر کرتی نظر آتی ہے۔ یہ موضوعاتی یا فکری تفہیم صرف افہام و تفہیم کے لیے ورنہ پندرہ بیس سالوں میں لکھی گئی اس شاعری میں افکار کے سبھی رنگ ملے نظر آتے ہیں۔ یعنی پس منظر میں کئی شعر ملکی احوال نامے کے ترجمان نظر آتے ہیں اور 'ڈوبتے بدن کا ہاتھ' میں بھی بہترین رومانی شعر مل جاتے ہیں۔ ان تینوں مجموعوں میں موضوعاتی تنوع کے متفرق نمونے دیکھیے:

☆... پس منظر

☆... گزرتے وقتوں کی عبارت

☆... ڈوبتے بدن کا ہاتھ

'خاک' ریاض مجید کا چوتھا مجموعہ ہے، جو پہلے تین مجموعوں کے قریباً ربع صدی بعد شایع ہوا۔ اس مجموعے کی غزلوں میں ماضی کے سبھی تجربے ایک مہارت اور پختگی کے ساتھ اظہار پذیر ہوتے ہیں، ان غزلوں میں شاعر کا تجربہ مہارت اور پختہ کاری کا ترجمان ہونے کے ساتھ جدّت اور ندرت کا حامل بھی ہیں۔

'خاک' کی شاعر جہاں ایک طرف شاعر کی غزل سے وابستگی کی علامت ہے، وہاں اپنے معاصر شعری میلانات کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں ان غزلوں میں رومان، زمانہ، سیاسی انتشار، زوال امّت کا گریہ، اخلاقی قدروں کا زوال، خیر اور شایستگی جھلکیاں، یعنی کم و بیش تمام شعبہ ہاے حیات کے تناظر میں زندگی کے آشوب کا بیان ملتا ہے۔ خاک کے درج ذیل مختلف شعر اسی بیان کی تصویریں پیش کرتے ہیں۔

خاک:

O ’خاک‘ کے بعد کی شاعری کو،جو زیر ترتیب طبع ہے تین درج ذیل مجموعوں میں ترتیب دیا گیا ہے۔

O ’کہیں اور‘ یہ غزل کی کتاب ہے،جو ان دنوں زیر اشاعت ہے۔اس کی غزل ’خاک‘ ہی کے فکری بیانیے کی توسیع ہیں اور اس کے مضامین بھی کم و بیش معاصر شاعری کے فکری میلانات کا عکس ہیں۔

O ’مدار سے نکلے ہوئے‘ریاض مجید کی غزلوں کی ایک اور کتاب ہے۔ اسے ریاض مجید کی غزلوں کا چھٹا مجموعہ کہہ سکتے ہیں اس میں زیادہ تر غزلیں رومانی انداز کی ہیں یہ غزلیں جداگانہ حیثیت رکھتے ہوئے بھی ایک ہی فکری کُل کا جز لگتی ہیں۔

O ’جزدان‘ ریاض مجید کا ساتواں مجموعہ غزل ہے۔یہ اپنی نوعیت کا مختلف مجموعہ ہے،جو چار چار، تین تین،اور دو دو کے تین حِصّوں پر مشتمل ہے۔اُنھیں ریاض مجید کی غزلوں کی باقیات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے،ان کی وہ غزلیں،جو کسی وجہ سے مکمل ہو سکیں جزدان میں شامل ہیں۔اُنھوں نے دست یاب نامکمل غزلوں کو تین حِصّوں میں الگ الگ جمع آوری کی چار اشعار سے زائد یعنی پانچ شعروں کی غزلوں کو اُنھوں نے ’مدار سے نکلے ہوئے‘ مجموعے میں شامل کیا ہے اور باقی چار چار، تین تین اور دو دو شعروں والے غزلیہ ٹکڑون کو ’جزدان‘ میں شامل کر لیا ہے۔یہ کتاب کافی ضخیم ہے دو تین مجموعوں کے برابر ہے۔

O ’فردیات‘ کے نام سے ریاض مجید کا ایک اور مجموعۂ غزل ہے،جو قریباً تین ہزار اشعار پر مشتمل ہیں ’فردیات نگاری‘ ریاض مجید کا ایک پسندیدہ شعری شغل ہے۔اُنھوں نے اپنے اکثر شعری تجربوں کو ایک ایک شعر میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ان کا یہ کلام ’کُلیّاتِ فردیات‘ کی صورت میں جمع ہونے جا رہا ہے۔اس کا ایک حِصّہ ’وہ‘ کے نام سے افشین شوکت نے مُرتّب کر کے شایع کر دیا ہے۔

واضح ہو کہ ان کی غزلوں کے یہ حِصّے کہیں اور مدار سے نکلے ہوئے اور فردیات کے نام سے پائلٹ ایڈیشن میں موجود ہیں۔یعنی ان کمپوز شدہ مسودہ چھپنے سے قبل کی حتمی صورت میں موجود ہے اور کسی وقت بھی شایع ہو سکتا ہے۔ یہاں ان کتابوں کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ ریاض مجید کی غزل کے حجم اور نوعیت کو سمجھنے کے لیے ان کی مطبوعہ کتابوں کے ساتھ ان پائلٹ ایڈیشنوں کی نشان دہی بھی ضروری تھی،یوں ریاض مجید کی غزلوں کا کل سرمایہ قریباً آٹھ مجموعوں پر مشتمل ہے۔ریاض مجید کی غزلوں میں سے ’گزرے وقتوں کی عبارت‘ اور ’خاک‘ کا ایک ایک ایڈیشن اور بھی شایع ہوا ’گزرے وقتوں کی عبارت‘ مکتبۂ دین و دنیا لکھنو سے ۱۹۷۸ء میں شایع ہو گی،جب کہ ’خاک‘ کا دوسرا ایڈیشن قرطاس فیصل آباد سے ۲۰۱۶ء کو شایع ہوا۔

ریاض مجید کی غزل گوئی کے حوالے سے مصروف اساتذہ فن اور ان کے معاصر شاعروں کے تاثرات درج ذیل ہیں۔

۱۔	فلیپ	گزرتے وقتوں کی عبارت	احمد ندیم قاسمی
۲۔	ایضاً	ڈوبتے بدن کا ہاتھ	شہزاد احمد، سجاد باقر رضوی
۳۔	تبصرہ	ایضاً	لالہ صحرائی (رسالہ سہ ماہی سیارہ، لاہور)
۴۔	ایضاً	خاک	مقصود عاقل (رسالہ سہ ماہی سیارہ، اسلام آباد)
۵۔	تبصرہ	گزرے وقتوں کی عبارت	احسان اکبر
۶۔	ایضاً	ڈوبتے بدن کا ہاتھ	انور محمود خالد، سیپ، کراچی
۷۔	ایضاً	پس منظر	سلیم بیتاب، دانش، فیصل آباد
۸۔	مضمون	ایضاً	ایضاً
۹۔	مضمون	ڈوبتے بدن کا ہاتھ	پروفیسر یعقوب مظہر گل

ریاض مجید نے شاعری کا آغاز کالج کے زمانے میں غزل گوئی سے کیا۔ خصوصاً ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء تک گورنمنٹ کالج میں، جب وہ بی اے سہ سالہ آنرزان لینگوا یجز کے طالب علم تھے، اُنھوں نے پاکستان کے مختلف شہروں میں منعقد ہونے والے بین الکُلیّاتی مشاعروں میں کالج کی نمایندگی کی ان دنوں تعلیمی اداروں کی سالانہ تقریبات میں حُسنِ قرات اور اُردو، انگریزی پنجابی مباحثوں کے ساتھ مشاعرں کا بھی چلن تھا۔ عام طور پر کسی مصروف شاعر یا اساتذہ کی غزل کا ایک مصرع طرح کے طور پر مختلف کالجوں سے میں بھیج دیا جاتا اسی طرح کسی موضوع پر نظم کے لیے کوئی عنوان دے دیا جاتا کالج سے دو دو شاعروں کی ٹیم ان مشاعروں میں شرکت کرتی غزل اور نظم کے دو دور ہوتے، جن میں بہتر نمایندگی کرنے والے شاعروں کو اوّل، دوم اور سوم انعام دیے جاتے اور بہ حیثیت مجموعی کارکردگی کی حامل ٹیم کو ٹرافی دی جاتی۔ ریاض مجید اِن دو سالوں کی ادبی کارکردگی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''میں نے اُن سالوں میں بیسیوں مشاعروں میں شرکت کی اور مختلف تعلیمی اداروں میں اپنے کالج کی نمایندگی کی اور متعدد انعامات اور ٹرافیاں حاصل کیں۔ اِس سب کی مختصر روداد 'کالج کے شب وروز' کے عنوان سے گورنمنٹ کالج کے علمی و ادبی مجلّہ روشنی (شمارہ ۱۹۶۳ء) میں موجود ہے۔'' (۵۰)

ریاض مجید کے مطابق ریاض احمد شیخ کے لکھے گئے اس مضمون میں ان کالجوں کا ذکر ہے، جہاں سے ریاض مجید نے یہ انعام حاصل کئے۔ اُس دور کے وہ شاعر جنہوں نے کالجوں کے مشاعروں کی روایت سے شہرت حاصل کی ان میں محمود شام،

سرمد صہبائی (گورنمنٹ کالج لاہور) سجاعت علی راہی، اسلم فیضی (کوہاٹ) سلیم بیتاب، عدیم ہاشمی (اسلامیہ کالج، لائل پور) تبسم کاشمیری، گوہر کوشاہی (اسلام کالج سول لائنز لاہور) عقیل احمد ادبی، حسین سحر، اقبال ارشد، گورنمنٹ کالج...(ملتان) کئی شاعر ہیں ۔ریاض مجید نے اپنی شاعری کے اوّلین مظاہرے اِنھی بین الکلیّاتی مشاعروں میں کیے ۔ایسے مشاعروں میں 'شمعِ تاثیر' کے نام سے اسلامیہ کالج سول لائینز لاہور اور 'مینائے نشور' کے نام سے گورنمنٹ کالج لائل پور کے مشاعرے بہت مصروف تھے۔ خصوصاً شمعِ تاثر کے مشاعرے کی اپنی ایک روایت تھی اور اُس میں کالجوں کے مشاعروں کی مِعیار شناسی کے لیے ملک کے مصروف شاعر تشریف لاتے تھے۔ اُس مشاعرے نے ساٹھ کی دہائی میں ایک رُجحان ساز ادارے کی حیثیت حاصل تھی۔ اُس کا انتظام پروفیسر سجاد باقر رضوی کے سپرد ہوتا تھا۔

کالجوں کے ساتھ ساتھ ریاض مجید نے شہر کے مشاعروں میں شرکت کا آغاز بھی اِنھی سالوں میں کیا جگر مراد آبادی کی وفات پر لائل پور ٹاؤن ہال میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا، جس میں ریاض مجید نے پہلی بڑی معلوم شرکت کی۔ اس میں صدر چوہدری منظور احمد منظور اور سٹیج سیکرٹری مدیر عوام خلیق قریشی تھے۔ اُنھوں نے، جو غزل پڑھی اس کے دو شعر درج ذیل ہیں:

بڑے اُداس ، بڑے سوگوار گزرے ہیں
ترے بغیر جو لیل و نہار گزرے ہیں
تمہاری صورت زیبا تو ہم نہ دیکھ سکے
تمہارے کوچے سے ہم بار بار گزرے ہیں (۵۱)

کالج ہی کے زمانے میں ریاض مجید کو خوش قسمتی سے پروفیسر مرزا محمد منور کے زیر اہتمام گروپ میں مسلسل دو سال شرکت کا موقعہ ملا۔ اُن دنوں ایک گھنٹہ طلبہ کی تہذیبی و ثقافتی اور علمی و ادبی صلاحیّتوں کی نشو و نما اور اظہار کے لیے وقف ہوتا اس میں سائنس اور آرٹس کے طلبہ مختلف جماعتوں سے ہفتہ میں ایک بار ملتے وہ طالب علم، جو تخلیقی صلاحیّتوں کے حامل ہوئے ان میں اپنی غزل، نظم یا افسانہ سناتے اس گروپ میں بھی ریاض مجید کو اپنی غزلیں سنانے کا موقع ملا۔

ریاض مجید نے گورنمنٹ کالج سے بی اے آنرز کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا وہ پنجاب یونی ورسٹی میں اوّل آئے اور اُنھوں نے وظیفہ حاصل کیا، جب وہ ایم اے (اُردُو) کے لیے ستمبر ۱۹۶۳ء میں یونی ورسٹی اوریئنٹل کالج لاہور پہنچے، تو بہ حیثیت ایک طالب علم شاعر کے طور پر ان کی شناخت کا آغاز ہو چکا تھا اوریئنٹل کالج سے اُنھوں نے متعدد بین الکلیّاتی مشاعروں میں شرکت کی اور متعدد انعامات اور ٹرافیاں حاصل کیں ۔لاہور کے علمی و ادبی حلقوں میں شرکت اور مصروف شاعروں سے ملاقاتوں نے میرے شعری ذوق کی آبیاری کی۔ ۱۹۶۴ء میں مجھے ریڈیو پاکستان لاہور کے سینئر شاعروں کے ساتھ مشاعرہ پڑھنے کا بھی موقع ملا۔ میرے ماموں حمید جالندھری (مالک مکتبہ کارواں) کے تعلق اور رابطے سے مجھے اپنے لاہور کے

قیام میں کم و پیش تمام شاعروں سے ملاقات کا موقع ملا۔ میں نے متعدد مشاعروں میں شرکت کی اور یوں ایک شاعر کے طور پر میری شناخت مستحکم ہوئی۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب ریاض مجید کے ماموں حمید جالندھری کی بدولت پیدا شدہ تعلق کی بدولت ریاض مجید کی تخلیقات ادبی جرائد میں بھی چھپنی شروع ہوئیں۔ یوں وقت کے ساتھ ساتھ اُن کی شہرت کے پر پُرزے نکلنے لگے اور ایک شاعر کے طور پر آپ ملکی سطح پر متعارف ہوتے گئے۔

ریاض مجید کی غزلوں کے مجموعے:

ریاض مجید کی غزلوں کے اب تک چھے مجموعے شایع ہو چکے ہیں ہم یہاں کتاب وار ان کا مختصر تعارف پیش کرتے ہیں

۱۔ پس منظر: یہ ریاض مجید کا پہلا مجموعہ غزل ہے جس میں اُن کی غزلیں شامل ہیں۔ ان کا یہ کلام جیسا کہ اُنھوں نے آغاز کتاب میں نشاندہی کی ہے ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء تک کی غزلوں پر مشتمل ہے۔

۲۔ گزرتے وقتوں کی عبارت: یہ ریاض کا دوسرا مجموعہ غزل ہے ،جو ۱۷/ مئی ۱۹۷۳ء میں شایع ہوا۔اِس میں اُنسٹھ(۵۹) غزلیں شامل ہیں۔

۳۔ ڈوبتے بدن کا ہاتھ: یہ ریاض مجید کا تیسرا مجموعۂ غزل ہے۔ اِس شامل غزلوں کی تعداد ۱۰۱ ہے۔ یہ جو ۱۷/ مئی ۱۹۷۳ء سے جو ۳۱/ مئی ۱۹۷۴ء تک کے زمانے کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان نظموں کا نمایاں حِصّہ سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے ہے۔ اِس کے فلیپ پر شہزاد احمد اور وزیر آغا کے تاثرات ہیں۔

۴۔ خاک: ریاض مجید کا چوتھا مجموعہ غزل ہے اس میں غزلوں کی تعداد ۸۸ ہے۔ یہ مجموعہ جو ۲۷/ مارچ ۲۰۱۶ء میں شایع ہوا۔

۵۔ کہیں اور: یہ ریاض مجید کی غزلوں کا پانچواں مجموعہ ہے۔ یہ خاک کے بعد کی غزلیں ہیں، مگر اِن میں کُچھ غزلیں پہلے زمانے کی بھی ہیں، جو اس کتاب کی اشاعت کے وقت غیر مطبوعہ رہی۔

۶۔ مدار سے نکلے ہوئے: اِس مجموعے میں غزلیں ہیں، جو ابھی تک منصۂ شہود پر نہیں آئی۔

درج بالا مجموعہ ہائے غزل کے علاوہ، ریاض مجید کے دو زیرِ ترتیب ضخیم مجموعہ ہائے غزل بھی شامل ہیں۔ ایک مجموعہ ''جُزدان'' کے نام سے ہے، جس میں اُن کی وہ غزلیں شامل ہیں ،جو اب تک کسی غزلیہ مجموعے کا حِصّہ نہیں بنیں۔ اِن دونوں مسودوں کے بارے میں اُنھوں نے انٹرویو میں بتایا کہ غزلوں کی کُچھ کتابوں کی اشاعت کے بعد میری توجّہ دوسری کتابوں کی ترتیب و اشاعت کی طرف رہی میں نے اپنی شاعری کے ابتدائی نمونے اور پہلی غزلیں 'شروعات' کے نام سے ایک مسودہ

ہے۔اِسی طرح غزلوں کے حوالے سے باقی تمام اشعار 'جُزدان' کی فائل میں جمع کر دیے ہیں۔اُن میں پانچ پانچ، چار چار، تین تین اور دو دو کے عنوانات سے چار حِصّوں میں سیکڑوں نامکمل غزلوں کے اشعار ہیں۔اکیلے شعروں کی تعداد بھی ہزاروں میں ہے اُنھیں 'فردیات' کے عنوان سے جمع کیا ہے۔اب چوں کہ توجُّہ غزل سے ہٹ کر دوسرے کئی کاموں کی طرف ہو گئی ہے،لہٰذا غزل کے اشعار اور مجموعوں کی جمع آوری ترجیحات میں نمایاں نہیں۔ غزل میں اب بھی کہتا ہوں ،مگر کبھی کبھار۔جہاں تک اِس صنف سے وابستگی کا تعلق ہے،وہ بدستور ہے۔میری ہی نہیں آج کی حمد و نعت و مناقب کا بڑا حِصّہ بھی غزل ہی کی صنف میں ہو رہا ہے۔

ریاض مجید کی غزلوں کی وہ تعداد،جو مطبوعہ مجموعوں کی صورت میں دست یاب ہے۔اُس کا" اشاریہ غزل ریاض مجید" مبشرہ فریاد نے مُرتّب کیا ہے۔ بیش تر اِس کے اُن کی غزل کے فکری اور فنّی پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے، اُن مطبوعہ کتب ورسائل کی نشان دہی بے محل نہ ہو گی،جو غزل کے حوالے سے شایع ہوئیں اور جن کے ذریعے سے ریاض مجید کی غزل گوئی کی ملک گیر سطح پر پذیرائی ہوئی۔

O آٹھ غزل گو: یہ کتاب جاوید شاہین نے ۱۹۶۸ء میں مکتبہ لائبریری کی طرف سے شایع کی۔اِس میں جن شاعروں کے کلام کے نمونے شامل ہیں،اُن میں کشور ناہید،انور شعور،اقبال ساجد،عبید اللہ علیم۔

O فنون (غزل نمبر): احمد ندیم قاسمی کے معروف رسالہ فنون کا غزل شایع ہوا۔یہ ضخیم نمبر دو جلدوں پر مشتمل ہے۔اِس میں ریاض مجید کی غزلیں شامل ہیں۔

O نیرنگ خیال(غزل نمبر):سلطان رشک کے زیرِ اہتمام اس غزل نمبر میں بھی ریاض مجید کی غزلیں شامل ہیں۔

O البم:ذوالفقاراحمد کے زیرِ اہتمام مُرتّب ہونے والے اِس مجموعۂ غزل میں بھی ریاض مجید کی غزلیں شامل ہیں۔

ریاض مجید کے مجموعۂ کلام "خاک" کا فنی و فکری جائزہ

"ریاض مجید" مبدل بہ زمانہ اُسلوب کا پیش رو:

ہر بڑا شاعر اپنے عہد سے کُچھ نہ کُچھ حد تک ضرور متاثر ہوتا ہے، مگر اس کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنی شخصیت اور فکر و فن کے حوالے سے ایک عہد کو بھی متاثر کرتا ہے۔اس کے سوچنے کا انداز اور اس کا شعری اُسلُوب ایک نسل کو بہر حال متاثر ضرور کرتا ہے۔اِسی طرح ایک بڑا شاعر اپنے عہد سے نہیں بل کہ اُس کا عہد اُس کی ذات سے پہچانا جاتا ہے۔اُردو زُبان وادب کی اگر صدیاں قائم کی جائیں،تو اٹھارویں صدی کا نمایندہ شاعر ہونے کا اعزاز میر تقی میرؔ کو حاصل ہے۔میرؔ کی

شاعری میں فکر و نظر ایک مخصوص انداز ہے ،جو دوسے لوگ سے بالکل مختلف چیز ہے،جو اُن کے مخصوص شعری نظام کے ساتھ اُنھیں امتیاز عطا کرتا ہے۔میرؔ کی اِسی کیفیت کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سیّد عبداللہ رقم طراز ہیں:

''میر کے فکر و نظر کے انداز گویا جنون و شعور سے ملے جلے انعکاسات ہیں،جن کی وجدانی تجلیات سے عقل فتنہ تراش کو بھی انکار نہیں اور اُن کے یہاں سوچ اور عقلی دلیل کی صورتیں بھی قابلِ توجّہ حد تک موجود ہیں۔وہ جذباتِ غم کے مصوّر ہونے کے باوجود فطرت کے مشاہدات کے بے نظیر مصوّر بھی تھے اور اِن سب باتوں کے ساتھ اُنھوں نے زندگی کے حقائق پر بھی غور کیا ہے،جس کا ثبوت اُن کی شاعری سے مہیا ہوتا ہے۔'' (۵۲)

میرؔ کے بساطِ شعری پر منفرد اثرات مُرتّب کرنے کے بعد انیسویں صدی غالبؔ کی صدی ہے۔غالب اِس صدی کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔اس بات کا بین ثبوت یہ ہے کہ غالبؔ نے ایک ہی عہد کو نہیں بل کہ آنے والے تمام زمانوں کو متاثر کیا ہے۔پروفیسر حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

''اُردُو شاعروں میں غالب کے کلام سے زیادہ کسی کے کلام کی قدر نہیں ہوئی۔دیوانِ غالب سے زیادہ کوئی دیوان نہ پڑھا گیا،نہ سمجھا گیا،نہ سمجھایا گیا،نہ چھاپا گیا اور یہ ،جو کُچھ ہوا بالکل بجا ہوا۔اُنیسویں صدی کا کوئی شاعر غالب سے زیادہ قدر دانی کا حق دار نہ تھا۔'' (۵۳)

مرزا غالب کو اللہ تعالیٰ نے ،جو شہرت اور قبولیت عطا کی ہے،وہ کسی اور شاعر کو آج تک نصیب نہ ہو سکی۔اُن کے بعد آنے والا شاید ہی کوئی شاعر ہو گا،جو فکرِ غالب کا خوشہ چین نہ ہوا ہو۔وہ اُردو شاعری کے لافانی شاعر کی حیثیت سے اپنی صلاحیّتوں کا بہت زمانہ پہلے لوہا منوا چکے ہیں۔اگر اُردو غزل گو شعرا غالبؔ تتبع میں اشعار نہ بھی کہیں،تو بھی وہ غالبؔ کے اثر سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے۔

مرزا غالب کے اُردو شاعری پر اَن مٹ نقوش چھوڑنے کے بعد اُردو شاعری کو چار چاند لگانے والا شاعر اقبال کی صورت میں اُفقِ شعری پر نمو دار ہوتا ہے۔ناقدینِ فن نے اقبال کو بیسویں صدی کا عظیم اور سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے۔اقبال کی شاعری اپنی ذات کے اعتبار سے ،جو انفرادیت رکھتی ہے ،اُس سے قطع نظر غالب سے اکتسابِ فیض کے ضمن میں شیخ عبدالقادر بانگِ درا کے دیباچے میں بڑی دل چسپ بات لکھتے ہیں:

''غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا،تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اُردو اور فارسی کی شاعری سے،جو عشق تھا،اُس نے اُن کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افراز ہو کر شاعری کے چمن کی آب یاری کرے،اور اُس نے پنجاب کے ایک گوشے میں،جسے سیالکوٹ کہتے ہیں،دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔''(۵۴)

درج بالا ہر صدی میں کسی نہ کسی عظیم شاعر نے اُردو شاعری کو عالمی سطح پر اعتبار عطا کیا ہے۔اب دیکھیے اکیسویں صدی میں اپنے اسلاف کی لاج کون رکھتا ہے۔اس کے متعلق تاحال کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی، مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اب شاید کوئی عبقر العباقر اور افصح الفصحا کے پیدا ہونے کا امکان اس لیے نہیں ہے کہ زمانے کے مقتضیات اور ماحول کے لوازمات بدل چکے ہیں اور اب دنیا کے ایک کونے میں آنے والا نیا فیشن یا اُسلُوب چشمِ زدن میں ساری دنیا میں اس قدر برق رفتاری سے پھیلتا ہے کہ اگلے ہی لمحے وہ قدیم ہو جاتا ہے۔اب اعتدال کی اس سادہ اور جمال افروز روش کا چلن ہے، جو موجودہ ماحول اور ثقافت میں اپنی جڑیں مضبوط رکھتی ہو اور جس کا مزاج اور مذاق نئے امزجہ و تلذذات پر منطبق ہو۔اب کسی تخلیق کار کا یا اس کی تخلیق کا ابعادِ اربعہ اپنی تعبیری اور تاویلی جہات اور فنی ریاضتوں کے بغیر قیام ممکن ہی نہیں،لہٰذا زمانے کے بدلتے ہوئے مذاق اور ادب کے مبدل بہ زمانہ رجحانات کے مطابق جس کسی شاعر نے بھی اپنے آپ کو ڈھال لیا وہ قبولِ عام کی سند حاصل کر لیتا ہے۔اب یہ اضافتوں کی دنیا نہیں رہی بل کہ نئے سائنسی اور منطقی امکانات کی دنیا ہے، جو تجربے اور تحقیق کی فضا میں سانس لیتی ہے۔

ریاض مجید متذکرہ بالا شعرا کے قبیل کے سالار ہیں، جن کی شاعری میں زمانی بدلاؤ آتا رہتا ہے اور ان کی پہلے کی شاعری کی نسبت ان کی آج کی شاعری ایک نیا اُسلُوب لے کر سامنے آتی ہے۔ریاض مجید بلاشبہ عبقری ذہن رکھنے والے اور پُر گو شعرا میں سے ایک ہیں، جنھوں نے اپنی ساری زندگی ادب کے لیے وقف کی ہوئی ہے۔ان کی ستر اور اِسی کی دہائی کی شاعری اس دور کے مقتضیات اور اُسلُوبیات سے لگاؤ کھاتی ہے اور آج کی شاعری میں ریاض مجید کے اُسلوب اور ان کے فکر و فن میں جہاں تبدیلیاں آئی ہیں، وہاں ان کے ہاں غیر محسوس انداز میں لفظوں کی بُنت کاری اور ان کے نفسیاتی برتاؤ میں بھی تغیرات واقع ہوئے ہیں۔اُن کا کمالِ فن یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے منفرد اُسلوب کی تازہ کاری میں محض اندازِ نگارش اور طرزِ بیان کے روکھے پھیکے انداز سے کام نہیں لیا بل کہ اُن کے اُسلوب پر سیّد عابد علی عابد کی درج ذیل بات صادق آتی ہے:

"اُسلوب دراصل فکر و معانی اور ہیئت و صوت یا مافیہ و پیکر کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔" (۵۵)

ریاض مجید نے، جو منفرد اُسلوب پیدا کیا ہے، اُس سے اُنھوں نے جدید ڈکشن کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے اور زُبان و بیان کے نئے ذائقوں سے اپنی شاعری کو آشنا کیا ہے۔یہی اُن کی وسیع المشربی کا ثبوت ہے کہ وہ تمام عمر ایک ہی روش پر چلتے ہوئے ایک جیسے اُسلوب سے چمٹے نہیں رہے بل کہ اپنے اُسلوب کی زیریں تہہ میں جہاں اُن کے اندر کا ریاض مجید رہتا ہے وہاں مافی الضمیر میں بیٹھ کر اپنی شاعری کے ذیلی اُسلوب کو موہوم زمانی تبدلات سے آشنا کیا ہے۔جدید شاعری کے متغیر مزاج اور بپھرے ہوئے تیوروں کو دیکھ کر اُنھوں نے بھی اپنی شاعری کے تیور بدلے ہیں اور اظہار کے نئے ذائقے تخلیق کیے ہیں۔یہ شعر جدید اُردُو غزل کا نمایندہ ہی نہیں بل کہ ایک مثالی شعر ہے:

ذرا سی دیر کو بیٹھا ،جھکا گیا شاخیں
پرندہ پیڑ میں اپنی تھکان چھوڑ گیا (۵۶)

’’ خاک‘‘ کا یہی نیا ذائقہِ اظہار جا بجا ہمیں ملتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ شاعر نے اُردُو شاعری کے بدلتے ہوئے لب و لہجے کو بھانپ کر اپنی شاعری کے اظہاریے علیٰ وجہ البصیرت بدل دیے ہیں۔ وہ تو خود اِسی نظریے پر ایمان رکھتے ہیں ہیں کہ پچھلی وضع کو چھوڑ کر اور اعتدال کی رسی کو تھام کر اپنے آپ کو بدل دینا ہی اصل انقلاب ہے۔

وہی سچا اور سُچا فن کار ہو تا ہے، جو اپنے زمانے کی رُوح کو سمجھتا ہے اور اُس کے قضیوں کو بہ اعماقِ نظر دیکھتا ہے اور پھر اُنھیں اپنے پیکرِ تخیّل میں اس طرح سے ڈھالتا ہے کہ اس کے طرزِ اظہار میں اس نئے زمانے کی روح کی نمایندگی ہو جاتی ہے اور یقین کیجیے اِسی کا نام ہی جدیدیت ہے اور اِسی میں نئے مضامین و خیالات اور نئے اظہاریے جنم لیتے ہیں۔ جہاں تک ریاض مجید کی شاعری میں جدّتِ ادا کا تعلق ہے، تو سیّد عابد علی عابد کی یہ رائے بالکل منطبق ہوتی ہے:

’’جدّتِ ادا کہنے کو ایک بات ہے، مگر دیکھیے، تو حسنِ ادا کے بعد شعر و شاعری کی ساری کائنات ہے۔‘‘(۵۷)

ریاض مجید کی شاعری اِس حوالے سے اپنی ایک الگ تھلگ پہچان رکھتی ہے۔ بہ غور جائزہ لینے سے معلوم ہو تا ہے کہ پرانی داستانوں میں، جو مافوق الفطرت مخلوق پیش کی جاتی تھی اور، جو جنوں اور پریوں کے کردار تھے اب جدید ٹیکنالوجی کے زور پر وہی کُچھ ہو رہا ہے۔ ایلینز کا تصوُّر اِسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جس پر ہالی ووڈ اربوں ڈالر لگا کر کئی فلمیں بنا چکا ہے۔ یورپ میں روبوٹوں نے ایسی ترقّی یافتہ ٹیکنالوجی کا لباس پہن لیا کہ اب داستانوں کے دیو ہیکل اور دیومالائی افراسیاب کا کام روبوٹ کر رہے ہیں۔ ادھر پرستان جانے کا تصوُّر اور ان دیکھی سرزمینوں میں پہنچ کر پھنس جانے کے قِصّوں کے مناظر آج ٹی وی اسکرین پر دیکھے جا رہے ہیں اور انسان مریخ اور دور دراز سیاروں یورینس پر کامیاب خلائی مشن بھیج چکا ہے۔ داستانوں کا خیالی اور فرضی کردار آج حقیقت میں اایک نئے روپ میں موجود ہے اور فسانے حقیقت میں بدلتے جاتے ہیں۔ مزید بر آں آج کے سائنسی دور میں ہم اپنے علم کو کامل نہیں قرار دے سکتے کیوں کہ انسان ہر لمحے جدید تحقیق کے سامنے بے بس ہو تا جاتا ہے اور اسے نئی تحقیق کے تمام رموز کا علم نہیں ہو سکتا۔ دہر میں واقع ہونے والی تمام تبدیلیاں اپنے ساتھ نئی معلومات لے کر آتی ہیں اور کوئی انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کا علم درجہِ کمال پر ہے۔ ان مضامین کو اگر پورے وثوق کے ساتھ کسی شاعر نے اپنے اظہاریے کا حِصّہ بنایا ہے، تو وہ بلاشبہ ایک اچھّا شاعر کہلایا جا سکتا ہے۔ ریاض مجید کے ہاں اس حقیقت کو کیسی خوب صورتی اور فنی چابکدستی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہ آپ خود ملاحظہ کر لیجیے:

وہ ہو رہا ہے جو پڑھتے تھے داستانوں میں
حقیقتوں میں ، فسانے بدلنے والے ہیں (۵۸)

فسانے اگر حقیقتوں میں بدلے ہیں، تو شاعر کی آنکھ سے یہ بدلتا ہوا منظر اوجھل نہ رہ سکا اور اس نے اس کے معروضات پر اظہارِ خیال کیا۔ اس کے اسرار کا جائزہ لیا اور اس کی رمزِ پنہاں کو تعبیر کی جہتوں سے آشنا کیا۔ تبدیلی کا یہ شعور ریاض مجید کے ہاں بڑی گہرائی کے ساتھ سرایت پذیر ہے۔ ریاض مجید کی حقیقت پسندانہ طبیعت اور شعری مزاج کے بارے میں شہزاد احمد لکھتے ہیں:

> "ریاض مجید اُن شعرا میں سے ہے، جن کے لیے زندگی کا کوئی رخ ممنوعہ سمت نہیں۔ وہ پرکار کی طرح چاروں طرف سفر کرتا ہے، مگر یہ سفر ایک مرکزی نکتے کا مرعونِ منت ہے، جو شاعر کی ذات ہے۔ یہ ذات محض ریاض مجید نہیں بل کہ موجودہ معاشرہ کا ایک حساس فرد ہے، جو اپنے اردگرد کے بارے میں حقیقت پسندانہ تخلیقی عمل کا قائل ہے، جو دیکھتا ہے مِن وعن بیان کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔" (۵۹)

ریاض مجید اپنے اندازِ فکر اور اپنی ادائے نگہ سے منظر کو دیکھتے ہیں۔ اُن کا مشاہدہ عمیق اور مطالعہ وسیع تر ہے۔ زمانوی تبدلات اُنھیں پائمال نہیں کرتے بل کہ وہ ان سے ایک جست آگے کی جانب رہتے ہیں اور منظر کے بدلنے کے ساتھ وہ نتائج و اثرات کو اپنے شعور کے منطقے میں ترتیب دینے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ اس آفاقی حقیقت سے آگاہ ہیں کہ زمان کسی کا منتظر نہیں ہوتا بل کہ سبھی اس کے سامنے پائمال ہو جاتے ہیں۔ یہ بات تو طے ہے کہ زمانے بدلتے ہیں، مگر ان کے بدلنے سے خارج کی دنیا میں ،جو مادیتی مبدلات واقع ہوتے ہیں وہ عین ذات کو متاثر کرتے ہیں، مگر ایک بڑا شاعر ان کے سامنے اپنے آپ کو مٹنے نہیں دیتا بل کہ ان پر حاوی رہتا ہے اور زمانے کو تخلیقی فن پارے میں مقید کر کے اس سے زمان و مکان کی پابندیوں سے ماورا کر دیتا ہے۔ ریاض مجید کی شاعری بھی ہمیں ادب کے ایسے ہی نگار خانے کا پتا دیتی ہے۔ اُن کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے درست لکھا ہے:

> "کٹی بانْھوں اور بندھے پاؤں کا یہ تماشائی یکسانیت کی اذیت سے اکتا چکا ہے او چاہتا ہے کہ درِ حسیات وا ہو وہ ایک اَن دیکھے جہاں کی سیاحت میں کھو جائے، اُس نے ایک تازہ لہجے میں اپنے خیالات کی ترسیل کی ہے۔" (۶۰)

ریاض مجید کے ہاں تازہ لہجے کے احساس کی ترسیل ہوتی دکھائی دیتی ہے، جس سے اُن کی شاعرانہ قدرت کا پتا چلتا ہے۔ اُن کی شاعری میں تمام ترکم زوریوں کے باوجود انسان کی پکار سنائی دیتی ہے۔ وہ ایک ایسے باشعور فن کار ہیں، جنھوں نے انسان کی تکریم اور حرمت کا مقدور بھر خیال رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی نظر میں انسانی وجود دکھوکھلا نہیں بل کہ تکملہ ارضی سے مرکب ہے۔ یعنی معروضی طور پر ایک فن کار کی ذات اور اس کا فن پارہ تکملۂ ارضی سے معبر ہیں اور ان کی حدبندی نہیں کی جاسکتی کیوں کہ فن پارے میں سوچ کا بنیادی کردار ہوتا ہے اور سوچ حدبندیوں سے آزاد ہوتی ہے۔ ان کا یہ شعر دیکھیے:

لگے نہ جاں میں کمی ، ذات میں خلا نہ لگے
وجود اپنی نظر کو تو کھوکھلا نہ لگے (۶۱)

شاعری جہاں تخلیقی کرب کی تشفی کرتی ہے وہاں ذات کے اظہاریے سے روحانی تشفی کا باعث بھی بنتی ہے ، لہٰذا شاعر بیک وقت تین طرح کی مُسرّتوں سے دوچار ہوتا ہے۔ ایک تخلیقی کرب کی تشفی کی مسرّت اور دوسری اظہارِ ذات سے روحانی مُسرّت اور تیسری فنی بلوغت کے خمیر سے اٹھنے والی مُسرّت، جو ایک شاعر کو اس وقت میسر آتی ہے جب وہ فن کے عوارضات کے اتمہ پر متمکن ہوتا ہے اور اس کے سامنے ہنر والا نہیں بل کہ ہنر زیادہ توجّہ کا طالب ہوجاتا ہے۔ اس کا ذہن بیک وقت اِنھی منطقوں کے اندر ایک حسین امتزاج کا متلاشی ہوتا ہے۔ ریاض مجید کے کلام میں بھی ہمیں کرب کی ایک خاص کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ ریاض مجید کی غزل کا محور وہ کرب ہے، جس میں نہ صرف اُس کی ذات اسیر ہے، بل کہ وہ پوری کائنات میں اِس کرب کی شدت میں اینٹھتا اور کراہتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ شاعر کا یہ کرب اگر سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی شعور کی پیداوار ہو، تو اُس کرب کے فن کارانہ اظہار سے شاعر اُس صورتِ حالات کو مثبت میں منقلب کر دینے کی تمناؤں کو نطق دیتا ہے، لیکن اگر یہ کرب احساسِ شکست اور اُس کے نتیجے میں بے بسی اور بے دلی کا اظہار ہے، تو اُسے منفیت کے سوا اور کُچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ریاض مجید کی غزل مثبت کرب کا اظہار ہے۔ کیوں کہ وہ اُس شعور سے مسلح ہے، جس کے بغیر انسان سفاک عناصر اور بے رحم انسانوں کی اِس دنیا میں ہتھیار ڈال کر بیٹھ جاتا ہے۔ ریاض مجید نے کسی مرحلے پر بھی ہتھیار نہیں ڈالے۔

ریاض مجید نے متذکرہ بالا حیثیتوں سے اپنی شاعری کی بنت کی ہے۔ اُنھوں نے اپنی کھوج سے اس کے حُصُول میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش ہے، جس سے اُن کے ذہن و قلب میں ایک نامیاتی تلازمہ قائم ہوا ہے، جس کے حتمی نتیجے میں یک گونہ تمانیت اور تسکین حاصل ہوئی ہے۔ یہی تسکین فن، اظہارِ ذات اور تخلیقی کرب کے جزئیات کا مرکب ہے، جو قاری کے برعکس ایک سچے شاعر کو میسر آتی ہے اور صرف تخلیق کار ہی اس کا ادراک رکھ سکتا ہے۔ ایسے شاعر کا مطمحِ نظر مختلف ہوتا ہے۔ اور وہ " اظہار" میں اپنا حِصّہ ڈالتے ہوئے آگے نکلتا ہے۔ اس کی نظر "ہنر" پر رہتی ہے نہ " ہنر والوں" پر البتہ وہ ہنر کے مزاج کے بدلاؤ کے ساتھ ساتھ اپنے " اظہار" میں بدلاؤ آتا ہے۔ یہی تخصص ریاض مجید کا ہے:

ڈالتے جاتے ہیں اظہار میں اپنا حِصّہ
ہم سمجھتے ہیں ہنر کو ، نہ ہنر والوں کو (۶۲)

اُن کے مجموعہِ کلام " خاک" میں ایسے بے شمار اشعار ہیں، جو جدید اُردُو شاعری کے مزاج سے باہم ممزوج ہیں۔ وجودیت انسان کا ہمیشہ ہی سے موضوع رہا ہے اور اس کا اہم جز "تکملہِ ذات" ہے۔ ذات کی تکمیل کی خواہش ہر کس ناکس میں ہے اور ہونی بھی چاہیے، مگر یہ ایک المیاتی اور تلخ حقیقت ہے کہ "تکملہِ ذات" معروضی دنیا میں ممکن ہی نہیں کیوں کہ یہ اس کائنات کے بنیادی اور واجب الوجودی اُصول کے عین خلاف ہے۔ سیّد عابد علی عابد کے مطابق:

"انسان کی ذات اور کائنات آشنائی کے محرکات: خدا، فطرت اور خود انسان ہیں۔"(۶۳)

انسان کے حسی تجربات اُس کی داخلی فطرت کا محرک ہوتے ہیں۔ کائنات کی ہر چیز جس طرح تکمیل کے مراحل میں ہے اور وہ صدا اپنی ارتقائی حالت میں رہتی ہے اور رہے گی کیوں کہ یہی اس کا منتہاے وجود ہے، بالکل اِسی طرح سے انسان "تکملۂ ذات" کے درجے پر متمکن نہیں ہو سکتا کیوں کہ جب کوئی چیز "تکملۂ ذات" پر پہنچ جاتی ہے، تو اس کے بعد اس کا وجود فنا ہو جاتا ہے۔ بہ ایں ہمہ انسانی ارتقا رک جائے اور انسان معدومیت سے آگے مکمل فنا سے دوچار ہو جائے۔ "تکملۂ ذات" کی دوسری صورت "تکملۂ روحانی" ہے، مگر اس کی تکمیل اس معروضاتی جہاں میں ممکن نہیں کیوں کہ حقیقت کبریٰ جب تک سامنے نہیں آتی اور جب تک اس معلول کی غایت اوّلیٰ یا علت العلل کے روبرو نہیں ہوا جاتا تب تک روحانیت اکمل نہیں ہو سکتی، مگر انسان کی یہ روزِ ازل سے خواہش ہے اور یہ جستجو ہے کہ وہ "تکمیلِ ذات" کو ممکن بنائے۔ کوزہ گر کے چاک سے اترا ہوا یہ شاہ کار اپنی تکمیل کی آرزو میں جگر سوختہ ہو کر پھر کوزہ گر کی مٹّی کا جز بن جاتا ہے، مگر اس سرِ نہاں کا سراغ نہیں لگا پاتا۔ حیرت کا جنم بھی یہاں سے ہوتا ہے کیوں کہ جہاں "تکمیلِ ذات" نہیں ہو پاتی وہاں حیرت جنم لیتی ہے، لیکن یہ وہ حیرت نہیں ہے جسے نظر کی حیرت سے تعبیر کیا جائے۔ یہ وہ حیرت ہے، جو دید کا احساں ہے اور تحیر آور فضا پیدا کرتی، مگر اس کے سوتے فکر و ادراک یا معرفت و وجدان سے نہیں پھوٹتے بل کہ اس کا منبع خارجی مشاہدہ ہے جس کے متعلق غالبؔ نے کہا تھا کہ:

صد جلوہ رو برو ہے جو مژگاں اٹھایئے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھایئے (۶۴)

"خاک" میں ریاض مجید نے اِس حیرت سے فکر کو مہمیز دی ہے اور اِس کا حدودِ اربعہ زمان و مکاں کے ابعاد سے بے نیاز کر دکھایا ہے۔ پھر اس حیرت کو آنکھ کے ساتھ کے ساتھ لازم و ملزوم کر کے ایک قضیہ قائم کیا ہے کہ "تحیر" کے فسانے کا وجود دراصل "آنکھ" کے وجود کا مرہونِ منت ہے:

جب تک آنکھوں میں تحیر کے فسانے سے رہے
میرے ہر سمت عجب آئینہ خانے سے رہے (۶۵)

یہ وہ حیرت ہے، جو قدیم سایہ اسناد کے زیرِ بارِ منت نہیں بل کہ اپنی معروضات ہیں اور اپنے قضیو ں کی حامل ہے۔ اسے اپنے وجود کے اثبات کے لیے گزشتگاں کی سند کی ضرورت نہیں۔ بل کہ تازہ کاری اور نئے ذائقوں کی ضرورت ہے۔ اس سے قطع نظر "تکملۂ ذات" کے لاینحل ہونے سے جس تحیر سے انسان دوچار ہوتا ہے وہ "اور بن جائیں گے تصویر، جو حیراں ہوں گے" کے مصداق "حیرت سرائے ذات" کے ذائقے سے آشنا ہوتا ہے۔ کسی کو یہ ذائقہ کڑوا لگتا ہے، کسی کو ترش، کسی کو شیریں، کسی کو پھیکا تو کسی کو نمکین لگتا ہے۔ پھر چکھنے کی حسیات کے اختلاف سے محسوسات و ادراک کے ذائقے میں بدلاؤ آتا ہے۔ یہی بدلاؤ جب اظہار میں وارد ہوتا ہے تو ہم کہتے ہیں "بھائی سبحان اللہ! کیا کمال کا شعر ہے۔"

اظہار کے اِسی بدلے ہوئے ذائقے میں ریاض مجید نے "تکملۂ ذات" پر استفہامیہ لہجے میں حیرت کا اظہار کیا ہے کہ کوئی بھی کوزہ گر جب کوزے کا نقش مکمل کر لیتا ہے، تو وہ اسے چاک پر ٹھہرائے نہیں رکھتا اور اس کی تکمیل کے بعد اسے چاک سے اتار دیتا ہے۔ یہی اس کا مقدر ہے، لیکن انسان ابھی تک "کوزہ گر" کے چاک پر کیوں ہے؟ کیا اس کی وجودی تشکیل ابھی تشنۂ تکمیل ہے؟ وہ "تکملۂ ذات" سے کب اور کیوں کر ہم کنار ہو گا؟ کیا علت العلل کی یہی منشا ہے کہ یہ نقش ارتقائی پذیر رہے اور اِسی میں اِسی کی تکمیل مضمر ہے؟ صدیوں سے اسے چاک پر سے نہ اتارنے میں نقش گر کی کیا حکمت ہے؟

یہ وہ تمام سوالات ہیں، جن کی طرف اشارہ ریاض مجید نے پہلے مصرعِ میں استفہام کا جواز پیدا کر کے دوسرے مصرع میں اُٹھائے ہیں۔ یہ سوالات پہلی بار نہیں اُٹھائے گئے بل کہ ہزارہا انسان فلسفیانہ اور شاعرانہ طور پر ان سوالات کی گتھی کو سلجھانے میں اپنی عمریں داؤ پر لگا چکے ہیں۔ یہ کیسا معما ہے، جو حل ہونے میں نہیں آتا؟ دراصل یہ عقدۂ لاینحل ہے، جو معروض کی دنیا میں حل ہو ہی نہیں سکتا کیوں کہ معروض نامکمل اور اپنی ذات میں اور صفات میں ناقص ہے، لہٰذا "تکملۂ ذات" یہاں ممکن ہی نہیں۔ اُس کے لیے اِس معروض اور عالم کی ضرورت ہے بالذات اور بالصفات اکمل ہو۔ اور جہاں انسان اپنی ارتقائی ضرورتوں سے مبرا اور ممکن الوجود نہ ہو بل کہ ارتقا کے مراحل سے کندن ہو کر واجب الوجود کا پرتو بن چکا ہو۔ یہی مرحلہ کوزہ گر کے چاک سے اترنے کا مرحلہ ہے۔ جہاں زمان و مکان کے باہمی اتصال سے ایک لامتناہی زمان و مکان وجود پذیر ہوتا ہے اور جہاں ماضی و استقبال نہیں بل کہ حال ہی حال کی بادشاہت ہے۔ ریاض مجید کا تذکرہ بالا شعر ملاحظہ کیجیے:

کوزہ گر! تو ہی بتا چاک سے کب اتروں گا
کیوں میں صدیوں سے مکمل نہیں ہونے پاتا؟ (٦٦)

اُنھوں نے یہیں پر ہی اکتفا نہیں کیا بل کہ اس استفہام اور اس کی زیریں تہہ میں استعجاب سے آگے بڑھ کر کوزہ گر کے لیے ایک چیلنج بھی کھڑا کیا ہے اور وہ یہ چیلنج ہے، جو ہمیں جدید شعرا کے بدلتے کوئے اُسلوب کی یاد دلاتا ہے۔ ان کے لہجے میں طنطہ اور رعب و دبدبہ ہے۔ آنکھوں میں مدِ مقابل کی ہزیمت کی مُسرّت کے جگنو ٹمٹمارہے ہیں اور اپنے نقش کے "پیچیدہ ہونے" پر شاعرانہ تفاخر کا اظہار نمایاں ہے۔ کوزہ گر سے طرزِ تخاطب کے تیور بدلے ہوئے ہیں۔ " آپ بننے کے نہیں ، تیرے بنانے کے نہیں" میں مقامِ حیرت سے آگے نکل کر" بانکپن اور باغیانہ روش" کی وہ کیفیت ہے جہاں " انانیت اور نرگسیت" کا راج ہوتا ہے اور جہاں انسان ناتواں ہونے کے باوجود بارِ گراں اٹھالاتا ہے۔ پہاڑ کو رائی سمجھتا ہے اور سمندروں کا پائمال کرنے ستاروں پر کمندیں ڈالنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ یہ شعر کوزہ گرِ کائنات و انس و جاں کی ذاتِ کُل کا استفسار یہ نہیں ہے بل کہ مقام حیرت سے آگے کی ایک جست ہے، جس میں انسان جھنجلا کر رہ جاتا ہے اور پھر اس کا جبلتی ردِ عمل ظاہر ہوتا ہے۔ ریاض مجید کا یہ شعر تحقی قِ کُل کی استھزائیت کا نمایندہ نہیں ہے بل کہ حیرت سرائے ذات سے ناکام آنے والے اس انسان کا استفسار یہ ہے، جو لاادریت کے عالم میں اپنا سر "نفی" میں پلا دیتا ہے ، لیکن یہ نفی "نفیِ جلی"،نہیں بل کہ "نفیِ

خفی"،ہوتی ہے جس کا ایک پہلو دوسرے پہلو کے لیے،جواز کھڑا کرتا ہے اور پہلے کے اثبات میں دوسرا اس کی نفی کرتا ہے تا کہ پہلا قائم بالذات ہو جائے اور دوسرا پہلو منہا ہو کر بھی اپنی منفیت کا،جواز قائم رکھ سکے۔یہ شعر ملاحظہ ہو:

کوزہ گر اور کسی ڈھب کی ہے اپنی مٹّی
آپ بننے کے نہیں ،تیرے بنانے کے نہیں! (٦٧)

درج بالا شعر میں " اور کسی ڈھب کی ہے اپنی مٹّی" کا جُملہ نہایت معنی خیز ہے۔اس کی تفہیم بھی دو سطحوں پر اپنا وجود رکھتی ہے۔اوّل یہ کہ متکلم کا خمیر اور اس کا مادہ کسی اور وضع کا ہے،جو عام انسانوں سے صریح تفارق رکھتا ہے۔متکلم کی خاک دیگر انسانوں کی خاک سے قدرے مختلف ہے۔اور یہ کتنی مختلف ہے ؟اس کا حتمی،جواب اس چیلنج میں موجود ہے،جس میں کہا گیاہے کہ کوزہ گر یہ تیرا کام نہیں،جاتُو اپنی راہ لے۔ہمارا خمیر اور ہماری مٹّی ایسی ہے کہ نہ تیری کوزہ گری کا ہنر اس کے نُقوش کی تکمیل کر سکتا ہے اور نہ یہ ہمارے بس میں ہے کہ ہم خود اپنے نقش بنائیں۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سا کوزہ گر ہو گا،جو متکلم کے نقش کو پایہ تکمیل تک پہنچائے ؟یہاں پر ایجابی خلا ہے اور یہیں پر وہ استفساریہ ہے،وہ استفہام ہے،جو شعر کو علیٰ وجہ دیکھنے سے قاری کے ذہن میں نہیں ابھر تا بل کہ اس کی تہہ در تہہ تفہیم اور اس کی ڈی کنسٹرکشن ہی سے اس شعر کی معنیات کے نہاں خانے کھلتے ہیں۔دوسرا یہ کہ شعر میں موجود الفاظ " اپنی" اور "آپ" کے علی الترتیب ضمائرِ ملکیتی و نفسی سے یہ امر مترشح نہیں ہوتا کہ مشارالیہ شاعر کی ذات ہے یا عالمِ کُل ؟یعنی انگلی اپنی طرف اٹھائی گئی ہے یا عالم کی طرف ؟اس کی تعبیراتی جہات کو اگر ہم عالمِ کُل پر کھول دیں تو پھر معاملہ متکلم کا نہیں رہتا بل کہ متکلم کے پردے میں یہ عالمِ کُل کی نقش گری کا استفساریہ بن جاتا ہے اور یوں شعر کی حیثیت آفاقی ہو جاتی ہے۔یہ مجموعی ادراک و شعور کی ہزیمت کے خمیر سے اٹھنے والا وہ استفساریہ ہے،جو اپنے کوزہ گر کے ہنر پر سوالیہ نشان لگاتا ہے۔

جدید اُردُو شاعری میں " پرندہ" امن و آشتی اور صلح جوئی کا استعارہ بن کر سامنے آیا ہے۔معاصر شعرا کے ہاں یہ ایک ایسا استعارہ ہے،جو ان کی مجموعی اندازِ فکر کا پتا دیتا ہے۔شاعر کی محسوس کرنے کی قوت اور معاصر حالات پر اس کا ردِ عمل اس کے زندہ ہونے پر استدلال کرتا ہے۔پھر لفظ" پرندے "کا شاعرانہ استعمال ہی اس کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے کہ اس میں کس قدر نفسیاتی جہات سما گئی ہیں۔یہی لفظ کے استعمال کی سائنس ہے،جو دو سطحوں پر قائم ہے۔پہلی اس کی نفسیاتی سطح ہے اور دوسری اس کی جمالیاتی سطح ہے۔غزل کی یہ مجبوری ہے وہ اپنے وجہی جمالیات کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی،لہٰذا غزل میں ہر استعمال ہونے والا لفظ جہاں اپنا نفسیاتی،جواز لے کر آتا ہے وہاں اسے اپنا جمالیاتی،جواز بھی دینا پڑتا ہے۔ذیل کے شعر میں "پرندے" کا استعارہ وسیع تر مفہوم میں جدید رنگ میں استعمال ہوا ہے۔ٹھکانہ بدلنا پرندوں کی مجبوری ہے،مگر ساتھ چمٹنا اور چھوڑ کے نہ جانا اس کے متضاد ایک خیال قائم کرتے ہیں۔یہ وہ موجودہ کش مکش اور عدم اعتمادی کی فضا کا نقشہ ہے،جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔

پرندے اپنے ٹھکانے بدلنے والے ہیں
ساتھ چمٹے ہیں مرے ،چھوڑ کے جانے کے نہیں (۶۸)

ایسے لوگوں کی کہانی جس میں ہر کردار کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں اور مجموعی بے حسی کا زمانہ جس میں کسی ایک کا گناہ نہیں ہوتا بل کہ مجموعی طور معاشرہ شریکِ جرم ہوتا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں کھیلی جانے والی آگ اور خون کی ہولی میں فردِ واحد مجرم نہیں بل کہ کہیں نہ کہیں پوری قوم ہی ملوث ہے:

ہر اک کے ہاتھ پہ اک بے گناہ کا خوں ہے
تمام لوگ ہی قاتل ہیں اِس کہانی میں (۶۹)

”خاک“میں مضامینی تنوع:

ریاض مجید کی غزلیات کی نمائندہ کتاب ” خاک “ ہے، جس میں مضامینی تنوع اور رنگارنگی بدرجہ اتم ہے۔ شاعر اپنے ماضی وحال سے مکمل جڑت رکھتا ہے اور اس کے عصرِ حاضر کا گہرا شعور ملتا ہے۔ اس کتاب میں کوئی ایک غزل بھی ایسی نہیں ہے ، جسے ہم فرسودہ یا محض روایتی کہہ کر یا عروضی مشق کہہ کر رد کر سکیں۔ ہر غزل اپنا مکمل تخلیقی جواز رکھتی ہے اور اس میں خیال کی تازہ کارہ اور مضمون کی ندرت نظر آتی ہے۔ اُسلوب عصرِ حاضر کی شاعری کی غمازی کرتا ہے۔ ان کی شاعری میں ایسے نہیں لگتا کہ ایک جگہ آکر اپنا ارتقائی سفر ختم کر چکی ہے بل کہ اس میں بتدریج زمانے کے مزاج کے مطابق تبدیلیاں آتی جاتی ہیں اور اس میں ان نئے سماجی و عمرانی مسائل کا شعور ملتا ہے ، جو آج ہمارے معاشرے کو درپیش ہیں۔ ذات اور اس کے عوارضات و مسائل ”خاک“ کا بنیادی موضوع ہیں اِسی طرح دیگر موضوعات جس میں آج کے عہد کا آشوب سانس لیتا ہے اور آج کا انسان جس ذہنی کرب وبلا کا شکار ہے، وہ تمام مسائل ریاض مجید کے اظہاریے میں موجود ہیں۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اُسلوب کے بدلنے سے شاعری کی انفرادیت پر کوئی اثرات واقع نہیں ہوئے ہیں کیوں کہ یہ اُسلوب کی وہ زیریں تہہ ہے، جس میں شاعر نے اپنے ذائقے میں نُدرت پیدا کی ہے اور نئے مضامین وخیالات کو جگہ دینے سے اس کی شاعری میں ایک نیا پن وجود میں آیا ہے۔ یہاں ریاض مجید کروچے کے نظریے کے قریب دکھائی دیتے ہیں:

”شاعرانہ اُسلوب جمالیاتی تجربے میں صورت و معنی اور مواد وہیئت کا انضمام کا باعث بنتا ہے۔“(۷۰)

اِس حوالے سے دیکھا جائے ،تو انفرادیت کسی شاعر کے ہاں اس کے اُسلوبِ شعر کے کُلی بدلاؤ کا نام ہے ،جب کہ مضامین وخیال کے ساتھ اظہار کے تیوروں کا بدل جانا یہ انفرادیت کو متاثر نہیں کرتا بل کہ اس کے نقش وخال وخد اور زاویوں سے بنا کر سامنے لے آتا ہے۔

ریاض مجید نے " خاک " کا عنوان اس کی مشمولات کی معنویت کی مناسبت سے رکھا ہے کیوں کہ غزلیات میں "خاک" ایک وسیع تر استعارے میں مستعمل ہوا ہے۔"خاک" میں اس لفظ کے ساتھ کئی جہتوں میں کھیلا گیا ہے اور کئی ایک مضامین، جو آفرینش اور ارتقاے انسانی و تکمیلِ ذات سے متعلق ہیں اس استعارے کے سہارے بیان کیے گئے ہیں۔ خاک در اصل استعارہ ہے، انسان کے بنیادی خمیر کا اور اس کے ازلی مادے کا جس سے اس کی صورت گری ہوئی ہے، مگر اس صورت گری میں خرابی یہ ہے کہ اس کے اندر جیتی جاگتی تکمیل کی خواہش موجود ہے، جب کہ اس کے لیے اس معروض میں تکمیل ممکن ہی نہیں۔ کوزہ گر، چاک، مٹّی، خاک، حیرت، تحیر، فسوں، فسانہ وغیرہ کے الفاظ اکثر اشعار میں بکثرت آئے ہیں، جو انسان کی تخلیقی کہانی اور اس کے خالق کی طرف ذہن کو متوجُّہ کرتے ہیں۔ کوزی گری اور حیرت " خاک " کا تخصص ہے۔ یہ دونوں الفاظ اس کتاب میں اپنے خاص تہذیبی مذہبی اور اعتقادی پس منظر میں استعمال ہوئے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

کوزہ گر اور کسی ڈھب کی ہے اپنی مٹّی
آپ بننے کے نہیں ،تیرے بنانے کے نہیں! (۷۱)

کوزہ گر! تو ہی بتا چاک سے کب اتروں گا
کیوں میں صدیوں سے مکمل نہیں ہونے پاتا؟ (۷۲)

انسان کی مٹّی کا ارتقائی سفر چاک در چاک ہوا ہے یا عہد بہ عہد ہوا ہے۔ اس کے متعلق کوئی عام انسان تو حتمی راے نہیں قائم کر سکتا، مگر ایک شعر کا نقطہ نظر مختلف ہوتا ہے اور وہ ایک اور زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ مٹّی اور خاک کے ساتھ جتنے بھی ریاض مجید نے مضامین نکالے ہیں، ان میں سے ہر خیال کے اندر کہیں نہ کہیں نیا پن اور ندرت موجود ہے اور وہ اپنے پیش رو سے مختلف ذائقے کا حامل ہے۔ یہ سفر، جو خاک کا سفر ہے اور جو انسان کے لیے لازمہ حیات سے اور اِسی پر اس کے ارتقا کا مدار ہے، ہماری شاعری کا موضوع رہا ہے۔ زیست ہمیشہ امتحان میں رہتی ہے اور ایک مشکل سے نکل کر انسان اگلی میں مشکل میں پھنستا ہے۔ زندگی چیلنجز سے معمور ہے اور مسلسل جدوجہد سے تعبیر ہے۔ چاک کے ساتھ اس سفر مشتِ خاک کے مضمون کو بیان کرنا واقعی اپنی جگہ ایک چیلنج رکھتا ہے۔

یہ خاک انسان کی تخلیق کا مادہ اور روحانیت اس کا لبادہ ہے۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور اپنی اپنی فطرت میں مقید ہیں۔ خاک عجُز انکساری اور بے بسی کی علامت ہے۔ اس کے مقابلے میں روح ترفع اور الوہی اعزاز کی علامت ہے۔ ہماری سرشت خاکی ہے اور اگر ہم اس سے منھ موڑ لیں گے تو نتائجِ صحّت مند بر آمد نہیں ہوں گے۔ خاک اپنی فطرت سے دُور نہیں رہ سکتی اور نہ رہی ہے۔ لہٰذا ہمارے اندر کا انسان اپنی بنیاد سے منھ نہیں موڑ سکتا۔ یہ خیال ایک نئی جہت کے ساتھ "خاک" کا جامہ زیب بنا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

رہی ہے دُور کبھی خاک اپنی فطرت سے
کوئی بتائے کہ کس طرح ہم بدل جائیں! (۷۳)

عدم کے کُوچ کی فکر لازم ہے ہستی میں یہی تو وہ درس ہے، جو شعرا دیتے آئے ہیں، مگر اس میں کوئی اظہار کی جدّت یا اس میں کم از کم اپنا رنگ پیدا کرنے کی کوشش نہ ہونے کے برابر ملتی ہے۔ ریاض مجید نے اس مشتِ خاک کے اس سفر کو مضمون بنایا ہے، لیکن اس میں اپنا انفرادی رنگ باقی رکھا ہے۔

اس سفر کو مزید یہاں تک ہی نہیں بیان کیا کہ اس کی حیثیت محض مخبر کی سی رہ جائے بل کہ اس سفر میں آنے والے حالات و واقعات اور تماشاؤں کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ یہ جو ورائے ذات کا اور ورائے خاک کا سفر ہے اس میں درپیش مسائل کو اِسی معروض میں دیکھنا اور قلبی آنکھوں سے محسوس کرنا بھی ایک نعمت ہے، جو ہر کس و ناکس کے پاس کہاں ہے! یہ وہ مضامین ہیں جن پر بہت کُچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا، مگر اس پر لکھنے کی گنجایشیں ہر دور میں رہیں گی اور لوگوں کے قلوب اذہان اس طرف ضرور مائل ہوں گے۔

لفظ خاک کسی اور شاعر کے ہاں اس طرح پُر معنی استعارہ بن کر سامنے نہیں آیا، جو اپنے وسیع تر وجودی معنوں میں مستعمل ہوا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ریاض مجید کے ہاں اس کے نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ ''خاک'' اپنے اِسی تخصص سے اپنی انفرادیت قائم کرنے کے لیے کافی ہے:

زمیں کا رزق بنی اور نہ غرقِ آب ہوئی
ہماری خاک یو نہی جا بجا خراب ہوئی (۷۴)

یہ خاک اگر زمیں کا رزق ہو جاتی تو اس کے امکانات ختم ہو جاتے اور اگر غرقِ آب بھی ہوتی تو انکشافات کے در بند ہو جاتے۔ اس سے قطع نظر شاعر نے ایک اور تاویل نکالی ہے اور وہ یہ کہ اگر عمر ذرا اور طویل ہوتی تو ہماری خاک کے امکان اور آگے جا سکتے تھے:

کُچھ اور روز اگر پھیل جاتی وسعتِ عمر
ہماری خاک کے امکان آگے جاتے اور (۷۵)

'' خاک کا جابجا خراب ہونا'' نہایت معنی خیز ہے، جو ایک نئے انداز میں رایگانی کے احساس کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہ وہ رایگانی ہے، جس کے سوتے تشنگیِ ذات اور عدم تشفیِ ذات سے پھوٹتے ہیں۔ یہ مضمون ریاض مجید نے کئی جہتوں میں اور کئی زاویوں میں بیان کیا ہے۔

شاعر نے جس چیز کی خواہش کی ہے وہ '' تکمیل '' کی ہے۔یہی آرزو اور اس کا اظہار اس کتاب کا مرکزی تخلیقی منطقہ بن کر سامنے آ رہی ہے۔اس میں انسان کی ازلی جستجو کا شعور بھی ہے اور شاعر کی اپنی آرزو بھی ہے کہ ایک بار تو اس درجہ کو کمال نصیب ہو جائے۔یہ شعر دیکھیے:

ہماری خاک کو خواہش ہے شکلِ تازہ کی
پھر ایک بار اسے ' چاکِ رواں ' پہ رکھا جائے (۷۶)

شاعر نے اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے کہ اسے ایک اور شکلِ تازہ چاہیے ،جو موجودہ شکل کی تجدید ہو تا کہ اس لیے کہ شاید اس طرح سے اس کی ذات میں،جو ازلی خلا رکھا گیا ہے وہ پُر ہو جائے، مگر یہ ازلی خلا پُر کیسے ہو گا؟اس کی وضاحت شاعر نے دوسرے مصرعے میں '' چاکِ رواں '' کی ترکیب سے کی ہے۔چاکِ رواں سے مراد کائنات و موجودات کے ارتقا کا وہ پہیہ، جس کی گردش سے لیل و نہار بنتے ہیں اور جس کی حرکت سے نئی مخلوقات تخلیق ہوتی ہیں۔چاکِ رواں '' کُن فیکون '' والا پہیہ ہے کوئی عام پہیہ نہیں اور یہ وسیع تر معنوں میں استعمال ہوا ہے۔یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِسی کن فیکون والے چاک پر انسان کی تخلیقِ مکرر کی جائے تو آج کے انسان سے استقبال کا انسان بہتر بن کر نکلے اور شاید اس طرح سے اس کی ذات کی تکمیل ہو جائے ۔یہی وہ تخلیقِ مکرر ہے جسے شکلِ تازہ کے مرکبِ اضافی سے تعبیر کیا گیا ہے۔درج بالا شعر تخلیقِ مکرر کی آرزو کا بیانیہ ہے اور اس میں ایک قوی لہجے اور مطالبانہ انداز میں اس خواہش کا ظہار کیا گیا ہے۔شاید اس تخلیقِ مکرر سے کسی اور طرح کے استفادے کی نیت پوشیدہ ہو۔یہ بھی عین ممکن ہے۔

اس طرح کے دیگر مضامین و خیالات '' خاک '' کا اختصاص ہیں۔اور اس کے عنوان کے ساتھ مکمل مطابقت رکھتے ہیں،خاک کے ساتھ حیرت کا استعارہ بھی ''کاک '' کی بنیادی صفت ہے۔اس حیرت کی نوعیت دو طرح کی ہے۔پہلی طرح کی وہ حیرت ہے ،جو نظری حیرت کہلائی جا سکتی ہے۔یعنی ایسی حیرت ،جو آنکھوں سے موجودات کے مشاہدے اور ان کے عجیب الخلقت ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ذیل کے اشعار میں حیرت کے ساتھ ،جو مضامین نکالے گئے ہیں وہ اِسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں، ملاحظہ کیجیے:

جب تک آنکھوں میں تحیّر کے فسانے سے رہے
میرے ہر سمت عجب آئینہ خانے سے رہے (۷۷)

ریاض مجید کے مجموعے ''خاک '' کی غزلوں پر یحییٰ امجد کی یہ بات صادق آتی ہے:

> ''غزل کے جُملہ شعروں میں جتنے بھی افکار یا باطنی تجربے منکشف کیے گئے ہیں، اُن کا لاشعوری پس منظر ایک ہوتا ہے۔وہ شاعر کے نظامِ جذبات میں سے صرف ایک ہی سلسلۂ احساس کے مختلف اور بہ ظاہر غیر مربوط، مگر بہ باطن خفیف سا ربط رکھنے والی اکائیاں ہیں۔''(۷۸)

اب درج بالا شعر کو اِس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ نظر کی حیرتیں انسان کو کائنات اور موجودات کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی دعوت دیتی ہیں۔ ہزاروں ایسی علامات اور عجائب خانے ہیں، جہاں نظر رکتی ہے اور ہر آئینے میں حیرت آثار مناظر کی ایک لاماحدود سلسلہ نظر آتا ہے۔ کوئی بھی عکس ایسا نہیں ہوتا، جس پر نظریں رک جائیں اور اس کی مکمل تفہیم کرلیں بل کہ اس ایک عکس کے عجائبات سے ورطۂ تحیر میں پڑ جاتی ہیں اور پریشان و سرگرداں ہوتی ہیں۔ ایسی حیرت ایک شاعر کے ہاں ہی ملتی ہے کیوں کہ ایک عام شخص مشاہدہ کی اس باریک بینی سے محروم ہوتا ہے۔

آئینے کے ساتھ اُردو شاعری میں بہت سے شعرا نے بہ کمال مضامین و خیال کو اشعار میں باندھا ہے اور کئی شعرا نے بڑے بڑے مضامین نکالے ہیں۔ میرؔ کا ایک شعر ہے، جو آئینے اور حیرت کے حوالے سے ایک اچھوتا خیال پیش کرتا ہے:

ریاض مجید نے بھی آئینے اور حیرت کے ساتھ کئی اشعار میں لائقِ توجہ مضامین نکالے ہیں اور ان میں نُدرت پیدا کی ہے۔ اظہار کے ذائقے کو بدلا ہے۔ یہ چشمِ تماشا کی حیرت ہے، جس کا اظہار شاعر نے آنکھوں کا لفظ استعمال کیا ہے اور اِسی حیرت سے انسان آگے کی جانب بڑھتا ہے کیوں کہ اسے نادیدہ جزیروں کو دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے اور اسے یہ جستجو رہتی ہے کہ وہ مظہرِ عجائب کی حقیقتوں تک رسائی حاصل کر سکے۔ اگر غور کیا جائے، تو دنیائے اُردو ادب میں غزل ہی کا ایسا کینوس ہے، جس میں ایسے مضامین کی سمائی ممکن ہے۔ کیوں کہ شمیم احمد کے نزدیک:

> ”غزل انسان کے جن بنیادی احساسات اور خواہشات کو آسودہ کرتی ہے، وہ ہزاروں سال سے فرد در فرد، نسل در نسل، گروہ در گروہ، قبیلہ در قبیلہ، قوم در قوم زمانے کی گردشوں سے بے نیاز یکساں چلی آرہی ہے۔ یہ انسان کی اِسی مشترک سرمایۂ حیات کی وہ نغمہ خواں ہے، جس میں آج بھی بہ قولِ فرقؔ وہی تھرتھراہٹ اور سرمدی فضا ملتی ہے، جس کو آفاقی کہا جاسکتا ہے۔“(۷۹)

اِس تعبیر کے مطابق ریاض مجید کی شاعری میں پایا جانے والا تعیّر زمان و مکان کی حدود اور اس کے ابعاد سے عبارت ہے۔ لہٰذا اُن حیرانیوں کا تعین محال ہی نہیں ناممکن ہے۔ ریاض مجید کی غزل بڑے انوکھے انداز میں انسانی احساسات اور جذبات کی حیرانیوں کو سمویا گیا ہے۔ اعداد شماری میں اس کے ابعاد کو بند نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے ابعاد کی وسعتیں لامحدود ہیں اور ان کی کوئی حد نہیں۔ ریاض مجید کی غزل بڑے انوکھے انداز میں انسانی احساسات اور جذبات کی حیرانیوں کو سمویا گیا ہے:

زماں مکاں کے سب ابعاد سے نکلتی جائیں
نظر کی حیرتیں ، اعداد سے نکلتی جائیں (۸۰)

حیرت کی دوسری قسم وہ ہے، جس میں ہر کس و ناکس مبتلا نہیں ہوتا اور صرف گنے چنے لوگ ہی اس حیرت سے آشنا ہوتے ہیں۔ اس کے ذائقے میں لذاتِ تجسسات ہیں اور اس کی الجھنوں میں فکر کی شیرینی ہے۔ یہ نظری حیرت سے کئی ابعاد پر

اپنا وجود رکھتی ہے اور اس کی حدودِ اربعہ وہاں سے شروع ہوتی ہیں، جہاں سے نظری حیرتیں سمٹ کر ایک نقطے میں مقید ہو جاتی ہیں۔ یہ نقطہ اور کائنات میں کہیں نہیں بل کہ انسان کے اپنے ذہن میں ہوتا ہے۔ حیرت کی موخر الذکر قسم ایک تخلیق کار اور فلسفی کے ذہن میں کی پیداوار ہے، جو ایک منطقی انداز میں عقل و خرد کے ذریعے سے اور اپنے تجربات کے استنتاج کی روشنی میں کسی مسلمہ حقیقت کو یا تسلیم کرتا ہے یا نئے سرے سے دریافت کرتا ہے یا اس کا استرداد کرتا ہے۔

شاعر کے ہاں اس کا محلِ وقوع تجربہ و مشاہدہ نہیں بل کہ متخیّلہ اور وجدان ہوتا ہے۔ یہیں سے نئی پیشین گوئیاں ہوتی ہیں۔ شاعر اپنے وجدان اور فلسفی اپنے تعقل سے عاجز آ کر کسی کے خلاف عقل امر یا واقعہ کی تفہیم سے عاجز آ جاتا ہے، تو حیرت جنم لیتی ہے۔ حیرت کی اس قسم کو ہم تعقلاتی حیرت کہہ سکتے ہیں۔ دوسری اصنافِ سخن کے مقابلے میں اِس تحیّر آمیزی کی فضا غزل میں زیادہ معنی خیز ثابت ہوتی ہے۔

ایک اچھّا شاعر اِسی استثنا سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اِس خاص فضا کو قائم رکھتا ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر اس کا تخلیقی تجسس قائم نہیں رہ سکتا اور جب تخلیقی تجسس معدوم ہو جائے، تو پھر شاعری محض ذہنی ریاضت رہ جاتی ہے اور اس میں شعریت کا شور انگیز سودا باقی نہیں رہتا۔

یہ حیرت کبھی ان دیکھی دنیاؤں کی حیرت بھی بن کر سامنے آتی ہے۔ آنے والے جہان اور آنے والے زمانے کی حیرت کا ذائقہ ہی کُچھ اور ہوتا ہے۔ ریاض مجید نے مستقبل کے حیرت افزا لمحوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قاری کو دعوتِ غور و فکر دی ہے:

وقت کے پار اُن اُڑتے ہوئے پر والوں کو
خاکِ حیرت سے بندھے ! دیکھ اُدھر والوں کو (۸۱)

یہی حیرت مابعد کی حیرت میں جب متشکل ہوتی ہے تو اس کے لیے کرن کا جسم اور خُوش بُو کا لباس کیوں مانگا گیا ہے؟ کیا اس کی کوئی مابعد الطبیعاتی توجیہہ ہے یا نہیں؟ اس بابت شاعر کا خیال واضح نہیں ہے، مگر اتنا ضرور مترشح ہوتا ہے کہ مابعد کے سفر کے لیے بدنِ خاک نہیں بل کہ روشنی کا بدن چاہیے۔ یہاں پر ہمیں مادے کا روشنی میں تبدیل ہونا اور روشنی کا مادہ میں تبدیل ہونے کا آئین سٹائینی نظریہ بھی یاد آتا ہے۔

ہست دراصل وہ آئینہ ہے، جو کسی بھی رت میں صیقل نہیں ہونے پاتا اور کوئی بھی لمحہ اس کے سرِ نہاں ہو مظہریت کا جامہ نہیں پہنا سکتا۔ پنہائی کا وہ مقام ہے، جہاں حیرت ہی حیرت ہے۔ انسان اِسی حیرت کا مُرقّع ہے۔ اس خیال کو کس قدر فنِ اظہار کی ندرت ملی ہے۔ انسان حیرت کا پتلا ہے۔ ریاض مجید کے ہاں حیرت زندگی کی معجز نمائیوں کے لیے مخصوص لفظ ہے، جو زندگی میں آنے والے معجزات کی نمایندگی کرتا ہے اور جہاں حیرتِ ذات میں پڑ کر انسان اپنی عقل کے ناقص ہونے کا گمان

کرنے لگتا ہے۔ معجزہ کیا ہے؟ اہلِ علم اس کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ، جو امر یا امرِ واقعہ عقل و خرد کے اُصولوں سے مبرا اور ماوراہو اسے معجزہ کہتے ہیں۔ یا پھر یہ کہ معجزہ الوہی اُصولوں کے ٹوٹنے کا نام ہے۔ ہمارے خیال میں یہ دونوں تعریفیں ناقص ہیں۔ دراصل معجزہ الوہیت کے مخفی اُصولوں کے ظاہر ہونے کا نام ہے۔ معجزات قوانینِ فطرت ہی کے تحت ہوتے ہیں اور اس سے ماوراہر گز نہیں ہوتے:

"موجودہ دور میں، جب غزل گو شاعر نے جُملہ حسیات کے برانگیختہ ہونے کے باعث، اپنی دھرتی کو بہ غور دیکھا، تو بہت سے قریبی اشیا اور مظاہر نئے علائم میں ڈھل کر غزل کا جُزِ بدن بننے لگے۔" (۸۲)

ریاض مجید کی غزل میں درج بالا کیفیات مختلف الانواع رنگوں میں جلوہ افروز ہوتی ہیں۔ وہ بڑی مہارت سے اِن کیفیات سے معنوی سطح پر نئے زاویے تخلیق کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ تحیّر اور حیرانی کے باب میں بھی اُنھوں نے اِنھی معجز نمائیوں پر اظہارِ حیرت کیا ہے، جن کا تعلق زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے ہے۔

حیرت کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر بڑھتے پھیلتے ارمان اور آرزوئیں آگے جاتیں تو اپنی ہی گرمیِ حیرت سے جل کر راکھ ہونے کا خدشہ ہو سکتا ہے۔ بظاہر مضمون بہت عجیب ہے، مگر ذیل کے شعر کو دیکھنے سے لگتا ہے کہ علامتی انداز میں "ہونے" اور "کربِ آگہی" کو ذاتِ انسانی کے انسلاک کے ساتھ اس طرح یوں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

خود اپنی گرمیٔ حیرت سے راکھ ہو جاتے
جو بڑھتے پھیلتے ارمان آگے جاتے اور (۸۳)

انسان جب کسی چیز کی اصل حقیقت کو جانتا ہی نہ ہو اور تمام عمر ایک ایسے نظریے کے تحت بتا رہا ہو جس سے عواقب اور ازلی حقائق کو وہ خود نہ سمجھتا ہو تو اس جیسا لاادری کوئی نہیں ہو سکتا۔ مگر جب اسے کسی حقیقت کا علم ہوتا ہے، تو وہ اس کو تسلیم کرنے کے بجائے اس پر اظہارِ حیرت کرتا ہے۔ حیرت کے متعلق علی الخصوص تجسس کی دعوت قرآن مجید نے دی ہے اور فرمایا ہے کہ: "ہم ان کو ان کے اپنے اندر اور آسمانوں میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے۔"

آفاق میں آیاتِ الٰہی یا اللہ کی نشانیاں تو انسان کو آج واقعی حیرت میں ڈالے ہوئے ہیں، جب کہ میڈیکل سائنس نے انسان کے اندر کی لامحدود اور لامتناہی کائنات کو بھی کسی حد تک کھنگال کر انسان کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ قرآن کا یہ قول اپنی صداقت کے اعتبار سے کتنا بے نظیر معلوم ہوتا ہے۔ اِسی حیرت کا سلسلہ ریاض مجید کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری سراپا اظہارِ استعجاب ہے اور استعجاب کے لہجے میں وہ آئینہ اور عکس کے پس منظر میں انسان کی ہستی کو موضوع بناتے ہیں:

کہنا کُچھ چاہتے ہیں، منہ سے نکلتا ہے کُچھ اور
کیسی حیرت ہے کہ اعصاب نہیں دیتے ساتھ (۸۴)

حیرت کے ساتھ ریاضؔ مجید نے آئینہ کے لفظ کا کثرت کے ساتھ استعمال کیا ہے، جس کا یہ مطلب ہے کہ حیرت اور آئینے کا کوئی نہ کوئی شاعر کے ذہن میں منطقہ موجود ہے، جو دونوں کے و، جو دی اتصال کا ما حصل و مآل ہے۔ ریاض مجید نے کمال ہنر وری سے خیال کی گرہ کشائی کرتے ہوئے نئی معنوی کیفیت پیدا کی ہے۔ عموماً آئینہ کے ساتھ حیرت کا مضمون شعرا نہیں نکالتے بل کہ اس کے ساتھ عکس اور چہرے کے مضامین، خوب صورتی یا جمالیاتی قسم کا رنگ شامل ہو جاتا ہے۔ میرؔ نے " منھ تکا ہی کرے ہے جس تس کا۔۔۔ حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا" کہہ کر اس روش کی ابتدا ڈالی تھی، مگر اُردُو شاعری میں اتنی کثرت میں ریاض مجید کے علاوہ کسی اور شاعر نے حیرت اور آئینہ کا باہمی معنیاتی تلازماتی نظام قائم نہیں کیا ہے۔ خوب کے تصوُّر میں صد ادل سر گرداں رہے تو یہ گویا ایسے ہی ہے جیسے آئینہ صد اتحیر میں رہے۔ حیرت کے متبادل لفظ " تجسس" بھی "خاک" میں استعمال ہوا ہے، مگر اس میں وہ شدت نہیں ہے، جو کسی معجز نمائیِ خرد کی کیفیت کا پورا پورا بیانیہ بن سکتا ہو۔ تجسس تو ایک بچّے کا بھی ہوتا ہے، جو ہر ایک چیز کو پورے انہماک سے دیکھتا ہے کیوں کہ اس کے سامنے ایک بالکل نئی دنیا ہوتی ہے:

مآل ذوقِ تجسس کا خوب تر نکلا
سمجھتا تھا جسے دیوار میں ، وہ در نکلا (۸۵)

درج بالا جُملہ شعری تمثیلات پر کیے جانے والے نقد و تبصرے کے بعد ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ریاض مجید نے جہاں کہیں غزل کے فن سے عہدہ برا ہونے میں کامرانی حاصل کی ہے، وہاں وہ اُسلوبیاتی سطح پر بھی کامیابی سے ہم کنار ہوئے ہیں۔

ریاض مجید کے مجموعۂ کلام "خاک" میں سماجی مسائل کی نمایندگی:

غزل یا نظم کا شاعر اپنے عہد کے آشوب سے بہ خوبی آگاہ ہوتا ہے اور اس کے سامنے گزرنے والا ہر واقعہ اپنے ساتھ ردِ عمل بھی ساتھ لاتا ہے۔ یہ ردِ عمل ویسے تو ہر انسان میں پیدا ہوتا ہے کیوں کہ تمام انسان حسیات کے بندے ہیں، مگر شاعر میں یہ حساسیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اور پھر شاعر کا یہ تخصص بھی ہوتا ہے کہ وہ اظہار کی قدرت سے بارور ہوتا ہے۔ اور اپنے خیالات کو فن کی اعلیٰ ترین صورت یعنی شاعری میں بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ شاعر کی آنکھ باریک بین ہوتی ہے اور وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی تبدیلی کا شاہد اور اس کا محسوس کرنے والا ہوتا ہے۔ کسی شاعر کا مشاہدہ جتنا زیادہ قوی ہو گا اس کی شاعری میں سماجی و عمرانی مسائل کی بازگشت اتنی ہی زیادہ سنائی دے گی اور جس شاعر کے ہاں تخیّل کی فراوانی ہو گی اس کی شاعری میں کے پاؤں زمین پر نہیں لگیں گے اور وہ تخیّل کی ہرزہ سرائیوں میں رہے گا۔

شاعر اِسی زمین کا نمک کھاتا ہے، لہٰذا اسے ساکنانِ ارض کی خبر گیری کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اِس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> ''زمین جس پر سال کے بیش تر حصّے میں تیز سورج چمکتا ہے، آندھیاں آتی ہیں، دھواں اور غبار چھا جاتا ہے، اور پھر اچانک ساون کی برکھا، ہر شے پر سبز رنگ اُنڈیل دیتی ہے، جہاں شہر گھروں، کھڑکیوں، منڈیروں کوٹھوں اور گلیوں کی ایک گڈ مڈ سی تصویر پیش کرتے ہیں اور جہاں جنگل اپنے پیڑوں، پتّوں، شاخوں، سانپوں اور سایوں سے، ہر گزرنے والے کو اپنی طرف متوجّہ کرتے ہیں۔ جدید اُردو غزل کے فروغ کا باعث یہی ہے۔'' (۸۶)

ریاض مجید کی غزل میں یہی مظبوط ارضی حوالہ ہے، جو اُن کی جدید غزل پر قائم کردہ عمارت کا باعث بنتا ہے۔ اُن سے قطع نظر تخیّلات میں مستغرق شعرا کے کلام میں وقتی طور پر ایک گوشۂ عافیت تو ہوتا ہے، مگر حقائقِ معروضی سے وہ کوسوں دور ہوتے ہیں۔ ایک اچھّا اور بڑا شاعر وہی ہو سکتا ہے، جس نے اپنی شاعری کی بنیادیں زمین اور اہلِ زمین کے مسائل کے ساتھ پیوستہ رکھی ہیں۔ شاخ اگر اپنے شجر سے ٹوٹ جائے تو سحابِ بہار اسے ہرا نہیں کر سکتا۔ اِسی طرح شاعر جب اپنے معاشرے سے کٹ جائے تو اس کی شاعری قبولِ عام کی سند حاصل کر نہیں سکتی اور وہ ایک اچھّا شاعر نہیں کہلایا جا سکتا۔ عوام اس تحریر یا فن پارے کو پڑھنا پسند کرتے ہیں، جس میں اُن کے مسائل کی نمایندگی کی گئی ہو۔

ایک اچھّے شاعر کے ہاں معاشرتی مسائل کی نمایندگی ہوتی ہے اور اس کی شاعری میں سماجی مسائل پر کُچھ نہ کُچھ کہا گیا ہوتا ہے، جو عوام کے دلوں اور ان کی سماعتوں کو اپیل کرتا ہے اور جس شاعر کی روئیدگی معاشرے کی جڑوں میں نہیں رہتی اور اس کی شاعری تہذیبی شعور سے بے گانہ ہوتی ہے، وہ جُز وقتی شاعر ہوتا ہے اور اس کے جانے کے ساتھ ہی اس کی شاعری بھی اس جہاںِ فانی سے کوچ کر جاتی ہے۔ ریاض مجید ان شعرا میں سے ایک ہیں، جن کی شاعری اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنی مٹّی سے گہری جڑت اور وابستگی رکھتی ہے۔ اِس کی بنیادی وجہ یہ ہے:

> ''ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہوئی ہے، دونوں کا سمت و رفتار، رنگ و آہنگ، وزن و وقار ایک دوسرے سے ملا ہوا ہے۔'' (۸۷)

ریاض مجید کی شاعری اِس ضمن میں بہ طورِ مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ اُن کی شاعری میں آج کے انسان کے مسائل کی نمایندگی موجود ہے۔ وہ فضاؤں میں بُلند پرواز کرنے والا ایسا شاعر نہیں ہے، جس کے پاؤں زمین پر لگنے نہیں پاتے۔ وہ غزل کی ایک بنیاد سے وابستہ ہیں، اِس لیے اُن کی غزل بقول جمیل الدین عالیؔ:

> ''اپنے بنیادی مزاج اور ذہنی فضا کے اعتبار سے ایک تہذیبی ذریعۂ اظہار ہے۔ اِس لیے اُس کا اُسلوب اور پیرایۂ بیان یہ ہے کہ یہ اکثر و بیش تر رمز و ایما کا سہارا لے کر علامتوں، اشاروں اور کنایوں میں بات کرتی ہے۔''(۸۸)

ریاض مجید ایسے شاعر ہیں، جن کی روئیدگی اور جس کی زندگی کا، جوہر اپنی تہذیب کے خمیر سے اٹھتا ہے۔ وہ تو خود اس بات کا قائل ہے کہ اگر پھلنا پھولنا ہے اور جنگل یا بنجر نہیں ہونا تو اپنی تہذیب میں جڑیں پیوستہ رہنی چاہئیں و گرنہ انسان جنگل ہو

جاتا ہے اور حقیقت سے کہیں بعید جا پڑتا ہے۔ ان کا یہ شعر ان کے حق میں کی گئی بات کا اثبات کرتا ہے۔ ایک حساس انسان کی طبیعت پر آج کا پُر آشوب دور جس میں جان و مال اور عزت و آبرو کُچھ بھی محفوظ نہیں ہے، کس طرح اپنے آپ کو بے بس و لاچار محسوس کرتا ہو گا یہ تو اس کے اظہاریے ہی بتا سکتے ہیں۔ اس بے بسی و پابستگی کے عالم میں جہاں چلتے پھرتے انسان آن کی آن میں بس ایک زور دار دھماکے کے نتیجے میں چیتھڑوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور جہاں اسکول جانے والے بچّوں کی سلامتی پر سوالیہ نشان ہے کہ وہ واپس زندہ بھی آتے ہیں یا نہیں؟ یہی وجہ ہے بے یقینیت اور عدم اعتماد کی فضا روز بروز مائل بہ تخریب ہوتی جا رہی ہے۔ اور زندہ رہنے یا اگلے لمحے صحیح سلامت ہونے کے بارے میں کُچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہر طرف خوف کی حکمرانی ہے کہ انسان اپنے سائے سے بھی بعض اوقات تو ڈر کر بھاگنے لگتا ہے۔ جہاں قاتلوں کو ہم جانتے ہیں، مگر اُنھیں کیفرِ کردار تک پہنچا نہیں سکتے۔ جہاں تعلیم پر اپنی ساری جمع پونجی خرچ کرنے کے بعد بھی صد ادھکے کھانے پڑتے ہیں۔ جہاں خونی رشتوں کا پاس نہیں۔ جہاں معاشرے کی اچھّی اقدار و روایات اپنا دم توڑ رہی ہیں۔ جہاں انسان محض روبوٹ کی صورت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ جہاں ہندو بنیے کا فرائض مسلمان سود خور بن کر انجام دے رہے ہیں۔ جہاں ایک مسلمان کو مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ جہاں فحاشی کی دلدل میں بچّوں سے لے کر بوڑھوں تک پھنسے ہوئے ہیں۔ جہاں انسان کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور چند روپوں کے مقابلے میں اس کی قیمت ارزاں ہے۔ جہاں اپنوں کی اور اپنے خونی رشتوں کی کوئی قدر نہیں۔ ''خاک'' میں ان مسائل کی بھرپور نمایندگی ہے:

نہ پری زاد ہی کام آیا رہِ حیرت میں
نہ کسی آدمی جائے نے مرا ساتھ دیا (۸۹)

ریاض مجید کی شاعری کا ایک مستند حوالہ اپنی مٹّی کی بو باس ہے، جس سے وہ بھرپور الفت کا اظہار کرتے آ رہے ہیں۔ اُنھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ انسان اپنا ساتھ خود ہی نبھاتا ہے اور اپنی مٹّی ہی اپنا ساتھ دیتی ہے۔ نہ کوئی ماں جیسا ساتھ دیتا ہے اور نہ کوئی دوست ساتھ نبھاتا ہے، لہٰذا خود اپنی انگلی پکڑ کر چلنے کی عادت ڈالنا ہوتی ہے۔ چناں چہ ریاض مجید اِسی طرف اشارہ کرتے ہیں:

تھی مری ذات اِسی مٹّی کے حوالے سے ریاضؔ
سدا اس خاک سرائے نے مرا ساتھ دیا (۹۰)

ایسا معاشرہ جہاں حکمران سات دہائیوں سے عوام اور ملک کو لوٹ لوٹ کر معیشت کو تباہ و برباد کر چکے ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں زندہ رہنے والے شاعر کے سامنے یہ سب کُچھ ہو رہا ہو اور وہ اسے اپنی شاعری کا پیرہن نہ دے، بہت ہی عجیب بات ہو گی لہٰذا ہر اچھّے شاعر کے ہاں ان مسائل کی بھرپور نمایندگی ہونی چاہیے۔ ریاض مجید نے ان معاشرتی مسائل کو

بڑی خوبی کے ساتھ اپنی شاعری کا حِصّہ بنایا ہے۔ یہ ملاحظہ کیجیے جس میں اس معاشرے کے مجرموں کو تو معزز ٹھہرایا جاتا ہے، مگر بے گناہ لب کشائی کرنے والے لوگ دھر لیے جاتے ہیں:

موجودہ دور میں انسان کی معاشرتی زندگی کو محدود کرنے اور دوستوں سے دور کرنے میں جس چیز کا سب سے بڑا ہاتھ ہے وہ مادیت پرستی ہے یا مشینی طرزِ زندگی ہے۔ یہ اب ہمارا ایک سماجی مسئلہ بن چکا ہے۔ جہاں پہلے ہمارے پاس رشتہ داروں اور دوستوں کے لیے گھنٹوں وقت ہوتا تھا اب چند ساعتیں بھی میسّر نہیں ہیں۔ اور تو اور اپنے والدین اور گھر والوں کے لیے بہت کم وقت ملتا ہے۔ گھریلو زندگی اور خاندان کی زندگی اس مشینی مصروفیت کی وجہ سے کافی متاثر ہوئی ہے۔ یہ سماجی مسئلہ روز بروز گھمبیر ہوتا جارہا ہے۔ اس کے پیچھے زیادہ تر، جو عوامل کارفرما ہیں وہ مادی ترقّی کی دوڑ دھوپ ہے۔ دولت کمانے اکٹھا کرنے کی جستجو ہماری خاندانی زندگی کے اجاڑ کا سبب بنی ہے۔ ریاض مجید کے ہاں اس المیے کا اظہار بکثرت ملتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ہے کس جگہ پہ ، جواز اے زمیں مرا اپنا
نہیں ہے وقت میں حِصّہ کہیں مرا اپنا (۹۱)

یہی وجہ ہے کہ انسان ماضی کی فرصتوں کو یاد کرکے بعض اوقات اپنے دل کی تسکین کا اسامان کرتا ہے۔ اِن کیفیتوں کا اظہار جتنا خوب صورتی کے ساتھ غزل میں ہو سکتا ہے، کوئی دوسری صنفِ سخن اِس کی متعامل ہو ہی نہیں سکتی۔ سیّد عابد علی عابد نے غزل کے خصوص میں معنی خیز بات لکھی ہے:

"مجھے تو غزل اور انسانی معاشرے میں بڑی مماثلت نظر آتی ہے۔ افراد اپنے مقام پر ایک اور مختلف حیثیت کے مالک ہوتے ہیں، لیکن اُن کا تعلق اپنی ذات کے علاوہ ایک اور "کل" سے بھی ہوتا ہے، جسے اجتماع یا معاشرہ کہتے ہیں۔" (۹۲)

انسان بنیادی طور پر ہمارے سماج کی اکائی ہے، جو چاہا کر بھی اپنے آپ کو معاشرے سے الگ نہیں کر سکتا۔ چناں چہ انسان کو ماضی کی فرصتیں اور احباب و اقارب کی بے لوث محبّتیں آج کے زمانے میں، تو محض خیالی باتیں ہی معلوم ہوتی ہیں ، لیکن انسان پھر بھی ہزاروں صدیوں پیچھے کی جانب پلٹنے پر تیار ہے اگر یہ دلی سکون اور تسکین اسے میسّر آجائے۔

اس زمانے کے آشوب کا اور کس طرح کے سوز و گداز کے ذریعے اظہار ہو کہ ایک ہی گھر میں رہنے والے ایک ہی بستر پر سونے والے دو روح یک قالب اپنی اپنی ہتھیلی پر رکھی دنیا میں محو ہیں اور ایک دوسرے کے لیے وقت نہیں۔ شاعر نے اسے اپنے اپنے خواب کی علامتیت کا رنگ دے کر بیان کیا ہے۔

درج بالا مباحث کو اگر سمیٹا جائے تو ریاض مجید کی غزل کے بارے میں آلِ احمد سُرور کی یہ بات بالکل صادق آتی ہے کہ ریاض مجید کی غزل:

"وہ نگار خانہ ہے، جو Miniature Painting سے آراستہ ہے۔" (۹۳)

”خاک“ میں عصری وسماجی شعور کی بازگشت:

ریاض مجید کا شمار بلاشبہ لائل پور کے چوٹی کے شعرا میں ہوتا ہے، ان کا نعت کے حوالے سے بُلند مقام ہے اور یہی ان کی پہلی پہچان ہے۔ اُنھوں نے نعت میں ایک بُلند مِعیار قائم کیا ہے علی الخصوص نعت کے محامد و محاسن کو جس تنقیدی نقطہ نظر کے ساتھ اُنھوں نے بیان کیا ہے وہ واقعی قابلِ داد ہے۔ نعت کے علاوہ غزل میں بھی ان کا اپنا ایک رنگ ہے اور وہ اس معاملے میں انفرادیت رکھتے ہیں۔ لائل پور میں اور بھی بہت اچھّے اچھّے شعرا موجود ہیں اور قادر الکلام بھی ہیں۔ ریاض مجید اپنی تہذیب سے اور اپنی مٹّی سے گہری جڑت رکھنے والا شاعر ہے۔ یہی اُن کی انفرادیت ہے، جو ریاض مجید کی غزل کو دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے، لہٰذا بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

> ”خارجی زندگی اور اِس کے ارضی پہلوؤں کو غزل میں سمونے، نیز مادے اور روح میں ایک نئی سطح پر مفاہمت تلاش کرنے کے لیے مقبولِ عام طریق تو وہی تھا، جسے اقبال اور اُس کے فوراً بعد آنے والے شعرا نے اختیار کیا، یعنی پرانی علامتوں کو نئے مفعوم میں استعمال کرنے کا رُجحان! لیکن بیسویں صدی نے نئے مظاہر اور نئی آوازوں کی مدد سے، انسان کی جُملہ حسیّات کو اِس طرح متاثر کیا کہ اب بہت سی ایسی قریبی اشیا بھی اُن حسیّات کی دست رس میں آنے لگیں، جو پہلے اُن سے گریزاں تھیں۔“(۹۴)

وزیر آغا نے پرانی تراشیدہ تراکیب کو نئی معنویت کے ساتھ اپنی غزل میں سمویا ہے۔ اُن کے ہم عصر اور بھی کئی نابغۂ روز گار ادبا و شعرا موجود ہیں، مگر یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ارد گرد پھیلے تضادات، بوالعجبیوں اور مسائل کا مشاہدہ جس دیدہ وری اور ژرف نگاہی کا ریاض مجید نے کیا اور پھر جس شگفتہ اُسلوب بیان میں پیش کیا وہ فقط اِنھی کا خاصہ ہے۔ جدید اُردُو شاعری میں اوّلین توجُّہ اس امر پر مرکوز کی گئی ہے کہ تاثر کی گہرائی کس طرح سے پیدا کی جائے اور وہ کون سے پیمانے یا ادبی میعارات ہیں، جن کی وساطت سے شاعری بالخصوص غزل میں تاثر کی گہرائی پیدا کی جاسکتی ہے؟ کیوں کہ غزل تاثیر مانگتی ہے اور یہ تاثیر غزل میں تغزل کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔ غزل کا دامن اگر تغزل سے خالی ہے، تو محض ذہنی مشق تو ہو سکتی ہے اسے غزل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ غزل عروض کا نام بھی نہیں ہے۔ بل کہ یہ علمِ عروض سے کہیں آگے تجربے، مشاہدے اور اس میں باطن کے اجزا کی پھینٹ سے بننے والے مشمولات کا ہونا لازم ہے۔ یہ وہ لوازمات ہیں، جو غزل کہنے والوں نے خصوصاً معاصر غزل میں تاثیر کی گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کے لیے مدخول کیے ہیں۔ اس حوالے سے ریاض مجید کی شاعری انتہائی متمول نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں جابجا ان اجزا کی پھینٹ سے بننے والا خمیر نظر آتا ہے۔

شاعر نے اپنے باطنی و خارجی سفر کے ساتھ جن متذکرہ معروضات ولوازمات کو شامل کیا ہے ان کے نظم وضبط اور ان کی ایک دوسرے کے ساتھ تطبیق میں بھی ایک نیا پن موجود ہے۔اِسی وجہ سے ان کے اظہاریے میں ایک احساسِ شگفتگی و تازگی نظر آتی ہے:

جو سیلِ دردا ٹھا تھا وہ جان چھوڑ گیا
مگر وہ جسم پہ اپنا نشان چھوڑ گیا!
ذرا سی دیر کو بیٹھا ، جھکا گیا شاخیں
پرندہ پیڑ میں اپنی تھکان چھوڑ گیا (۹۵)

اُردُو کے جدید غزل گووں، جن میں احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، فیض احمد فیض، اقبالؔ اور جون ایلیا وغیرہ کے نام آتے ہیں، اُنھوں نے غزل میں داخلیت و خارجیت سے آگے بڑھ کر اس میں جدید لب و لہجے اور آج کے دور کے ذائقوں کے سمندر کا لمس پیدا کیا اور اس میں خارجی مناظر میں بھی وہ چیز پیدا کر دکھائی، جو صرف اور صرف افسانے یا ناول میں کی جا سکتی تھی یا جس کی بھنک خاکہ نگاری میں ملتی ہے۔بعد از تقسیم اُردُو شاعری میں کئی طرح کے رجحانات پیدا ہوئے۔غزل کو اقبال نے ارفعیت سے ہم کنار کیا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق:

”اقبال کے بعد آج تک جدید اُردُو غزل کے دو رنگ زیادہ زیادہ شوخ ہوئے ہیں، اور یہ عجب بات ہے کہ اُن دونوں رنگوں نے زیادہ تر اثرات اقبال ہی سے قبول کیے ہیں۔پہلا رنگ اقبال کی غزل کے بلاواسطہ اثر کا مظہر ہے۔غزل میں عورت اور مرد کی باہمی محبّت کی ہزار تدریجات، نظر کے سامنے اُبھرتی ہیں اور سراپا نگاری اور معاملہ بندی کے جُملہ مراحل نمودار ہوتے ہیں۔۔۔لیکن اقبال کے ہاں محبّت کا جنسی پہلو پس منظر میں رہا۔۔۔اقبال کی غزل میں فرد نے خود کو خالص آسمانی فضا سے بھی منسلک رکھا اور خالص زمینی معاشرے سے بھی اپنے بندھن اُستوار کیے اور زمین اور آسمان، بندے اور خدا، جُز اور کُل کے باہمی ربط پر ایک گہری نظر بھی ڈالی۔۔“ (۹۶)

اقبال نے غزل کو، جو ارفعیت عطا کی اُس کے بعد فیضؔ نے آکر اُس میں انقلابیت کی روح پھونک دی۔یوں غزل کے لب و لہجے میں جس طرح کی مانوسیت اور سادگی، جون نے آکر پیدا کی وہ اِنھی کا خاصہ ہے۔تحریر و تقریر کا اور عام بول چال کا انداز غزل میں، جونؔ نے پیدا کیا۔غزل کو مکالمہ بنانے والے بھی وہی ہیں۔یہاں یہ حقیقت ماننی پڑتی ہے کہ غزل اپنے مزاج کے حوالے سے:

”مکمل مزاجی کیفیت کا اظہار رکھتی ہے۔“(۹۷)

ریاض مجید نے بھی اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے غزل میں بدلتے رجحانات کو مناسب جگہ دی اور طرزِ کہن پر اڑے نہیں رہے۔اُنھوں نے انقلاباتِ زمانہ کو خندہ پیشانی سے گلے لگایا، مگر خود اس میں بہہ نہیں گئے بل کہ حدِ اعتدال میں رہ

کر اس کے اثرات کو قبول کیا۔ ان کے ہاں تاثر کی گہرائی اور گیرائی دونوں لوازمات ملتے ہیں اور قاری جب ان غزلوں علی الخصوص ''خاک'' کی غزلیات کو پڑھتا ہے تو اس کی نہ صرف باصرہ کو مناظری اور شعری گلگشت سے تسکین ملتی ہے بل کہ وہ خود کو شاعر کی واردات کا حِصّہ سمجھتا ہے اور غزل کے باطن میں وہ چیز دریافت کر لیتا ہے، جو اسے ایک افسانے یا اچھّے ناول سے مطلوب ہوتی ہے اور جسے ارسطو اپنی مخصوص اصطلاح میں ''کیتھارسس'' یعنی تزکیہِ نفس سے تعبیر کرتا ہے۔

شاعر یا افسانہ نگار جس طرح سے اپنی ذات میں غزل یا نظم کو تحلیل کرتا ہے پھر اس کی صورت گری اپنی متخیلہ اور متصوُّرہ کے سانچے میں تشکیل دے کر خود اپنے آپ کا جب غزل کے مزاج میں تشکل کرتا ہے تو وہ ایک لمبے چوڑے تخلیقی عمل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ اِسی طرح احساس میں ادبی عنصر کا پیدا ہونا اس امر کا متقاضی ہے کہ شاعر خارجی اور داخلی مظاہر و مناظر کو اپنی ذات کے لمس کی جمال آفرینی سے بیان کرے۔ جدید اُردو غزل میں اس قسم کے اُسلوب کو آزمانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس قسم کی کاوشوں میں لفظ کو اُلٹنے، معنی کی معکوسی صورت ابھارنے اور شاعرانہ لطافت کو بیانیہ میں پرونے کی کاوش زیادہ نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اِس ضمن میں جدید غزل کی بابت رقم طراز ہیں:

> ''جدید اُردو غزل کا فروغ اِس بات کو ثابت کرتا ہے کہ غزل میں زمانے کی ہر نئی کروٹ کو اپنے خاص لہجے میں بیان کرنے کی بڑی صلاحیّت ہے اور یہ اپنے رمزیہ اور ایمائی انداز کی مدد سے سامنے کی چیزوں کو بھی اجتماعی تجربے کے اظہار کے لیے استعمال کرنے پر قادر ہے۔''(۹۸)

شاعر کے ہاں خارجی اور باطنی دنیا کے تاثرات اس قدر گہرے منقش ہیں کہ وہ اس کی شاعری میں تاثر کی گہرائی پیدا کرنے میں کامیاب طور ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ اس میں ہمیں شاعر کی قوت اور واقعات و حالات کے اخذ و اکتساب کے لیے فکری بصیرت کا درست استعمال بھی نمایاں نظر آتا ہے، جو کہ ایک شاعر کے بنیادی اوصاف میں سے ایک ہے۔ غزل کا شاعر اگر یہاں چوٹ کھا جائے، تو جہاں وہ خود متاثر ہوتا ہے، وہاں ناقدینِ غزل کو شاعر سے قطع نظر صنفِ غزل کی مخالفت اور اعتراض کا موقع مل جاتا ہے۔

غزل کے ایسے ہی سقم کا تذکرہ درج بالا حوالے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی کیا ہے، جہاں پختہ گو شعرا بھی چوٹ کھا جاتے ہیں۔ شمیم احمد کے درج بالا حوالے کو اگر غالب، اقبال اور فیض کے ہاں تلاش کیا جائے، تو یقیناً ناکامی ہوتی ہے۔ کیوں کہ اُن کی غزل میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہے، جو غزل کے تمام تر لوازم کے ساتھ اور بھی بہت کُچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ غزل کی تاثراتی اور جذباتی فضا کا تجزیہ ہوا، مگر لسانی حوالے اور شعر کی فنی مقتضیات کے اعتبار سے اگر ہر شاعر کا تجزیہ کیا جائے تو سلیس زُبان کے، جو تقضیے قائم ہوتے ہیں تو وہ ان میں پورا نہیں اترتا۔ بعض کے ہاں محاورے کا فقدان نظر آتا ہے، تو بعض کے ہاں معنیاتی تلازمہ بندی نہیں ہوتی۔ شعر میں سہلِ ممتنع کی شان پیدا کرنے کی مقدور بھر کوشش اپنی جگہ، مگر

شعری سانچے کے اندر رہ کر بہر کیف اس میں سادگی اور نثریہ شان پیدا کرنا اور ایک جمالیاتی نقش تخلیق کرنا اُن پر واجب ہوتا ہے۔ ریاض مجید نے ان شعری واجبات کو کمال خوبی سے پورا کیا ہے۔ جیسے کے ذیل کے اشعار میں اس بات کا پتا ملتا ہے:

گلی میں تیز ہَوا ، گھر میں تیرگی ہے بہت
چراغ رکھیں کہاں ، دل کہاں پہ رکھا جائے؟ (۹۹)

شاعر منظر کو اپنی شریر آنکھ سے دیکھتا ہے اور حیرتوں کو جگانے کے بہانے منظر کی تمام ناہمواریوں کو ابھارتا ہے۔ وہ قاری کو بھی آمادہ کرتا ہے کہ وہ اس منظر نامے میں اپنے آپ کو شامل کرلے اور شاعر کا شریکِ جلوہ بن جائے۔ کبھی یہ منظر شریک ہونے والے کو رلاتا ہے، تو کبھی اسے کھل کر قہقہہ لگانے پر مجبور کرتا ہے۔ چناں چہ وہ شگفتہ کیفیت، جو غزل کو یا کسی بھی تخلیقی فن پارے کو قاری کے قریب تر کر دیتی اور قاری پر داخلی مُسرّت کا دروازہ کھول دیتی ہے وہ شعری مُسرّت کا جُز بن جا تی ہے، مگر غزل میں یہ چیز اگر مقصود بالذات بن جائے، تو منظر کا بیان ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے اور یوں غزل کا اساسی تصوُّر مجروح ہونے لگتا ہے اِنھی وجوہ کی بنا پر کسی چیز کا یا مقصدیت کا شعوری طور پر غزل کا جُز بدن بنانے کی کوشش نہیں کی جا تی، جن شعرا نے یہ شعوری کوشش کی ہے، اُن کی شاعری بنیادی طور پر ان کے نظریے و مقصد کے منشور نامے بن گئے ہیں اور انھیں غزل کا شیریں ثمر قرار دینا مناسب نہیں۔ غزل کے ادبی پن میں اس حقیقت کا عمل دخل بہت زیادہ ہے کہ شاعر نے اس سفر کے لیے کون سا وسیلہ استعمال کیا ہے اور متخیّلہ و مدرکہ اور مشاہدہ و مناظرہ کے مختلف مقامات پر رفت و بود میں کتنی زمانی مسافت کو طے کر لیا ہے۔

شاعری چوں کہ دنیا کا قدیم ترین فن ہے اور اس فن کے ذریعے نہ صرف ایک نئے وجود کو دریافت کیا جاتا ہے بل کہ نامعلوم کا اسرار دریافت کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ اس لیے شاعری نے اپنا اوّلین رابطہ متخیلہ سے قائم کیا ہے۔ اس سے ایک نقطہ نظر تو سامنے آیا کہ شاعری کا اساسی عنصر متخیلہ کو قرار دیے بغیر بڑی شاعری تخلیق نہیں کی جاسکتی۔۔ اوّل الذکر نقطہِ نظر میں یہ صداقت مو، جو دہے کہ دنیاے قدیم کی بڑی بڑی کہانیوں میں مرکزی کردار مہم جوئی کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ طلسمات کے ہفت خواں طے کرتا ہے۔ ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں سے گزرتا ہے۔ بالآخر گوہر مراد حاصل کر کے کا میاب و کامران واپس لوٹتا ہے۔ ہومر کی اوڈیسی، طلسم ہوشربا، قِصّہ چہار درویش اور افسانہ آزاد وغیرہ میں ہیرو اساسی طور پر سفر پسند اور مہم جو ہے۔ اُسے نہ صرف نئی زمینوں اور نئی تہذیبوں سے پالا پڑتا ہے بل کہ وجودی سفر کے عمل سے وہ اپنی شخصیت کا رنگ اتارنے اور داخل کی روحانی پرت کو نکھارنے کی سعی بھی کرتا ہے۔ چناں چہ ان کہانیوں کا خمیر سفر کے قوام ہی سے اٹھایا جاتا ہے۔ شاعر بھی یہی فریضہ انجام دیتا ہے اس کی قوتِ متخیّلہ اس کو قریب و بعید کے سفر پر آمادہ کرتی ہے اور اسے ان مقامات کی سیر کرا دیتی ہے، جو کسی کہانی کار یا افسانہ نگار کے بس کی بات نہیں ہوتی، جو کسی کہانی یا ناول کے فرضی کردار کی طرح کا شبیہ تو رکھتی ہے، مگر اس کے وجودی عوارضات سے بے نیاز ہوتی ہے۔

متخیّلہ بذاتِ خود شاعر کے ذہن میں ایک کردار کی صورت میں ہئیت پذیر ہونے کی قدرت سے مالامال ہوتی ہے۔ کسی نادیدہ جزیرے کی سیر ہو یا کسی ہفت خواں کا سفر، یہ برابر شاعر کو اس کی مسافت طے کرنے پر ابھارتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اچھّا شاعر اس کے زور پر آنے والے واقعات کی پیشین گوئی بھی کرتا ہے اور عامۃ الناس سے بالاتر ہو کر کسی امر واقعہ کے ہونے یا نہ ہونے کا ادراک بھی رکھتا ہے۔ ریاض مجیدؔ کے ہاں متخیّلہ کا یہ بنیادی کرادر بدرجہ کمال فعالی صورت میں موجود ہے۔ ان کے ہاں مابعد الطبیعاتی مضامین اِسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ ان کے ہاں یہی مقام تو قیدِ مقام سے نکلنے اور حبسِ دوام سے پیچھا چھڑانے کا مقام ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کرنے سے آپ کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاے گا:

ہمارے پاؤں میں ہے چاپ اُن آتی صدیوں کی
جو دُور تر رہِ اَجداد سے نکلتی جائیں (۱۰۰)

ریاضؔ الفاظ معنی آشنا ہم کر رہے ہیں
کہ لاموجود کو موجود کرتے جا رہے ہیں (۱۰۱)

ریاض مجید کی غزلوں میں اظہار کی ندرت بھی ہے اور خوب صورت قرائن کے ساتھ مابعد الطبیعاتی مضامین کو بیان کیا ہے۔ ان کے ہاں فنِ شعر کی پختگی بھی نمایاں ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخاست دیکھیے یا پھر صنائع بدائع کا استعمال ہو، ہر ممکن قرینے کو جمالیات کا لبادہ دے کر خوب صورت مُرقّع تشکیل دیا ہے۔ ان مضوعات کو فرسودہ اور قدامت پرستانہ کہنا بھی جائز نہیں اور اس طرز کو طرزِ کہن قرار دینا اس لیے مناسب نہیں کہ شاعر نے کسی موجود زمین پر سفر کرنے کے بجائے زیادہ تر متخیّلہ کی ضرورت کے مطابق نئی سر زمینیں خود تخلیق کی ہیں۔ اور شعر کے بطون میں متخیّلہ کی مملکتوں کے عجائبات جمع کر دیئے ہیں۔ نتیجتاً ان کی شاعری کو اس عنصر نے تحریک عطا کرنے اور اس کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں معاونت کی ہے اور اس کی صرف تخلیقی سطح ہی کو نہیں منظر پر لایا گیا بل کہ اس کا معروض بھی مِن و عَن ساتھ موجود ہے۔ ان کے اشعار میں الفاظ کے تخلیقی برتاؤ نے مزید اس جمالیات کو ابھارا ہے اور اِسی پر ریاض مجید کی شاعرانہ انفرادیت کا مدار ہے۔ یہ اشعار اس پر دال ہیں:

ذرا سی دیر کو بیٹھا جھکا گیا شاخیں
پرندہ پیڑ میں اپنی تھکان چھوڑ گیا (۱۰۲)

شاعر کی اس تخلیقی اپج سے شاعری متمول ہوتی ہے اور اس میں آنے والے شعرا کے لیے نئے امکانات پیدا کرنے کی وسعتِ قلبی پیدا ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ ہماری آج کی شاعری میں کسی بھی روایت کا موجودہ برقی مواصلات کی موجودگی میں دخیل ہونا کوئی بعید از قیاس امر نہیں ہے اور، جو روایت یا ادا ایک بار رواج پا جاتی ہے اس کے بعد مدتوں اس کا چرچا رہتا ہے اور اس کے اثرات کے تحت پوری ایک نسل آجاتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس روایت میں ایسی کشش اور جاذبیت ہو کہ نئی نسل اس کی طرف اپنے آپ کو خود بخود متوجُہ کر لے۔ اس کی مثال جونؔ ایلیا کی ہے۔ جون ہر نوجوان کا پسندیدہ شاعر ہے اور اس کی

شعری روایت، الفاظ کے برتاؤ اور بطرزِ اظہار سے ایک پوری نسل متاثر ہوئی ہے۔ اس نے اپنے لب و لہجے اور مشاعرے میں شعر کی ادائی سے لوگوں کے دل جیتے ہیں۔ اِسی طرح کوئی بھی شاعر جب تک اپنی انفرادی روایت کو لے کر نہیں آتا اس کی شاعری میں عوامی رنگ پیدا نہیں ہوتا۔

ماضی پر نظر دوڑائی جائے تو علم ہوتا ہے کہ روایت کو اہمیت اس لیے حاصل ہوئی کہ اس سے اگلی نسل اپنے قصر شاعری کو تعمیر کرتی تھی اور اپنے سے پہلے زمانے کی اقدار سے مانوس تھی، لہٰذا روایت کو ایک عظیم شئے جان کر عہد بہ عہد سفر طے کیا گیا۔ اب بھی روایت معتبر ہے جتنی کل تھی، مگر اس کی تقلیدی روش دم توڑ چکی ہے۔ چناں چہ تخلیقی سفر نے حقیقی سفر کی اور شاعری کی داخلی جہت نے اپنی خارجی جہت کی صورت اختیار کر لی۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

> "نئے زمانے کی برق رفتاری نے خود جدید غزل گو شاعر کی ذات کے اندر ہیجان سا برپا کر کے، اُسے نئی قدروں کی تلاش پر اکسایا ہے۔"(۱۰۳)

اِس حوالے سے غزل اور نظم کی روایت میں، جو مشترک اقدار ملتی ہیں۔ اُن کی حیثیت موضوعی ہی نہیں معروضی بھی ہے۔ اس اجمال سے یہ نتیجہ برآمد کرنا مقصود ہے کہ علی الخصوص غزل میں ادبی عناصر یا ادبیت کا ناگزیرپن کیوں کر معرض و جود میں آتا ہے اور یہ سفر ایک معروضی حقیقت ہوتے ہوئے اور ایک خارجی طبیعاتی تجربہ ہو کر بھی ایک داخلی اور تخلیقی سفر کس طرح بنا۔ اُردُو غزل کو اس حوالے سے اگر دیکھا جائے، تو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اس میں معروضی دنیا کے تاریخی بیانیے میں تخلیقی سفر کی بازگشت سنائی دینے لگتی ہے۔ البتہ اس کی گونج اتنی پر تاثیر اور زور آور نہیں ہے، جو بعد از تقسیم ہند اُردُو غزل کا خاصہ ہے۔

قبل از تقسیمِ ہند اُردُو شاعری میں ایک بھونچال دو تہذیبوں کے تصادم سے بھی آیا اور اس کے اُردُو شعر و ادب پر دور رس اثرات مُرتّب ہوئے۔ نتیجتاً ہمارا شاعر طرزِ کہن سے نکلا اور تخیّل کی سر زمینوں میں گشت کرنے کے بجائے اس نے خود کو جب معروضی دنیا میں اتارا تو اسے زمینی حقائق کا علم ہوا اور یہی زمینی حقائق اس کے لہجے کی کاٹ بن کر سامنے آئے۔ چنانچہ غزل و نظم دونوں کا دامن وسیع ہوا۔ اس کے برعکس سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں شاعر بذاتِ خود اگر نئے ممالک کے سفر کرتا اور وہاں کی تہذیب و تعلیمات سے متاثر ہوتا تو اس کی شعری روایت میں بدلاؤ آتا ورنہ وہ ساری عمر داخلیت کے چکر میں ہی رہتا۔ اٹھارویں صدی کے اوخر اور انیسویں و بیسویں صدی کے شعرا نے بدیسی معاشرت کی نقشہ کشی بالکل اُسی انداز میں کی ہے، جس طرح ناول نگار اور ڈراما نگار اپنے کرداروں کے ذریعے کسی معاشرت کی تصاویر ہمیں دکھاتا ہے۔ یوں شاعر کا یہ رخ ہمیں ایک لحاظ سے ناول نگار یا ڈراما نگار کی شخصیت کے قریب نظر آتا ہے ور اُن میں ادبیت کی شان پیدا ہوتی دکھا ئی دیتی ہے۔ مثال کے طور نظیر اکبر آبادی اور اکبر الٰہ آبادی کی شاعری دیکھ لیجیے، جس سے ہندوستانی تہذیب میں ولایتی

تہذیب کی تخریب کاریاں صاف طور پر دکھائی گئی ہیں اور ہندوستانیوں کو اس امر سے متنبہ بھی کیا گیا ہے کہ بدیسی تہذیب اور بود باش کے اثرات کے تحت ان کی اپنی تہذیب و ثقافت خطرے میں ہے اور ان کے نظریات پر کاری ضرب لگائی جا رہی ہے۔ نظیر اور اکبر کو دیکھ کر انور جمال کی بات صادق آتی ہے:

"نظم انسان کی مذہبی اور فطری صلاحیّت کی وہ معجز نمائی ہے، جس کے عملی عناصر کی تلاش کرنا، ناممکن ہے۔ ہم آسانی سے اُسے تخلیق اور تخیّل کی کار فرمائی کا نام دے سکتے ہیں ۔"(۱۰۴)

نظیر کی نظموں میں پنجاب کی تمام تہذیب سانس لیتی ہے ۔ نظیر اور اکبر نے اہلِ فرنگ کے مجموعی مزاج، کثیر الامتزاجیت، مزاج کے تشکیلی عناصر اور مذہبی اقدار کے شخصیات پر اثرات اور اُن کے تہذیبی و تمدنی استنتاج کو تجزیاتی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ اس وقت کی ضرورت تھی اس لیے ایسا کیا گیا، مگر بعد میں یہ روش روایت کے درجے پر نہ پہنچ سکی کیوں کہ اس کی ضرورت نہ رہی تھی اور آنے والے شعرا نے اس کی جگہ ایک طاقت ور اور صحّت مند روایت ڈال دی تھی، جس میں اقبال کا سب سے زیادہ حِصّہ ہے۔ اقبال نے اپنی انفرادیت سے، جو روایت قائم کی اس سے بیسویں صدی مجموعی طور پر متاثر ہوئی ہے۔ ہر صدی میں اس طرح کی روایتیں قائم ہوتی ہیں اور چھوٹے بڑے شعرا اس کے تتبع میں شعر کہتے ہیں:

"اپنی قوم کو مغربی تہذیب سے محفوظ رکھنے کے لیے اقبال نے طنز و مزاح کے حربوں کو عام طور پر استعمال کیا۔ تاہم اقبال نے بہت جلد اکبر کے طنزیہ طریقِ کار کو ردّ کر دیا اور وہ ایک علمی اور نظریاتی سطح پر مغربی تہذیب کے خلاف صف آرا ہو گیا۔" (۱۰۵)

اِس طرزِ تقلید سے اقبال جیسے شاعر اگر دامن کشاں نہیں ہو سکے، تو اِس فطری تتبع سے کسی طور پر انکار ممکن نہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اِس تقلیدی رنگ میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ ہمارے دور میں، جو روایت قائم ہوئی ہے وہ جدید لب و لہجے کی غزل یا نظم کی روایت ہے، جس میں اندازِ بیان کا بدلاؤ اور اظہار کا ذائقہ اپنی ندرت اور تازہ کاری سے پہچانا جاتا ہے۔

یہ روایت پچھلی صدی کے نصف آخر کی قائم کردہ ہے اور اب تک چل رہی ہے۔ معاصر شعرا نے اِسی روایت کو قبول کیا ہے۔ اب اس تمہید کا مقصد یہی تھا کہ اس حوالے سے ریاض مجید کی شاعری کو پرکھا جائے۔ مبدل بہ زمانہ روایت میں جان ہوتی ہے اور اس کی کشش سے کوئی بھی شاعر بچ نہیں سکتا۔ کہیں نہ کہیں وہ اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال غالبؔ کی انفرادی روایت ہے، جو غزل میں اس نے قائم کی جسے ہم غالبؔ کا انداز کہتے ہیں۔ غالب شکنی میں یاس یگانہ چنگیزی کا نام کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ اس نے ساری زندگی غالب شکنی کی، مگر عجیب بات یہ ہے کہ یگانہ بھی غالبؔ کے اثر سے بچ نہیں سکا اور اس کی شاعری پر بھی غالبؔ کی قائم کردہ روایت کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اس حکیمانہ طرزِ اظہار در اصل غالبؔ ہی کا دین ہے

۔اِسی طرح آج کا شاعر اپنے عصری ماحول کی قائم کردہ روایتوں سے تہی پہلو نہیں ہو سکتا۔ وہ ان کا اثر قبول کرتا ہے اور اس میں کُچھ کُچھ اپنی انفرادیت کا رس بھی گھولتا ہے۔

ریاض مجید بھی عمومی شعرا کی طرح اپنے عہد کے رجحانات سے متاثر ہونے والے شعرا میں سے ہیں، لیکن ان میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ صحّت مند روایت سے متاثر ہوتے ہیں۔ مضحکہ خیز اور نامعقول روش پر اُنھیں چلنا نہیں آتا۔ مثال کے طور پر ظفر اقبال ہی کو لیجیے ،جو بزعمِ خود غالبؔ سے بھی بڑا شاعر کہلوانے کی آرزو رکھتا ہے اور اس کا اظہار بھی کئی بار بڑے بھدے طریقے سے کر چکا ہے ۔اس نے غزل میں ،جو ہزل کی روایت قائم کرنے کی کوشش کی ہے، اس کا تتبع ایک خاص نو،جوان طبقے نے کیا ہے، مگر ہر اچھّا شاعر اس قسم کی فضولیات کا انجام پہلے ہی سے بھانپ لیتا ہے اور اس طرح کی ہرزہ سرائیوں اور مضحکہ خیزیوں سے دور رہتا ہے۔ ظفر اقبال نے غزل میں اپنی انفرادی روایت قائم کرنے کی دوڑ دھوپ میں غزل کی روح کو مجروح کیا ہے، کیوں کہ:

> ”غزل کا فن اسالیبِ اظہار کے نو بہ نو رنگوں کے ساتھ ہمارے تہذیبی اور تمدّنی مزاج کی آئینہ داری کرتا ہوا ہر عہد اور ہر زمانے کی روح کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔“ (۱۰۶)

ظفر اقبال نے غزل کے اِس تہذیبی اور تمدّنی مزاج سے صریحاً انکار کیا ہے، لہٰذا اُس کی شاعری ایک کباڑیے کی دکان سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، جس میں فرسودہ قسم کی تعفن آمیز اشیا بکھری پڑی ہوتی ہیں۔ اور ان کی بے ترتیبی و بے نظمی سے دیکھنے والے کو تے آتی ہے ۔یہی حال ظفر اقبال کی قائم کردہ شعری روایت کا ہے ۔اس طرح کی فضولیات سے ریاض مجید کا دامن پاک ہے اور اُنھوں نے عصرِ حاضر کی روح کو اپنی شاعری میں پھونکا ہے ۔اس کے ساتھ اُنھوں نے اپنے اُسلوب کی انفرادیت کو بھی برقرار رکھا ہے۔ البتہ کوئی ایسی روایت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی، جس سے شعرا کی ایک نسل متاثر ہو۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کتابِ عمر میں ہر ایک جا اُداسی ہے
متن سفید ، سیہ حاشیہ اُداسی ہے (۱۰۷)

لفظی تکنیک کا موزوں انتخاب و استعمال شعر سے دل چسپی اور اُس کے فنی حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ تاہم اصل اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ شاعر نے اپنی قوت باصرہ اور متصوّرہ و متخیلہ سے کس طرح کام لیا ہے اور واقعات کے اخذ و اکتساب کے لیے اپنی ذہنی بصیرت کو کیوں کر استعمال کیا ہے۔ شاعری کا مواد سادہ انداز میں پیش کر دیا جائے، تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ شعر کی مجموعی فضا قاری کو فوری طور پر اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، لیکن مواد اچھّا نہ ہو، تو اچھے لفظوں کی تکنیک بھی شعر کی داخلی خوبیوں کو اجاگر کرنے میں معاونت نہیں کر سکتی اچھّے مواد کو پیش کرنے میں اچھّے لفظ کی تکنیک اُس صورت میں استعمال ہو سکتی ہے، جب ایک شاعر اور اس میں موجود ایک فن کار دُونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلتے ہیں۔ شاعر اپنی تیز باصرہ سے

ماحول کی جزئیات کو سمیٹتا ہے اور فن کار ان جزئیات کو خوب صورت اور دل کش انداز میں جاذبِ توجّہ اُسلوب میں یوں پیش کرتا ہے کہ پورا منظر متحرک ہو کر قاری سے ہم کلام ہو جاتا ہے۔ ریاض مجید کے ہاں لفظوں کی یہ تکنیک خُوب صُورت طریقے سے استعمال ہوئی ہے اور ان کے اندر کے فن کار نے اس میں فنِ شعر کے رنگ بھر دیے ہیں۔ ذیل کا شعر ملاحظہ کیجیے:

ریزہ ریزہ کوئی شے ٹوٹ رہی ہے مجھ میں
عمر لے آئی ہے کس دُکھ کے کٹاؤ میں مجھے (۱۰۸)

ریاض مجید نے اپنے مجموعۂ غزلیات ''خاک'' میں اگرچہ لفظ کی اس تکنیک کا استعمال کیا ہے، جس میں مشاہدہ اور فن کا متزاج ملتا ہے یا فکر و فن کا امتزاج ملتا ہے، مگر اس قدر قلیل کہ قاری تاثر کی گہرائی کے اُس تلذّذ اور شاعر کے اس تجربے سے نہیں گزرتا، جو جدید اُردو غزل کو پڑھ کر حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''خاک'' کی غزلیات کو خالصتاً اس تجربے کی چاشنی سے معمور قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مزید یہ ہے کہ ''خاک'' کی ان غزلیات کا اُسلوب تخلیقی سے زیادہ اپنے معاصر نامے کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ یوں ان غزلیات کا حلقہ اثر جدید اُردو غزل کے مقابلے میں محدود نہیں ہوتا بل کہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ ''خاک'' کی شاعری اپنے عہد کے آشوب کو بھی ساتھ لیے ہوئے ہے۔ اس میں سیاست سے لے کر گلی محلے کی معاشرت کے مسائل کا شعور ملتا ہے۔ ریاضؔ مجید کی غزل کا یہ غزل آج کے اہلِ سیاست اور عمائدینِ مملکت کی بے ایمانیوں کی طرف علامتی انداز میں اشارہ کرتی ہے، جو ملک کی ہر چیز کو ایک ایک کر کے چند ہاتھوں میں بیچ رہے ہیں۔ نجی کاری کا یہ مکروہ عمل ملک و قوم سے سرِ عام غداری ہے مگر کوئی روکنے والا نہیں ہے:

چلو درخت تو دشمن کے ہات میں بِک جائیں
مگر یہ کیا کہ پرندے بھی سات میں بِک جائیں؟
بڑا حریص ہے سوداگر ان زمینوں کا
اُسے یہ ضد ہے مزارع بھی سات میں بِک جائیں (۱۰۹)

ریاض مجید نے ماضی کی گم گشتہ یادوں کو تازہ کرنے اور اپنی جنم بھومی کی یادوں سے معمور اور جذبات سے مفرح ہوا کے پالنوں میں تازہ جھونکے لینے کی خاطر '' خاک'' میں تخیّلات کے زور پر سفر بھی اختیار کیے ہیں۔ ان کا یہ سفر ایک سیاح کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے کیوں کہ یہ متخلیہ کا سفر خُوش بُو کا سفر ہے، جس کے تخلیقی پسِ منظر میں ،جو سب سے نمایاں، جواز یا تحریک دکھائی دیتی ہے، وہ فقط حصُولِ مُسرّت اور روح کی شگفتگی کا اکتساب ہے۔ کیوں کہ غزل کے مزاج سے وابستہ:

''اُس کا بلا کا لوچ ہے، جس کے باعث وہ ہر طرح کے خیالات کو اپنے دامن میں سمونے کی صلاحیّت رکھتی ہے۔'' (۱۱۰)

یہی وجہ ہے کہ ریاض مجید کی بعض غزلوں میں ایک شاعر کی تیز باصرہ اور ایک فن کار کی متخیّلہ کی باہم آمیزش اور امتزاجی صورت نظر آتی ہے۔ ریاضؔ مجید نے ''خاک'' کی غزلوں کو اپنی ذات کی داخلی اور جذباتی روداد بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کے ہر ہر

لفظ میں نہ صرف یہ کہ ان کی ذات کے لمس کی خُوش بُو کا احساس ہوتا ہے بل کہ وہ خود کو اور قاری کو غزل کے داخلی نظام میں مبتلا کر لیتے ہیں۔ لہٰذا غزل کا شناور کسی نہ کسی طرح غزل کے نہاں خانوں میں جھانک لیتا ہے، جو اُس کی لطف اندوزی کو مہمیز کرتا چلا جاتا ہے۔ یہی وصف ان کے اُسلوبِ بیان کو تروتازگی اور شگفتگی سے ہم کنار کرتا ہے، وہ خارجی ماحول کو داخلی واردات کے لمسی اور داخلیت کے مناظر سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی مناظری جزئیات میں بھی ان کی ذات کا عکس دیکھا جاسکتا ہے۔

"خاک" کے فنی محاسن:

ریاض مجید ان شعرا میں سے ہے، جو فنِ شعر کے تمام اسرار ورموز پر نگاہ رکھتے ہیں۔ شعر کس طرح سے آفاقی وسعتوں کا حامل ہو سکتا ہے۔ ایسے کون سے عوامل ہیں، جو ایک کشی تخلیقی فن پارے کو عظیم بناتے ہیں؟ ان کا ادراک و شعور ریاض مجید کے ہاں بدرجہ اتم موجود ہے، کیوں کہ:

> "۔۔۔بڑی شاعری دفعتاً ظہور میں نہیں آجاتی۔ بڑی شاعری مدتوں شاعر کی شخصیت میں پکتی رہتی ہے، تب کہیں جاکے سامنے آتی ہے۔" (۱۱۱)

درج بالا حوالہ سے میری مراد ریاض مجید کی طویل ریاضت ہے۔ وہ ایسے باشعور فن کار ہیں کہ بڑی شاعری کے جُملہ لوازم اُن کے پیشِ نظر ہیں۔ اُنھوں نے بھی برسوں اِس چمن کی آبیاری کی ہے۔ اِس کے ساتھ ہی وہ لفظوں کے اِس قدر نبض شناس واقع ہوئے ہیں کہ وہ، جس لفظ کو بھی اپنے شعر میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کا مکمل جواز بھی فراہم کرتے ہیں۔ ان کے اشعار کا پوسٹ مارٹم کرنے سے پتا چلتا ہے کہ یہ فقط عروضی تجربے کا حاصل نہیں ہیں بل کہ ان میں شاعر کا ادراک و شعور اور اس کا شعری وجدان بھی شامل ہے۔ اس میں شاعر کی ذات کا داخلی منظرنامہ دکھائی دیتا ہے اور ساتھ میں فن کی ایسی پختگی، جو اُردُو شاعری کے اساتذہ کے ہاں نظر آتی ہے۔ غزل ایسی کافر صنفِ سخن ایک بھی اضافی لفظ کو برداشت نہیں کرتی اور اس میں غیر فصیح لفظ کانٹے کی طرح چبھتا ہے۔ لفظ کا صحیح استعمال ہی اسے فصیح یا غیر فصیح بناتا ہے اور یہی استعمال ہی اس کی قسمت کا فیصل ہوتا ہے۔ لفظی برتاؤ کی اس تکنیک کا موزوں اور بہترین استعمال ہی کسی شاعر کو جدید یا روایتی بناتا ہے۔

"خاک" کی غزلیات کا اظہار یہ تازہ ہے اور اس میں جدّت ترقّی پذیر ہے۔ ترقّی یافتہ اس لیے نہیں کہ ترقّی یافتہ کا تو ارتقائی سفر ہی ہمیشہ کے لیے رک جاتا ہے اور اس میں کوئی بدلاؤ نہیں آتا، جب کہ ریاض مجید کی شاعری میں ایسا نہیں ہے اور اس میں مسلسل تبدّلات ہر سطح پر آتے رہتے ہیں۔ ان کے شعر میں لفظ کے برتاؤ میں جدّت ہے۔ جدّت میرے خیال میں اظہار کے ذائقہ کو بدلنے کا نام ہے۔ ریاض مجید نے اپنے اظہار کے ذائقے کو بدلا ہے۔ ان کی بعض غزلوں میں الفاظ وتراکیب اور مشکل الفاظ کی ثقالت اس کے ددامن کو بوجھل نہیں کرتی۔ کم کم ہی ایسا کوئی شعر ہوتا ہے، جہاں معنیاتی تلازمہ بندی نہ ہو۔ وہ

اپنی تخلیق میں کوئی ایک شعر بھی بڑی فکر لے کر نہ آئیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے جدّت نہیں ہے۔کیوں کہ بنیادی اُصول یہ ہے کہ:

"بڑا شاعر پیدا ہوتے ہی بڑا شاعر نہیں بن جاتا۔اگر کسی شاعر کو کسی نئے رجحان کا نقیب بننا ہے،تو شروع ہی سے اُسے یہ حیثیت حاصل نہیں ہو جاتی۔ابتدائی مرحلے میں،تو کُچھ پر چھائیاں نظر آتی ہیں۔اپنے اصل مقام تک پہنچنے کے لیے اُسے ریاضت کی ایک پورے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔" (۱۱۲)

یہ بات ریاض مجید کی ریاضت کا منھ بولتا ثبوت ہے کہ اُن کے ہاں شعری قرینہ بھرپور التزام رکھتا ہے۔اُن کے کلام میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں،جو بہ ظاہر معنی کی عقدہ کشائی کے متقاضی ہیں۔اِس کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ اُن میں شاعر نے مہمل بات کی ہے۔ریاض مجید کے اِس قبیل کے اشعار میں جدّت پھر بھی ہوتی ہے اور وہ شعر کے ٹریٹمنٹ میں مخفی ہوتی ہے۔تمام اشعار میں سادہ مضامین کو سادہ اندازِ بیان دے کر اظہار کی گتھی میں سُلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔شعری جمالیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔غزل تغزل مانگتی ہے اور تغزل انفرادیت اور اظہار کے نئے ذائقوں کے بطن سے جنم لیتا ہے اور یہی تغزل،جو آج کی غزل کا سب سے بڑا مسئلہ ہے،بعض جدید شعرا کے ہاں بھی مفقود ہو جاتا ہے اور ان کی غزل محض بنجر زمین بن کر رہ جاتی ہے،جہاں جمالیاتِ شعری مفقود ہو جاتی ہیں۔علاوہ ازیں ریاض مجید کے ہاں سہولتِ گویائی موجود ہے۔عمر کے لحاظ سے شاعر کے ہاں تبدیلی واقع ہوتی ہے،مگر وہ تبدیلی اس کے فن کو آگے بڑھاتی ہے۔بڑھاپا آتا ہے،تو شاعری جوان ہوتی ہے۔بقول اسد اللہ خاں غالبؔ:

جتنی بڑھتی گئی پیری غالبؔ
اتنی میرے شعروں پہ جوانی آئے (۱۱۳)

عمر کے بڑھنے کے اعتبار سے ضعف فنِ شعر کو نکھارتا ہے۔اور فکر میں زیادہ پختگی در آتی ہے۔ایک اچھّے شاعر کے ہاں شعر کی جمالیات کو جلا ملتی ہے اور فن و فکر کے امتزاج سے ایک عظیم فن پارہ تشکیل پاتا ہے۔ریاض مجید کے ہاں فنِ شعر اوج پر ہے۔اُنھوں نے اپنی شاعری میں لفظ کی معکوسی صورتوں کی تکنیک استعمال کی ہے۔معنی کو الٹا کر اس سے ایک نئی معنویت کی تشکیل کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔یہ وہی شخص کر سکتا ہے،جو فنِ شعر پر کامل دستگاہ رکھتا ہو اور جس کا وسیع مطالعہ ہو۔ان کے بعض اشعار اِسی فن کے شاہ کار ہیں۔ایک دو شعر ملاحظہ کیجیے:

جو سیلِ درد اٹھا تھا وہ جان چھوڑ گیا
مگر وہ جسم پہ اپنا نشان چھوڑ گیا!
ذرا سی دیر کو بیٹھا جھکا گیا شاخیں
پرندہ پیڑ میں اپنی تھکان چھوڑ گیا (۱۱۴)

ا۔ فلیش بیک:

ڈاکٹر ریاض مجید نے اپنی شاعری میں ریڈیو کی ایک اصطلاح فلش بیک کا استعمال کیا ہے۔ اس تکنیک کے ذریعے ڈراما نگا ر سامعین کو زمانہ حال سے ازمنۂ قدیم میں لے جاتا ہے اور ماضی کی بھولی بسری داستانوں کو دہرا کر ان میں دوبارہ جدّت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے ذریعے قارئین کے ذوق مطالعہ کو عمل انگیز کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید نے فلیش بیک کی تکنیک کو " خاک " کی بعض غزلوں میں خصوصاً استعمال کیا ہے۔

انسان ماضی کی فرصتوں کو یاد کر کے بعض اوقات اپنے دل کی تسکین کا سامان کرتا ہے۔ ماضی کی فرصتیں اور احباب و اقارب کی بے لوث محبّتیں آج کے زمانے میں، تو محض خیالی باتیں ہی معلوم ہوتی ہیں۔ اگر یہ دلی سکون اور تسکین اسے میسّر آجائے تو انسان آج بھی ہزاروں صدیوں پیچھے کی جانب پلٹنے پر تیار ہے:

ہزاروں سال پیچھے لوٹ جانے کی تمنا ہے
دلِ سادہ کو کس گزرے زمانے کی تمنا ہے
جہاں پر صورتیں سب ایک اُس کے عکس جیسی ہوں
مری حیرت کو اس آئینہ خانے کی تمنا ہے (۱۱۵)

۲۔ منظر کشی:

ریاض مجید کے ہاں لفظی تصویر کاری اور منظر نگاری کے مُرقّعات وجود میں آتے ہیں۔ ان کے ہاں منظر جامد نہیں بل کہ متحرک ہیں۔ ان کے مناظر تخیلاتی بھی ہیں اور مبنی بر مشاہدات بھی ہیں، جو اِسی معروضی دنیا پر عکوس لیے ہوئے ہیں۔ وہ منظر میں جزئیات نگاری پر بھی خوب توجّہ دیتے ہیں۔ وہ، جو کُچھ دیکھتے ہیں قاری کو بھی دکھاتے ہیں۔ اُنھوں نے یہ خاص کوشش کی ہے کہ قاری کو ذہنی طور پر اپنے ہم راہ لے کر چلیں۔ ان کے مناظر ٹھہرے ہوئے اسپاٹ نہیں بل کہ چلتے پھرتے کرداروں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ وہ برجستہ تشبیہات و استعارات سے اپنی تصویروں کو نئی زندگی عطا کرتے ہیں۔ مصنف نے لفظوں سے، جو تصویریں بنائی ہیں وہ کس قدر مکمل اور جاندار ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

تُو پہاڑ پہ گری برف سا پاکیزہ ہے
اے مری روشنی ! اے صبح کے تارے میرے (۱۱۶)

ریاض مجید کی غزلوں میں قاری کے ذوقِ نظر کے لیے وہ سارا سامان مہیا کیا گیا ہے، جو اس کی آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے اور اس کی بصری جمالیت کی بہر طور تسکین بھی کرتا ہے۔ غزل چوں کہ داخلیت کا لمس مانگتی ہے اور داخلیت کے بغیر اس کے شوخ رنگ ابھر نہیں پاتے۔ اس میں چاشنی نہیں پیدا ہو پاتی، لہٰذا ایک غزل گو شاعر افسانہ نگار کی طرح اپنے سفر ناموں کے

مناظر میں بھی داخلیت کا امتزاج کرتے ہیں اور اس امتزاج سے سفر نامے کی داخلی روح قاری کے داخل میں جذباتی وحسیاتی سطح پر مدخل ہو کر اسے منظر میں لے جاتی ہے جہاں وہ خود شریکِ منظر بن جاتا ہے۔ اور بالکل اِسی تجربے اور تلذذ سے گزرتا ہے، جس سے مصنف کو سابقہ پڑا تھا۔ منظر کشی کو مرصع زُبان میں پیش کرنے کے عمل میں تخیّل کی اعلیٰ پرواز کی ویسی ہی ضرورت ہوتی ہے، جس طرح کہ شاعر کو آوُرد کی صورت میں شعر کہنے کے وقت ہوتی ہے۔ اس صورت میں زُبان پُر شکوہ ہو جاتی ہے اور اُسلوبِ بیان پر لفظی ثقالت حاوی ہو جاتی ہے، جس کے نتیجے میں ایک ناگواری اور بوجھل پن کا احساس ہوتا ہے اور شگفتگی و بے ساختہ پن تخلیق سے غائب ہو جاتا ہے ، مگر اس لحاظ سے ریاض مجید بڑے خوش بخت ہیں کہ ان کے ہاں جہاں کہیں بھی منظر کشی میں پُر شکوہ زُبان وبیان اختیار کیا گیا ہے، وہاں اس بات کا خصوصی اہتمام نظر آتا ہے کہ تحریر سے برجستہ بیانی اور شگفتگی کا عنصر غائب نہ ہو جائے۔ اس ضمن میں یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

آپ کو نصف سے بڑھ کر میں گنوا بیٹھا
جب کھلا مجھ پہ کہ سارے کی ضرورت تھی اُسے (۱۱۷)

۳۔ استعارات وعلامات:

ریاض مجید کی شاعری میں تشبیہ واستعارات کا استعمال دو سطح پر ہوتا ہے۔ ایک شاعرانہ اور دوسرا مجتہدانہ استعمال، جہاں تک شاعرانہ طور پر علامت و تشبیہ کا تعلق ہے، تو اس میں شاعر اپنی حساسیت اور روایت کے شعور کو استعمال میں لاتا ہے، لیکن موخر الذکر علامت و تشبیہ اور استعارات کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کی فکری بصیرت اور اس کے علمی اجتہاد کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ شاعر اس میں روایت کا پاس نہیں رکھتا اور نہ ہی اس کے ہاں اس ضمن میں کسی قسم کی تقلید ہوتی ہے بل کہ وہ اپنے فکری اجتہاد سے لفظ و معنی سے کھیلتے ہوئے نئے استعارے اور علامتیں تراشتا ہے۔ اس کی مثالیں میرؔ و غالبؔ کے ہاں بکثرت ملتی ہیں۔ استعارہ اور علامت غزل میں دوسری اصناف کے مقابلے میں ایک خاص تاثر پیدا کرتے ہیں۔ چناں چہ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی شاعری میں استعارے اور علامت کے استعمال سے پیدا شدہ معنویت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”شاعری کی لیے علامتی زُبان کا استعمال ایک بنیادی ضرورت ہے اور ہر دور میں شعرا نے علامتی اظہار سے کام لیا ہے۔ ہر استعارہ ایک علامت ہے کیوں کہ وہ اپنی لغوی حدود سے ماورا کسی اور چیز کی نشان دہی کرتا ہے۔“ (۱۱۸)

ریاض مجید کے ہاں تشبیہ و استعارات اور علامتوں کے استعمال میں مجتہدانہ اور شاعرانہ دونوں قسم کے رنگ شامل ہیں۔ اُنھیں فنِ تشبیہ و علامت کو استعمال کرنے کا ہنر معلوم ہے اور وہ اسے سبھی لوازمات کے ساتھ استعمال میں لاتے ہیں۔ اُنھوں نے علامتوں کو نئے معنوی انداز میں استعمال کرتے ہوئے اُن کے دامن میں وسعت پذیری کا سامان کیا ہے۔

۵۔ سہلِ ممتنع:

سہلِ ممتنع دراصل کسی شعر کا فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے مقتضائے حال کے اس طرح مطابق اور سہل ہونا کہ سننے والا یہ گمان کرے کہ ایسا شعر تو وہ بھی کہہ سکتا ہے، مگر لاکھ کوشش کے باوجود وہ کہہ نہ سکے۔ سہلِ ممتنع کا انداز میر اور غالب کے ہاں بکثرت ملتا ہے۔ میر کی شاعری تو سر تا پا سہلِ ممتنع کی شاعری ہے اور عام بول چال کا انداز رکھتی ہے۔ اچھّا شاعر وہی ہوتا ہے، جو عام بول چال کے لب و لہجے میں بڑی بات کہہ جاتا ہے۔ سہلِ ممتنع ہمیشہ سہولتِ گویائی سے پیدا ہوتا ہے۔ جہاں سہولتِ گویائی مفقود ہو جاتی ہے وہاں سہلِ ممتنع نایاب ہے:

> ”اصل میں سہلِ ممتنع کا کمال یہ ہے کہ مصرعوں کو اگر بول چال کی نثر میں تبدیل کیا جائے، تو ترتیبِ الفاظ تک میں فرق نہ کرنا پڑے۔“ (۱۱۹)

ریاض مجید کے مجموعہِ کلام ”خاک“ میں زیادہ تر غزلیں سہلِ ممتنع میں ہیں اور ان کے مفاہیم و مطالب بھی نہایت سپاٹ ہیں، مگر یہ سپاٹ پن ان کی غزلوں کو غیر مِعیاری نہیں بناتا بل کہ بلاغت میں معاون ثابت ہوتا ہے کیوں کہ یہ سپاٹ لہجہ غرابت سے مُبرّا ہے۔ غرابت بھی دو طرح سے وارد ہوتی ہے۔ ایک وہ، جو فکری غرابت کہلاتی ہے اور کمزور فکر شعر میں ہوتی ہے۔ دوسری وہ، جو لفظ کے اُلجھاؤ اور اس کے غیر فصیح استعمال سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں شعر کی جمالیات مجروح ہو جاتی ہیں۔ دونوں قسموں کی غرابت داری سے شعر کی فصاحت و بلاغت متاثر ہوتی ہے اور سہلِ ممتنع کا انداز نہیں بن پاتا۔ ہمارے ہاں اکثر شعرا کا المیہ یہ ہے کہ وہ لب و لہجے کے سپاٹ پن اور سادہ گوئی کو ہی سہلِ ممتنع سمجھ بیٹھے ہیں، جب کہ حقیقتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ سہلِ ممتنع نہ تو لب و لہجے کے سپاٹ پن سے وجود میں آتا ہے اور نہ ہی یہ سادہ گوئی سے مترکب پذیر ہوتا ہے۔ یہ تو محض سہلِ ممتنع کے جز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سہلِ ممتنع دراصل سہولتِ گویائی اور جمالیاتی سلاست کا نام ہے، جو شعر کے داخل و خارج دونوں کو منفرد بنا دیتی ہے اور اشعار میں ایک نیا نکھار اور ندرت واقع ہوتی ہے۔ ریاض مجید کی غزلوں میں جہاں کہیں ایسے اشعار ہیں، جن میں سہلِ ممتنع کا استعمال ہوا ہے، تو پتا چلتا ہے کہ شاعر قادر الکلام بھی ہے اور جمالیات کی نفسیات کو بھی سمجھنے والا ہے۔ جمالیات کی نفسیات شعر کی صوری تکمیل میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ان کی بعض غزلیں تو من جُملہ طور پر سہلِ ممتنع کی غزلیں ہیں۔ چند اشعار اِسی حوالے سے ملاحظہ کیجیے:

غبارِ جاں ابھی دھونا بہت ہے
دلا! روشن تجھے ہونا بہت ہے (۱۲۰)

بہت بے زار ہیں اشرافیہ کی رہبری سے
کوئی انسان، کوئی خاک زادہ چاہتے ہیں (۱۲۱)

۷۔ ردیف و قوافی کے استعمال میں نُدرت:

غزل میں ردیف اور قافیہ بنیادی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ردیف سے زیادہ قوافی کی اہمیت ہے، حالیؔ نے مقدمہ شعر و شاعری میں شعر کے حسن و قبح کے بیان میں جس چیز کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے وہ اس میں سے قافیہ ایک ہے حالیؔ کے مطابق قافیہ خیال اور بحر کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ اور مضمون یا خیال پر اثرانداز ہوتا ہے۔ قافیے کا اِنتخاب اہم موڑ ہوتا ہے۔ بعض قوافی غزل کی معنیاتی وسعت کو محدود کر دیتے ہیں اور بعض قوافی سہولت بھی پیدا کرتے ہیں۔ قافیے میں بلا کی طاقت ہوتی ہے اور اس کا سامع کی سماعتوں پر اچھّا خاصا اثر پڑتا ہے۔ ایک اچھّا قافیہ شعر کی جمالیات میں اضافے کا باعث بنتا ہے اور نامناسب قافیے سے شعر کی جمالیات مجروح ہوتی ہیں۔ قافیے میں نُدرت اس وقت آتی ہے جب شاعر پہلے سے سوچ کر قوافی نہ رکھ لے اور اسے عمداً استعمال میں لائے۔ قافیے سوچ کر غزل کہنے میں، جو قباعت ہے، وہ سبھی جانتے ہیں کہ اس سے غزل قافیہ بندی کا شکار ہو جاتی ہے اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ محض قافیہ بندی سے شاعری نہیں ہو جاتی اور نہ ہی اس میں شاعرانہ چاشنی آتی ہے۔ غزل میں تغزل نہ قافیہ بندی سے آتا ہے نہ ردیف کے بہتر اِنتخاب یا صنائع و بدائع کے استعمال سے بل کہ یہ تو جذبے کی شدت اور صداقت کا محتاج ہے۔ جذبے کی شدت یا وفورِ جذبات سے قافیے کا موزوں اِنتخاب خود بخود ہو جاتا ہے اور قافیہ غزل کے مجموعی مزاج پر منفی اثرات مُرتّب نہیں کرتا۔ اُردُو ادب میں ایسے شعرا کی کمی نہیں ہے جن کی شاعری محض قافیہ بندی اور عروضی تجربات پر کھڑی ہے اور اس میں شعریت عنقا ہے، لہٰذا وہ عوام و خواص کی توجُّہ کو کھینچنے میں ناکام رہی ہے اور آج ان میں سے بیشتر شعرا کے ہم نام بھی نہیں جانتے۔ عصر حاضر کا شاعر قافیے کے بجائے خیال کی تازگی اور فکری سہولت پر زیادہ زور دے رہا ہے کیوں کہ یہی اس دور کا چلن اور مقتضا ہے۔ مرصع اور مشکل و ثقیل قسم کے قوافی یا الفاظ و تراکیب کا اب دور نہیں رہا کیوں کہ آج کا سامع سہل پسند اور آج کا شاعر آسان گو ہے، لہٰذا عصری شعور کو لے کر چلتے ہوئے شعرا ہی قبولِ عام کی سند حاصل کرتے ہیں۔

ریاض مجید کی غزل مجموعی طور پر قافیے بندی کا نام نہیں ہے۔ البتہ بعض غزلیں ایسی ضرور ہیں جن میں قافیے کا عمدہ انتخاب شامل ہے۔ ان کے ہاں قافیہ غزل کے مزاج کے مطابق منتخب ہو کر سامنے آتا ہے۔ ''خاک'' کی غزلوں میں بعض نئے قوافی بھی استعمال میں لائے گئے ہیں یا کم از کم ایسے قوافی موجود ہیں، جن کو بہر طور بہت کم آزمایا گیا ہے۔ ان میں شاعر نے اپنا انفرادی اور اجتہادی رنگ شامل کیا ہے۔ غزل کی زمین کا اِنتخاب اور پھر اس کے مطابق قافیے کا اِنتخاب اور پھر اگلا مرحلہ اس کا شاعرانہ استعمال ہی اس کی صحیح حیثیت کا تعّین کرتا ہے۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب غزل گو شاعر روایت اور جدّت دونوں کے سنگم پر کھڑا ہو کر اپنی شاعری کو پرکھ رہا ہو اور اس میں قدامت و جدّت کے رجحانات کا باریک بینی کے ساتھ مشاہدہ کر رہا ہو۔ ریاض مجید کی کئی نغزلیں ایسی ہیں، جن میں دو حرفی قافیہ ہے۔ دو حرفی قافیہ جس شعر میں استعمال ہو اس میں کوئی بڑا شعر

نکالنا، جو معنیات اور جمالیات سے پُر ہو، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ایسے میں ریاض مجید کی اس طرح کی غزلوں کا وصف یہ کہ اس ن میں قابلِ قدر شعر بر آمد ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر درج ذیل غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے، ے جس میں دو حرفی قافیہ مستعمل کیا گیا ہے۔

یہ کاروبارِ مَحبّت ہے جاں کا ڈ ر کیسا
کہ اس بساط پہ تو جو گنوائے سو پائے!
عجیب رات تھی ، اس کا مہیب تر تھا خوف
دو چار لمحے ہی مشکل سے لوگ سو پائے (۱۲۲)

قوافی کی طرح ردیف کا اِنتخاب بھی شعر کی معنیاتی حدود کو محدود یا لا محدود کرتا ہے۔ بعض ردیفیں ایسی ہوتی ہیں، جو شعر میں خیال یا مضمون کو ایک بند ڈبے میں مقید کر دیتی ہیں اور ان کی وجہ سے شاعر ایک خاص حد کا پابند ہو جاتا ہے۔ اس کی باؤنڈری ردیف ہی متعین کر دیتی ہے۔ ایسی غزلیں، جن میں کھلی ردیف آتی ہے، وہ زیادہ کامیاب ہوتی ہیں، بہ نسبت ان غزلوں کے جن میں شاعر بند اور تنگ ردیف کا اِنتخاب کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر ''اضافی تھے'' کی ردیف میں کتنا ایک بڑا شعر نکالا جا سکتا ہے؟ ریاض مجید کی ایک غزل اِسی ردیف میں ہے۔ اس غزل کی ردیف ''اضافی تھے'' شاعر کے خیال کو دست و پابستہ کر رہی ہے اور اس میں معنوی وسعت پیدا ہی نہیں ہو سکی۔ ایک دو اشعار ملاحظہ کرنے کے بعد آپ اس امر سے بخوبی آگاہ ہو جائیں گے:

وصال و بُعد کے سب واقعات اضافی تھے
جو ہو رہے تھے وہ سب تجربات اضافی تھے
کسی ستارۂ امکاں کا میں مسافر تھا
جو میرے سامنے تھے شش جہات ، اضافی تھے (۱۲۳)

ریاض مجید کی غزلیات '' خاک '' کی انفرادیت:

ریاض مجید ادبی عبقریت کا نام ہے۔ وہ غزل و نظم کے شاعر ہیں۔ ریاض مجید کی غزل کا معاملہ بہت ٹیڑھا، الجھا ہوا یا متنازع نہیں ہے۔ اُنھوں نے اپنی شاعری کو تجربات، زُبان کی تخریب و تشکیلات، اور موضوعات کی رنگا رنگی اور فنِ عروض کے لیے ایک تجربہ گاہ بنا رکھا ہے۔ اس تجربہ گاہ کو وہ مختلف بیانات اور احکامات سے مذاقِ زمانہ کے مطابق بنا چکے ہیں۔ وہ غزل کے شعر میں تعمیمی اور اظہاراتی کے ساتھ غزل کی روایت کے بھی نبض شناس ہیں۔ غزل کے اِس عمومی رویّے کے بارے میں یوسف حسن لکھتے ہیں:

”غزل کے فن میں بقول مختار صدیقی ایک ضدی پن ہے اور اِس ضدی پن کی بنیاد غزل کے شعر کا تعمیمی اختصار ہے، جو اِسے بالخصوص استعاراتی اظہار میں روایت سے جلدی جلدی جدا نہیں ہونے دیتا۔“ (۱۲۴)

اِس حوالے سے ریاض مجید کی تمام تر شعری کاوشوں، جن میں ان کے شاعرانہ مزاج کی شوریدگی اور خودسری بہ تمام و کمال عمل پذیر ہوتی ہے، نہایت سنجیدگی سے جانچنے اور محاکمہ کرنے کوشش کی گئی ہے۔ ریاض مجید اُس شعری نظریے کے حامل ہیں، جس کے تحت اشیا کا مطالعہ انسان کے جذبوں کے بجاے اُن کے اعمال سے لیا جاتا ہے اور جذبہ تاثر کی چاشنی قائم رکھنے کے لیے لازمی جُز کی حیثیت سے موجود رہتا ہے۔

اوّل دن ہی سے اُن کی شعری دنیا مقامِ آہ و فغاں، بلبل و شراب و کباب اور فکرِ معاش و فریب حسن جیسی روائتی اور کچلی ہوئی شاعری سے دور، انسانی رویوں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں اور کیفیتوں کا بیانیہ تھی، جس کے لیے اُنھوں نے اپنے شعر میں استعمال ہونے والے لفظیات کو مقامی سماجی اور معاشرتی کلچر کی مٹّی سے تیار کیا۔ پھر اُسے پنجاب کے نہری پانی سے گوندھا۔ اِس کے بعد اُس شاعری کا بُت تیار کیا جس کا نمونہ پہلے ہمارے شعری بُت کدوں میں تھا بھی اور نہیں بھی تھا، اگر تھا تو اس میں اتنی صفائی نہیں تھی اور کہنگی کے اثرات زیادہ تھے۔ پھر اُس بُتِ شعر میں نئے خدا کی پوجا کرنے والوں کے احساسات کی روح پھونک دی، جسے آپ گنگا، جمنا اور گومتی کے بجاے پنجاب اور اس میں بھی خاص طور پر لائل پور سے پرے وسطی مضافات کے ادبی پانیوں کا خدا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر ریاض مجید اپنے اوّلین شعری اثاثے پر قناعت کر لیتے اور قلم کی باگ روک لیتے، تو اُن کی فکری پرواز پہلا آسمان بھی عبور نہ کر پاتی اور ادبی جغادری اُنھیں مضافات کا ایک منفرد شاعر کہہ کر تھوڑی بہت شاباش دے کر ایک برخوردار کی طرح دوسری طرف بٹھا دیتے۔ لوگ (چاہے وہ کتنے بڑے حساسیت کے استھان پر ہی کیوں نہ بیٹھے ہوں) کبھی تھوڑے واویلے پر نہیں چونکتے۔ اُن کو فن و فکر کا ہنگامہ پیدا کر کے متوجّہ کرنا پڑتا ہے۔ چناں چہ ریاض مجید نے پوری استعداد کے ساتھ اس کا مظاہرہ کیا۔ اور اپنے آپ کو منوایا۔ اس ضمن میں ان کے اس قبیل کے اشعار ہمیشہ یادگار رہیں گے:

ذرا سی دیر کو بیٹھا جھکا گیا شاخیں
پرندہ پیڑ میں اپنی تھکان چھوڑ گیا (۱۲۵)

ریاض مجید نے اپنے قد کاٹھ کو بُلند کرنے کے لیے ظفر اقبال کی طرح زُبان نہیں توڑی، اچھّی اور بُری دونوں روایات کو نہیں روندا، لفظیات کی پھرکیاں نہیں بنائیں اور اُنھیں پیچ مجمعے کے نہیں گھمایا کہ اُن کی پھرکی ایک ایسا رنگین لٹو بن گیا ہو، جس کی کیل نے چھوٹی چھوٹی لٹونیوں کے سر اپنی ضربوں سے زخمی کر دیے۔ اس طرح سے لوگوں کو متوجّہ نہیں کیا کہ خلقِ خدا یہ کہے کہ یہ نیا شعبدہ گر، جسے ہم محض ایک درمیانے درجے کا مداری سمجھ رہے تھے، یہ تو خلاؤں میں باندھی گئی رسیوں پر کھیلنے والا بازی گر نکلا۔ اُنھوں نے تو اپنی شاعری کے فلیپ یا دیباچے بھی کسی سے نہیں لکھوائے، کبھی کوئی تقریبِ رونمائی اپنے کسی

نئے مجموعہِ کلام کی نہیں کرائی اور نہ اس خواہش کا کبھی اظہار کیا، مگر اس کے باوجود تعجب کی بات یہ ہے کہ اِس عمل میں اُن کی ستایش بھی پُرانے شعری بُت خانوں کے بڑے پجاریوں نے کی اور مزے کی بات یہ ہے کہ بغیر کہے اُنھوں نے تعریف کی۔۔ اُنھوں نے دل سے اعتراف کیا کہ یہ شاعر کسی دوسرے کے یا چھوٹے منطقے کا نہیں ہے۔اس کی اپنی جاگیر ہے، اپنے بت کدے ہیں اور اپنے پجاری ہیں۔اس کا اپنا ایک انفرادی لب ولہجہ ہے اور انفرادی اُسلوب ہے۔وہ ہر زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے والا شاعر ہے۔اس کی انفرادیت اِسی امر میں مضمر ہے کہ وہ اپنے آپ کو زمانے کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔فنِ شعر کے رموز سے آشنا ہے اور اس کی شعری ترسیل میں یدِ طولیٰ رکھتا ہے۔اپنی آواز کو نمایاں کرنے کا شوق نہیں ہے، مگر اس کی آواز ہجومِ سُخن وراں میں نامانوس اور اجنبی ہو کر گم نہیں ہو جاتی بل کہ اپنی پہچان رکھتی ہے۔وہ شاعری، جو فطرت اور زمینی جمالیات سے اپنا خمیر اٹھاتی ہے یا وہ، جو کسی شاعر کے ذہنی منطقے میں اپنا خمیر تیار کرتی ہے۔

ریاض مجید کی شاعری ایک الگ قسم کی اور روشِ عام سے ہٹ کر کی گئی شاعری معلوم ہوتی ہے، لیکن اس معاملے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ایسی شاعری میں عمومی شعرا کا رجحان اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے چکر میں یا تو روایت شکنی کی طرف مبذول ہو جاتا ہے یا پھر ظفر اقبال کی طرح بونگے بازی کا چلن عام ہوتا ہے۔ایک کامیاب فب کار وہ ہوتا ہے، جو دونوں کے مابین جادہِ اعتدال پر قائم رہتا ہے اور اس کا یہ اعتدال اسے اپنے قائم کردہ مِعیارات سے نیچے نہیں اترنے دیتا۔ریاض مجید کی انفرادیت اِسی میں مضمر ہے کہ اُنھوں نے اپنی شاعری کو حدِ اعتدال میں رکھا ہے اور اسے کسی قسم کی بے رہ روی کا شکار نہیں ہونے دیا۔جہاں تک داخلیت کے اظہار کی بات، ہو تو اس میں بھی وہ کامیاب نظر آتے ہیں اور اپنے ہی رنگ میں اور اپنی ہی دھن میں آگے نکلتے جاتے ہیں ۔وہ اپنی دھن کے پکے شاعر ہیں اور زمانے کے انقلابات کی اصل حقیقتوں کو سمجھتے ہیں۔

وہ لوگ ریاض مجید کی زبردستی کے شعوری تجربات والی شاعری پر جان چھڑکنے کی کوشش میں ہیں اور یہ بات ریاض مجید بھی جانتا ہے۔چناں چہ ریاض مجید ان لوگوں کو اس کھیل میں لگائے ہوئے ہے اور اپنے فن اور طبیعت کی روانی سے خود اچھّی شاعری بھی کر رہا ہے۔یعنی غبار آلود سمتوں کے سراغ والی۔کیوں کہ وہ آنے والے دور کی کہانی خوب سمجھتا ہے۔نہیں سمجھتے تو اس نقطے کو اس کے نام نہاد نقال شاعر، جن کی شاعری پر اکثر اپنے کالم بھی چڑھائے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اِسی شوق میں لوگوں کی اکثریت بہک گئی اور وہی کُچھ کہنے لگی، جو ریاض مجید کہلوانا چاہتے تھے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔غزل سے ایک خاص قسم کا لگاؤ اور کمٹمنٹ ہر شاعر کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔نام نہاد نقال شاعر غزل سے حقیقی معنوں میں عہدہ برا کیوں نہیں ہو سکتے، اِس کی وجہ ڈاکٹر وزیر آغا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”غزل نے جس انداز سے شعر کے پیمانے میں بڑے بڑے مطالب کو سمیٹا ہے، شاعری کی کسی اور صنف کے بس کا روگ نہیں۔“ (۱۲۶)

محض نقالی شاعری کی صنفی خصوصیات کی کسی طرح متعامل نہیں ہو سکتی، چناں چہ غزل اپنے اندر پائے جانے والے اختصار اور ایمائیت کی بدولت ایک خاص آہنگ بھی رکھتی ہے۔ ریاض مجید کی نقالی سے اُن کا، تو کُچھ نہیں بگڑا، لیکن وہ تمام طبقہ ،جو شعر کہہ سکتا تھا وہ اپنے لٹنے کی خبر بھی نہیں رکھتا۔ یہ طبقہ شعرا اس نقالی میں یہی سمجھ رہا ہے کہ اپنا شعر کہہ رہے ہیں حال آں کہ وہ ریاض مجید ہی کو دہرا رہے ہیں۔ ہمارے غزل کی یہ بد نصیبی رہی ہے کہ نقال اور تک بند شعرا کے ایک ہجوم نے غزل کے معترضین کو اعتراض کا موقع فراہم کیا ہے۔ اِسی قسم کی ایک مثال محمد عظمت اللہ خاں کے ہاں دیکھیے، جس سے درج بالا کم فہم شعرا کے بارے میں بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے:

"ہماری شاعری محض قافیہ پیمائی ہے اور اِس قافیہ پیمائی کا سہرا غزل کے سر ہے، جس صنفِ سخن میں سوائے ردیف اور قافیہ کی یگانگت کے معنوی تسلسل کو دخل نہ ہو، اُس صنف میں سوائے اِس کے اور کیا ہوتا ہے کہ قافیہ کی تلاش ایک بڑی چیز ہوتی؛ جہاں قافیہ ہاتھ آیا اُس کے لحاظ سے مضمون شاعری کے مقررہ مواد میں سے ڈھونڈنا شروع کر دیا۔" (۱۲۷)

ریاض مجید کی غزل خاص طور اِس قابلِ اعتراض طرزِ سخن سے ہمیشہ بالاتر رہی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ریاض مجید نے جس دور عندلیبِ گلشنِ غزل کے طور پر نغمہ سرائی کی اور اُردو غزل کے منظر نامے پر اُبھرے اس وقت بہت اہم شاعر پورے برّصغیر میں موجود تھے اور زمانے کی ہوا نے ان کی خُوش بُو ریاض مجید سے کہیں زیادہ قریب دور کے علاقوں میں پھیلائی اور ان کو شہرت کی اڑن طشتریوں پر اڑا دیا۔ ان سب میں ناصر کاظمی اور فیض احمد فیض، شہزاد احمد، منیر نیازی اوراحمد فراز تو بہت ہی خوش قسمت واقع ہوئے۔ ناصر کاظمی کے متعلق تو سبھی کی راے ہے کہ وہ میر سے مستفیض ہونے کے ساتھ ساتھ اُسلوب میں بھی ان کے تابع ہیں (اگر چہ میرا اس معاملے میں اختلاف ہے، میر رعایتوں کے شاعر ہیں، جب کہ ناصر کاظمی رعایتوں کو کم کم ہی اہمیت دیتے ہیں یا وہ ان کو سمجھ نہیں پاتے) اور فیض صاحب ایک جمالیاتی منطقے کی شیریں نظموں کا مُرقّع، جن میں روایت کی متغزلانہ دل دوزی گھلی ہوئی ہوتی ہے، جو ان کو ایک منفرد اور دل کش اُسلوب سے ہم کنار کر گئی ہے۔ شہزاد احمد ایک ایسے شاعر، جو جدید اُردو شاعری کے منظر نامے پر اپنا نام کنندہ کرنے والے ہیں، جن کی نظموں میں سائنسی فکشن اور مابعد الطبیعات کو ایک نئے لب و لہجے اور نئی ادائے دل فریب کے ساتھ پیش کیا گیا۔ منیر نیازی جنھوں نے نظم و غزل دونوں کے آسمانوں پر اپنے نام کے ستارے ہی نہیں بل کہ کہکشائیں تخلیق کیں اور پھر اُنھیں اپنے شاعرانہ جمال سے مزّین کیا ان کے اندر اپنے وجدان اور تخلیل کی رنگینی بھر دی، جس کی ضیا پاشی سے آسمانِ غزل و نظم منور ہوا اور رہا احمد فراز تو اس نے عوامی اُمنگوں اور عوامی جذبات کی نیز نوجوانوں کے نوخیز جذبات کو اشتہا انگیز کرنے والی شاعری کی، جس کی گونج برصغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں سنی گئی۔ اُردو ادب میں غزل کے اِن عظیم شعرا کی شعری تخلیقات کو دیکھ کر ہمیں معلوم ہوتا ہے:

"غزل کی زُبان کا غزل کے فن سے گہرا تعلق ہے۔ اُس زُبان میں شیرینی، بے ساختگی (جو خاصے ریاض کا ثمر ہو سکتی ہے) ضروری ہے۔" (۱۲۸)

غزل کی فنی ریاضت کرنے اور اُس کی روایت کا احترام کرنے والے ریاض مجید کے علاوہ درج بالا نوع کے نقالِ محض جتنے شاعر ہیں، وہ اس پائے کے نہیں کہ ان کا نام ریاض مجید کے ساتھ لیا جائے، مگر وہ مشہور ضرور ہوئے ہیں اور کسی حد تک ریاض مجید سے زیادہ ہوئے ہیں، مگر اب جب کہ ہواؤں کی اچھالی ہوئی گرد بیٹھ رہی ہے تو ریاض مجید کا چہرہ ابھر کر سامنے اٹھ رہا ہے۔

اِس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ شاعر ہے جسے آپ جدید ٹیکسٹ یعنی متنیّت کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ بات کا الٹ پھیر، استعاروں کو مصاریع میں پیچ دینا اور لفظ اور خیال کی آمیزش سے شعر کو ہلکے طنز اور سنجیدگی کی ملی جلی بناوٹ سے ایسے برتنا کہ انسان اس شعر پر نہ ہنس سکتا ہے نہ رو سکتا ہے اور نہ چُپ بیٹھ سکتا ہے۔ یہ جو ان کو ٹیکسٹ کا شاعر کہا گیا ہے، تو اس کے معنی کُچھ وسیع اور پیچیدہ ہیں، جن تک پہنچنے کے لیے ہمیں ریاض مجید کی ذاتی اور علاقائیت کو کریدنا پڑے گا۔ ان تنہائیوں کو اصل میں دیکھا جائے، تو اِنھی لوگوں نے پیدا کیا، جو ادب کی جاگیر میں کسی خاص علاقے کی زُبان اور محاورات، حتٰی کہ سکونت تک کے علاوہ باقی تمام علاقوں کے افراد اور شعرا کی شعری و ادبی حیثیت یا اتھارٹی پر سوالیہ نشان لگا دیتے ہیں۔ یہ وہی اسرائیلی یا یہودی نسلی برتیت کی تمثیل ہے، جن کے مذہب اور ادب میں کسی اور نسل کا انسان داخل نہیں ہو سکتا۔ اس طرح ادب اور شعر میں ایک خاص طبقہِ اشرافیہ نے جنم لیا، جن کے الفاظ و محاورہ اور تراکیب کی رِٹ ادبی کورٹوں یا ثقہ بند نقاد قاضیوں کی عدالت میں چلتی رہی۔ ایک خاص طرح کے آدابِ مجلس اور مکلف زُبان نے مضافاتی زُبان و محاورے کو اچھوت قرار دے دیا۔ یوں مضافاتی شاعر بھی اچھوت بن کر رہ گیا، جسے میں نے تنہائی کی اصطلاح قرار دیا۔ اس رویّے نے شاعری کی نسبت علاقے اور محاورے کو برتری دی۔ جسے دور کرنے کے لیے ریاض مجید نے اپنے آپ کو اور انتقام خاطر دوسروں کو بھی بے بس کرنے کے لیے فنی اپج کا سہارا لیا۔ فن کا اعلیٰ مِعیار قائم کر دیا۔ خصوصاً اُردو نعت میں فن و فکر جائزوں اور تحقیق کے حوالے سے ان کا کوئی ثانی نہ رہا، ذاتی طور پر نئی تراکیب اور تشبیہات تراشیں، زُبان کی کایا کلپ کی، وسطی پنجاب کے کرداروں، اور اشیا کے ضمیروں کو گھیر گھیر کر ان میں داخل کیا۔

یہ غزلیہ کہانیاں پہلے ایسی نہیں تھیں، پہلے کی غزل کا شاعر گویا یوپی کا چوڑی دار پاجامہ اور باریک لٹھے کا کرتا پہننے والا ایسا مالی تھا، جس کے باغ میں سرو سمن تھے، سیدھی قطاروں میں کلیوں اور پودوں کے پھول تھے، نازک برگ و بار کی بیلیں تھیں اور بلبل و مینا کی آوازیں۔ ریاض مجید کی شاعری میں پائی جانے والی اِن کہانیوں میں بے شمار کردار کبھی الٹے کام کرتے ہیں، کبھی سیدھے۔ ریاض مجید نے ان غزلوں میں اندرونی خلا کو خارج کی ڈرامائی اور بانسری دار آواز کے طلسم سے پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کا سحر خیمے کی چاروں طنابوں کی طرح خیمے کو بُلند کیے ہوئے ہے۔ جن چوبوں سے ریاض مجید نے یہ طنابیں باندھی ہیں، ان کو اس نے اپنے زمین پر تیار ہونے والی لکڑی سے خود تیار کیا ہے۔ یہ ڈرامائی طلسماتی آواز ان فن کاروں سے بالکل جدا تھی،

جو علاقائی تنہائی کا شکار نہیں تھے اور جن کے پاس بتانے کو اور یاد رکھنے کو بڑے بڑے ثقافتی شہروں اور زُبانوں کے نسب نامے تھے۔ درج ذیل اشعار اِسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں ملاحظہ کیجیے:

ہم فلک کے آدمی تھے ساکنانِ قریہ مہتاب تھے
ہم ترے ہاتھوں میں کیسے آ گئے ؟ ہم تو بڑے نایاب تھے! (۱۲۹)

خوشی اس کی نہیں ہم خندقوں میں جاگتے ہیں
اَلم یہ ہے ہمارے خواب سوتے جا رہے ہیں (۱۳۰)

ریاض مجید کے معاصر مرکز کے شعرا، اِن نسب ناموں کے طلسم میں اتنے گرفتار تھے کہ ان کے پاس ٹیکسٹ کے بجاے فخر اور کُہنہ الفاظ کی ہئیت رہ گئی۔ مضمون، الفاظ کی نئی ساخت، نئی ہواؤں کی خُوش بُو کا لمس اور کچی سڑکوں پر چلتے ہوئے بیلوں کی گھنٹیوں کے نغمے اُن کے ہاتھ نہ آسکے۔ یوں ریاض مجید اُن سے بازی لے گئے۔ اُس کی آواز اور کہانی میں ہر آنے والے نئے شاعر نے نئی جمالیات سیکھی، اپنے ارد گرد کے الفاظ دیکھے اور عام قاری نے اپنی محرومی کو دیکھا۔ اس لیے اُنھوں نے ریاض مجید کی شاعری کو آسانی سے گلے لگالیا۔ یہ بات ہمیشہ سے مصدقہ ہے کہ ایک بڑا شاعر تتبع سے بچ نہیں سکتا۔ لٰہذا ریاض مجید کی اس بو قلمونی، رنگ برنگی اور نازک شعری تتلیوں اور نازک شعری اُسلوب سے شعرا متاثر ضرور ہوئے ہیں۔

مذکورہ بالا توجیہہ ایسی کھلی واردات تھی، جو ریاض مجید کو دوسرے تمام شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ اِسی میں ان کی جرات اور بے نیازی کے باب چھپے ہوئے ہیں۔ کیوں کہ اکثر چوڑی دار یا چوڑی دار روایت کے شعرا اپنے حلقۂ اثر میں بلاوجہ کی عزت و توقیر اور کھوکھلی آن بان بر قرار رکھنے کے لیے بندھے ٹکے اُصولوں کی پیروی کرنے سے ڈرتے ہیں۔ اُن کا مسئلہ شعر سے زیادہ اپنی بڑائی اور برتری کا احساس پیدا کرنا ہوتا ہے، جو اُنھیں روایت پسندی کا خوگر بنا دیتا ہے۔ یہ رویّہ ان شاعروں کے لیے بھی ایسی دیوار ثابت ہوتا ہے، جسے نہ وہ پھلانگ سکتے ہیں اور نہ گرا کر آگے گزر سکتے ہیں۔ البتہ اپنے خشک لفظوں کے پتھروں سے اسے مزید بُلند اور مضبوط کر لیتے ہیں۔ اُن کے اس عمل میں وقت کے نام نہاد درسی نقاد بھی کشادہ دلی سے ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ نتیجتاً اس تعمیر میں تمام مواد کہنہ ادبی دیواروں اور ادبی ملبے سے جمع کیا جاتا ہے اور پرانی شکل پر اسے تعمیر کیا جاتا ہے۔

یہ شاعر اپنی تمام زندگی میں اپنی ایک آدھ ترکیب یا ایک دو شعر کے علاوہ کُچھ نہیں دے پاتے۔ اس مثال کے لیے یہاں کُچھ نام بھی دہرا دیت ہیں تا کہ سمجھنے میں آسانی رہے۔ چھوٹے موٹے شاعروں کا، تو خیر کیا مذکور، مشہور شاعروں میں میرؔ کے دور میں سوداؔ کے علاوہ کم و بیش تمام شاعر اِسی صف میں آتے ہیں۔ دردؔ، جو بعض لوگوں کی نظر میں کوئی بڑی توپ چیز ہے ،وہ بھی ایک تیسرے درجے کا شاعر تھا۔ غالبؔ کے دور میں مومنؔ کا بڑا ذکر کرنے والے، اُس کی شاعری میں دو تین غزلوں

کے علاوہ کُچھ نہیں نکال سکیں گے۔ اور ان میں بھی مصرعے کی بندش کے سوا کُچھ نہیں نکل سکے گا۔ اِسی طرح ناصرؔ کاظمی، فیض احمد فیضؔ، منیرؔ نیازی اور، جونؔ ایلیا کے استثنٰی کے ساتھ نیچے آتے جائیں تو روایتوں میں بندھے اور جکڑے ہوئے اکثر بس حفیظ جالندھری، احمد مشتاق، فرازؔ، احسان دانشؔ وغیرہ جیسے تیس مار خاں ہی ہیں، مجتہد شاعر نظر نہیں آئیں گے۔ ریاض مجید نے ایسا نہیں کیا۔ اُنھوں نے اپنے سامنے قدما کی کوئی دیوار نہیں کھڑی ہونے دی اور نہ اُس کا لحاظ کیا۔ ایسا نہیں کہ اُنھوں نے قدیم شعری ادب کو رد کر دیا ہو اور اس کی عزّت و توقیر پر کاری ضرب لگائی ہو۔ اس طرح کُچھ نہیں ہوا، مگر یہ ضرور ہوا کہ میرؔ ، غالبؔ کی طرح ایسا جدید شعری مجتہد نکلا جسے نئے دبستان کا نام بھی دیا جا سکتا ہے، جو دہلی، لکھنؤ اور لاہور کے دبستان سے مکمل الگ اور نیا ہے۔ آپ اسے کوئی بھی نام دے سکتے ہیں، دبستانِ لائل پور یا دبستانِ ریاض مجید، ریاض مجید نے سوچا، اگر جمنا اور گومتی کے پانیوں میں اجتہاد کی تاثیر پائی جاتی ہے تو چناب اور راوی کے درمیان میں بہتی دوآبہ کو یہ قدرت حاصل کیوں نہیں ہو سکتی۔ سو یہی ان کی جرأت اُنھیں ایسے ادبی اور شعری استھان پر لے آئی جہاں سے نئے چاند اور سورج نکلنے لگتے ہیں۔ ان کے ہاں شعر میں الفاظ کی آمد محض لفظ نہیں رہتے، وسطی پنجاب کے میدان یا نہر کنارے برسن کے کھیت میں بھینی بھینی خُوش بُو بکھیرنے والے پھول بن جاتے ہیں۔ جنھیں آپ دیکھ بھی لیتے ہیں، چھو بھی لیتے ہیں اور خُوش بُو کی مہک بھی اڑا لیتے ہیں۔

ریاض مجید کے بارے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنی ذات کی طرف اُنھوں نے اتنے دروازے کھول دیے ہیں کہ زمانے نہ چاہتے ہوئے بھی ان دروازوں سے ضرور گزرے گا اور دوسروں کو بھی اس خریداری میں شریک کرے گا۔ بہر حال ریاض مجید کو اُردو زُبان کا ایسا شاعر سمجھنا چاہیے، جس کا اثر آیندہ نسلیں ضرور قبول کریں گی۔

ریاض مجید کے مجموعۂ غزل "گزرے وقتوں کی عبارت" کا فنی و فکری جائزہ

میرا دُکھ یہ ہے میں اپنے ساتھیوں جیسا نہیں
میں بہادر ہوں مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں (۱۳۱)

"گزرے وقتوں کی عبارت" کا شاعر:

کارخانۂ عالم میں ہر انسان کی طبع خام کا خمیر دوسرے انسان سے مختلف ہے اور ہر انسان کی طبیعت اور مزاج میں دوسروں کی نسبت اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہی اختلاف معاشرتی حسن کا باعث بھی بنتا ہے اور باعثِ آزار بھی بنتا ہے۔ ہر شخص بذاتِ خود اپنی اور دوسروں کی کہانی ہوتا ہے۔ دوسروں کی کہانی اس لیے کہ اس کی زندگی میں دوسرے لوگوں کے کردار بھی بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ گویا زندگی اپنی اور دوسروں کی کہانی ہوتی ہے۔ یوں تو ہر شخص کی کہانی الگ ہوتی ہے اور کسی نہ کسی طرح سے دل چسپ بھی ہوتی ہے اور دوسروں کے لیے اس میں مُسرّت و عبرت کا سامان بھی ہوتا ہے، لیکن ہر شخص اپنی زندگی کی روداد کو شعری اظہار کی صورت نہیں دے سکتا۔ لکھنے کا ملکہ ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا اور اس پر مستزاد یہ کہ صحیح لکھنا

تو خداداد صلاحیّت ہے، جو فی زمانہ بہت کم لوگوں میں موجود ہے۔ بھلے لوگ لکھتے وقت خود سرائی اور ذاتی مدحت کا مطلق لحاظ نہیں رکھتے، جب کہ کُچھ لوگوں پر خبطِ عظمت کا بھوت بھی سوار ہو جاتا ہے۔ ایسی شاعری، جو ظاہری اور جعلی قالب اوڑھ کر سامنے آتی ہے وہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ شعر کہنا انتہائی دشوار گزار کام ہے۔ یہ جان جوکھوں کا کام ہے، جس میں جگہ جگہ پر اُسلوبِ بیان میں فنی نزاکتوں کا خیال دامن گیر رہتا ہے اور شاعر کی جان سولی پر لٹکتی رہتی ہے۔ کُچھ مخفی رکھنے اور چھپانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، یہاں تو سب کُچھ سامنے رکھنا ہوتا ہے، مگر ایسے متمدن قرینے کے ساتھ دیکھنے والے کو شاعری میں بھونڈے پن کا احساس نہ ہو۔ یوں شاعر کو کانٹوں بھرے دشوار گزار راستوں پر چلنا ہوتا ہے، جسے وہ خود اپنے لیے متعیّن کرتا ہے۔

میرؔ و غالبؔ سے لے کر اقبالؔ تک اُردو غزل کے مزاج اور اُسلوب میں خاطر خواہ تبدّلات وقوع پذیر ہوئے اور اقبال نے غزل کو، جو اُسلوبِ بیان عطا کیا، اس سے غزل میں خطابت کا زور، تحرک اور ٹھوس حکیمانہ و سائنسی انداز ترویج پانے لگا۔، جوشؔ ملیح آبادی غالباً اُردو کے قد آور شعرا میں سے ہیں، جنہوں نے اُردو نظم کو غزل پر ترجیح دیتے ہوئے غزل کو پس انداز کیا، تو غزل نے حسرت و فانی، فیض اور، جون ایلیا کی انگلی پکڑ کر نئے اسالیبِ بیان مُرتّب کیے، جو نئے ذائقوں سے مملو تھے۔ بیسویں صدی کے اواخر میں آنے والے اُردو شعرا نے اپنا اپنا انفرادی لب و لہجہ غزل یں متعارف کروایا، جن میں شہزاد احمد، احمد ندیم قاسمی، شکیب جلالی، جون ایلیا اور لائل پور سے نصرت جاوید اور ڈاکٹر ریاض مجید ہیں۔ ریاض مجید کی غزل تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔ ان کی وہ غزلیں، جو ستر اور اَسّی کی دہائیوں کی غزلیں ان میں بے پناہ تازگی و شگفتگی اور نیا پن موجود ہے۔ وہ غزل میں فنی و فکری نزاکتیں پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ غزل کے نئے آفاق کو لوگوں میں متعارف کروایا اور اس کی وسعتوں میں مزید پھیلاؤ کا سبب بنے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

> ’’میں نے غزل میں نئی تراکیب وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری کوشش رہی ہے کہ غزل کے نئے امکانات اور نئے آفاق سے غزل کے قاری کو کوئی الگ دے سکوں۔ میری غزل گیت کی طرح پنجاب کی مٹّی کی بوباس سے مزیّن ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ غزل میں اچھّی یا بری یہی انفرادیت قائم کر سکا ہوں۔‘‘(۱۳۲)

اُردو غزل کی روایت میں ریاض مجید نے ایک قابلِ قدر اضافہ کیا ہے، جس میں ہر طبقے اور ہر علاقے کا عصری شعور شامل ہے۔ اُنھوں نے جدید اُردو غزل کی روایت کو مضبوط کیا اور اپنی بساط کے مطابق اس کارِ خیر میں حِصّہ ڈالا۔ لوگوں نے جہاں ان کی شاعری سے مُسرّت کشید کی اور تازگی و جدّت ملاحظہ کی، وہیں اُنھوں نے جدید شاعری کے اس بدلے ہوئے اور نئے انداز کی جدّت طرازی کو بھی محسوس بدرجہ اتم محسوس کیا۔ ان کی غزل کے یہ اشعار اس امر پر دال ہیں:

اک مسلسل رقص کرتا لمحۂ زندہ ہوں میں
بے نیازِ رفتہ و امروز و آئندہ ہوں میں

جی رہا ہوں میں مثالِ کرمکِ سنگ اے ریاضؔ
زیست کی تنظیم کا خاموش کارندہ ہوں میں (۱۳۳)

غزل ایک میراتھن ریس ہے، جس میں ہر شاعر مسلسل دوڑ رہا ہے، جو ذرا ٹھہرا کچلا گیا اور قافلے سے یوں بچھڑا کہ نشانِ منزل تک اوجھل ہوا۔ اس میں جدید عصری قضیوں کو پورا کیے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ ''گزرے وقتوں کی عبارت'' اگرچہ اپنے عنوان کے باعث صدائے ماضی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس میں حال کی غزل کے وہ تمام عناصر موجود ہیں۔ جن سے یہ مترکب پذیر ہوئی ہے۔

فنی و فکری حوالوں سے یہ کتاب ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے۔ مزید بر آں اس میں شاعرانہ ذکاوت پائی جاتی ہے اور یہاں کسی بھی جگہ شاعر نے جذب و احساس سے اپنا رشتہ منقطع نہیں ہونے دیا۔ یہی اس مجموعہ غزل کی خوبی ہے کہ جب ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے اور پورے چمن پر ویرانی کا عالم ہوتا ہے، تو اس چمن کا بلبل اپنے میٹھے گیت سنانے لگ جاتا ہے اور چمن کی بے رونقی کو آواز میں بدل دیتا ہے۔ اس میں شاعرانہ نفاست ہے، لیکن شاعر کے دیگر کلام کی نسبت اس میں علمیت کے بجائے جذب و احساس کا کم و کیف زیادہ ہے۔

ریاض مجید ایک ہمہ جہت انسان ہیں۔ اُنھوں نے اصنافِ ادب میں قریب قریب ہر صنف کے حوالے سے کُچھ نہ کُچھ ضرور لکھا ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی ہیں۔ اُن کی آپ بیتی کہیں کہیں تو افسانوی اندازِ بیان اختیار لیتی ہے اور باقاعدہ افسانہ معلوم ہوتی ہے۔ چناں چہ وہ اپنے فن کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''میری زندگی ایک کھلی کتاب ہے، جس میں خود کو شاعری کے پردے میں کھول کر رکھ دیا ہے۔ میں نے اپنی طبیعت اور مزاج کے ہر داخلی عنصر کو ادب کے اوراقِ پریشاں میں سمو دیا ہے۔ مجھے تلاش کرنے والوں کو چاہیے کہ میری تحتیروں سے رجوع کریں، وہاں اُنھیں داخل سے خارج اور خارج سے داخل کے مضمرات ملیں گے۔'' (۱۳۴)

ریاض مجید کا یہ مجموعہ کلام ان کی قلبی وارداتوں کا وہ لطیف اظہاریہ ہے، جس میں عصری حسیت بھی بر آمد ہوتی ہے۔ یہ اکیلے شخص کی کہانی نہیں بل کہ ایک شاعر کی اور اس کے عہد کی سر گزشت ہے، جسے بڑے نفیس انداز میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کلام میں اُردُو غزل کی روایت کا التزام اور احترام دونوں موجود ہیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ مصنف نے اپنی انفرادیت بھی بر قرار رکھی ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید کا تعلق چوں کہ درس و تدریس سے ہے، لہٰذا ان کے دیگر مجموعہ ہائے کلام میں علمیت زیادہ ہوتی ہے، مگر ''گزرے وقتوں کی عبارت'' نازک احساسات، لطیف جذبات اور قلبی کیفیات کا اظہاریہ ہے۔

(الف) فکری و موضوعاتی مطالعہ

ا۔ عصری حسیت:

عند الناس حسیت سے مراد محسوس کرنے کی قوت ہے۔ یعنی محسوسات کی وہ قوتیں جن کے ذریعے ہم گرد و نواح کا ادراک کرتے ہیں اور ہر محرک کا ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں۔ محرک کا ردِ عمل حسیت کے ساتھ مشروط ہے کیوں کہ بغیر احساسِ محرک کے کوئی ردِ عمل واقع ہی نہیں ہو سکتا۔ حسیت کی عمارت قوتِ لامہ، قوتِ شامہ، قوت باصرہ اور سامہ پر تعمیر ہوتی ہے۔ عصری حسیت کے لزومات سماجی و شعوری ہیں۔ یہ اجتماعی اور انفرادی شعور کا اہم جز ہے۔ عصر کا لفظ چوں کہ زمانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے اس سے مراد زمانی حالات و واقعات کا کسی تخلیق کار کی تخلیق اور فن کار کے فن پارے میں موجود ہونا ہے۔ زمانی حالات و واقعات کسی بھی شاعر یا ادیب کے ادب پاروں پر بڑا گہرا اثر مُرتّب کرتے ہیں۔ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے اور وہ معاشرے ہی سے اخذ و قبول کرتا ہے۔ ہر بڑا شاعر اپنے عہد سے کُچھ نہ کُچھ حد تک ضرور متاثر ہوتا ہے، مگر اس کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنی شخصیت اور فکر و فن کے حوالے سے ایک عہد کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اس کے سوچنے کا انداز اور اس کا شعری اُسلوب ایک نسل کو بہر حال متاثر ضرور کرتا ہے۔ اس کی مثال غالبؔ ہے جس نے ایک ہی عہد کو نہیں بل کہ آنے والے تمام زمانوں کا متاثر کیا ہے اور اس طرح سے وہ ہمارا لازمانی شاعر بن گیا ہے۔ اگر اُردو غزل گو شعرا غالبؔ کا تتبع میں اشعار نہ بھی کہیں تو وہ غالبؔ کے اثر سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے۔ اِسی طرح ایک بڑا شاعر اپنے عہد سے نہیں بل کہ اس کا عہد اس کی ذات سے پہچانا جاتا ہے۔ اُردو زُبان میں بیسویں صدی کا عظیم شاعر اگر اقبال ہے، تو انیسویں صدی غالبؔ کی صدی ہے۔ اِسی طرح اکیسویں صدی میں اپنے اسلاف کی لاج کون رکھتا ہے۔ اس کے متعلق تا حال کوئی پشین گوئی نہیں کی جا سکتی، مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اب شاید کوئی عبقر العباقر اور افصح الفصحا کے پیدا ہونے کا امکان اس لیے نہیں ہے کہ زمانے کے مقتضیات اور ماحول کے لوازمات بدل چکے ہیں اور اب دنیا کے ایک کونے میں آنے والا نیا فیشن یا اُسلوب چشمِ زدن میں ساری دنیا میں اس قدر برق رفتاری سے پھیلتا ہے کہ اگلے ہی لمحے وہ قدیم ہو جاتا ہے۔

اب اعتدال کی اس سادہ اور جمال افروز روش کا چلن ہے، جو موجودہ ماحول اور ثقافت میں اپنی جڑیں مضبوط رکھتی ہو اور جس کا مزاج اور مزاق نئے امزجہ و تلذذات پر منطبق ہو۔ اب کسی تخلیق کار کا یا اس کی تخلیق کا ابعادِ اربعہ اپنی تعبیری اور تاویلی جہات اور فنی ریاضتوں کے بغیر ممکن ہی نہیں، لہٰذا زمانے کے بدلتے ہوئے مذاق اور ادب کے مبدل بہ زمانہ رجحانات کے مطابق جس کسی فن کار نے بھی اپنے آپ کو ڈھال لیا وہ قبولِ عام کی سند حاصل کر لے گا۔ شاعر اپنے عہد کے آشوب سے بہ خوبی آگاہ ہوتا ہے اور اس کے سامنے گزرنے والا ہر واقعہ اپنے ساتھ ردِ عمل بھی ساتھ لاتا ہے۔ یہ ردِ عمل ویسے تو ہر انسان میں پیدا ہوتا ہے کیوں کہ تمام انسان حسیّات رکھتے ہیں، مگر شاعر میں یہ حساسیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اور پھر شاعر کا یہ تخصص

بھی ہوتا ہے کہ وہ اظہار کی قدرت سے بارور ہوتا ہے۔ اور اپنے خیالات کو فن کی اعلیٰ ترین صورت یعنی شاعری میں بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ شاعر کی آنکھ باریک بین ہوتی ہے اور وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی تبدیلی کا شاہد اور اس کا محسوس کرنے والا ہوتا ہے۔ کسی شاعر کا مشاہدہ جتنا زیادہ قوی ہو گا اس کی شاعری میں سماجی و عمرانی مسائل کی بازگشت اتنی ہی زیادہ سنائی دے گی اور جس شاعر کے ہاں تخیّل کی فراوانی ہو گی۔ اس کی شاعری کے پاؤں زمین پر نہیں لگیں گے اور وہ تخیّل کی ہرزہ سرائیوں میں رہے گا۔ شاعر اِسی زمین کا نمک کھاتا ہے، لہٰذا اسے ساکنانِ ارض کی خبر گیری کرنا چاہیے۔ تخیّلات میں مستغرق شعرا کے کلام میں وقتی طور پر ایک گوشۂ عافیت تو ہوتا ہے، مگر حقائقِ معروضی سے وہ کوسوں دور ہوتے ہیں۔ ایک اچھّا اور بڑا شاعر وہی ہو سکتا ہے، جس نے اپنی شاعری کی بنیادیں زمیں اور اہلِ زمین کے مسائل کے ساتھ پیوستہ رکھی ہیں۔ شاخ اگر اپنے شجر سے ٹوٹ جائے تو سحابِ بہار اسے ہرا نہیں کر سکتا۔ اِسی طرح شاعر جب اپنے معاشرے سے کٹ جائے تو اس کی شاعری قبولِ عام کی سند حاصل کر نہیں سکتی اور وہ ایک اچھّا شاعر نہیں کہلایا جاسکتا۔ عوام اس تحریر یا فن پارے کو پڑھنا پسند کرتے ہیں، جس میں ان کے مسائل کی نمایندگی کی گئی ہو، لہٰذا ایک اچھّے شاعر کے ہاں معاشرتی مسائل کی نمایندگی ہوتی ہے اور اس کی شاعری میں سماجی مسائل پر کُچھ نہ کُچھ کہا گیا ہوتا ہے، جو عوام کے دلوں اور ان کی سماعتوں کو اپیل کرتا ہے اور جس شاعر کی روئیدگی معاشرے کی جڑوں میں نہیں رہتی اور اس کی شاعری تہذیبی شعور سے بے گانہ ہوتی ہے وہ جُز وقتی شاعر ہوتا ہے اور اس کے جانے کے ساتھ ہی اس کی شاعری بھی اس جہانِ فانی سے کوچ کر جاتی ہے۔ بہ ایں ہمہ عصری مسائل کی آگہی اور ان کا اظہار شاعری میں عصری حسیت کو جنم دیتا ہے۔ یہ عصری حسیت ریاض مجید کے ہاں داخلی رجحانات کی عکاس بن کر بھی سامنے آتی ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار قابلِ ملاحظہ ہیں:

رات آئی ،مرا سایہ مرے جسم سے کٹ کر
ڈسنے لگا مجھ کو میرے پیکر میں سمٹ کر (۱۳۵)

کشش لہو کی تھی زنجیر طائرِ جاں کو
نہ توڑ پائے زمینِ بدن کے زنداں کو
میں برف جھیل کی تہہ میں جمی ہوئی مچھلی
بجھایا سردئ خارج نے شعلۂ جاں کو (۱۳۶)

عصری حسیت داخل و خارج کے ابعادِ اربعہ پر متشکل ہوتی ہے۔ عصری حسیت انفرادی اور اجتماعی دونوں سطوح پر شعری اظہار میں آنے کے قابل ہے۔ ایک فرد کی مشاہداتی ژرف نگاہی اس کی حسیّات کا ماحصل ہوتی ہے۔ اِسی طرح شاعر کا ماحصل حسیّات کے ساتھ ساتھ اس کا تخیّل اور وجدان بھی ہوتا ہے۔ وجدان حسیّات سے اگلے مرحلے کا نام ہے کہ جہاں حسیاتی ادراک اپنے دائرہ کار میں محدود ہو جاتے ہیں۔ حسیّات کا دائرہ کار تہذیب و ثقافت کی جڑت سے نکل کر آگے کی جست کا نام ہے

کہ جہاں ایک آفاقی دائرہ کار مُرتّب ہوتا ہے اور اس آفاقی دائرہ کار میں اپنے عصر کا شعور سانس لیتا ہے۔ ریاض مجید ان شعرا میں سے ایک ہیں، جن کی شاعری اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنی مٹّی سے گہری جڑت اور وابستگی رکھتی ہے، ان کی شاعری میں آج کے انسان کے مسائل کی نمایندگی موجود ہے۔ وہ فضاؤں میں بُلند پرواز کرنے والا ایسا شاعر نہیں ہے جس کے پاؤں زمین پر لگنے نہیں پاتے، بل کہ ایسا شاعر ہے، جس کی روئیدگی اور جس کی زندگی کا، جوہر اپنی تہذیب کے خمیر سے اٹھتا ہے۔ وہ تو خود اس بات کا قائل ہے کہ اگر پھلنا پھولنا ہے اور جنگل یا بنجر نہیں ہونا، تو اپنی تہذیب میں جڑیں پیوستہ رہنی چاہئیں وگرنہ انسان جنگل ہو جاتا ہے اور حقیقت سے کہیں بعید جا پڑتا ہے۔ ذات کا عرفان انسان کے کسی نئے اور تازہ بیانیے سے آگہی دیتا ہے ۔ایک نیا شعور اور ایک نئی فکر کی روشنی مہیا کرتا ہے، لیکن یہاں کیا کیجیے کہ آشوبِ جہاں کی وجہ سے ذات میں غوطہ زن ہونے کے بعد جب باہر آتے ہیں، تو پھر اِنھی لوگوں میں ہوتے ہیں جن لوگوں میں پہلے موجود تھے۔ یہ خارج کے منظر کے نہ بدلنے اور واجبی تبدیلی سے پیدا ہونے والے عارضی حالات کے بے ثمر تغیر کا نتیجہ ہے، جس کا عصری شعور شاعر کے ہاں ایک شعری اظہاریے میں سامنے آیا ہے۔ ایک حساس انسان کی طبیعت پر آج کا پُر آشوب دور جس میں جان و مال اور عزّت و آبرو کُچھ بھی محفوظ نہیں ہے، کس طرح اپنے آپ کو بے بس و لاچار محسوس کرتا ہوگا یہ تو اس کے اظہاریے ہی بتا سکتے ہیں۔ اس بے بسی و پابستگی کے عالم میں جہاں چلتے پھرتے انسان آن کی آن میں بس ایک زوردار دھماکے کے نتیجے میں چیتھڑوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے بے یقینیت اور عدم اعتماد کی فضا روز بروز مائل بہ تخریب ہوتی جارہی ہے اور زندہ رہنے یا اگلے لمحے صحیح سلامت ہونے کے بارے میں کُچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہر طرف خوف کی حکمرانی ہے کہ انسان اپنے سائے سے بھی بعض اوقات تو ڈر کر بھاگنے لگتا ہے۔ اگر امن قائم ہوتا بھی ہے، تو وہ ریاض مجید کے مندرج بالا شعر میں پیدا ہونے والی محویتِ عرفانِ ذات کی اس عارضی شکل کی طرح ہے، جو خارج میں پھر سے، اِنھی لوگوں میں لا کر پھینک دیتی ہے:

میرا دکھ یہ ہے میں اپنے ساتھیوں جیسا نہیں
میں بہادر ہوں ،مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں
مجھ سے بھی اڑتے ہوئے لمحے نہ پکڑے جا سکے
میں بھی دنیا کی طرح حالات کے چکر میں ہوں (۱۳۷)

آج کے انسان کا المیہ کل کے انسان کے المیے سے کہیں زیادہ ہے ۔ تنہائی اور رائیگانی کا دکھ سب سے بڑا دکھ ہے۔ معاشرتی تناؤ اور جنگ و جدل کی وجہ سے مشرقِ وسطیٰ سے لے کر ہندوستان تک سارا انسانی سماج ایک ہی آگ کے شعلوں میں جھلس رہا ہے۔ دہشت گردی اور بدامنی نے انسانی زندگیوں کو اجیرن کر کے رکھ دیا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ پر امریکہ اور یورپی ممالک کی طرف سے عائد ہونے والی معاشی سینکشنز اور پابندیوں کی وجہ سے خِطّے کے امن و امان میں استحکام لانا ناممکن سا ہو گیا ہے۔ ایسے میں معاشرہ ایک بڑی تخریب کاری کے عمل سے گزر رہا ہے۔ جہاں قاتلوں کو ہم جانتے ہیں، مگر اُنھیں کیفرِ کردار

تک پہنچا نہیں سکتے۔ جہاں تعلیم پر اپنی ساری جمع پونجی خرچ کرنے کے بعد بھی صد ادھکے کھانے پڑتے ہیں۔ جہاں خونی رشتوں کا پاس نہیں۔ جہاں معاشرے کی اچھّی اقدار و روایات اپنا دم توڑ رہی ہیں۔ جہاں انسان محض روبوٹ کی صورت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ جہاں ہندو بنیے کا فریضہ مسلمان سود خور بن کر انجام دے رہے ہیں۔ جہاں ایک مسلمان کو مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ جہاں فحاشی کی دلدل میں بچّوں سے لے کر بوڑھوں تک پھنسے ہوئے ہیں۔ جہاں انسان کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور چند روپوں کے مقابلے میں اس کی قیمت ارزاں ہے۔ جہاں اپنوں کی اور اپنے خونی رشتوں کی کوئی قدر نہیں۔ ان حوالوں سے دیکھا جائے، تو عصری حسیّت کو انفرادی، اجتماعی اور علاقائی اور آفاقی سطح پر دیکھ سکتے ہیں۔ انفرادی عصری حسیّت جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، ایک فرد کی حسیّات کا اظہار ہے۔ یہ فرد کی داخلی اور خارجی رجحانات کی عکاسی کرتی ہے۔ ''گزرے وقتوں کی عبارت' میں انفرادی عصری حسیت کی نمایندگی زیادہ ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

جی رہا ہوں میں مثالِ کر مکِ سنگ اے ریاضؔ
زیست کی تنظیم کا خاموش کارندہ ہوں میں (۱۳۸)

اک عمر چل کے بھی اب تک اُسی جگہ پہ ہوں
خود اپنے ساتھ زمیں بھی رواں ہی آئے نظر (۱۳۹)

یہ ایک فرد کی سر گزشت ہے، جسے اس نے خود محسوس کیا ہے۔ ایک ایسا فرد، جو معاشرے کو بڑی ژرف نگاہی کے ساتھ دیکھتا ہے اور اس کے غلط و درست کا ادراک رکھتا ہے۔ اس کے معائب و محاسن کے ساتھ ساتھ اپنی محرومیوں سے اور حسرتوں کی داستان سنا کر اپنا بوجھ ہلکا کر لینا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اشعار میں ریاض مجید کے ہاں انفرادی اور ذاتی سطح پر عصری حسیت زیادہ ہے۔ وہ ذات اور اس کے عوارض کا مکمل ادراک رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس دورِ مکر و فریب میں انسان اپنا ساتھ خود ہی نبھاتا ہے اور اپنی مٹّی ہی اپنا ساتھ دیتی ہے۔ نہ کوئی ماں جیسا ساتھ دیتا ہے اور نہ کوئی دوست ساتھ نبھاتا ہے۔ ایسی صورت میں خود اپنی انگلی پکڑ کر چلنے کی عادت ڈالنا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں مادرِ مشفق یعنی زمین سے بھائیوں کی سرد مہری پر اظہارِ معذرت کیا ہے، جو علامتی سطح پر ایک وسیع تر استعارہ ہے۔

اجتماعی حسیت در اصل سماجی شعور کا نام ہے۔ سماج کے معاصر حالات کا ادراک مجموعی طور پر کسی بھی ذی الحس انسان پر گہرے اثرات مُرتّب کرتا ہے۔ ایک تخلیق کار کی تخلیق کے لیے ان حالات و واقعات کی بازگشت کا ہونا یا نہ ہونا واقعی بڑے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اچھّی تخلیق وہی ہوتی ہے، جو اپنے عہد کی نمایندگی کرے اور جس جس میں پڑھنے والے اپنا عہد تلاش کر سکیں۔ بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی کے حالات و واقعات کو پڑھنے کے لیے کسی تاریخ کی کتاب کو پڑھنے سے زیادہ ہم ایسے ادب پر اکتفا کر سکتے ہیں، جو اس دور کی نمایندگی کرتا ہو اور جس میں تمام کردار موجود ہوں۔ اس میں ہر طبقے کی نمایندگی کا حق ادا کیا گیا ہو اوزر اس میں ہر سماجی طبقے کے رجحانات کی عکاسی ہو۔

شاعری کے بر عکس نثر میں یہ زیادہ آسان کام ہے، لیکن بالخصوص غزل کے میدان میں ایک عہد کے سماجی شعور کو سمیٹنا نہایت دِقّت طلب امر ہے۔ ہمارے ہاں ایک ایسا معاشرہ ہے، جہاں حکمران سات دہائیوں سے عوام اور ملک کو لوٹ لوٹ کر معیشت کو تباہ و برباد کر چکے ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں زندہ رہنے والے شاعر کے سامنے یہ سب کُچھ ہو رہا ہو اور وہ اسے اپنی شاعری کا پیرہن نہ دے، بہت ہی عجیب بات ہو گی۔ ہر اچھّے شاعر کے ہاں ان مسائل کی بھرپور نمایندگی ہونی چاہیے۔ ریاض مجید نے ان معاشرتی مسائل کو بڑی خوبی کے ساتھ اپنی شاعری کا حِصّہ بنایا ہے۔ یہ ملاحظہ کیجیے جس میں اس معاشرے کے مجرموں کو تو معزز ٹھہرایا جاتا ہے، مگر بے گناہ لب کشائی کرنے والے لوگ دھر لیے جاتے ہیں۔ ریاض مجید کی غزلوں میں اس حوالے سے ایسے کئی اشعار تلاش کرنے پر نکل آتے ہیں، جن میں اجتماعی عصری شعور کی بازگشت سنائی دیتی ہے:

خواہشیں مٹتی گئیں، ویرانۂ جاں رہ گیا
کٹ گئے سارے شجر سنسان میداں رہ گیا (۱۴۰)

کھوٹے سکوں کی طرح ہم ہو چکے ہیں ناقبول
اب نیا ہی دور ہے اپنے زمانے جا چکے (۱۴۱)

اجتماعی عصری حسیت سے اگلی منزل عصری حسیت کے آفاقی پہلو کا ہے۔ آفاقی عصری حسیت عالمی شعور کے معاصر نامہ کا نام ہے۔ یہ اپنے وقت کی مجموعی آواز ہے۔ ظلم چاہے انسان کے کسی بھی لسانی و نسلی گروہ پر ہو اور وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں موجود ہو، اس کے خلاف صدائے احتجاج بُلند کرنا فرضِ عین ہے اور یہی ایک ادیب اور شاعر کی ذمّے داری ہے کہ وہ اپنی تخلیقات میں انسانی سماج کے دشمنوں کے خلاف آواز بُلند کرے، چاہے وہ دنیا کے کسی بھی خِطّے سے تعلق رکھتا ہو اور کسی بھی انسانی طبقے کی نمایندگی کرنے والا ہو۔ یہی انسانیت کا رشتہ اور احساس ہے۔ ستر اور اسّی کی دہائی میں ایک نیا ورلڈ آرڈر بنا کیوں کہ سوویت یونین کا افگانساتن پر حملے دنیا کے ایک نئے بلاک کی تشکیل کا باعث بنا اور اس نئے بلاک میں اب کے، جو سپر پاور تھا وہ امریکہ تھا۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابلِ غور رہے کہ افغانستان سے آنے والے مہاجرین اور پناہ گزین، جن کی تعداد بیس لاکھ ہے، اُنھوں نے پاکستانی معاشرے پر گہرے اور دوررس منفی اثرات مُرتّب کیے ہیں۔ مقامی لوگوں کے لیے بے شمار مسائل کا باعث بنے اور اپنے ساتھ منشیات اور اسلحے کا کلچر لے کر آئے۔ ریاض مجید نے ایک انتہائی حساس اور ذکی الحس شاعر کی طرح ان مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اُردُو شاعری میں سوویت یونین کے انہدام اور اس کے بعد کے تناظر میں نئے ذائقے اور نئی تبدیلیاں آئیں کیوں کہ تخلیق کاروں کو اب کے بڑی تعداد میں نئے مضامین ہاتھ لگے اور اُنھوں نے اس پر خوب طبع آزمائی کی، لیکن ریاض مجید نے اس حوالے سے ”گزرے وقتوں کی عبارت“ میں علامتی اور رمزیہ سطح پر ہی اکتفا کیا ہے اور اس پر آشوب عہد کے لیے نئے اور ڈھکے چھپے انداز میں اپنے معاصر عالمی منظر نامے کے شعور کو شعروں میں جگہ دی ہے۔

ریاض مجید کے ہاں معاصر نامہ اور خارج نامہ داخلیت کے احساس کے ساتھ عبارت ہے۔ اگر کوئی بڑی تبدیلی جس نے انسانی سماج کو تاثر کیا ہو وہ امریکہ میں بھی واقع ہوئی ہو، تو ریاض مجید کے ہاں اس کا اظہار داخلیت کے لمس کے ساتھ ہو گا اور یہی ان کی غزلیات کی خوب صورتی اور داخلی معنیات کا حسن ہے کہ وہ بڑے سے بڑے واقعے کی تجذیب اس انداز سے کرنے کا ہنر جانتے ہیں کہ وہ ان کا جز لاینفک بن جاتا ہے اور پڑھنے والا اسے ان کی اپنی بپتا سمجھتا ہے۔

علاقائی حسیت خِطّے اور علاقے سے نسبت رکھتی ہے کہ یہ ہر خِطّے کے اعتبار سے بدل جاتی ہے۔ کسی بھی علاقے کی تہذیب و ثقافت اور اس کے رسوم و رواج اس کی علاقائیت کو مُرتّب کرنے میں بڑی مدد کرتے ہیں۔ نہ صرف مدد گار ثابت ہوتے ہیں بل کہ ان کے بغیر علاقائی حسّیت متر کب پذیر ہی نہیں ہو سکتی۔ تہذیب و تمدن سے اگلا، جو بنیادی اختلاف ہے وہ زُبان کا ہے۔ زُبان انسانی محسوسات و ادراک پر تو کوئی اثر نہیں ڈالتی، لیکن ان محسوسات کے اظہار پر مکمل طور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زُبان و بیان محسوسات کے اظہار کو بھی بدل دیتے ہیں۔ علاقائی تغیرات و تبدلات بھی علاقائی حسیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ موجودہ دور میں انسان کی معاشرتی زندگی کو محدود کرنے اور دوستوں سے دور کرنے میں جس چیز کا سب سے بڑا ہاتھ ہے وہ مادیت پرستی ہے یا مشینی طرزِ زندگی ہے۔ یہ اب ہمارا ایک سماجی مسئلہ بن چکا ہے۔ جہاں پہلے ہمارے پاس رشتہ داروں اور دوستوں کے لیے گھنٹوں وقت ہوتا تھا، اب چند ساعتیں بھی میسّر نہیں ہیں اور تو اور اپنے والدین اور گھر والوں کے لیے بہت کم وقت ملتا ہے۔ گھریلو زندگی اور خاندان کی زندگی اس مشینی مصروفیت کی وجہ سے کافی متاثر ہوئی ہے۔ یہ سماجی مسئلہ روز بروز گھمبیر ہوتا جارہا ہے۔ اس کے پیچھے زیادہ تر جو عوامل کارفرما ہیں، وہ مادی ترقّی کی دوڑ دھوپ ہے۔ ریاض مجید کے ہاں اس المیے کا اظہار بکثرت ملتا ہے۔ وہ اس زمانے کی طرف لوٹ جانے کی جستجو کرتے ہیں، جو واقعی فرصتوں کا زمانہ تھا، جہاں لوگ ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹتے تھے اور کام آتے تھے۔ اس زمانے کے آشوب کا اور کس طرح کے سوز و گداز کے ذریعے اظہار ہو کہ ایک ہی گھر میں رہنے والے ایک ہی بستر پر سونے والے دو روح یک قالب اپنی اپنی ہتھیلی پر رکھی دنیا میں محو ہیں اور ایک دوسرے کے لیے وقت نہیں۔ شاعر نے اس المیے کو ایک خاص رنگ دے کر بیان کیا ہے:

چاک پر پھرتے ہم انساں نت نئی شکلوں میں تھے
ہم گندھی مٹّی کی صورت وقت کے ہاتھوں میں تھے (۱۴۲)

تجھ کو اِتنا کُچھ بنانے میں مرا بھی ہاتھ ہے
میری جانب دیکھ! میں بھی تیرے پس منظر میں ہوں (۱۴۳)

وقت انسان کی آرزوؤں اور حسرتوں کو روند کر آگے گزر جاتا ہے۔ وقت محسن و ممنون اور آشنا و اجنبی سبھی کو بدل دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان ماضی کی فرصتوں کو یاد کر کے بعض اوقات اپنے دل کی تسکین کا سامان کرتا ہے اور ماضی کی

فراغتیں ہی اس کے لیے باعثِ تسکین ثابت ہوتی ہیں۔ بے لوث محبّتیں آج کے زمانے میں، تو محض خیالی باتیں ہی معلوم ہوتی ہیں، لیکن انسان کو اگر وہی بے لوث محبّتیں اور فرصتیں مل جائیں، تو وہ ہزاروں صدیوں پیچھے کی جانب پلٹنے پر تیار ہے۔

(ب) کثیر الجہت موضوعات اور داخلی رجحانات:

غزل کارِ جگر کاوی ہے۔ موضوعات میں جب تک تازگی نہ ہو یا کم از کم پرانے موضوعات کو نئے انداز میں کہنے کا ملکہ نہ ہو تب تک میدانِ غزل میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام نہیں دیا جا سکتا۔ ریاض مجید کے حوالے سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ غزل میں ان کا اپنا ایک رنگ ہے اور وہ اس معاملے میں انفرادیت رکھتے ہیں۔ لائل پور میں اور بھی بہت اچھّے اچھّے شعرا موجود ہیں اور قادر الکلام بھی ہیں۔ ریاض مجید اپنی تہذیب سے اور اپنی مٹّی سے گہری جڑت رکھنے والا شاعر ہے۔ ان کے ہم عصر اور بھی کئی نابغۂ روز گار ادبا و شعرا موجود ہیں، مگر یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ارد گرد پھیلے تضادات، بوالعجبیوں اور مسائل کا مشاہدہ جس دیدہ وری اور ژرف نگاہی کا ریاض مجید نے کیا اور پھر جس شگفتہ اُسلوب بیان میں پیش کیا وہ فقط اِنھی کا خاصہ ہے۔ جدید اُردُو شاعری میں اوّلین توجُہ اس امر پر مرکوز کی گئی ہے کہ تاثر کی گہرائی کس طرح سے پیدا کی جائے اور وہ کون سے پیمانے یا ادبی میعارات ہیں جن کی وساطت سے شاعری بالخصوص غزل میں تاثر کی گہرائی پیدا کی جا سکتی ہے؟ کیوں کہ غزل تاثیر مانگتی ہے اور یہ تاثیر غزل میں تغزل کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔ غزل کا دامن اگر تغزل سے خالی ہے تو محض ذہنی مشق تو ہو سکتی ہے اسے غزل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ غزل عروض کا نام بھی نہیں ہے۔ بل کہ یہ علمِ عروض سے کہیں آگے تجربے، مشاہدے اور اس میں باطن کے اجزا کی پھینٹ سے بننے والے مشمولات کا ہونا لازم ہے۔ یہ وہ لوازمات ہیں، جو غزل کہنے والوں نے خصوصاً معاصر غزل میں تاثیر کی گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے کے لیے مدخول کیے ہیں۔ اس حوالے سے ریاض مجید کی شاعری انتہائی متمول نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں جا بجا ان اجزا کی پھینٹ سے بننے والا خمیر نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ کرنے کے قابل ہیں، جن میں شاعر نے اپنے باطنی و خارجی سفر کے ساتھ، جن متذکرہ معروضات و لوازمات کو شامل کیا ہے ان کے نظم و ضبط اور ان کی ایک دوسرے کے ساتھ تطبیق میں بھی ایک نیا پن موجود ہے۔ اِسی وجہ سے، ان کے اظہار یے میں ایک احساسِ شگفتگی و تازگی نظر آتا ہے:

ہو گیا ہے ایک اک پل کاٹنا بھاری مجھے
مار دے گی زندگانی کی گرانباری مجھے
لحہ لحہ موت ہے یہ وحشت آوارگی
کس طرف لے جائے گی جانے یہ بیزاری مجھے (۱۴۴)

غزل اپنے ارتقائی مراحل میں ہے۔ اکیسویں صدی کے موضوعات میں زیادہ تنوع ہے کیوں کہ یہ سائنسی ارتقا کے نقطۂ عروج کی صدی ہے، مگر ''گزرے وقتوں کی عبارت'' میں ناسٹلجیا کا کم و کیف زیادہ ہونے کے بجائے کم ہے۔ اس میں

یادوں کی شدت کے بجاے ان کا تخلیقی بر تاؤ زیادہ ہے۔ اُنھوں نے غزل میں داخلیت و خارجیت سے آگے بڑھ کر اس میں جدید لب و لہجے اور آج کے دور کے ذائقوں کے سمندر کا لمس پیدا کیا اور اس میں خارجی مناظر میں بھی وہ چیز پیدا کر دکھائی، جو صرف اور صرف افسانے یا ناوّل میں کی جا سکتی تھی یا جس کی بھنک خاکہ نگاری میں ملتی ہے۔ بعد از تقسیم اُردو شاعری میں کئی طرح کے رجحانات پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے انقلاباتِ زمانہ کو خندہ پیشانی سے گلے لگایا، مگر خود اس میں بہہ نہیں گئے بل کہ حدِ اعتدال میں رہ کر اس کے اثرات کو قبول کیا۔ ان کے ہاں تاثر کی گہرائی اور گیرائی دونوں لوازمات ملتے ہیں اور قاری جب ان غزلوں علی الخصوص ''گزرے وقتوں کی عبارت'' کی غزلیات کو پڑھتا ہے، تو اس کی نہ صرف باصرہ کو مناظری اور شعری گلگشت سے تسکین ملتی ہے بل کہ وہ خود کو شاعر کی واردات کا حِصّہ سمجھتا ہے اور غزل کے باطن میں وہ چیز دریافت کر لیتا ہے، جسے تزکیہ نفس کہا جاتا ہے۔ چند ایک اشعار اِسی بحث کے ضمن میں ملاحظہ ہوں، جن میں موضوعاتی تنوع کے ساتھ ساتھ داخلی رجحانات کی عکاسی بھی ملتی ہے:

نفرتوں کا ذکر ہی تیرے لبوں پر آئے گا
جو بھرا ہے تیرے اندر وہ ہی باہر آئے گا (۱۴۵)

قدم قدم پہ نہ حق گوئی سر کٹاتی ریاضؔ
نہ ایسے زیست کا ہر لمحہ کربلا ہوتا (۱۴۶)

تازہ موضوعات شاعری کے رگ وپے میں نئے خون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعض اشعار میں پرانے مضامین کو اس انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ ان میں جدّت اور تازگی نمودار ہو گئی ہے۔ نیز یہ کہ روایت کا خیال بھی رکھا گیا ہے۔ شعری تلازمہ بندی کا التزام ہر شعر کی خوب صورتی میں معنوی اضافہ کر رہا ہے۔ یہ بھی ریاض مجید کا اعزاز ہے کہ اُنھوں نے ''گزرے وقتوں کی عبارت'' میں کل، جو المیہ بیان کیا تھا، وہ کل کے انسان کا نہیں بل کہ آج کے انسان کا المیہ ہے۔ ایسے بہت سے اشعار موجود ہیں، جن میں اس قبیل کے مضامین کو بیان کیا گیا ہے۔ آج کے فرد کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ وہ سوشل میڈیا کمپین سے الگ ہو کر شہرتِ دوام حاصل نہیں کر سکتا، چاہے اس کے اندر کتنی ہی صفات کیوں نہ ہوں۔ اس کے لیے اسے سوشل میڈیا کے لشکر کا حِصّہ بننا پڑتا ہے تا کہ اس کی تشہیر ایک مثبت انداز میں معاشرے میں ممکن ہو سکے۔ اس پر لگے ہوئے لیبل یعنی میڈیا ٹیگ ہی کی وجہ سے اس کے اچھّا یا برے ہونے کا اندازہ کیا جاتا ہے اور باطن کو کوئی نہیں دیکھتا۔ اِسی طرح کا خیال ریاض مجید نے اس شعر میں یوں پیش کیا ہے:

میرا دُکھ یہ ہے میں اپنے ساتھیوں جیسا نہیں
میں بہادر ہوں، مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں (۱۴۷)

(ج)فنی جمالیات کا مطالعہ:

شاعری ایک الہامی فن ہے۔ یہ ودیعتی بھی ہے اور کسی حد تک اکتسابی بھی ہے۔اکتسابی اس لیے کہ فن بغیر سیکھے درجۂ کمال تک نہیں پہنچتا۔ آسمان کی دعوت کو زمین کے نمک سے تڑکا لگا کر تناول کرنے کا نام ہے۔ غزل کی صورت گری ہی ایسی ہے کہ اس میں تخیّل اور تغزل کی موجودگی کے بغیر چاشنی پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔جمالیات فی الحقیقت ہے کیا چیز اِس کے بارے میں ابو الاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

> ”جمالیات فلسفہ ہے، حسن اور فن کاری کا۔جمالیات سے مراد اربابِ فن کے وہ نظریے ہیں، جو حسن اوراُس کے کوائف و مظاہر (جن میں فنونِ لطیفہ بھی شامل ہیں) کی تحقیق و تشریح میں پیش کیے گئے ہیں۔“ (۱۴۸)

غزل کی بھی ایک خاص جمالیات ہے، جس کی رو سے معروضیت جہاں تک ممکن ہو غزل کا جُز لاینفک ہے، لیکن نِری معروضیت غزل کے جمالیات کا گلہ گھونٹ دیتی ہے۔ اس لیے اس میں تغزل اور تخیّلِ شاعر کا تڑکا اسے مزید حسین بناتا ہے کیوں کہ اب اس میں شاعر کی ذات تحلیل ہو چکی ہوتی ہے۔شاعر جس طرح سے اپنی ذات میں غزل یا نظم کو تحلیل کرتا ہے۔ پھر اس کی صورت گری اپنی متخیلہ اور متصوّرہ کے سانچے میں تشکیل دے کر خود اپنے آپ کا جب غزل کے مزاج میں تشکل کرتا ہے، تو وہ ایک لمبے چوڑے تخلیقی عمل سے گزر رہا ہوتا ہے۔اِسی طرح اس میں سوز و گداز اور تغزل کا پیدا ہونا اس امر کا متقاضی ہے کہ شاعر خارجی اور داخلی مظاہر و مناظر کو اپنی ذات کے لمس کی جمال آفرینی سے بیان کرے۔ جدید اُردُو غزل میں اس قسم کے اُسلوب کو آزمانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس قسم کی کوششوں میں صنائع وبدائع کا استعمال، تلمیحات کا نیا انداز اپنانے، نئی علامتیت کو جنم دینے، لفظ کو اُلٹنے، معنی کی معکوسی صورت ابھارنے اور شاعرانہ لطافت کو بیانیہ میں پرونے کی کاوش زیادہ نظر آتی ہے۔

شاعر کے ہاں خارج اور باطنی دنیا کے تاثرات اس قدر گہرے منقش ہیں کہ وہ اس کی شاعری میں تاثر کی گہرائی پیدا کرنے میں کامیاب طور ممد و معاں ثابت ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ اس میں ہمیں شاعر نگار کی قوت اور واقعات وحالات کے اخذ واکتساب کے لیے فکری بصیرت کا درست استعمال بھی نمایاں نظر آتا ہے، جو کہ ایک شاعر کے بنیادی اوصاف میں سے ایک ہے۔ یہ غزل کی تاثراتی اور جذباتی فضا کا تجزیہ ہوا، مگر لسانی حوالے اور شعر کی فنی مقتضیات کے اعتبار سے اگر ہر شاعر کا تجزیہ کیا جائے، تو سلیس زُبان کے، جو قضیے قائم ہوتے ہیں تو وہ ان میں پورا نہیں اترتا۔ بعض کے ہاں محاورے کا فقدان نظر آتا ہے تو بعض کے ہاں معنیاتی تلازمہ بندی نہیں ہوتی۔ شعر میں سہلِ ممتنع کی شان پیدا کرنے کی مقدور بھر کوشش اپنی جگہ، مگر شعری سانچے کے اندر رہ کر بہر کیف اس میں سادگی اور نثر یہ شان پیدا کرنا اور ایک جمالیاتی نقش تخلیق کرنا اُن پر واجب ہوتا ہے۔”گزرے وقتوں کی عبارت“ میں غزل کی یہ فنی جمالیات بہ کمال خوبی سے پورا کیا گیا ہے۔

اُسی فضا اُسی ماحول میں مکیں ہوں میں
وہاں سے آ کے بھی اب تک وہیں کہیں ہوں میں
گئے زمانوں کو سمجھو مرے حوالے سے
کہ رفتگاں کی روایات کا امیں ہوں میں (۱۴۹)

غزل صرف لفظی قلابازیوں ہی کا نام نہیں ہے۔ یہ جگر کا خون مانگتی ہے۔ جیسا کہ آتش کے الفاظ میں اسے مرصع ساز کا کام کہا گیا ہے، لیکن مرصع سازی میں تصنّع ہوتا ہے اور غزل میں تصنّع در آئے تو وہ محض فن کاری رہ جاتی ہے اور اس کم و کیف غائب ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض احباب کی غزل فقط لفظی تراکیب کے فن کارانہ استعمال، صنائع و بدائع اور نئی علامتیت ہی تک محدود ہے، جب کہ معنیاتی جمالیات سے خالی ہے۔ ریاض مجید کا کمال یہ ہے کہ "گزرے وقتوں کی عبارت" میں کوئی ایک بھی ایسا شعر نہیں ہے، جو بھرتی کا شعر محسوس ہو، جس میں محض قافیہ پیمائی کی گئی ہو۔ غزل کے اشعار میں ہفت رنگ مناظر ہیں، جن کے بیان کرنے میں ریاض مجید نے نئی علائم و رموز کو بھی بروے کار لانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اس ضمن میں اُنھوں نے شعر کے بیرونی قالب اور اندرونی قالب کو دو الگ الگ معنیات عطا کیے ہیں۔ اس سے شعر کے فنی جمالیات میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ اس شعری مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے سجاد باقر رضوی نے لکھا ہے:

> " ریاض مجید کے اس مجموعے میں امکانات کی تفتیش پر اعتماد اور اپنی ذات کے اندر سمٹنے پر بے بسی اور پژ مردگی کے احساسات ہر جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔" (۱۵۰)

ریاض مجید کے کلام میں اِنھی عناصر کی کارفرمائی سے ایک خاص تحیر کی فضا نظر آتی ہے، جس نے ان کے اندر ایک ڈرامائی کیفیت پروان چڑھائی ہے، جس نے انسان کو سوچنے کی رہ دکھائی ہے۔ اس ضمن میں ریاض مجید ضرور بامراد رہے ہیں۔ اُن کی آنکھ ایسی ایسی اَن دیکھی حقیقتیں جلوہ گر کرتی ہی، جو مزید تحیر آمیزی کا سامان کرتی ہے۔ اُنھوں نے تصویر کا صرف ایک رخ دیکھنے کے بجاے اسے ہر زاویے سے دیکھا ہے اور ہر اینگل سے اس کی بنت اور بناوٹ کو بیان کیا ہے۔ یہی ان کا کمال ہے کہ ہر شعر میں مناظری جزئیات کو حیرت انگیز حد تک متحرک کر کے پیش کیا ہے۔ اُنھوں نے بیان کیے گئے ہر منظر کو اپنی باریک بین نگاہوں سے دیکھا ہے اور حیرتوں کو جگانے کے بہانے منظر کی تمام ناہمواریوں کو ابھارا ہے۔ وہ قاری کو بھی آمادہ کرتے ہیں کہ وہ اس منظر نامے میں اپنے آپ کو شامل کر لے اور شاعر کا شریکِ جلوہ بن جائے۔ کبھی یہ منظر شریک ہونے والے کو رلاتا ہے، تو کبھی اسے کھل کر قہقہہ لگانے پر مجبور کرتا ہے۔ چناں چہ وہ شگفتہ کیفیت، جو غزل کو یا کسی بھی تخلیقی فن پارے کو قاری کے قریب تر کر دیتی اور قاری پر داخلی مُسرّت کا دروازہ کھول دیتی ہے وہ شعری مُسرّت کا جُزبن جاتی ہے، مگر غزل میں یہ چیز اگر مقصود بالذات بن جائے تو منظر کا بیان ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے اور یوں غزل کا اساسی تصوّر مجروح ہونے لگتا

ہے اِنھی وجوہ کی بنا پر کسی چیز کا یا مقصدیت کا شعوری طور پر غزل کا جزِ بدن بنانے کی کوشش نہیں کی جاتی، جن شعرا نے یہ شعوری کوشش کی ہے، اُن کی شاعری بنیادی طور پر ان کے نظریے و مقصد کے منشور نامے بن گئے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے :

میں پہاڑوں کی طرح خاموش تھا سویا ہوا
جاگ اٹھا تھا سر سے پاؤں تک لبِ گویا ہوا (۱۵۱)

وہ سالِ نو پہ ملا بھی تو سرسری اب کے
اُداس کر گئی پہلی ہی جنوری اب کے (۱۵۲)

’’گزرے وقتوں کی عبارت‘‘ بیسویں صدی کے آخری ربع کی اُردُو غزل کا بیانیہ ہے، جس میں ریاض مجید نے بدرجۂ غایت فنی جمالیات کو پیش کیا ہے۔ شاعر نے رفت و بود میں کتنی کئی زمانی مسافتوں کو کامیابی کے ساتھ طے کر لیا ہے۔

(د) معروضاتِ فن اور متخیلہ:

فنِ شعر ایک قدیم ترین فن ہے اور فنون لطیفہ میں سے شاعری سب سے ارفع فن ہے۔ فن کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اس کا جمالیاتی پہلو ہے دوسرا معروضی پہلو ہے۔ معروضیت میں ثقافتی فن کا پہلو بھی شامل ہوتا ہے۔ شعر اپنے عہد کی تاریخ اور آئینہ ہوتا ہے۔ اِسی معروضیت میں لسانی تخصصات بھی شامل ہوتے ہیں، کیوں کہ زُبان کے بطن ہی سے اُسلوبِ بیان اور ہئیتی نمونے نکلتے ہیں۔ شاعری اپنے عہد اور وجود کا پتا دیتی ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ اُوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ دنیا کا قدیم ترین فن ہے اور اس فن کے ذریعے نہ صرف ایک نئے موجود کو دریافت کیا جاتا ہے بل کہ نامعلوم کا اسرار دریافت کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ اس لیے شاعری اپنا اوّلین رابطہ متخیلہ سے قائم کرتا ہے۔ اس سے ایک نقطہ نظر تو سامنے آتا ہے کہ شاعری کا اساسی عنصر متخیلہ کو قرار دیے بغیر بڑی شاعری تخلیق نہیں کی جا سکتی۔ اوّل الذکر نقطۂ نظر میں یہ صداقت مو، جود ہے کہ دنیاے قدیم کی بڑی بڑی کہانیوں میں مرکزی کردار مہم جوئی کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ طلسمات کے سفر طے کرتا ہے۔ ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں سے گزرتا ہے۔ بالآخر گوہر مراد حاصل کر کے کامیاب و کامران واپس لوٹتا ہے۔ ہومر کی اوڈیسی، طلسمِ ہوشربا، قِصّہ چہارر درویش اور افسانہ آزاد وغیرہ میں ہیرو اساسی طور پر سفر پسند اور مہم جو ہے۔ اُسے نہ صرف نئی زمینوں اور نئی تہذیبوں سے پالا پڑتا ہے بل کہ وجودی سفر کے عمل سے وہ اپنی شخصیت کا رنگ اتارنے اور داخل کی روحانی پرت کو نکھارنے کی سعی بھی کرتا ہے۔ چناں چہ ان کہانیوں کا خمیر سفر کے قوام ہی سے اٹھایا جاتا ہے۔ شاعر بھی یہی فریضہ انجام دیتا ہے اس کی قوتِ متخیلہ اس کو قریب و بعید کے سفر پر آمادہ کرتی ہے اور اسے ان مقامات کی سیر کرا دیتی ہے، جو کسی کہانی کار یا افسانہ نگار کے بس کی بات نہیں ہوتی، جو کسی کہانی یا ناوّل کے فرضی کردار کی طرح کا شبیہ تو رکھتی ہے، مگر اس کے وجودی عوارضات سے بے نیاز ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نوازش علی ایسی ہی کیفیت کا اظہار اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

”وہ شخص جس میں تخلیقی عمل پیچیدہ راستوں سے گزر کر، جداگانہ شعری پیکر کی تخلیق کا باعث بنتا ہے، اُس کی تلاش اور دریافت ہی تنقید کا فریضہ ہے۔ خود کو شاعری اور شاعر میں شاعر اور شاعری کو خود میں جذب کیے بغیر جداگانہ شعری دنیا کی دریافت ممکن نہیں ہے۔ “ (۱۵۳)

ڈاکٹر نوازش علی نے اِس تخلیقی عمل میں تخیّل کے ساتھ سوچنے کے اتفاقی عوامل کو آمیخت کرتے ہوئے بات اور بڑھا دی ہے۔ چناں چہ متخیّلہ بذاتِ خود شاعر کے ذہن میں ایک کردار کی صورت میں ہیئت پذیر ہونے کی قدرت سے مالامال ہوتی ہے۔ کسی نادیدہ جزیرے کی سیر ہو یا کسی کردار کا سفر، یہ برابر شاعر کو اس کی مسافت طے کرنے پر ابھارتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اچھّا شاعر اس کے زور پر آنے والے واقعات کی پیشین گوئی بھی کرتا ہے اور عامۃ الناس سے بالاتر ہو کر کسی امر واقعہ کے ہونے یا نہ ہونے کا ادراک بھی رکھتا ہے۔ ریاض مجیدؔ کے ہاں متخیّلہ کا یہ بنیادی کردار بدرجہ کمال فعالی صورت میں موجود ہے۔ ”گزرے وقتوں کی عبارت“ میں وہ ان دیکھی زمینوں کی طرف سفر کرنے کا، جو عندیہ لے کر آئے ہیں، وہ فنِ شعر کے معروضات اور متخیّلہ کے مابین ایک خوب صورت جمالیاتی پُل ہے جسے وہ جگہ جگہ قائم کرتے ہیں، لیکن یہاں ریاض مجید کے ہاں ایک خاص کرب کی کیفیت بھی نظر آتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے ریاض مجید کی شاعری کے اِسی پہلو کو قدرے وضاحت سے بیان کیا ہے:

”ریاض مجید کی غزل کا مرکز و محور وہ کرب ہے، جس میں نہ صرف اُس کی ذات اسیر ہے، بل کہ وہ پوری کائنات کو اِس کرب کی شدت میں اینٹھتا اور کراہتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ “ (۱۵۴)

ریاض مجید کا یہی کرب آگے چل کر ایک جمالیاتی رنگ دھار لیتا ہے، جس سے وہ اپنی فکر کی بُلندیوں کی طرف روبہ خرام ہو کر وہ طبیعات سے مابعد الطبیعات کی سرحد میں جانکلتے ہیں۔ ان کے ہاں مابعد الطبیعاتی مضامین بھی اِسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ ان کے ہاں یہی مقام تو قیدِ مقام سے نکلنے اور حبسِ دوام سے پیچھا چھڑانے کا مقام ہے۔ اِسی لیے تو نئی اور ان دیکھی زمینوں کی طرف اڑان بھرنے کا اشتیاق بدرجہ غایت موجود ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ کرنے سے آپ کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا:

سب میرے بوسیدہ خدو خال سے بیزار ہیں
اے بدن اب اور کوئی سوانگ بھرنے دے مجھے
ہو چکا ہے ختم کھارے پانیوں کا سلسلہ
دیکھ دھرتی آ گئی ہے اب اترنے دے مجھے (۱۵۵)

اب یہ تمنائے نجاتِ حبسِ دوام اس قدر شدت اختیار کر جاتی ہے کہ شاعر روح کا کانٹا بھی نکال باہر کرنا چاہتا ہے۔ ”ناآسودہ خواہش“ اس مصرعے میں مرکبِ توصیفی کے طور پر ایک نئے انداز میں مستعمل ہوئی ہے۔

یہ تغیر و تبدل کا جہان ہے میاں۔ یہاں ہر کوئی اپنے آپ کو نئ نمود سے تعبیر کرنا چاہتا ہے۔ یہ نئے پن کی خواہش گزشتہ سے پیوستہ رہ کر نہیں بل کہ نئے انداز میں بسر کرنے کی آرزو ہے۔ ہر ایک چیز کی ماہیت فن کے مانند بدلتے جانے کا نام ہے۔ فنِ شعر کی ماہیت بھی اِسی طرح کی ہے کیوں کہ فن بدلتا ہے اور ایک سا نہیں رہتا۔ یہ مسلسل تغیر سے عبارت ہے، لیکن اس آرزو کو فن کا کون سا قرینہ اظہار کی نئ شکل دیتا ہے، اس بات کا اندازہ آپ شاعر کے اشعار ہی سے لگا سکتے ہیں:

نکل سکوں گا کب اس تیرگی کے ہالے سے
یہ واہمہ سا مرے گرد ، روز و شب کیا ہے؟
میں رات خواب میں کیوں چونک چونک اٹھتا ہوں
مرے وجود میں جو شے ہے مضطرب کیا ہے؟ (۱۵۶)

غالبؔ نے اشیا کی ماہیت کے حوالے سے سوال نہیں اٹھایا تھا بل کہ سبزہ و گل کے وجود پر اس کا سوال تھا کہ یہ کہاں سے آتے ہیں اور ابر کیا چیز ہے، لیکن ریاض مجیدؔ نے اشیاء کے وجود کی ماہیت پر سوال کیا ہے، جو فنی لحاظ سے زیادہ اہمیت کا حامل سوال ہے کیوں کہ اس میں زیادہ سائنٹی فک اپروچ پائی جاتی ہے۔ "گزرے وقتوں کی عبارت" کا فنی تجزیہ کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان غزلوں میں اظہار کی ندرت بھی ہے اور خوب صورت قرائن کے ساتھ مابعد الطبیعاتی مضامین کو بیان کیا ہے۔

ان کے ہاں فنِ شعر کی پختگی بھی نمایاں ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخاست دیکھیے یا پھر صنائع وبدائع کا استعمال ہو، ہر ممکن قرینے کو جمالیات کا لبادہ دے کر خوب صورت مُرقّع تشکیل دیا ہے۔ ان موضوعات کو فرسودہ اور قدامت پرستانہ کہنا بھی جائز نہیں اور اس طرز کو طرزِ کہن قرار دینا اس لیے مناسب نہیں کہ شاعر نے کسی موجودہ زمین پر سفر کرنے کے بجائے زیادہ تر متخیلہ کی ضرورت کے مطابق نئ سر زمینیں خود تخلیق کی ہیں اور شعر کے بطون میں متخیلہ کی مملکتوں کے عجائبات جمع کر دیے ہیں۔ نتیجتاً ان کی شاعری کو اس عنصر نے تحریک عطا کرنے اور اس کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں معاونت کی ہے اور اس کی صرف تخلیقی سطح ہی کو نہیں منظر پر لایا گیا، بل کہ اس کا معروض بھی مِن و عَن ساتھ موجود ہے۔ یہی بات ان کے کلام کی اثر انگیزی پر دال ہے، ورنہ عمومی طور پر تو بقول خلیل الرحمان اعظمی:

> "عام طور پر غزل کا شاعر ایک مُرتبہ اپنی آواز کو دریافت کر لینے اور اپنا مخصوص اُسلوب متعیّن کر لینے کے بعد پھر عمر بھر کے لیے اُسی کا ہو رہتا ہے۔" (۱۵۷)

اس خاص ارتقائی رنگ کے باوجود ان کے اشعار میں الفاظ کے تخلیقی برتاؤ نے مزید اس جمالیات کو ابھارا ہے اور اِسی پر ریاض مجید کی شاعرانہ انفرادیت کا مدار ہے۔ لفظی تکرار سے ترنم مُرتّب ہوا ہے ۔ مزید یہ کہ درج بیانیے کے مطابق

ریاض مجید کے نفسیاتی داخلیت پسند یعنی Introversive ہونے کا بھی علم ہوتا ہے۔ مزید یہ عرفانِ نفس اور تنہائی کے لمحات میں استغراقی کیفیات کا، جو فنی نقطہ نظر سے بہترین اظہار ممکن ہوتا ہے وہ یہاں مل سکتا ہے۔ یہ اشعار اس پر دال ہیں:

اب گھر بنا کے کتنے جھمیلوں میں پھنس گئے
کتنا سکون بے سرو سامانیوں میں تھا (۱۵۸)

(ہ) معروضاتِ فن اور روایتی انطباق:

شاعر کی تخلیقی اپج سے شاعری متمول ہوتی ہے اور اس میں آنے والے شعرا کے لیے نئے امکانات پیدا کرنے کی وسعتِ قلبی پیدا ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ ہماری آج کی شاعری میں کسی بھی روایت کا موجودہ برقی مواصلات کی موجودگی میں دخیل ہونا کوئی بعید از قیاس امر نہیں ہے اور، جو روایت مستحکم ہو جائے اس کے بعد مدتوں اس کا چرچا رہتا ہے اور اس کے اثرات کے تحت پوری ایک نسل آجاتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس رایت میں ایسی کشش اور جاذبیت ہو کہ نئی نسل اس کی طرف اپنے آپ کو خود بخود متوجہ کرلے۔ اس کی مثال جون ایلیا کی ہے۔ جون ہر نوجوان کا پسندیدہ شاعر ہے اور اس کی شعری روایت، الفاظ کے برتاؤ اور بطرزِ اظہار سے ایک پوری نسل متاثر ہوئی ہے۔ اس نے اپنے لب و لہجے اور مشاعرے میں شعر کی ادائی سے لوگوں کے دل جیتے ہیں۔ اِسی طرح کوئی بھی شاعر جب تک اپنی انفرادی روایت کو لے کر نہیں آتا۔ اس کی شاعری میں عوامی رنگ پیدا نہیں ہوتا۔ فن اگر روایت کے ساتھ انطباق نہ رکھتا ہو وہ فن یا تو جلد ہی رتب و یابس ہو جاتا ہے یا پھر یہ نیا فن بذاتِ خود ایک طاقت ور روایت لے کر وارد ہوتا ہے اور اِسی سے ایک نئی روایت جنم لیتی ہے۔

بہر کیف روایت کے ساتھ فنِ شعر کے نئے رجحانات کا ہم آہنگی اور انطباق اہم ہے۔ ماضی پر نظر دوڑائی جائے تو علم ہوتا ہے کہ روایت کو اہمیت اس لیے حاصل ہوئی کہ اس سے اگلی نسل اپنے قصرِ شاعری کو تعمیر کرتی تھی اور اپنے سے پہلے زمانے کی قاقدار سے مانوس تھی، لہٰذا رویت کو ایک عظیم شے جان کر عہد بہ عہد سفر طے کیا گیا۔ اب بھی روایت معتبر ہے، جتنی کل تھی، مگر اس کی تقلیدی روش دم توڑ چکی ہے۔ چناں چہ تخلیقی سفر نے حقیقی سفر کی اور شاعری کی داخلی جہت نے اپنی خارجی جہت کی صورت اختیار کر لی۔ اس حوالے سے غزل اور نظم کی روایت میں، جو مشترک اقدار ملتی ہیں۔ اُن کی حیثیت موضوعی ہی نہیں معروضی بھی ہے۔ اس اجمال سے یہ نتیجہ بر آمد کرنا مقصود ہے کہ علی الخصوص غزل میں ادبی عناصر یا ادبیت کا ناگزیر پن کیوں کر معرض وجود میں آتا ہے اور یہ سفر ایک معروضی حقیقت ہوتے ہوئے اور ایک خارجی طبیعاتی تجربہ ہو کر بھی ایک داخلی اور تخلیقی سفر کس طرح بنا۔ اُردُو غزل کو اس حوالے سے اگر دیکھا جائے، تو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اس میں معروضی دنیا کے تاریخی بیانیے میں تخلیقی سفر کی بازگشت سنائی دینے لگتی ہے۔ البتہ اس کی گونج اتنی پر تاثیر اور زور آور نہیں ہے، جو بعد از تقسیم ہند اُردُو غزل کا خاصہ ہے۔

قبل از تقسیمِ ہند اُردُو شاعری میں ایک بھونچال دو تہذیبوں کے تصادم سے بھی آیا اور اس کے اُردُو شعر و ادب پر دور رس اثرات مُرتّب ہوئے۔ نتیجتاً ہمارا شاعر طرزِ کُہن سے نکلا اور تخیّل کی سر زمینوں میں گلگشت کرنے کے بجائے اس نے خود کو جب معروضی دنیا میں اتارا تو اُسے زمینی حقائق کا علم ہوا اور یہی زمینی حقائق اس کے لہجے کی کاٹ بن کر سامنے آئے، چناں چہ غزل و نظم دونوں کا دامن وسیع ہوا۔ اس کے بر عکس سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں شاعر بذاتِ خود اگر نئے ممالک کے سفر کرتا اور وہاں کی تہذیب و تعلیمات سے متاثر ہوتا تو اس کی شعری روایت میں بدلاؤ آتا ورنہ وہ ساری عمر داخلیت کے چکر میں ہی رہتا۔ اٹھارویں صدی کے اوخر اور انیسویں و بیسویں صدی کے شعرا نے بدیسی معاشرت کی نقشہ کشی بالکل اُسی انداز میں کی ہے، جس طرح ناول نگار اور ڈراما نگار اپنے کرداروں کے ذریعے کسی معاشرت کی تصاویر ہمیں دکھاتا ہے۔ یوں شاعر کا یہ رخ ہمیں ایک لحاظ سے ناول نگار یا ڈراما نگار کی شخصیت کے قریب نظر آتا ہے اور اُن میں ادبیت کی شان پیدا ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ مثال کے طور نظیر اکبر آبادی اور اکبر الہ آبادی کی شاعری دیکھ لیجیے، جس سے ہندوستانی تہذیب میں ولایتی تہذیب کی تخریب کاریاں صاف صاف طور پر دکھائی گئی ہیں اور ہندوستانیوں کو اس امر سے متنبہ بھی کیا گیا ہے کہ بدیسی تہذیب اور بود باش کے اثرات کے تحت ان کی اپنی تہذیب و ثقافت خطرے میں ہے اور ان کے نظریات پر کاری ضرب لگائی جا رہی ہے۔ نظیرؔ کی نظموں میں پنجاب کی تمام تہذیب سانس لیتی ہے۔ نظیرؔ اور اکبرؔ نے اہلِ فرنگ کے مجموعی مزاج، کثیر الامتزاجیت، مزاج کے تشکیلی عناصر اور مذہبی اقدار کے شخصیات پر اثرات اور اُن کے تہذیبی و تمدنی استنتاج کو تجزیاتی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ اس وقت کی ضرورت تھی اس لیے ایسا کیا گیا، مگر بعد میں یہ روش روایت کے درجے پر نہ پہنچ سکی کیوں کہ اس کی ضرورت نہ رہی تھی اور آنے والے شعرا نے اس کی جگہ ایک طاقت ور اور صحّت مند روایت ڈالی تھی، جس میں اقبالؔ کا سب سے زیادہ حِصّہ ہے۔ اقبال نے اپنی انفرادیت سے، جو روایت قائم کی، اس سے بیسویں صدی مجموعی طور پر متاثر ہوئی ہے۔ ہر صدی میں اس طرح کی روایتیں قائم ہوتی ہیں اور چھوٹے بڑے شعرا اس کے تتبع میں شعر کہتے ہیں۔ ہمارے دور میں، جو روایت قائم ہوئی ہے، وہ جدید لب و لہجے کی غزل یا نظم کی روایت ہے، جس میں اندازِ بیان کا بدلاؤ اور اظہار کا ذائقہ اپنی ندرت اور تازہ کاری سے پہچانا جاتا ہے۔

یہ روایت پچھلی صدی کے نصف آخر کی قائم کردہ ہے اور اب تک چل رہی ہے۔ معاصر شعرا نے اِسی روایت کو قبول کیا ہے۔ اب اس تمہید کا مقصد یہی تھا کہ اس حوالے سے ریاضؔ مجید کی شاعری کو پرکھا جائے۔ مبدل بہ زمانہ روایت میں جان ہوتی ہے اور اس کی کشش سے کوئی بھی شاعر بچ نہیں سکتا۔ کہیں نہ کہیں وہ اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال غالبؔ کی انفرادی روایت ہے، جو غزل میں اس نے قائم کی، جسے ہم غالبؔ کا انداز کہتے ہیں۔ غالبؔ شکنی میں یاس یگانہؔ چنگیزی کا نام کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ اس نے ساری زندگی غالبؔ شکنی کی، مگر عجیب بات یہ ہے کہ یگانہ بھی غالبؔ کے اثر سے بچ نہیں سکا اور اس کی شاعری پر بھی غالبؔ کی قائم کردہ روایت کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اس حکیمانہ طرزِ اظہار در اصل غالبؔ ہی کا دین

ہے۔اِسی طرح آج کا شاعر اپنے عصری ماحول کی قائم کردہ روایتوں سے تہی پہلو نہیں ہو سکتا۔ وہ ان کا اثر قبول کرتا ہے اور اس میں کُچھ کُچھ اپنی انفرادیت کا رس بھی گھولتا ہے۔ ریاض مجید صحّت مند روایت سے متاثر ہوتے ہیں۔ مضحکہ خیز اور نامعقول روش پر اُنھیں چلنا نہیں آتا۔ ریاض مجید کا دامن پاک ہے اور اُنھوں نے عصرِ حاضر کی روح کو اپنی شاعری میں پھونکا ہے۔ اس کے ساتھ اُنھوں نے اپنے اُسلوب کی انفرادیت کو بھی برقرار رکھا ہے۔ البتہ کوئی ایسی فنی روایت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی جس سے شعرا کی ایک نسل متاثر ہو۔ اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اُداس صحن ، کُھلا در پکارتا ہی رہا
گئے ہوؤں کو مِرا گھر پکارتا ہی رہا (۱۵۹)

ترا وُجود ترے تجربے ہی تو ہیں ریاضؔ
متاعِ جاں کی طرح تجربے سنبھال اپنے (۱۶۰)

درج بالا اشعار میں فن روایت کے ساتھ خصوصی التزام رکھتا ہے۔ روایت کے بطن سے ریاضؔ مجید کا فن برآمد ہوا ہے۔ لفظی تراکیب اور استعارہ و تشبیہ کے بہتر استعمال نے ان کے فنِ شعر کو مزید بڑھا دیا ہے۔ لفظی تکنیک کا موزوں انتخاب و استعمال شعر سے دل چسپی اور اُس کے فنی حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ تاہم اصل اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ شاعر نے اپنی قوت باصرہ اور متصوُّرہ و متخیّلہ سے کس طرح کام لیا ہے اور واقعات کے اخذ و اکتساب کے لیے اپنی ذہنی بصیرت کو کیوں کر استعمال کیا ہے۔ شاعری کا مواد سادہ انداز میں پیش کر دیا جائے، تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ شعر کی مجموعی فضا قاری کو فوری طور پر اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، لیکن مواد اچھّا نہ ہو تو اچھے لفظوں کی تکنیک بھی شعر کی داخلی خوبیوں کو اجاگر کرنے میں معاونت نہیں کر سکتی۔ اچھّے مواد کو پیش کرنے میں اچھّے لفظ کی تکنیک اُس صورت میں استعمال ہو سکتی ہے، جب ایک شاعر اور اس میں موجود ایک فن کار دُونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر چلتے ہیں۔ شاعر اپنی تیز باصرہ سے ماحول کی جزئیات کو سمیٹتا ہے اور فن کار ان جزئیات کو خُوب صُورت اور دل کش انداز میں جاذبِ توجّہ اسلوب میں یوں پیش کرتا ہے کہ پورا منظر متحرک ہو کر قاری سے ہم کلام ہو جاتا ہے۔ ریاض مجید کے ہاں لفظوں کی یہ تکنیک خوب صورت طریقے سے استعمال ہوئی ہے اور ان کے اندر کے فن کار نے اس میں فنِ شعر کے رنگ بھر دیے ہیں:

میں تری صد رنگیوں کے کھیل سے بیزار ہوں
اے زمانے ہر گھڑی صورت بدلنا چھوڑ دے
دل کے اُوپر بوجھ ہے یہ ٹھہرے پانی سی حیات
یا تو میرے ساتھ چل یا میرا رستہ چھوڑ دے (۱۶۱)

’’صدرنگیوں‘‘ کی لفظی تکنیک اور اس کا برتاؤ اپنی جگہ شعر کی باطنی معنیات میں ایک جمال افروز اضافہ ہے اور اِسی طرح’’ پانی سی حیات‘‘ ایک نادرالوجود تشبیہ ہے۔

پڑا ہی کیا ہے جو تیرہ گھٹاؤں میں دیکھوں
میں کب تلک یونہی اندھے خلاؤں میں دیکھوں
دھواں اگلتی ملیں کھا گئیں اُسے بھی ریاضؔ
رہا ہی کیا ہے جو اب اپنے گاؤں میں دیکھوں (۱۶۲)

غزلیات کی اس کتاب میں لوح سے تمت تک مضامین رنگارنگ کا ایک جہانِ نو آباد ہے ہی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ فنی بوالعجبیاں بھی جگہ جگہ ہیں۔ شاعر کا کلام اس کے فنی معروضات کی روشنی ہی میں جانچا جاتا ہے کیوں کہ فن کے معروضات ہر زمانے میں انسانی جمالیاتِ فن کا منتہاے مقصود سمجھے جاتے رہیں۔ ریاضؔ مجید نے اپنے مجموعۂ غزلیات ’’گزرے وقتوں کی عبارت‘‘ میں اگر چہ لفظ کی معکوسی و حسیّاتی تکنیک کا استعمال کیا ہے، جس میں مشاہدہ اور فن کا امتزاج ملتا ہے یا فکر و فن کا امتزاج ملتا ہے، مگر اس قدر قلیل کہ قاری تاثر کی گہرائی کے اُس تلذذ اور شاعر کے اس تجربے سے نہیں گزرتا، جو جدید اُردُو غزل کو پڑھ کر حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ’’گزرے وقتوں کی عبارت‘‘ غزلیات کو خالصتاً اس تجربے کی چاشنی سے معمور قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مزید یہ کہ ’’گزرے وقتوں کی عبارت‘‘ کی ان غزلیات کا اُسلوب تخلیقی سے زیادہ اپنے معاصر نامے کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ یوں ان غزلیات کا حلقہ اثر جدید اُردُو غزل کے مقابلے میں محدود نہیں ہوتا بل کہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ ’’گزرے وقتوں کی عبارت‘‘ کی شاعری اپنے عہد کے آشوب سے زیادہ اپنی ذات کے آشوب کو لیے ہوئے ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ ریاضؔ مجید کے ہاں دروں بینیت یعنی Introversiveness کے رجحان کی زیادتی ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار قابلِ ملاحظہ ہیں:

تیری خواہش بند مٹھی سے پھسلتی ریت ہے
میں غروبِ جاں کے لمحوں میں ترا ، جویا ہوا (۱۶۳)

رہے نہ ربط تو ہر لفظ و صورت بے معنی
مرے بُلانے پہ وہ میرے گھر بھی کیوں آئے (۱۶۴)

فنِ شعر کا ایک پہلو ردیف اور قافیہ کا بہتر استعمال ہے۔ غزل عموماً قافیہ کی بنا پر تعمیر ہوتی ہے۔ مترنم قوافی غزل میں موسیقیت کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں اور ردیف شاعر کے خیال کو محدود یا لا محدود کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے، لہٰذا غزل میں ردیف اور قافیہ بنیادی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ردیف سے زیادہ قوافی کی اہمیت ہے۔ قافیہ خیال اور بحر کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہے اور مضمون یا خیال پر اثرانداز ہوتا ہے۔ قافیے کا اِنتخاب اہم موڑ ہوتا ہے۔ بعض قوافی غزل کی معنیاتی وسعت

کو محدود کر دیتے ہیں اور بعض قوافی سہولت بھی پیدا کرتے ہیں۔ قافیے میں بلا کی طاقت ہوتی ہے اور اس کا سامع کی سماعتوں پر اچھا خاصا اثر پڑتا ہے۔ ایک اچھا قافیہ شعر کی جمالیات میں اضافے کا باعث بنتا ہے اور نامناسب قافیے سے شعر کی جمالیات مجروح ہوتی ہیں۔ قافیے میں نُدرت اس وقت آتی ہے جب شاعر پہلے سے سوچ کر قوافی نہ رکھ لے اور اسے فی البدیہہ استعمال میں لائے۔ قافیے سوچ کر غزل کہنے میں، جو قباحت ہے وہ سبھی جانتے ہیں کہ اس سے غزل قافیہ بندی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ محض قافیہ بندی سے شاعری نہیں ہو جاتی اور نہ ہی اس میں شاعرانہ چاشنی آتی ہے۔ غزل میں تغزل نہ قافیہ بندی سے آتا ہے نہ ردیف کے بہتر اِنتخاب یا صنائع و بدائع کے استعمال سے بل کہ یہ تو جذبے کی شدت اور صداقت کا محتاج ہے۔ جذبے کی شدت یا وفورِ جذبات سے قافیے کا موزوں اِنتخاب خود بخود ہو جاتا ہے اور قافیہ غزل کے مجموعی مزاج پر منفی اثرات مُرتّب نہیں کرتا۔

"گزرے وقتوں کی عبارت" کی غزلیات مجموعی طور پر قافیہ پیمائی کا شکار نہیں ہیں۔ قافیہ غزل کے مزاج کے مطابق منتخب ہو کر سامنے آتا ہے۔ نئے قوافی بھی استعمال میں لائے گئے ہیں یا کم از کم ایسے قوافی موجود ہیں، جن کو بہر طور بہت کم آزمایا گیا ہے۔ ان میں شاعر نے اجتہاد سے کام لیا ہے۔ غزل کی زمین کا اِنتخاب اور پھر اس کے مطابق قافیے کا اِنتخاب اور پھر اگلا مرحلہ اس کا شاعرانہ استعمال ہی "گزرے وقتوں کی عبارت" کی غزلیات کا ایک اہم فنی برتری کا منھ بولتا ثبوت ہے اور اس کی صحیح حیثیت کا تعیّن کرنے میں مددگار ہوا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ محمد شمس الحق، پیمانۂ غزل، جلد: اوّل، نیشنل بُک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۴

۲۔ ریاض مجید، بیاض نمبر ا، غیر مطبوعہ، ص ۶۵

۳۔ محمد شمس الحق، پیمانۂ غزل، جلد: دوم، نیشنل بُک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۳۶۱

۴۔ احمد ندیم قاسمی، فلیپ پشتِ ورق، گزرے وقتوں کی عبارت، از ریاض مجید، قرطاس پبلیشرز، لائل پور، ۱۹۷۳ء

۵۔ ریاض مجید، پس منظر، قرطاس پبلشرز، لائل پور (فیصل آباد)، ۱۹۷۳ء، ص ۳۲-۱۰۰-۷۴

۶۔ ایضاً، ص ۳۸

۷۔ ایضاً، ص ۹۳-۹۴

۸۔ ایضاً، ص ۷۶

۹۔ ریاض مجید، پس منظر، ص ۴۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۴۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۵۳

۱۵۔ ریاض مجید، پس منظر، ص ۲۸

۱۶۔ ریاض مجید، گزرے وقتوں کی عبارت، قرطاس پبلشرز، لائل پور، ۱۹۷۳ء، ص ۱۲

۱۷۔ احمد ندیم قاسمی، فلیپ، پشتِ ورق، گزرے وقتوں کی عبارت، از ریاض مجید، قرطاس پبلشرز، لائل پور، ۱۹۷۳ء

۱۸۔ ریاض مجید، گزرے وقتوں کی عبارت، ص ۵۵

۱۹۔ ریاض مجید، گزرے وقتوں کی عبارت، ص ۱۳

۲۰۔ ایضاً، ص ۷

۲۱۔ ایضاً، ص ۸۵

۲۲۔ ریاض مجید، ڈوبتے بدن کا ہاتھ، ص ۷۷

۲۳۔ ایضاً، ص ۵۵

۲۴۔ پروفیسر خالد عباس بابر، ڈوبتے بدن کا ہاتھ، پشتی فلیپ

۲۵۔ پروفیسر خالد عباس بابر، ڈوبتے بدن کا ہاتھ، پشتی فلیپ

۲۶۔ مسعود مختار، مُرتّب: پہچان (غزل نمبر)، عوام ہاؤس، لائل پور، ۱۹۷۴ء، ص ۹۳

۲۷۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، تعارف، مشمولہ: آٹھ غزل گو، مُرتّب: جاوید شاہین، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۷۸، ص ۱۹۴

۲۸۔ ریاض مجید، گزرے وقتوں کی عبارت، ص ۲۰

۲۹۔ ریاض مجید، ڈوبتے بدن کا ہاتھ، ص ۳۷

۳۰۔ ریاض مجید، ڈوبتے بدن کا ہاتھ، ص ۲۸

۳۱۔ www.wikkipedia.africa.comdecember20,2021

۳۲۔ ریاض مجید، گزرے وقتوں کی عبارت، ص ۴۹

۳۳۔ ایضاً، ص ۸۴

۳۴۔ ایضاً، ص ۳۵

۳۵۔ ریاض مجید، پس منظر، ص ۸۵

۳۶۔ ریاض مجید، ڈوبتے بدن کا ہاتھ، ص ۱۰

۳۷۔ ریاض مجید، گزرے وقتوں کی عبارت، ص ۱۰

۳۸۔ ایضاً، ص ۷۲

۳۹۔ ریاض مجید، پس منظر، ص ۱۱۰

۴۰۔ ریاض مجید، ڈوبتے بدن کا ہاتھ، ص ۲۵

۴۱۔ ایضاً، ص ۳۳

۴۲۔ ریاض مجید، پس منظر، ص ۱٦

۴۳۔ ریاض مجید، ڈوبتے بدن کا ہاتھ، ص ۳۵

۴۴۔ ایضاً، ص ۴۰

۴۵۔ ریاض مجید، ڈوبتے بدن کا ہاتھ، ص ۷

۴٦۔ ریاض مجید، ڈوبتے بدن کا ہاتھ، ص ۳۹

۴۷۔ ریاض مجید، گزرے وقتوں کی عبارت، ص ۸۱

۴۸۔ ریاض مجید، ڈوبتے بدن کا ہاتھ، ص ۲۱

۴۹۔ ایضاً

۵۰۔ ریاض مجید، قلمی بیاض نمبر ۱، ص ۱۷۰

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۸۸

۵۲۔ ڈاکٹر سیّد عبد اللہ، ولی سے اقبال تک، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ٦۷

۵۳۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی، شرح دیوانِ غالب، مکتبۂ تعمیرِ انسانیت، لاہور، س ن، ص ۱۷

۵۴۔ شیخ عبد القادر، دیباچہ، بانگِ درا، مشمولہ: کُلیّاتِ اقبال، از علّامہ محمد اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۲۵

۵۵۔ سیّد عابد علی عابد، اُسلوب، مجلسِ ترقّیِ ادب، لاہور، ۱۹۹٦ء، ص ۳٦

۵٦۔ ریاض مجید، خاک، ص ۱۱۵

۵۷۔ سیّد عابد علی عابد، اُسلوب، ص ۹۴

۵۸۔ ریاض مجید، خاک، ص ۳۶

۵۹۔ شہزاد احمد فلیپ، ڈوبتے بدن کا ہاتھ، از ریاض مجید، قرطاس پبلشرز، لائل پور، ۱۹۷۴ء

۶۰۔ وزیر آغا، فلیپ، ڈوبتے بدن کا ہاتھ، از ریاض مجید، قرطاس

۶۱۔ ریاض مجید، خاک، ص ۳۳

۶۲۔ ریاض مجید، خاک، ص ۲۱

۶۳۔ سیّد عابد علی عابد، اُسلوب، ص ۱

۶۴۔ عبد الباری آسی، شرحِ دیوانِ غالب، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور، سن، ص ۲۵۶

۶۵۔ ریاض مجید، خاک، ص ۱۴۲

۶۶۔ ایضاً، ص ۴۱

۶۷۔ ایضاً، ص ۲۹

۶۸۔ ایضاً

۶۹۔ ایضاً، ص ۴۰

۷۰۔ سیّد عابد علی عابد، اُسلوب، س ۷

۷۱۔ ریاض مجید، خاک، ص ۲۹

۷۲۔ ایضاً، ص ۴۱

۷۳۔ ایضاً، ص ۸۰

۷۴۔ ایضاً، ص ۲۳

۷۵۔ ایضاً، ص ۷۷

۷۶۔ ایضاً، ص ۱۵

۷۷۔ ریاض مجید، خاک، ص ۱۴۲

۷۸۔ یحییٰ امجد، فن اور فیصلے، اظہار سنز، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۶۴

۷۹۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، اصنافِ ادب: تفہیم و تعبیر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۵۱

۸۰۔ ریاض مجید، خاک، ص ۱۳۹

۸۱۔ ایضاً، ص ۲۱

۸۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اُردُو شاعری کا مزاج، مجلسِ ترقّیِ ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۲۶۷

۸۳۔ ریاض مجید، خاک، ص ۷۸

۸۴۔ ایضاً، ص ۶۸

۸۵۔ ایضاً، ص ۱۰۹

۸۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اُردُو شاعری کا مزاج، ص ۲۶۷

۸۷۔ رشید احمد صدیقی، جدید غزل، ص ۵

۸۸۔ جمیل الدین عالیؔ، اُردو غزل چند مسائل، مشمولہ: سرسیّدین (پاکستانی ادب)، جلد، پنجم، فیڈرل گورنمنٹ سر سید کالج، راول پنڈی، س ن، ص ۸۸۶

۸۹۔ ریاض مجید، خاک، ص ۱۲۲

۹۰۔ ایضاً، ص ۱۲۲

۹۱۔ ایضاً، ص ۶۹-۷۰

۹۲۔ سیّد عابد علی عابد، اُصولِ انتقادِ ادبیات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۳۱۵

۹۳۔ آلِ احمد سرور، پہچان اور پرکھ، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۴۶

۹۴۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اُردُو شاعری کا مزاج، ص ۲۶۷

۹۵۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۹۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اُردُو شاعری کا مزاج، ص ۲۵۵

۹۷۔ سیّد عابد علی عابد، اُصولِ انتقادِ ادبیات، ص ۳۲۱

۹۸۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اُردُو شاعری کا مزاج، ص ۲۷۱

۹۹۔ ریاض مجید، خاک، ص ۱۵

۱۰۰۔ ایضاً، ص ۱۳۹۔۱۴۰

۱۰۱۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۱۰۲۔ ریاض مجید، خاک، ص ۱۱۵

۱۰۳۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اُردُو شاعری کا مزاج، ص ۲۷۱

۱۰۴۔ انور جمال، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد ۱۹۹۸ء، ص ۱۱۲

۱۰۵۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اُردُو شاعری کا مزاج، ص ۳۲۳

۱۰۶۔ جمیل الدّین عالیؔ، اُردُو غزل چند مسائل، مشمولہ: سر سیّدین، جلد: پنجم، ص ۸۸۷

۱۰۷۔ ریاض مجید، خاک، ص ۱۴۵

۱۰۸۔ ایضاً، ص ۱۳۳

۱۰۹۔ ایضاً، ص ۱۹

۱۱۰۔ ایضاً، ص ۱۴۵۔۱۴۶

۱۱۱۔ ریاض مجید، خاک، ص ۱۵۹

۱۱۲۔ محمد حسن عسکری، آدمی اور انسان، لاہور، ۱۹۵۳ء، ص ۲۴۰

۱۱۳۔ انتظار حسین، اُردُو ادب کا ہمالیہ پہاڑ، مطبوعہ رسالہ: نیا دور، لکھنؤ فراق نمبر، حصّہ دوم، ۱۹۸۴ء، ص ۵۴

۱۱۴۔ میرزا اسد اللہ خاں غالب، دیوانِ غالبؔ، خزینۂ علم و ادب لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۵۴

۱۱۵۔ ریاض مجید، خاک، ص ۱۱۵

۱۱۶۔ ریاض مجید، خاک، ص۵۵

۱۱۷۔ ایضاً، ص۱۱۷

۱۱۸۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، مُرتّب: کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زُبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص۱۲۴

۱۱۹۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، مُرتّب: کشاف تنقیدی اصطلاحات، ۱۰۵

۱۲۰۔ ریاض مجید، خاک، ص۱۳۱

۱۲۱۔ ایضاً، ص۱۱۴

۱۲۲۔ ایضاً، ص۹۹-۱۰۰

۱۲۳۔ ایضاً، ص۵۹

۱۲۴۔ یوسف حسن، پاکستان میں اُردُو غزل کے پچاس سال، مشمولہ: پاکستان میں اُردُو ادب کے پچاس سال، گندھارا، راول پنڈی، ۲۰۰۲ء، ص۵۹

۱۲۵۔ ریاض مجید، خاک، ص۱۱۵

۱۲۶۔ ڈاکٹر وزیر آغا، تنقید اور احتساب، جدید ناشرین، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص۴۶

۱۲۷۔ محمد عظمت اللہ خاں، سُریلے بول، اُردُو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۹ء، ص۴۵

۱۲۸۔ پروفیسر آلِ احمد سرور، مجموعۂ تنقیدات، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص۴۴

۱۲۹۔ ریاض مجید، خاک، ص۸۹

۱۳۰۔ ایضاً، ص۶۶

۱۳۱۔ ریاض مجید، گزرے وقتوں کی عبارت، ص۸

۱۳۲۔ ریاض مجید، قلمی بیاض نمبر ۲، ص۲۵

۱۳۳۔ ریاض مجید، گزرے وقتوں کی عبارت، ص۱۰

۱۳۴۔ ریاض مجید، قلمی بیاض نمبر ۳۲

۱۳۵۔ ریاض مجید، گزرے وقتوں کی عبارت، ص ۱۲۱

۱۳۶۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۱۳۷۔ ایضاً، ص ۱۴

۱۳۸۔ ایضاً، ص ۸

۱۳۹۔ ایضاً، ص ۹-۱۰

۱۴۰۔ ایضاً، ص ۳۳

۱۴۱۔ ایضاً، ص ۳۱-۳۲

۱۴۲۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۱۴۳۔ ایضاً، ص ۱۳-۱۴

۱۴۴۔ ایضاً، ص ۷

۱۴۵۔ ایضاً، ص ۲۷

۱۴۶۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۱۴۷۔ ایضاً، ص ۸

۱۴۸۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص ۶۴

۱۴۹۔ ریاض مجید، گزرے وقتوں کی عبارت، ص ۱۹

۱۵۰۔ سجاد باقر رضوی، فلیپ، پشتِ اندرونی ورق، گزرے وقتوں کی عبادت

۱۵۱۔ ریاض مجید، گزرے وقتوں کی عبارت، ص ۸۱

۱۵۲۔ ایضاً، ص ۸۵

۱۵۳۔ ڈاکٹر نوازش علی، فراق گورکھپوری شخصیت اور فن، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۱۱

۱۵۴۔ احمد ندیم قاسمی، فلیپ پشتِ ورق، گزرے وقتوں کی عبارت، از ریاض مجید، قرطاس پبلشرز، لائل پور، ۱۹۷۳ء

۱۵۵۔ ریاض مجید، گزرے وقتوں کی عبارت، ص۱۱-۱۲

۱۵۶۔ ایضاً، ص۲۱

۱۵۷۔ خلیل الرحمان اعظمی، فراق کو سمجھنے کے لیے، مطبوعہ رسالہ، شاہ کار فرق نمبر ۱۹۶۵ء، ص۴۵۰

۱۵۸۔ ریاض مجید، گزرے وقتوں کی عبارت، ص۳۱

۱۵۹۔ ریاض مجید، گزرے وقتوں کی عبارت، ص۵۷-۵۸

۱۶۰۔ ایضاً، ص۶۵

۱۶۱۔ ایضاً، ص۶۸

۱۶۲۔ ایضاً، ص۶۹

۱۶۳۔ ایضاً، ص۸۱

۱۶۴۔ ایضاً، ص۹۵

باب سوم:

ریاض مجید کی نظم کا مطالعہ

ہر کلامِ موضوع نظم کے دائرۂ کار میں آتا ہے۔ لفظ نظم دہری معنویت کا حامل ہے۔ عمومی طور پر نظم سے مراد کلامِ موزوں ہی ہے، جو جُملہ اصنافِ سخن کا احاطہ کرتا ہے۔ نظم بہ طورِ صنفِ شاعری کسی ایک ہی خیال کو تسلسل سے مربوط انداز میں بیان کرنے کی متقاضی ہے، جس میں داخلی سطح پر ایک مرکزی خیال ضرور شیرازہ بند ہوتا ہے۔ نظم کے بارے میں انور جمال لکھتے ہیں:

''نظم انسان کی مذہبی اور فطری صلاحیّت کی وہ معجز بیانی ہے، جس کے عملی عناصر کو تلاش کرنا ناممکن ہے۔ ہم آسانی سے اِسے تخلیق اور تخیُّل کی کار فرمائی کا نام دے سکتے ہیں، جس میں زُبان اور ہیئت ''آلات'' کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ نظم کی تخلیقی صنعت کاری کے عناصر کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔''(۱)

انور جمال نے درج بالا حوالے میں ہیئت کے حوالے سے نظم کی آزادی کا ذکر کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ نظم کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ کوئی خاص ہیئت اِس کی ترجمان ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہیئت کے اعتبار سے نظم پابندیوں سے آزاد ہے، لہٰذا اِس کی کوئی بھی ہیئت ہو سکتی ہے، جس کی اپنی اپنی شناخت ہے۔ خاطر غزنوی نے نظم کے بارے میں لکھا ہے:

''لفظ نظم کا عام مفہوم نثر کے برعکس، وہ کلام ہے، جو اوزانِ شعری کی تابع ہو، لیکن موجودہ دور میں نظم کے معنی محدود ہو گئے ہیں اور یہ لفظ اشعار کے ایسے مجموعے کے لیے استعمال ہوتا ہے، جو کسی ایک موضوع پر تسلسل کے ساتھ موزوں کیا گیا ہو۔'' (۲)

اُردُو شاعری کی دو بڑی اصنافِ سخن یعنی غزل اور نظم قبولِ عام کے عتبار سے کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ اُردُو میں اِن دو اصنافِ سخن میں جتنا لکھا گیا شاید ہی کسی اور صنفِ سخن میں لکھا گیا ہو گا۔ یہ اِن اصناف کی بین شہرت کی دلیل ہے کہ جابر علی سیّد کو یہاں تک کہنا پڑا:

''غزل تہذیب کی شاعری ہے اور نظم شاعری کی تہذیب۔''(۳)

شاعری کی اِن دونوں اصناف کی ہمہ گیریت پورے اُردُو کے شعری نظام میں اِن کو، جو انفرادیت عطا کرتی ہے، وہ اِن کے مزاج میں پایا جانے والا داخلی نظام ہے،، جو اِن کی خاص موضوعیت کا تقاضا کرتا ہے،، جو اپنے اندر متفاوت بیانیے سے عبارت ہوتا ہے۔ پروفیسر احتشام حسین نے نظم کے خصوص میں اِنھی اشیا کی طرف اشارے کیے ہیں:

''نظم کا لفظ جب شاعری کی ایک مخصوص صنف کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، تو اُس سے وہ نظمیں مقصود ہوتی ہیں، جن کا کوئی حسین موضوع ہو اور جن میں فلسفیانہ، بیانیہ یا مفکرانہ انداز میں شاعر نے کُچھ خارجی اور کُچھ داخلی دونوں قسم کے تاثرات بیان کیے ہوں۔''(۴)

اُردُو ادب کا قدیم دور نظم کے ترویج و ارتقا کے حوالے سے نظیر اکبر آبادی کا ممنونِ احسان ہے، جنھوں نے اُس دور میں، جب ہر بڑا شاعر قصیدہ گوئی کی طرف شعوری طور پر متوجّہ تھا اور تفنّنِ طبع کے لیے غزل میں شعری، جولانیاں دکھاتا تھا، نظم نگاری کو بھرپور انداز میں اپنائے رکھا۔ کمال بات یہ ہے کہ نظیر نے اُردُو نظم کو آغاز ہی سے ایسے موضوعات عطا کیے ،جن پر آنے والے وقتوں میں نظم کی فلک بوس عبارت اُستوار ہونی تھی۔ یہ اُن کا کمال ہے کہ اُنھوں نے خود کو دربار سے شعوری طور پر دامن کشاں رکھا اور عوام سے اپنا مضبوط رشتہ قائم رکھتے ہوئے، خود کو عوامی شاعر سے ملقب کیا۔ اُن کے دور میں اُنھیں وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی، قصیدہ جیسی مشکل صنفِ سخن، جس کی سدِ رہ رہی۔ تاہم آنے والے وقتوں نے اُن کی عظمت کا اعتراف کیا اور اُنھیں اُردُو ادب کا سب سے بڑا ترقّی پسند شاعر قرار دیا۔ نظیر کے دور میں نظم سے مراد پابند نظم ہی تھی، ابھی جدید نظم کا غلغلہ نہیں ہوا تھا۔ یہ سب بعد کی بات ہے، جب اظہار نے نت نئے اسالیب تراشے۔ عتیق اللہ پابند نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

"پابند نظم میں بحر، آہنگ، بندوں کی تشکیل، قافیے اور ردیف کا التزام یا صنف کی مقررہ ساخت وغیرہ اُمور، جن سے ہیئت کا ظاہری پن متشکل ہوتا ہو، نظم کے کل معنی ہی کا حِصّہ ہوتی ہے۔"(۵)

نظیر نے اُردُو نظم کو، جو اعتبار عطا کیا وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اِس بات سے قطع نظر کہ اُس دور میں نظم کے مقابلے میں قصیدہ اور غزل ہی شعری بساط پر متمکن رہے، جس کی وجہ سے نظم کا وہ رواج،، جو بعد میں جدید نظم کی صورت میں ممکن الوقوع ہوا کامیابی کا باعث نہ بن سکا۔ یہ بات بھی ہر کوئی جانتا ہے کہ جدید دور میں نظم کا فروغ انجمنِ پنجاب کی بدولت ہوا۔ اِس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

"انجمنِ پنجاب کے محرکِ اعلیٰ کرنل ہالرائیڈ تھے۔ اُن کے تصوّر کو ڈاکٹر لائیٹر نے عملی صورت دی۔ البتہ اُس کے روحِ رواں محمد حسین آزاد تھے۔"(۶)

محمد حسین آزاد نے انجمن کے مشاعروں کے ذریعے سے جدید اُردُو نظم کو پروان چڑھانے میں کردار ادا کیا۔ اُن کی اِس کاوش کے ساتھ مولانا حالیؔ کی خدمات بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ اگرچہ نصاب سازی کے لیے مناظر فطرت پر مبنی نظموں کی ضرورت نے اُس وقت کے شعرا کا روِ سخن جدید نظم نگاری کی طرف موڑا، لیکن اِس سے نہ صرف جدید نظم نگاری کو فروغ ملا بل کہ اُردُو ادب میں نظام کے ذریعے سے حقیقت نگاری کے بھی امکانات روشن ہوئے۔ اُس کے بعد اقبال نظم کے فروغ کا باعث بنے اور مخزن تحریک نے بھی جدید اُردُو نظم کے فروغ میں فعال کردار ادا کیا۔ بعد ازاں ترقّی پسند تحریک اور اُس سے وابستہ شعرا نے بھی نظم کے موضوعات کو عوام کے مسائل کا آلہ کار بنایا۔ اِس تحریک کے ذریعے سے نظم نے خارج سے داخل کی رہ تلاش کی اور بڑی حد تک اِس میں کامیاب بھی ہوئے۔ یہاں تک نظم نے سفر کرتے ہوئے بہت کُچھ سیکھ لیا اور وقت کے بدلتے

ہوئے دھارے نظم کو جدید سائنس سے آمیخت کرنے پر آمادہ ہوئے۔اِس برق رفتار ترقّی اور زندگی کے بدلتے ہوئے رجحانات کے بارے میں جیلانی کامران نے کہا تھا:

> ''ہمارا فکری نظام بدل چکا ہے اور ہم اس زمانے کا حِصّہ بن چکے ہیں،جو سائنسی عقل پرستی کا زمانہ ہے۔''(۷)

نظم کی اُس جدید دنیا میں شعرا نے بدلتے ہوئے مذاق کو محسوس کیا اور بے وقت کی راگنی کو ترک کرتے ہوئے، نظم کے نئے امکانات کی طرف رجوع کیا۔یوں نظم مختلف تحریکات سے ہوتے ہوئے ترقّی کے زینے طے کرنے لگی۔ بعد میں آنے والے شعرا میں تصدق حسین خالد، میرا جی، ن م راشد،، جوش اور فیض نے نظم نگاری کی رہ کو خصوصی توجُّہ کا نشانہ بنایا اور، جدید نظم میں نہ صرف ہیئت کے نت نئے تجربے ہوئے بل کہ اُردُو میں معرّا اور آزاد نظم کے شاہ کار نمونے منظرِ عام پر آنے لگے۔ نظم کا یہ سفر ارتقا کی منازل طے کرتے ہوئے نثری نظم کی طرف گام زن رہا،، جو نہ صرف نظم کی مقبولیت اور اثر پذیری کی دلیل ہے کہ بہت سے شعرا، جو عروضی شناخت کے معتبر حوالے تھے، ابتدا میں اِس کی شدید مخالف کے باوجود آزادیِ اظہار کے لیے عروضی آزادی کے قائل ہو گئے۔اِس طرح نظم نے ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے، جہاں ہیئت کے نت نئے تجربات کیے، وہاں قرینۂ اظہار کے لیے عروضی پابندیوں کو بھی ایک ایک کرتے ہوئے، پہلے قافیہ پھر ارکان اور بعد ازاں عروض سے مکمل فرار کی راہیں تلاش کر لیں۔

ریاض مجید کی نظم نگاری

ریاض مجید کی نظم نگاری کا آغاز اُن کی غزل گوئی کے ساتھ ہُوا اُنھوں نے کالج کے زمانے (۱۹۶۰ء۔۱۹۶۴ء) گورنمنٹ کالج فیصل آباد (تب لائل پور) اور یونی ورسٹی اورینٹل کالج (پنجاب یونی ورسٹی) لاہور کی طرف سے متعدد بین الکلیّاتی مشاعروں میں حِصّہ لیا۔ اس زمانے میں کالجوں کی علمی و ادبی تقاریب میں مشاعرے کو ایک خاص حیثیت حاصل تھی۔اُردُو کے وہ شاعر جنھوں نے اپنی شاعری کا آغاز ساٹھ اور ستر کی دہائی میں کیا کم و بیش ان سب کا تعلق ان مشاعروں سے رہا ہے۔یہ مشاعرے قریباً ہر کالج کی سالانہ تقاریب کا حِصّہ ہونے پر کالج سے ایک غزل اور نظم کے ساتھ اس میں حِصّہ لیتی۔ اوّل، دوم، سوم اور حوصلہ افزائی کے انعامات حق داروں میں تقسیم کئے جاتے، جو عام طور پر کپوں (Cups) کی صورت میں ہوتے، نظم اور غزل میں بہ حیثیت مجموعی اچھّی کارکردگی کرنے والے ادارے کو ٹرافی دی جاتی۔ اسلامیہ کالج سول لائینز میں شمع تاثیر کا مشاعرہ ایسی تقاریب کا سب سے نمایاں اور بار گاہ حِصّہ تھا۔یہ ٹرافی معروف ادیب اے ڈی تاثیر کے نام سے جاری کی گئی تھی۔ اسی طرح پروفیسر منظور حسن شور کے نام سے گورنمنٹ کالج فیصل آباد 'مینائے شور' کے نام سے ایک ٹرافی کا آغاز ہوا تھا۔ان

اداروں کے علاوہ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد، گورنمنٹ کالج ملتان، گورنمنٹ کالج جھنگ اور گورنمنٹ کالج جہلم کے مشاعرے بھی بڑی اہمیت کے حامل تھے۔

ریاض مجید نے ان مشاعروں میں غزلوں کے ساتھ نظمیں بھی پڑھیں۔ ان کی نظم نگاری کا ابتدائی حِصّہ اُنھیں نظموں پر مشتمل ہے۔ یہ نظمیں 'کالج نامہ___ غزل' کے نام سے ریاض مجید کے آثار میں ملتی ہیں۔ ان نظموں کے بارے میں چند باتیں نمایاں ہیں:

۱۔ یہ نظمیں زیادہ تر پابند ہیں۔

۲۔ ان کی ہئیت مختلف میں غزل و قصیدہ کی ہئیت، مسدس کی ہئیت، قطعہ بار صورت

۳۔ یہ نظمیں طویل ہیں بیس بیس چالیس چالیس شعروں کی۔

۴۔ یہ موضوعاتی نظمیں ہیں جن کے عنوانات عام طور پر مظاہر فطرت یا موسموں کے بارے میں مثلاً: چاندنی رات، خزاں، برسات، آبِ رواں وغیرہ۔

عصر حاضر کے عنوان سے ایک نظم آزاد نظم کی ہئیت میں بھی ملتی ہے۔ اس کی یہ سطریں دیکھیں:

یہ عصر حاضر کا آدمی بھی ہے عجب

ہوا میں رستہ اچھال کر اس پہ چڑھ رہا ہے

کالج کے زمانے ہی کی ایک طویل نظم 'خاکے' بھی ریاض مجید سے یادگار ہے، یہ معرّا نظم ہے۔ اس زمانے میں کالجوں میں معرّا نظم کا رواج کم تھا۔ گورنمنٹ کالج فیصل آباد ہے۔ اِنتخابات کے موقع پر کالج میں طلبہ کی ایک منتظم 'سپورٹرز گلڈ' کا قیام عمل میں آیا۔ اس تنظیم کا مقصد کالج میں ہونے والے اِنتخابات کے لیے بہتر سے بہتر اُمیدوار کا اِنتخاب کرنا تھا۔

ترقّی پسند تحریک نے جہاں ادب کو اپنی لپیٹ میں لیا وہاں ادبی اور سماجی جماد کو توڑنے کی پوری کوشش بھی کی اس تحریک نے پورے ادب کو متاثر کیا۔ انسان کے داخل کو بیدار کیا اور اُسلُوب حیات بھی بُلند کیا۔ اس کا اثر شعرا کے کلام میں نمایاں ہے۔ نظم نے ان اثرات کو اپنے لب و لہجہ میں بلا کی وسعت دی اور اس لب و لہجہ کی گونج پورے برصغیر کے شعرا کرام تک پہنچی اور اس میدان میں جن شعرا کرام کا خاص طور پر ذکر آتا ہے، ان میں مولانا حالی، اکبر الہ آبادی، شبلی نعمانی، ظفر علی خان کے نام نمایاں ہیں۔ ان سب نے نظم میں مقصدیت کو سرفہرست رکھا۔ ترقّی پسند تحریک میں نظم کو مقبولیت انہیں شعرا کے توسط سے ملی۔ دوسری جانب یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ترقّی پسند شعرا کے بعد اُبھرنے والے شعرا جن کا نئ نظم کے ساتھ تعلق

ہے وہ ترقّی پسندیت سے دور تک کا بھی تعلق نہیں رکھتے۔ گویا جدید نظم اور نئی نظم میں ایک حدِ فاصل قائم کی گئی ہے۔ اِس ضمن میں جیلانی کامران لکھتے ہیں:

''نئی نظم کے شاعر کا ترقّی پسند تحریک کے شاعر سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔''(۸)

ترقّی پسند تحریک کے تحت نئے لکھنے والوں میں ریاض مجید کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ اُنھوں نے نظم میں بہت خوب صورت اضافے کئے، جو اِنھی کے حوالے سے ان کی پہچان بن گئے۔ ''انتساب'' ریاض مجید کا چوتھا شعری صحیفہ ہے، اس کا سن اشاعت ۷ اپریل ۱۹۷۸ء ہے۔ اس میں اس کا شدید گہرا تاثر نظم کی پوری اکائی میں نازل ہوا ہے اور قاری کو حیرت زدہ کر دیتا ہے کہ وہ شاعر، جو تین سابقہ صحیفوں سے غزل کی دنیا کا مسکن سمجھا جاتا تھا، جب نظم کی طرف مراجعت کرتا ہے۔ تو اس کے داخل میں دھکتا ہوا آتش فشاں کس زور سے پھٹتا ہے اور قاری کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔

غزل میں ریاض مجید نے ماضی کی معدوم عبارتوں کو بازیافت کرنے اور گزرے وقت کی برسی ہوئی اوس کو اپنی تخلیق آنکھ سے چننے کی سعی کی تھی۔ ریاض مجید احساس کے اس عقبی دیار سے ہی منظر پر طلوع ہوتا ہے۔ اور ان ندامتوں کو، جو اس نے اپنے عہد سے حاصل کی ہیں اور ان جراحتوں کو، جو اس کے اپنے عہد کا عطیہ ہیں۔ بڑی خوش سلیقگی سے زمانے کو سپرد کر دیتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ریاض مجید نے بے شبساہت ساعتوں اور جامد رتوں کو بیضوی صورت ملی تھی۔ نظم میں ریاض مجید نے خود اپنی ذات کی تخلیقی صورت کو اجاگر کیا ہے۔ اس کے ہاں سب سے اہم قِصّہ وہ تجسس ہے، جس کے تحت وہ اپنی ذات اور کائنات دونوں کا ادراک کرنے کا آرزومند ہے۔ ریاض مجید نے خود اپنی ذات کی تخلیقی صورت کو اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے کا اگر بہ غور جائزہ لیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ریاض مجید کی شاعری بھی اپنی ذات کے اعتبار سے ایسا ہی سفر معلوم ہوتی ہے:

''نظم کے مزاج کا تعیّن کریں، تو مجموعی اعتبار سے یہ نتیجہ مُرتّب ہوتا ہے کہ نظم، استقرائی طریقِ اظہار کر کے، خارجی اشیا کو مس کرتی ہے، لیکن اُس کی جہت واضح طور پر باہر سے اندر کی طرف ہے۔''(۹)

ریاض مجید کی نظم میں اِس خارج سے داخل کے سفر نے تجسس کی کیفیت پیدا کر رکھی ہے، جس کے تحت وہ اپنی ذات اور کائنات دونوں کا ادراک کرنے کا آرزومند ہے۔ ریاض مجید چوں کہ بیسویں صدی کے ربع آخر کا شاعر ہیں۔ اِس لیے اُن کا سب سے بڑا المیہ اس کے ادراک سے پیدا ہوا ہے۔ اس آشوب آگہی کے لیے اس نے اپنے وجود کو اہمیت دی اور وجود کی آشنائی کے لیے نسبتاً طویل سفر، پر پیچ راستوں سے طے کیا چناں چہ وہ اس صداقت کو آشکار کرنا چاہتا ہے، جو وجود تذکرہ آشنائی کا ثمرہ ہے۔ مثلاً:

دنیا کی ہر ایک شے میری ہمزاد ہے

یہ صدیوں کے ردوبدل کے تسلسل کی موجودہ صورت مرا عکس احساس ہے

میری آئینہ ذات کے واسطے،

یہ مکاں، یہ درخت اور پرندے بھی انسان ہیں! (۱۰)

ریاض مجید گمشدہ حقیقتوں کی بازیافت کرتے ہیں۔ وہ اس ماضی کو تلاش کرتا ہے، جو لمحوں کے ملبے تلے دبا پڑا ہے اس کا وجود عذاب میں مبتلا ہے، لیکن یہ بنیادی نیکی سے محروم نہیں۔ وہ موجودہ کثافت کو چشم گریاں سے دیکھتا ہے، لیکن اساسِ ضمیر سے انکار نہیں۔ ریاض مجید، جو دنیاؤں کا سنگم تعمیر کرنے کی کوشش نہیں کی بل کہ وہ کھوئی دنیا کو بازیافت کرتا ہے۔ اُنھوں نے فرد اور سماج کے مابین پائے جانے والے ربط و تعلق کی سراغ رسانی کی ہے، جس سے نظم نگاری کے مزاج کا اندازہ ہوتا ہے:

"گیت اور غزل کی طرح نظم بھی فرد اور سماج کے باہمی ربط کو اُجاگر کرتی ہے۔"(۱۱)

ریاض مجید نے جہاں کہیں جذبے کی اسالت سے کام لیا ہے، وہاں وہ اپنی شاعری کی جڑوں کو اپنی زمین اور مٹّی میں پیوست رکھتے ہیں۔ باہمی ربط و تعلق اور اِس پیوستگی کی بدولت وہ موجود کے خلاف شدید ردِّ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس کوشش میں اس کی رخنہ دیوار آنکھوں نے اس اوڑھی کو زیادہ اہمیت دی ہے، جو اس کا عہد لکھ رہا ہے۔ چناں چہ اس کا تجربہ کُچھ زیادہ خوش گوار نظر نہیں آتا اس کی بڑی وجہ لا حاصل کا وہ احساس ہے، جس نے پوری انسانی زندگی کو ایک بڑے ویسٹ لینڈ میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس پر ریاض مجید کا تاثر دیدنی ہے۔ ہونے کے باوجود کیوں خشک ہیں، جو دل میں ہے اس کی ترجمانی اب کن الفاظ میں ہوگی؟ یہ سب دکھ ایک ایسے خاص انسان کے دکھ ہیں، جس نے کوکا کولا کلچر میں زندگی گزاری ہے، جسے بدن کی اِمپورٹڈ آسائشوں نے کم مائیگی کے احساس سے دوچار کیا ہے۔ وہ چاہ کر بھی اِس کلچر سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کرا سکتے۔ کیوں کہ:

"نظم کی اُٹھان کلچر کی اُٹھان ہے اور یہی کلچر جب تہذیب میں ڈھلتا ہے، تو سماج کو ایک نئی بُلند سطح پر فائز بھی کرتا ہے... فرد اور سماج کا تصادم، کلچر اور تہذیب کے تصادم ہی کی ایک صورت ہے۔"(۱۲)

تہذیب سے وابستگی کی بدولت ریاض مجید فنا کا واضح احساس رکھتے ہیں اور مادے کی بقا پر یقین نہیں رکھتے، چناں چہ ریاض مجید مٹّی سے گلاب گسوں عمر تراشنے کی بجاے اپنی روح کا زنگ دعا کی ایک مار سے کھرچتا ہے اور یوں انسان کی کھوکھلی عظمت کا اعلان کیے بغیر انسان کی بقائے دوام کی دعا کرتے ہیں۔ ریاض مجید کی اس تخلیقی سرگرمی کو جس پر احساس گناہ حاوی ہے، ترقّی پسند ادبانے قبول نہیں کیا اور اسے بالعموم قنوطی شاعر کہہ کر اپنی پٹڑی پر چڑھانے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ریاض مجید نے زندگی کے بار گراں کو اپنے شانوں پر اٹھا کر فرد کو وجود کی یاسیت کا نہ صرف ادراک بخشا بل کہ اس سے نبرد آزما ہونے کے انداز بھی سکھائے۔ چناں چہ جب وہ اپنے ہم عصر کو آواز دیتا ہے۔

پلوں کے نیچے سے بہتے پانی کی مثل پل پل حیات بے سود

جا رہی ہے سحر سر بے مراقبہ ہے

صحن روح میں دھول اڑ رہی ہے (۱۳)

تاہم ریاض مجید ترقّی پسند شعرا کی طرح رومانی واہموں میں مبتلا نہیں، اس لیے وہ اس حقیقت کا ادراک بھی رکھتا ہے کہ: ''ضمیر ہستی کو خواب رنگوں نے بے حقیقت بنا دیا ہے۔''

چناں چہ وہ اس صداقت کو زندہ کرنے کا آرزو مند ہے، جو نیکی اور سچائی کی مصروفیت سے پیدا ہوتی ہے اور نفس نفس رایگاں زندگی میں معنویتوں کی نئی کہکشاں مُرتّب کر ڈالتی ہے۔ چناں چہ ریاض مجید کا امکان یہ ہے کہ: ''بدن سے باہر ہزار نا کردہ نیکیاں منتظر ہیں''لیکن ہوس کی آواز سیٹیوں پر لگے کبوتر سا دل عجب بے جہت خلاؤں میں اڑ رہا ہے۔ بدن سے لذّت کا رنگ اترے تو گوشۂ جان میں سال ہا سال کی دل نیک آرزو کوئی شکل پائے کسالتوں کی تہیں سیٹیں تو نثر زار جان سے ہزیمتوں کے پہاڑ اتریں صداقت آباد منزلوں کے بہشت رستوں کی ابتدا ہیں۔

کسالتوں کی تہوں اور نثر رار جان کی ہزیمتوں نے ریاض مجید کو جس آزار جان میں مبتلا کیا ہے۔ اس نے ریاض مجید کی ہاں اَن گنت چھوٹے بے نام اور بے عنوان دکھوں کو جنم دیا ہے۔ ان دکھوں کا اگر جائزہ لیں، تو ریاض مجید ایک ایسے دنیادار کے روپ میں سامنے آتا ہے، جس کا باطن روشن ہے وہ خداے رحیم و کریم کے سامنے با قاعدگی سے سجدہ کناں ہوتا ہے، لیکن مجلس ''محفل ہوٹل''میں آراستہ کرتا ہے، لیکن اگر کوئی غرض مند سب اظہار گویا نہ کر سکے، تو ریاض مجید اس کی مٹھی یوں گرم کر دیتا ہے کہ لینے والے ہاتھ کا پتا بھی معلوم نہیں ہوتا، لیکن جب اہلِ طمع کا اجتماع ہو تو ریاض مجید اپنے کھیے کو زور سے گرہ دے لیتا ہے اور انور محمود خالد سے مودبانہ گذارش کرتا ہے کہ معزز مہمانوں کی خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے۔ پھر کبھی مرغ پلاؤ کبھی شامی کباب کبھی پولکا آئس کریم اور کبھی کبھی گرم گرم چاے۔ وہ آشوب عصر کا مرثیہ نگار ہے، لیکن ملامتی صوفیوں کی طرح اپنی انا کو شراب میں غرق نہیں کرتا۔ وہ چہرے کے داغ اور لباس کی آلودگی کی واضع نشان دہی کرتا ہے، لیکن کھوٹے سکوں کو بازار میں چلانے کی کوشش نہیں کرتا۔ چناں چہ وہ انکساری سے کہتا ہے۔

ہرے پیڑوں سے روشن آگ پیدا کرنے والے

مجھے تازہ حسوں، تازہ حرارت سے بکھرتے خود

کو باہر مجتمع کر کے ہزاروں آتی نسلوں کے

تسلسل میں مسلسل زیست کی نعمت عطا کر (۱۴)

بقائے دوام یہ خواہش ہر چھوٹے بڑے فن کار کی ازلی اور ابدی خواہش ہے۔ لیکن ریاض مجید کے ہاں یہ خواہش نسبتاً زیادہ فطری انداز میں ابھری ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے دکھ نے اگرچہ گناہ اور شر کے نقطہ انفہام پر جنم لیا ہے ،لیکن وہ مادی آسایشوں کی طرف راغب نہیں ہوا۔ منصب عہدے اور شہرت کے لالچ نے اسے کبھی شماتت ہمسایہ پر آمادہ نہیں کیا۔شاید شر میں رہنے کے باوجود اس کا دکھ یہ ہے کہ بگوے کیوں ابر نہیں ہوسکتے؟سوچوں کے حلقے کربلا میں معصوم لفظوں کی زُبان کیوں سوکھی پڑی ہے؟

نئے میثاق پچھلے عہد ناموں سے زیادہ دیرپا کسی طرح ٹھہریں گے۔کتابوں میں لکھی سچائیاں بے معنویت کے سمندر میں کچے گھڑے کیوں بن گئے ہیں؟ہمارے حلق بہت سے پانیوں کے ذائقوں سے آشناتوبقول وزیر آغا:

> ”وہ ایک ایسی کیفیت کو جنم دیتاہے،جو عروج پر پہنچنے کے بعد عرفان میں ڈھل جاتی ہے۔ایک ایسالمحہ عرفان،جو من وتو کے رشتے کی نفی کر دیتاہے۔انتساب کی بیشتر نظموں میں یہ عرفانی کیفیت نظر آتی ہے اور یہ اگر قنوطیت ہے،تو میں آپ سے دریافت کرتاہوں رجائیت کسے کہتے ہیں۔“(۱۵)

ریاض مجید نے نازک رشتوں،نازک لمحوں کو بڑی خوب صورتی سے اپنی نثری نظم میں سمو دیاہے۔یہ اُن کی نظم کی مقبولیت کی دلیل ہے کہ اُنھوں نے مروّجہ عروضی سانچوں سے گہری وابستگی کے باوجود نثری نظم کو قبول کر لیا تھا۔اُنھوں نے اظہار کی اِس نئی کیفیت کے حق میں اُن لوگوں کو بھی اوزان کے بندھنوں سے آزاد کروانے میں معاونت کی ہے،جن کی رہ میں شعری اوزان رخنہ انداز تھے۔ترقّی پسندوں کا،جو بھی طرزِ عمل سہی ریاض مجید نے اِس حوالے سے شعری نزاکتوں کا خوب اظہار کیاہے۔کیوں کہ:

> ”آزاد نظم کے بعد جدید اُردُو نظم میں سب سے بڑاہیئتی تجربہ نثری نظم کی صورت میں ہوا۔اِسے آسانی سے نظم کی ارتقائی کڑی قرار دیا جاسکتاہے۔نظمِ معرّاسے قبل قافیے کے بغیر نظم کہنے کارواج نہیں تھا۔آزاد نظم سے قبل عروضی آہنگ کو منقسم کرنے کا تصوّر نہیں تھا۔نظم نے پہلے قافیہ سے آزادی حاصل کی،پھر متعیّن عروضی پیٹرن سے آزادی حاصل کی اور پھر عروضی آہنگ سے آزاد ہوئی۔“ (۱۶)

ریاض مجید نے نظم کا،جو بھی پیٹرن استعمال کیاہے،اُس میں اپنی ذات کو مدنظر رکھاہے۔ان کی نظم ”تنہائی کا بن باسی“اس کی خوب صورت کتاب آنے والے لمحوں کے تصوّر میں بیٹھے بڑے خوب صورت انداز میں ذکر کرتے ہیں۔یہ وہ لمحہ، جن کا ہمیشہ انہیں انتظار رہااور ان کے احساس کے قرب میں جلتے رہے۔کبھی خوش ہو جاتے کبھی نہ ملنے والی خواہشوں کی آگ میں جلتے رہے۔کبھی یہ آگ جس میں وہ جل کر کندن بن گئے۔بڑے ہی خوب صورت جذبات کا احساس اس نظم میں دیکھیے اور نظم کُچھ یوں ہے:

سہیلیو!

چلو اسے دلہن بنائیں

اس کا چہرہ اپنے ہاتھ سے سجائیں

کسی نہ دیکھے اجنبی کے سامنے

چلو اسے دلہن بنائیں (۱۷)

ریاض مجید کی نظموں کے بارے میں وزیر آغا نے بڑے اچھّے الفاظ میں لکھا ہے اور کہتے ہیں:

"بکھرتی ذات نیا یافت کا سفر نامہ رخنہ دیوار آنکھیں بوڑھے لمحے جامد رتیں اور بے شباہت ساعتیں۔ یہ سب الفاظ اور تراکیب ریاض مجید کی اسی نفسی کیفیت کو بے نقاب کرتی ہیں، جو بے معنویت کے عرفان سے جنم لیتی اور، جو بیسویں صدی کے حساس انسان کا سب سے بڑا المیہ ہے، جب ماضی کسی عبارت کی تہہ بہ تہہ اینٹوں جیسے جامد اور سنگ دل کی یادوں کا ڈھیر نظر آئے اور مستقبل۔۔۔ دور صدیوں کی دوری تلک سوچ کی انتہائی حدوں سے بھی باہر زمانے تلک گرمی خون کی صبحِ کاذب کا اک المیہ ہی نہیں ہے۔" (۱۸)

نظم کی صورت خود ایک واہمہ بن جائے تو ہر حال کے لمحہ گریز اں پر ساری توجّہ کا مرتکز ہو جانا ناگزیر ہے۔ یہی ریاض مجید کی نظموں کا خاص، جو ہر ہے کہ وہ ماضی اور مستقبل سے کہیں زیادہ حال کے لمحہ گریز پا کا درد انگیز توجّہ ہیں۔، مگر ہمارے محترم نظریہ بر دوش ترقّی پسند شعرا کی طرح ریاض مجید نے حال کو محض معاشی مسائل اور طبقاتی کش مکش کے حوالے سے نہیں دیکھا بل کہ بے معنویت اور بے معرفی کے احساس اور اس احساس سے پھوٹنے والی بوریت اور دل شکستگی کے حوالے سے اسکا ادراک کیا ہے۔ ان کی نظمیں پڑھتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ریاض مجید نے اٹلس کی طرح "وجود" کے بار گراں کو اپنے شانوں پر اٹھا رکھا ہے۔ ریاض مجید کی یہ نظمیں اُردُو شاعری کے لپٹے ہوئے اور پامال موضوعات اور مصنوعی جذبایت سے لبریز فضا میں ایک زخمی روح کا دل اتر جانے والا قوم میں موجود وجود کے معنویت سے لبریز مخفی رخ کو آواز دینے کی ایک دلآویز کوشش بھی کی ہے۔

ان کی ایک بہت ہی خوب صورت نظم "انتساب" (جس کے نام پر کتاب کا نام بھی انتساب رکھا گیا ہے) اس نظم کو انیس ناگی نے انگلش میں ترجمہ بھی کیا ہے:

شب وروز کی ساری اچھّی دعائیں تیرے واسطے ہیں

تمام اچھّے الفاظ، سب اچھّی باتیں (جو میرے قلم کی پہنچ میں ہیں اور وہ، جو میرے قلم کی پہنچ میں نہیں ہیں)

تیرے ہی لیے ہیں

اے مرے !

کیا تجھے علم ہے؟

میرا ہر سانس تیری مَحبّت بھری یاد میں ڈوب کر

میرے سینے سے باہر نکلتا ہے۔ (۱۹)

انگلش میں:

All the gentle prayers of day and naght are

.for you

.All the noble words

.All the gentle locations

.That are within the ambit of my pen

All those which are not

All are but for you

Translate by:Anis Nagi

Flape.book inthsab

ریاض مجید کو اپنی نظموں میں بھی بچھڑی ہوئی رفاقتیں اسے اپنے عمل اور اپنی شخصیت کے تجزیے کے موضوع پر شدت سے یاد آئیں۔ اور وہ رو دیا ہے اس کے شعر حسین ترین ٹکڑے وہ ہیں، جہاں اس نے گزرے ہوؤں کو یاد کیا۔ کالج نامہ کسی ایک کالج کے اوّلڈ سٹوڈ نٹس کے نام ایسو سی ایشن کا خط نہیں۔ سب جدائی پکڑنے والوں کے دلوں کی آواز ان کے صدموں کی تصویر ہے۔ مثلاً! تمہارے سانس آج بھی تمہارے پرانے مسکن کی خواب آور ہواؤں میں سر سرا رہے ہیں۔ تمہیں یہاں سے گئے ہوئے سال بسال‘ کتنے ہی عہد گزرے، مگر یہاں پر تمہارے قدموں کی چاپ اب بھی بر آمدوں میں سنائی دیتی ہے قدم قدم پر تمہارے پاؤں کا لمس اب بھی مہک رہا ہے:

پرانے ڈیسک اور اونچے اونچے درخت،

جن پر تمہاری ارمان بھری

رفاقت کی داستانیں کھدی ہوئی ہیں،

تمہیں بلاتے ہیں (۲۰)

رفتگان ریاض مجید کی شاعری کا حِصّہ ہے۔ ان کی شاعری کا پہلا حِصّہ ہی وہ لوگ تھے، جو چلے گئے۔ ''رفتگان کی یاد ان کے رول نمبر رہ گئے''۔

ماضی ریاض مجید کا ایک مستقل حوالہ اور حال کی شناخت کا ایک وسیلہ بنتا ہے، مگر ماضی پسندی کے سلسلے میں یہ کہنا کہ ''آتے موسم سے آنکھیں ملانا گناہ ہے۔ ''شاید زیادتی کی بات ہو گی۔''

شوکت علی خواجہ نے ایک مضمون (نیک ساعت کا منتظر شاعر) میں کیا ہے کہ تراکیب کی متضاد کیفیات میں، جو حدِ فاصل ہے وہ ریاض مجید کی نظموں کی فکر وسعت ہے اور یہی وسعت ایک صحرائے مرگ بن کر اس کے گروپ میں المیے کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

ریاض مجید نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم کو بھی اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ نظم اور غزل کے وہ گہرے مزاج دان ہیں۔ کم از کم غزل کے شعرا کی نظم دانی پر اعتراض کرنے والے حضرات ریاض مجید کی غزل اور نظم پر اعتراض نہیں کر سکتے۔ ریاض مجید کی نظم اور غزل کو دیکھ کر کلیم الدین احمد کی یہ رائے ردّ ہو جاتی ہے:

''اُردُو کی زیادہ تر نظمیں، غزلیں ہیں، جو نظم کے بھیس میں جا نکلتی ہیں۔'' (۲۱)

ریاض مجید نے نظم اور غزل کی فارم اور الگ شناخت کا خیال رکھا ہے۔ وہ دونوں اصناف کے رمز شناس ہیں۔ ستر کی دہائی نظم خصوصاً نئی نظم کی ترویج و اشاعت کا زمانہ تھا، ان سالوں میں اُردُو نظم ایک نئے رجحان اور میلان سے گزر رہی تھی۔ یہ رجحان اور میلان سادہ بیانی سے علامتی اظہار تک پھیلا ہوا ہے۔ مجید امجد، ن۔ م راشد، فیض احمد فیض کے بھرپور نظمیہ تجربات اور کامیاب نظم نگاری کے اثرات نئے شاعروں پر بھی پڑے اور اُردُو شاعری میں غزل کے ساتھ نظم بھی معروف صورت اختیار کر گئی۔ اُردُو شاعری میں پابند نظم، جو عام طور پر قطعہ بند صورت میں لکھی جاتی تھی، ان دہائیوں میں رفتہ رفتہ کم ہو رہی تھی اور معرّا اور آزاد نظم کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ ادبی و مسائل کسی بھی صنف کے معروف ہونے کا عکس ہوتے ہیں، لہٰذا اگر ساٹھ اور ستر کی دہائیوں کے رسائل کے مندرجات پر نظر ڈالی جائے، تو ہمیں اندازہ ہو گا کہ یہ زمانہ نئی اُردُو نظم کا زریں دور ہے۔ اِس حوالے سے جیلانی کامران نے درست کہا تھا:

''نئی نظم کے شاعر کی ذِمّے داریاں پہلے شاعروں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔'' (۲۲)

اس زمانے میں انیس ناگی کی معروف کتاب "Modern Urdu Pakistani Poems" شایع ہوئی، جو اُردُو کے پچیس شاعروں کی چار چار نظموں (یعنی کل ۱۰۰ نظموں) کے انگریزی تراجم پر مشتمل ہے۔ اس میں جن شاعروں کی نظموں کو

انیس ناگی میں منتخب کیا۔ اس میں نئی نظم کے قریب قریب سارے معروف شاعر شامل ہیں، ان میں ریاض مجید کی چار نظمیں بھی شامل ہیں۔ اس دور تک ریاض مجید کی نظموں کا پہلا مجموعہ 'انتساب' ابھی شایع نہیں ہوا تھا۔ یہ مجموعہ ۱۹۷۸ء میں شایع ہوا۔ ریاض مجید کی نظم نگاری کے حوالے سے ہم اس مجموعے کو ان کا پہلا اہم سنگ میل قرار دے سکتے ہیں۔ اس اِنتخاب اور ترجمہ کے ذریعے جہاں پہلی بار اُردُو نظم کا ایک اہم مجموعۂ اِنتخاب وترجمہ سامنے آیا۔ وہاں ریاض مجید کی چار اہم نظموں کی طرف بھی اُردُو قارئین کی توجُّہ مبذول ہوئی۔

واضح رہے کہ انیس ناگی کی اس کتاب کا بعد میں ایک اور ایڈیشن بھی شایع ہوا، مگر اُردُو میں نئی نظم کے ترجمے کی کوئی اور اس انداز کی کتاب شایع نہیں ہوئی اس کتاب کی بیرون ملک بھی پذیرائی حاصل ہوئی اور جہاں کہیں نظم کے ترجمہ کی ضرورت ہوئی اسی کتاب سے استفادہ کیا جاتا اس میں وہ چار نظمیں، جو ریاض مجید کی بہ حیثیت نظم نگار شناخت کا باعث ہیں درج ذیل ہیں:

ریاض مجید کی ابتدائی نظم 'خاک' گورنمنٹ کالج لائل پور (اب فیصل آباد) کے زمانے میں جب وہ بی اے آنرز ان لینگوایجز کے طالب علم تھے، شایع ہوئی۔ یہ ایک سادہ سی پیراپیگنڈہ ٹائپ نظم تھے، جو بقول ریاض مجید :

> "ان دنوں کالج میں کالج سٹوڈنٹس یونین کے اِنتخابات ہونے والے تھے۔ چند سینئر سٹوڈنٹس نے فیصلہ کیا کہ اچھّے اُمّیدواروں کے اِنتخاب کے لیے ایک انجمن بنائی جائے، جو متوقع اُمّیدواروں کو مل کر ان کے خیالات کا جائزہ لے اور ان سے موزوں ترین سٹوڈنٹ کا اِنتخاب کر کے وہ اس کا اعلان کرے اور پھر باقی سٹوڈنٹس اس کو ووٹ دیں۔ اس کے لیے 'سپورٹرز گلڈ' جی سی لائل پور کی ایک باڈی تشکیل دی گئی، جس کا پروپیگنڈا اسکرٹری مجھے بنایا گیا۔ مقصد ہی تھا کہ مختلف اُمیدواروں کے درمیان لڑائی نہ ہو نہ کالج میں زیادہ نعرہ بازی اور اشتہار بازی ہو سپورٹرز گلڈ اپنے فیصلے سے دوسرے سٹوڈنٹس کو آگاہ کر دے کہ ہماری طرف سے یہ موزوں اُمیدوار ہے۔ اس گلڈ کے لیے مجھے ایک نظم لکھنی پڑی۔ یہ طویل نظم چھپی اور طلبہ میں تقسیم کی گئی اور اس کے ساتھ مختلف اُمّیدواروں سے مل کر موزوں ترین اُمّیدواروں کا اعلان کر دیا گیا اور حسنِ اتفاق سے اس سال وہی اُمّید وار کامیاب ہوئے۔ گلڈ کے بجوزہ اُمّید وار شمیم احمد خان تھے، جو بعد میں ایڈوکیٹ اور پیپلز پارٹی کی طرف سے پنجاب اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر بھی بنے۔"(۲۳)

یہ نظم واقعی اِنتخابی منشور جیسی سادہ اور صحافیانہ، اندازی نظم تھی جس کی چند لائینیں درج ذیل ہیں:

ہمارا حلف ہے ان دوستوں کو دیں گے ووٹ

وہ دوست جن کا لہو وقف ہو ہمارے لیے (۲۴)

اس نظم کے مطالعے سے دو باتیں ریاض مجید کی نظم نگاری کے باب میں واضح ہوئیں، ایک یہ کہ یہ طویل نظم معرّا ہئیت میں تھی۔ دوسرے اس نظم کے مصرعوں کی روانی اور بہاؤ تھا، جس کے پیچھے ریاض مجید کی ان نظموں کا تجربہ بول رہا تھا، جو

اُنھوں نے مختلف کالجوں کے بین الکُلیّاتی مشاعروں کے لیے کینٹوز کی صورت میں لکھی تھیں۔جدید شعرا طویل نظم سے شعوری طور پر دامن کشاں رہے ہیں۔ریاض مجید کی قادر الکلامی کا اِس بات سے بھی اندزاہ ہوتا ہے۔اِس ضمن میں آفتاب اقبال شمیم کی یہ راے بالکل صادق آتی ہے:

''طویل نظم کی بنیاد مرکزی تلازمے پر رکھی جاتی ہے،جو بڑا مشکل کام ہے۔''(۲۵)

''نئے سال کی پہلی نظم'' کا تجزیاتی مطالعہ:

سال آتے ہیں چلے جاتے ہیں زندگی کا کارواں ایسے ہی چلتا رہتا ہے۔ہمیں زندگی میں بہت سے لوگ ملتے ہیں، لیکن کُچھ لوگوں کی یادوں کے نقوش اتنےَ ان مٹ ہوتے ہیں کہ ہم چاہ کر بھی نہیں مٹاسکتے۔لوگ ملتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں، لیکن زندگی کے اس بہتے دریا میں ہم سے بچھڑنے والے لوگوں کے چہرے تمام سال ہمیں اپنی نظروں میں کبھی ڈوبتے اور کبھی ابھرتے نظر آتے ہیں۔نگاہوں میں ایک اُمّید ہوتی ہے کہ شاید یہ پیارے چہرے واپس لوٹ آئیں، مگر یہ انتظار لاحاصل رہتا ہے اور جانے والے یہ نہیں جانتے کہ اگر انتظار طویل ہو جائے، تو محبّتیں بے یقین ہو جاتی ہیں اور وہ جذبے،جو اظہار کے پانی سے سیر اب نہیں ہوپاتے سوکھ جاتے ہیں۔ٹوٹ جاتے ہیں وہ خواب جن کی تعبیر نہیں ملتی۔اور ان ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں بہت رُلاتی ہیں تڑپاتی ہیں، لیکن انسان بے بس ہوتا ہے۔

جیسے ہر چیز کی ایک مدت ہوتی ہے،اسی طرح دنوں مہینوں اور سالوں کی بھی ایک میعاد ہوتی ہے۔بعض اوقات یہ دن،مہینے،سال اتنے طویل اتنے بھاری محسوس ہوتے ہیں کہ ان کو کاٹنا انسان کے بس سے باہر ہوتا ہے۔جس طرح انسان کی زندگی میں ہمیشہ دکھ اور سکھ نہیں رہتے اسی طرح خزاں کے بعد بہار کا آنا۔ساون کا برسنا،گرمی کا آنا اور پھر سردی کا آنا۔اُداس اور لمبی راتوں کا آنا۔پہاڑ کی چوٹیوں پر برف کا گرنا۔سورج کا اپنے وقت پر نکلنا،چاند کا آنا۔یہ سب نظامِ کائنات ہے یہ ہمیشہ ایسے ہی چلتا رہتا ہے۔

انسان کی زندگی میں بھی دکھ اور سکھ کی دھوپ چھاؤں آتی جاتی رہتی ہے۔کبھی خوشیوں کی چاندنی ایسے چٹکی ہے کہ انسان ہر غم بھلا دیتا ہے اور کبھی غم کا ایسا اندھیرا چھاتا ہے انسان خود کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مَیں اکثر سوچتی رہوں

اگر

خودکشی حرام نہ ہوتی

تو

تیری اس دنیا میں

کون جیتا؟

اے خدا!　　(۲۶)

اِس نظم میں پائی جانے والی شعری کیفیات میں وہ تمام ترڈکشن موجود ہے، جس کے بارے میں ہمیں یہ تاثر ملتا ہے:

''نظمِ معرّا کی طرح نظمِ آزاد بھی انگریزی ادب کے توسط سے اُردُو میں رائج ہوئی۔ اُسے بھی اُردُو شاعروں نے مِن و عن قبول نہیں کیا، بل کہ اپنے خطّے اور تہذیبی صورتِ حال کے مطابق تبدیل کیا۔ انگریزی میں آزاد نظم کو عروض سے زیادہ آہنگ کو اہمیت حاصل ہے، چاہے یہ آہنگ مختلف بحور کے استعمال سے قائم ہو یا کسی سطر میں نثری آہنگ کو استعمال کر لیا جائے۔''(۲۷)

اِس عروضی کیفیت میں ریاض مجید نے نثری آہنگ سے دامن کشائی کی ہے۔ دیگر حوالوں سے اُن کی یہ نظم ایک مثال رکھتی ہے۔ ریاض مجید نے انسانی فکر کی اُس جہت کو بیان کیا ہے کہ ہر نئے آنے والے سال سے انسان بہت سی اُمّیدیں وابستہ کرتا ہے اور جانے والا سال زندگی میں اچھّی بری یادیں چھوڑ جاتا ہے۔ ''نئے سال کی نظم'' شاعر کے ان جذبات کی ترجمان ہے کہ نئے سال کی آمد پر محسوس ہو رہے۔ شاعر کہتا ہے کہ کل رات جب میں نئے سال کا کیلنڈر لگانے کے لیے دیوار سے پرانا کیلنڈر اُتارا تو جانے والے سال کی یادوں نے ایک پل کو مجھے اپنی گرفت میں لے لیا اور بیٹے ہوئے لمحوں کی یاد نے میری آنکھوں میں نمی بھر دی۔ مَیں اور آزردہ ہو گیا اور گزرے وقت کی پرچھائیاں مجھے دبوچنے لگیں۔ یہ ایک ایسی جدّت اور انوکھی موضوعیت ہے، جس کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''موضوع کی تبدیلی تو ہر نئے دور کا ایک امتیازی وصف ہے، کیوں کہ نیا دور، اپنے ساتھ نئی اشیا، نئے محرکات اور نئے مسائل لے کر آتا ہے۔''(۲۸)

اِس حوالے سے دیکھا جائے، تو ریاض مجید نے اِس نظم میں جانے والے سال پر حیرت انگیز ہوتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ گزرنے والا سال بھی کیا عجیب تھا، جس نے میری زندگی میں اتنی یادیں بکھیر دیں کہ ان کو سوچ کر میں افسردہ ہو رہا اس سال مجھے میرے محبوب سے ملایا اور ابھی میں اس ملن پر خوش بھی نہ ہو پایا کہ جدائی میرے مقدر میں لکھ دی گئی۔ شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ یہ سال ایک ایسا سال تھا، جس نے مجھے تجھ سے قریب کیا۔ تیرا وصال میرے لیے کسی معجزے سے کم نہیں۔ یہ میرے لیے بڑا انعام تھا، مگر پھر جلد ہی یہ وصال ہجر میں تبدیل ہو گیا۔ اسی سال نے ہمارے درمیاں دوریاں پیدا کر دیں۔

یہی سب سوچتے ہوئے جب نئے سال کا خوب صورت زندگی کے رنگوں میں مزین نیا کیلنڈر دیوار پر لگایا تو دل کی دھڑکنیں منتشر ہو گئیں اور اس سوچ نے جیسے سانس نکال لی کہ نہ جانے اس سال میری قسمت میں کیا لکھا ہے، نہ جانے کون

سے حادثات اس سال رونما ہوں گے اور گزرے وقت میں، جو خطا کی اس کی سزا کتنا عرصہ جھیلنا پڑے گی۔ میں نے، جو پیار کرنے کا جرم کیا ہے نہ جانے کب تک اس جرم کی پاداش میں سزا پاؤں گا۔ تیری آرزو تیری چاہت نہ جانے مجھے اور کن آزمائشوں میں ڈالے گی۔ کس کو خبر ہے کہ مزید تیری خواہش مجھ سے کیا کیا امتحان لے گی۔

کسی کو چاہنا کوئی گناہ تو نہیں، مگر میرے لیے یہ ایک گناہ ثابت ہو رہا اور اس گناہ کی بدولت میں دوزخ کی جس آگ میں جل رہا نہ جاننے کب تک اسی آگ میں جلوں گا۔ کوئی نہیں جانتا اور نہ مجھے خود یہ علم ہے کہ مجھے اور کیا سزا ملنے والی کیوں کہ میں وہی طلب تیری نگاہ میں دیکھنے کا خواہش مند ہوں جیسی طلب میرے دل میں تیرے لیے۔ مَیں تیری رفاقت کا طلب گار ہوں اور چاہتا ہوں کہ تو بھی میری طلبگ ار ہو، لیکن یہ خواہش مجھے پل پل نئے درد سے آشنا کرتی اور مَیں کسی مجرم کی طرح یہ سزا برداشت کر رہا اور نہ جانے مزید کتنے امتحان میرے نصیب میں لکھے ہیں اور یہ نیا سال بھی تو ایک امتحان ہی ہے، جو نہ جانے کبھی ختم ہو گا بھی کہ نہیں کوئی یہ نہیں جانتا۔ ریاض مجید کی زیرِ نظر نظم سے چند مصرعے بہ طورِ مثال دیکھیے:

عجب وقت تھا، جس نے تجھ سے ملایا بھی تجھ سے جدا بھی کیا

ترے قرب کا سلسلہ بھی اُنھیں گزرے لمحات کا معجزہ تھا

ترے ہجر کے فاصلے بھی اُنھی گزرے لمحات کی دین ہیں

اور کُچھ دیر کے بعد، جب اُس جگہ پر نئے سال کا خوب صورت سار نگین کیلنڈر آہستگی سے لگایا

تو یہ سوچ کر ایک پل کے لیے سانس رک سی گئی...

کہ جانے اُن آتے دنوں میں مرے واسطے کیا لکھا ہے؟ (۲۹)

ریاض مجید کی اِسی عنوان کے زیرِ اثر ایک اور نظم اُن کے مجموعے "بے چہرہ کونپلیں" میں بھی شامل ہے، جس میں اُنھوں نے ایک نئے انداز میں نئے سال کی پہلی نظم کو دہرایا ہے۔ اِس میں شاعر کا اظہار یہ ملاحظہ ہو:

تجھے یاد کر کے نئے سال کا خیر مقدم کیا ہے

نئے سال کی بس یہی اک دعا ہے

کہ آتے شب و روز، جیسے بھی ہوں

ذہن جس آگ میں بھی جلے

پر......

خدا میرے دل کو تمھاری محبّت سے آباد رکھے! (۳۰)

نظم ''اُسے علم ہے'' کا تجزیاتی مطالعہ:

زندگی ایک ایسا پیچیدہ سوال ہے، جس کا جواب آج تک کوئی نہ دے سکا۔ اِس کا گزرتا ہر پل انسانوں کو نت نئے تجربات سے روشناس کراتا ہے۔ ان تجربات کی بھٹی میں کُچھ لوگ تپ کر کندن (کوئلے کی طرح جل کر راکھ ہو جاتے ہیں) بن جاتے ہیں اور کُچھ لوگ خام ہی رہ جاتے ہیں، کُچھ تجربات انسان میں نئی اُمنگ نئی آرزو پیدا کرتے ہیں اور کُچھ لوگوں میں اتنی تلخی بھر جاتی ہے کہ ان کو زندگی صرف اور صرف ایک کڑوا گھونٹ محسوس ہوتی ہے۔

''اُسے علم ہے'' ایک ایسی نظم ہے، جس میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر زندگی کی اذیتوں سے اس قدر دو چار ہو چکا ہے کہ اس میں تلخی بے تحاشا سرایت کر چکی ہے۔ شاعر کو یہ احساس بھی ہے کہ اس کو محبوب اس کا مزاج آشنا ہے اور وہ اس کی تلخیوں کے رد عمل کو بخوبی سمجھتا بھی ہے شاعر کہتا ہے کہ مجھے زندگی میں، جو اذیتیں ملیں، جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اُنھوں نے مجھے اتنا تلخ کر دیا ہے کہ بعض اوقات مجھے زندگی کسی وبال کی صورت محسوس ہوئی اور کبھی کبھار کسی بات کے ردِّ عمل کے نتیجے میں دل کرتا ہے کہ یا تو میں خود کو ختم کر لوں یا کسی کی جان لے لوں۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں بل کہ حالات نے مجھے اتنا تند مزاج بنا دیا ہے۔ زندگی میں قدم قدم پر مجھے اس قدر ستایا گیا ہے کہ اب اگر میں رد عمل کے طور پر کُچھ الٹا سیدھا کرتا ہوں یا کہتا ہوں میں اس میں خود کو بجا سمجھتا ہوں آخر انسان کی برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے اور جب یہ حد عروج پر پہنچتی ہے تو انسان کُچھ بھی کر گزرتا ہے چاہے وہ غلط ہو یا درست۔ چند مصرعے بہ طور مثال دیکھیے:

خود مروں یا کسی اور کو مار دوں

کُچھ مری تلخیوں کے منافی نہیں ہے

سبھی جانتے ہیں،

کہ جس طرح مجھ کو ستایا گیا اُس کے پیشِ نظر...

میں ہر اک بات کے کہنے اور کرنے میں حق بہ جانب ہوں (۳۱)

نظم کا آخری حِصّہ شاعر کی اعلیٰ ظرفی کا اظہار کرتا ہے کہ شاعر کو کوئی علم بھی ہے کہ اس پر، جو آزمایش آئیں اسے جن کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے جو لوگوں کے اذیت ناک رویے اور ستم برداشت کرنا پڑے۔ اس سب کا ذمّے دار صرف اور صرف اس کا محبوب ہے، لیکن اس سب کا اظہار وہ اس سے نہیں کر سکتا۔ حال آں کہ وہ جانتا ہے کہ اس کا محبوب باخبر ہے میرے تمام حالات سے، مگر وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں کبھی اس سے شکوہ نہ کروں گا اور نہ کبھی زندگی میں اس کی راہ میں کوئی

رکاوٹ پیدا کروں گا نہ اس سے اس سب کا جواب طلب کروں گا۔ ریاض مجید کی اِس نظم سے اُن کے تجربے کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ:

> ''نئی نظم کی اساس تجربے پر ہے اور اِس لحاظ سے منفرد ہے۔ کیوں کہ اس کا تجربہ اپنی پیدایش کے اعتبار سے وسیع فکری منطقوں سے تعلق رکھتا ہے اور رونمائی کے اعتبار سے ایک ہی وقت میں مختلف زاویوں سے اپنی شباہت کو پیدا کرتا ہے۔'' (۳۲)

یہ شاعر کی اعلیٰ ظرفی کی حد ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ اپنے محبوب کی ہم دردی حاصل کرنے کے لیے اسے اپنے اُوپر کی جانے والی سختیوں سے آگاہ کروں کہ تیری بدولت میری یہ حالت ہے۔ میری ان آزمایشوں کا ذمّے دار تو ہے۔ اور نہ کبھی اسے یہ جتلاؤں گا کہ تیرے سبب میری زندگی کی راہ میں قدم قدم پر کانٹے بچھے ہیں، جن کی اذیت میری روح میں سرایت کر چکی ہے اور میں ان خاردار راہوں میں چلتے چلتے لہولہان ہو رہا ہوں۔ مجھے اپنی گناہی ثابت کرنے کے لیے کن کن مراحل سے گزرنا پڑا ہے میں تجھے نہیں بتا سکتا کہ میں خود تو اس اذیت کی بھٹی میں پل پل جل رہا ہوں، مگر میں نہیں چاہتا کہ تجھے اس بات کا علم ہو کہ یہ سب تیری وجہ سے ہے چاہے تو میرے حالات سے باخبر ہے اور جانتا ہے کہ یہ سب تیری وجہ سے ہے، مگر میں پھر بھی کبھی تجھے موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا اور تو بھی اس بات کو بہت اچھّی طرح جانتا ہے:

> لیکن اُسے علم ہے!
>
> میں کبھی اُس کا رستہ نہ روکوں گا!
>
> اُس کا دامن پکڑ کر کبھی یہ نہ جتلاؤں گا......
>
> کہ تیرے سبب مجھ کو کس طرح کانٹوں پہ چلنا پڑا ہے؟ (۳۳)

نظم ''وہ جو مل جائے'' کا تجزیاتی مطالعہ:

جب قدرت انسان کے دل میں کسی کی چاہت ڈال دیتی ہے، تو دل و دماغ پر صرف اسی ہستی کا قبضہ رہتا ہے۔ انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیّت سلب ہو جاتی ہے وہ کرنا کُچھ چاہتا ہے اور ہو کُچھ جاتا ہے محبّت انسان کو اپنی خودی بھولا دیتی ہے۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، آتے جاتے غرض ہر دنیاوی فعل انجام دیتے انسان کا دھیان صرف اور صرف اپنے محبوب کی طرف اٹکا رہتا ہے اور جب یہ جذبہ یک طرفہ ہو تو یہ حالت اور بھی ابتر ہو جاتی ہے۔ انسان کے پیشِ نظر صرف اور صرف اس کا محبوب نظر ہوتا ہے۔ جسے سوچ کر اسے روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے اور وہ محبوب کے خیالات میں کھو کر ہی مسرور رہتا ہے اور آتی جاتی سانسوں کے ساتھ وصالِ یار کی دعائیں کرتا رہتا ہے۔

"وہ، جو مل جائے" شاعر کی خود فراموشیاں کو بیان کرتی ہے اور شاعر بار گاہِ ربّ العزّت میں التجا کرتا ہے کہ میں، جو تصوّرِ جاناں میں خود کو کھو بیٹھتا ہوں اور مجھے دنیا کا ارد گرد کا کوئی ہوش نہیں رہتا اور یہ حالات بعض اوقات میرے لیے مشکلات پیدا کرتی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ یہ سلسلہ میرے ساتھ اب مزید نہ رہے۔ کیوں کہ ایسا کرتے ہوئے اکثر میرے ساتھ ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ میں چیزیں رکھ کر بھول جاتا ہوں جس کی وجہ سے اکثر مجھے پریشانی اٹھانا پڑتی ہے۔

شاعر کہتا ہے اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں اپنا کُچھ کھو بیٹھا ہوں۔ انسان جب کسی کی چاہت کو دل میں بساتا ہے تو اس کا چین سکون تو خود بخود ہی چھن جاتا ہے اور کبھی راہ چلتے ایسے حالات بھی ہوتے ہے کہ پاس سے گزرتے ہر چہرے میں اپنے محبوب کے نقوش کو تلاشتا ہوں اور ہر چہرے پر اس کے چہرے کا گمان ہوتا ہے اور کبھی بیٹھے بیٹھے جب اس کی یاد آتی ہے، جو کہ ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے، لیکن بعض اوقات یہ یاد اتنا بے چین کر دیتی ہے کہ ضبطِ شدت کے باوجود آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ تو میں چاہتا ہوں کہ میری یہ کیفیت ختم ہو جائے۔ ریاض مجید کی یہ فکرِ نو نظم کے قالب میں رہتے ہوئے غزل کے مزاج کا پتا دیتی ہے۔ اِس موقع پر آل احمد سرور کی بات یاد آتی ہے:

> "نظم کی دنیا، اُردو شاعری میں غزل سے ہٹی نہیں ہے۔" (۳۴)

ریاض مجید نے زیرِ نظر نظم میں، جو رومانی فضا پیدا کر رکھی ہے، اِس سے اندازہ ہوتا ہے:

> "جدید نظم کی کامیاب صورتیں بعض اوقات نظم کی بہ نسبت غزل سے قریب تر محسوس ہونے لگتی ہیں۔" (۳۵)

متذکرہ بالا دونوں حوالہ جات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ریاض مجید کی اِس قبیل کی کئی نظمیں اُنھیں غزل اور نظم کے گہرے نباض ہونے کے حوالے سے ایک نئی رہ تراشنے پر آمادہ کر رہی ہیں۔ چناں چہ اِس نظم میں شاعر التجا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے دل میں ،جو محرومیوں کی خلش ہے یہ میرے دل کو اکثر اتنا دکھی کر دیتی ہے کہ یہ درد نا قابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ اب یہ محرومیاں ختم ہو جانی چاہیے اور زندگی میں سکون در آئے تا کہ راتوں کو کُچھ خواب اتنا بے سکون او ر بے چین کر دیتے ہیں کہ اٹھ کر بے بسی سے رونا شروع کر دیتا ہوں، تو یہ بے بسی اب ختم ہو جائے۔ کاش گزرے ہوئے لمحے یوں پاؤں کو زنجیر نہ کریں کہ چلتے چلتے ایک دم کسی مقام ہر کوئی نہ کوئی یاد اس طرح سے سامنے آئے کہ قدم آگے بڑھنے سے انکار کر دیں۔ کیا میری زندگی میں ایک سے شب و روز لکھ دیے گئے ہیں، جو ہر پل مجھے غمگین رکھتے ہیں۔ کیا یہ اُداسی اور افسردگی ختم نہ ہو گی یہ اُداسی، جو مجھے ہر وقت مضطرب رکھتی ہے اب تو ختم ہو جائے۔

شاعر فریاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر میرا محبوب مجھے مل جائے تو میں زندگی کے تمام دکھ بھول جاؤں اور مجھے لوگوں سے ،جو شکوے شکایات رہتے ہیں اور میں ہر کسی سے ،جو گلے کرتا رہتا ہوں تو آیندہ کسی سے کوئی شکایت نہ کروں بس

میرا محبوب مجھے مل جائے، تو میری دنیا شوخ و رنگین ہو جائے اور اب تک، جو زندگی کو ایک بوجھ سمجھ کر گزار رہا ہوں تو یہ بوجھ بھی نہ محسوس ہو اور اب، جو میں اپنا قیمتی وقت فضول کاموں میں ضایع کر رہا ہوں یہ پھر ضائع نہ ہو گا کیوں کہ مجھے جینے کا جواز مل جائے گا۔

شاعر چاہتا ہے کہ اگر میرا محبوب میری زندگی میں آجائے تو میں آوارگی کی زندگی کو خیر باد کہہ دوں میرے دن، جو بغیر کسی وجہ کے مختلف ریستورانوں وغیرہ میں گزرتے ہیں اور راتوں کو سوچ بچار کرتے ہوئے شہر کی سڑکیں ناپتا ہوں تو میں یہ سب ترک کرنا چاہتا ہوں اگر محبوب کی رفاقت نصیب ہو جائے تو میں اپنی تمام عادتیں بدل لوں اور اچھّا بن جاؤں میں بھی عام انسانوں کی طرح زندگی کو برتوں وقت پر سویا کروں اور صبح وقت پر بیدار ہوں اور زندگی کے قیمتی لمحات، جو مٹھی سے ریت کے ذروں کی مانند پھسل رہے یوں ضایع نہ ہوں اور، جو یہ زندگی ملی، جو کہ ایک بار ملتی ہے تو اس کو یوں بے کار نہ گزاروں۔ اور اپنے محبوب کو اپنی زندگی کا مرکز اور محور بنالوں اور اپنی زندگی کو ترتیب سے گزاروں۔ زندگی میں ایک مقصد مل جائے گا اور اس کی خاطر میں بھی زندگی کے ہر مرحلے کو خوش اُسلُوبی سے انجام دوں اور اب، جو میں کبھی کہیں تو کبھی کہیں بھٹکتا پھرتا ہوں اور ہر وقت بکھرا بکھرا رہتا ہوں خود کو مُرتّب کر لوں اور جب میرے سامنے ایک منزل اور سنگِ میل موجود ہو گا تو میں تو بے قصّہ زندگی نہ گزاروں اور زندگی کے سفر کو با مقصد بنا کر ترقّی کے حُصُول کے لیے کوشاں ہوں اور اپنے محبوب کو پالوں تو پھر میں بھی اپنے لیے ایک چھوٹا، مگر خوب صورت سا گھر بناؤں، جو کہ خوشیوں کا گہوارہ ہو۔ جہاں ہم چین سکون کی زندگی بسر کریں بس میرا محبوب مل جائے، تو میری زندگی کی تمام کٹھنائیاں خود بخود دور ہو جائیں گی اور میں اپنے آپ کو درست سمت میں زندگی گزارنے کے قابل بنالوں گا۔ زیرِ نظر نظم سے چند مصرعے بہ طور مثال ملاحظہ ہوں:

خود فراموشیوں کا نہ سایہ رہے

رکھ کے چیزیں نہ یوں بھول جایا کریں

کھویا کھویا نہ محسوس ہو اپنا کُچھ

آتے جاتوں کے چہرے نہ دیکھا کریں

بیٹھے بیٹھے نہ گیلی ہوں پلکیں کبھی

اُس کی یادیں نہ ایسے رلایا کریں (۳۶)

نظم "جدائی کی پہلی نظم" کا تجزیاتی مطالعہ:

انسان کی زندگی میں جب جدائی کے لمحات در آتے ہیں، تو وہ جیتے جی مر جاتا ہے۔ اس کا پل پل اپنے پیار کی یاد میں گزرتا ہے زندگی کا ہر لمحہ کاٹنا انتہائی مشکل محسوس ہوتا ہے۔ سانسیں بار بار بے ترتیب ہوئی ہیں زندگی کسی امتحان سے کم نہیں لگتی۔ جدائی انسان کو گھن کی طرح کھا جاتی ہے۔

"جدائی کی پہلی نظم" ایک ایسی نظم ہے، جس میں شاعر جدائی پر محسوس ہونے والے اپنے جذبات بیان کرتا ہے اور بہت حوصلے کا مظاہرہ کرتا ہے۔ خود کو باحوصلہ ظاہر کرتے ہوئے اپنے محبوب کو بھی ہمت و حوصلہ کا مشورہ دیتا ہے، جب ساتھ چلتے چلتے ایک دم ساتھ چھوٹ جاتے ہیں تو انسان حیران و پریشان سوچے چلا جاتا ہے کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا۔ قدرت کی ستم ظریفی پر شکوے شکایات بھی کرتا ہے۔ زندگی میں اس کی دل چسپی ختم ہو جاتی ہے اور وہ ہر وقت ملن کی تمنا میں زندگی بسر کیے جاتا ہے۔

شاعر نے اس نظم میں جدائی کو حادثہ کہا ہے اور بیان کیا ہے۔ زندگی میں گزشتہ شب ،جو واقعہ رونما ہوا ہے وہ اگرچہ ایک حادثہ ہے، جس نے ہماری زندگی کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے، مگر یہ حادثہ بھی کسی معجزہ سے کم نہیں ہے یہ الفاظ شاعر کی ہمّت اور حوصلہ بندی کی بھرپور نمایندگی کرتے ہیں کہ شاعر بجائے اُداس ہونے یا غم منانے کے اس جدائی پر مسرور ہو کر پر اُمّید ہے کہ جدائی کا عرصہ جلد ختم ہو جائے گا۔ ریاض مجید نے یہاں، جو تجربات اور تاثرات بیان کیے ہیں، اُن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایک خاص رومانی فضا کے باوجود اُنھوں نے غزل کے مقابلے میں نظم ہی کو بہ طورِ سانچہ کیوں منتخب کیا ہے؟ اِس سوال کا، جواب ہمیں ڈاکٹر وزیر آغا سے مل جاتا ہے:

> "نظم بنیادی طور پر تاثرات کے تجزیاتی مطالعے کا ایک وسیلہ ہے اور اِس خاص میدان میں اِس کا کوئی حریف نہیں۔"(۳۷)

ریاض مجید نے اِس نوع کے بہت سے مضامین کو غزل کے بجائے نظم کے قالب میں ڈھالا ہے۔ وہ شعوری طور پر روایتی ڈگر سے ہٹ کر خرام کرتے ہیں۔ نظم میں قائم شدہ یہ فضا ریاض مجید کے ہاں ہی نہیں موجود، اِس باب میں معاصر شعری ادب بھی عمدہ مثالیں پیش کرتا ہے۔ چناں چہ اِس نظم کا خاصہ ہے کہ شاعر اپنے محبوب کی ہمت بندھاتے ہوئے اس کو حوصلہ دیتا ہے اور اس کو کہتا ہے کہ اگرچہ ہم آج ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں تو کیا ہوا؟ تو ان لمحات کا غم نہ کرو اور یوں افسردہ اور غمگین نہ ہو اور اس جدائی پر آنسو نہ بہا۔ یہ کڑا وقت، جو ہم پہ آزمایش بن کر آیا ہے جلد گزر جائے گا۔

شاعر اپنے محبوب کو اُمّید کے جگنو تھماتے ہوئے پُر اُمّید لہجے میں دلاسہ دیتا ہے کہ بیشک ہم جدا ہو رہے ہیں، مگر تو اس دل اور دل میں موجود اپنی مَحبّت پر مشکوک نہ ہو۔ میرے دل میں تیری عزت اور تیرا احترام ہمیشہ قائم و دائم رہے گا۔ تیری مَحبّت میرے لیے زادِ راہ ہے۔ میں کبھی تجھے رسوانہ کروں گا۔ تو میرے خلوص پر مشکوک نہ ہو۔ مجھ سے ڈر مت اور اپنے دل میں یہ اُمّید کا دیا روشن رکھ کہ ہم اک نہ اک روز ضرور مل جائیں گے اور، جو پر مُسرّت چاہت کے لمحات ماضی کا حِصّہ بن چکے ہیں ،وہ ضرور ایک بار پھر ہمارا مقدر ہوں گے۔ یہ پل یہ گھڑیاں، جو کہ بہت کٹھن ہی گزر جائیں گی اور ملن رت ایک بار پھر نئے سرے سے ہماری زندگیوں میں لوٹ آئے گی:

یہ جدائی کی گھڑیاں بھی کٹ جائیں گی

میں اگر آج تجھ سے جدا ہو رہا ہوں، تو کیا؟

دیکھ اِس دل کی تقدیس پر شک نہ کر

یوں نہ ڈر

جاچکی ساعتیں پھر پلٹ آئیں گی (۳۸)

نظم ''آتے موسم سے آنکھیں ملانا گنہ ہے'' کا تجزیاتی مطالعہ:

کہتے ہیں کہ پہلی چاہت انسان کو تاحیات نہیں بھولتی۔ آتی جاتی سانسوں کے ساتھ ساتھ ان یادوں کو ڈوری بندھی رہتی ہے اور یادوں کی آبیاری اس کی بڑھنے اور پھلنے پھولنے میں مددگار ہوتی ہے۔

دنیا میں بہت کم ایسے انسان ہیں، جو یادوں کو سینے سے لگائے ان کے سہارے جیون بتا دیتے ہیں۔ یہ یادیں ہی ان کا سرمایہ حیات ہوتی ہیں۔ اس نظم میں بھی شاعر کُچھ ایسے ہی جذبات کا احساس اجاگر کر رہا ہے۔ شاعر اپنی خالص مَحبّت کو کسی کی امانت کی طرح اپنے سینے سے لگائے چاہت کے جذبات تھے مَحبّت کی خواہش تھی۔ اس کو پورا کر اور صرف محبوب کو یاد کر۔ ریاض مجید اچھّی طرح جانتے ہیں:

''جدید نظم کی امتیازی خصوصیت اُس کا تمثیلی انداز ہے۔''(۳۹)

لہٰذا وہ نظم کے اِس خاصے سے اپنی نظمیہ شاعری میں بھرپور کام لیتے ہیں۔ اُنھوں نے بہت خوب صورتی سے گزشتہ لمحات کا احترام کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے، یہ دل کی قوانین میں سب سے بڑا فرض ہے کہ ان لمحات کو مقدس سمجھتے ہوئے ان کی حفاظت کر، جو پل بیت چکے ہیں وہ چاہے اچھّے تھے یا برے وہ گزر چکے ہیں، لیکن اس گزرے کل کی یاد سکون کا باعث ہے اور ان کا احساس ہی زندگی کے آرام کا سبب ہے۔ حال جس میں آج کل میں جی رہا ہوں، وہ میرے لیے مسلسل دکھ کا باعث ہے۔ میں

اس میں بہت بے چینی اور اضطراب محسوس کرتا ہوں اور آنے والا کل مجھے ڈراتا ہے کہ یہ ماضی میں گزرے تمام حسین لمحات، تمام یادوں کی موت کا پیامبر محسوس ہوتا ہے اور میں اس موت پر آمادہ نہیں اس لیے مستقبل سے آنکھیں دوچار کرنے سے کتراتا ہوں۔ درج بالا فکری عناصر اپنے اندر، جو رومانی فضا کے فروغ کا باعث بن رہے ہیں، اُنھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ ریاض مجید نظم روایت سے متصادم بیانیہ اختیار کر رہے ہیں۔ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہو گا کہ ریاض مجید کی غزل میں پائے جانے والے ایسے فکری عناصر اُنھیں غزل اور گیت کے فکری ڈانڈوں سے ملانے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ورنہ عمومی طور پر تو نظم کی یہ روایت نہیں رہی ہے۔ کیوں کہ ن م راشد کے نزدیک:

> ’’اُردو میں نظم کی تخلیق براہِ راست انگریزی شاعری کے اثرات کا نتیجہ ہے، لیکن یہ ایک حد تک روایت کے خلاف بغاوت کا نتیجہ بھی ہے اور روایت سے زیادہ غزل اور گیت کے خلاف ردّ عمل تھا۔‘‘ (۴۰)

اِس نظم میں پیدا شدہ فضا میں ریاض مجید یہ نہیں جانتے کہ اس کی نگاہوں میں اس کے محبوب کے علاوہ کسی کا چہرہ آباد ہو، وہ اپنی نظروں کو ارد گرد بھٹکنے سے روکتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ بہت نقصان دہ ہے اور محبوب سے بے وفائی کے مترادف ہے۔ شاعر اپنے آپ سے التجا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے میرے دل اور میری بے چین روح موجودہ، جو بے چینیاں لاحق ہیں، ان سے اپنا دامن بچا اور خود کو ان میں گم نہ کر بل کہ خود کو گزرے ہوئے کل میں زندہ رکھ۔ ان بیتے لمحات کو یاد رکھ ان میں خود کو محفوظ تصوّر کرتے ہوئے ماضی میں پڑاؤ ڈالے رکھ اور خوشی محسوس کر۔ ریاض مجید کی زیرِ نظر نظم کے چند مصرعے دیکھیں:

فرداتو ماضی سے وابستہ ہر چیز، ہر یاد ہر رنگ کی موت کا نام ہے

آنکھ کے نت نئے راستوں کی سیّاحت خطرناک ہے

حال کے قہر سے اپنا دامن بچا

بیتے لمحات کے سائے میں...اے مری مضطرب روح!

اپنی پنہ گاہ ڈھونڈ...اور خوش رہ! (۴۱)

نظم ’’کالی رتوں کا معمول‘‘ کا ناقدانہ مطالعہ:

جن انسان کی زندگی میں جدائی کا موسم اپنا ڈیرا جمالیتا ہے، تو اس پر ہر وقت نااُمّیدی اور مایوسی کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ یادیں تلخ اور کڑوی یادیں اس کا مقدر بن جاتی ہیں۔ خوشی اُمّیدی کا اوزن کہیں سے ہوتا نظر نہیں آتا۔ انسان کو ماضی میں گزرے ہوئے حیات بخش لمحات میں جی کر خوشی محسوس ہوتی ہے اور وہ مستقبل اور حال سے نظریں چراتا ہے۔ اس کے شب و

روز اپنے محبوب کی یادوں میں کھوئے ہوئے گزرتے ہیں اور وہ اس عمل میں احساس کو پسندیدہ ترین مشغلہ تصوّر کرتا ہے اور ایسا کر کے وہ اپنے دل کو بہلاتا ہے۔ ریاض مجید اپنی زندگی کے ایک مخصوص ماضی کے جزیرے میں پناہ گزیں دکھائی دیتے ہیں۔ اُنھیں جذباتی سطح پر سہارا دینے کے لیے ہی سہی، لیکن اِس خاص منطقے نے یک گونہ تمانیت ضرور عطا کر رکھی ہے۔ بلراج کومل نے شاید ایسی کیفیتوں کے پیشِ نظر جدید نظم کے باری میں کہا تھا:

"جدید اُردُو نظم میرے نزدیک مختلف انسانی جزیروں میں سے ایک سرسبز جزیرہ ہے۔"(۴۲)

خالی رتوں کا معمول ایک ایسی ہی نظم ہے، جس میں ریاض مجید کا ماضی میں گھر کر آنے والے اچھّے دنوں کے انتظار میں رات دن کا ایک ہی مشغلہ ہے کہ جب رات اپنے پر پھیلاتی ہے، تو رات کی تاریکی آسمان پر ٹمٹاتے ستاروں کو دیکھتا رہتا ہوں۔ ان کی ماہیت پر غور و فکر کرتا رہتا ہوں ستاروں کی گردش کا کھوجتے کھوجتے رات گزر جاتی ہے اور جب دن کا اجالا پھیلتا ہے، تو اپنے ہاتھوں کو اپنے سامنے پھیلا کر ان کی لکیروں کو پڑھتا رہتا ہوں۔ ان پھیلی ہوئی لکیروں میں چھپے بھید اور راز مجھے غور و فکر پر اکساتے ہیں۔ دور میں اسی ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہوں۔ شاعر اس مایوسی کی حالت میں بھی اُمّید کا دیا روشن رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگرچہ نااُمّیدی پوری طرح مجھ پر حاوی ہو چکی ہے اور میں مایوسی کی انتہا پہنچ چکا ہوں، مگر نااُمّیدی اور مایوسی کی اس حالت میں بھی مجھے اُمّید کی ہلکی سی کرن نظر آ رہی ہے اور میں خوش اُمّید ہوں کہ کبھی تو یہ ٹوٹتے ستارے کسی اچھّی خبر کی نوید دیں گے، کبھی تو ان کی گردش یہ بنائے گی کہ اب میری زندگی میں بھی خوشیاں اپنی چھب دکھلائیں گی۔ ستاروں کی چال مجھے آنے والے اچھّے وقت کی خوش خبری دے گی اور کبھی تو ایسا بھی ہو گا کہ جب اپنے ہاتھ کی لکیروں کو کھوجوں تو یہ مہرباں اور سہانے موسم کے آنے کی اطلاع دیں گی اور ابھی، جو میں اُمّیدی اور نااُمّیدی کی راہوں میں بھٹک رہا ہوں مایوسی کے اندھیرے مجھے نگل رہے ہیں اور چوں کہ مایوسی کفر ہے اس لیے میں خوش اُمّید ہوں کہ ان اندھیروں میں جلد ہی گمشدہ سہانہ موسم ایک بار پھر سے اپنی خواہشوں کے سورج کے ساتھ طلوع ہو گا اور میری اندھیری زندگی کو روشن کر دے گا۔ ملاحظہ ہوں:

رات دن ایک ہی شغل ہے

رات ہوتی ہے تو آسماں پر ستاروں کی گردش کا احوال پڑھتا ہوں

دن نکلتا ہے تو اپنے ہاتھوں کی پھیلی لکیروں کے اسرار پر غور کرتا ہوں

نااُمّیدی کی اِس انتہائی گئی گزری حالت میں بھی ایک اُمّید سی ہے (۴۳)

نظم "ایک دعا" کا مطالعہ:

پیار ایک ایسا جذبہ ہے کہ انسان کو سر تا پا بدل دیتا ہے۔ انسان کو اپنا آپ اپنے اختیار میں نہیں رہتا۔ اس کی ہر سوچ ہر خیال حتیٰ کہ سوتے جاگتے میں بھی محبوب اور محبوب کی یادوں کا گزر رہتا ہے۔ ایک طرح سے پیار انسان کو کسی کام کے قابل نہیں چھوڑتا اور اگر پیار کے خوب صورت رستے میں اچانک جدائی کا کالا ناگ سامنے آجائے، تو یہ زہریلا ناگ جیون کی تمام خوشیوں کو ڈس لیتا ہے اور انسان جیتے جی مر جاتا ہے انسان اس دنیا سے کٹ کر رہ جاتا ہے اور انسان اس زہر میں ڈوبے اس کے درد کو برداشت کرتے کرتے ادھ موا ہو جاتا ہے۔ پیار اگر ایک طرف انسان کی زندگی میں خوشی بھرے حسین لمحات لے کر آتا ہے، تو پھر یہی پیار کبھی کبھی انسان کے لیے آزمایش بن جاتا ہے اور انسان اس امتحان سے کامیاب گزر جانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے، مگر یہ کوششیں تمام بے کار ہوتی ہیں اور اکثر انسان اس آزمایش میں اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کی برداشت کی قوت، جواب دے جاتی ہے اور وہ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتا ہے اور خدا سے گلے شکوے کرنے لگتا ہے۔

"ایک دعا" نظم ایک ایسی نظم ہے، جو کہ شاعر کی اس ذہنی حالت کی غمازی کرتی ہے۔ جب انسان آزمایش کی گھڑیوں سے تنگ آ چکا ہوتا ہے اور وہ اس آزمایش کا خاتمہ چاہتا ہے۔ شاعر بھی آزمایش کے ان لمحات کے اختتام کے لیے دعا کرتا اور وہ چاہتا ہے کہ اب اس کے دل کو چین وسکون حاصل ہو جائے اور وہ، جو متضادی کیفیتوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس سے چھٹکارا حاصل کر لے، جب انسان اپنے محبوب سے بچھڑ جاتا ہے تو اس کے ملن کی دعائیں ہر وقت اس کے لبوں پہ جاری رہتی ہیں۔ محبوب کی جدائی انسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتی انسان محفل میں بیٹھا ہوا بھی خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ اسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ محبوب کی یادیں ہی اسکے لیے سرمایہ حیات ہوتی ہیں اور وہ ان یادوں میں کھو کر خوشی محسوس کرتا ہے، مگر بعض اوقات انسان ان یادوں میں رہتے رہتے بہت بے بسی محسوس کرتا ہے اور وہ اپنی زندگی میں سکون کی خواہش کرنے لگتا ہے وہ آر یا پار کوئی ایک فیصلہ چاہتا ہے۔ شاعر نے خود کو یہاں ماضی سے گہری وابستگی کی وجہ سے اُن خاص لمحوں کے لیے مقید کرتے ہوئے ایک طرح کا دعائیہ پیش کیا ہے، جو اُس کے جذبات کا حاصل دکھائی دے رہا ہے۔ ریاض مجید جدید نظم کے ماضی میں بود وباش اختیار کرتے ہوئے ایک غیر انسانی منطقے کے امکان کا شعوری طور پر سراغ لگا رہے ہیں، جس کا بہ ظاہر قاری کو بالکل اندازہ نہیں ہو پاتا اور وہ ریاض مجید کی ایسی نظموں کو ماضی کی حسین یادوں کا مُرقّع سمجھتے ہوئے لطف اندازہوتا ہے، حال آں کہ جدید نظم کے حوالے سے بات اِس سے بھی کہیں آگے کی ہے، جیلانی کامران نے ٹھیک کہا تھا:

> "نئی نظم کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اِس میں انسانی منطقے، غیر انسانی منطقوں کے تابع ہیں۔"(۴۴)

ریاض مجید نے انسانی منطقے کے ماضی میں رہتے ہوئے، غیر انسانی منطقے میں دعائیہ پیش کیا ہے۔ چناں چہ وہ التجا کرتے ہیں کہ ان آزمایش بھرے وقت میں میرے دل کی گہرائیوں سے، جو دعا لب پہ آتی ہے بس یہی ہے کہ اے میرے پروردگار!

اگر میرا میرے محبوب سے ملنا میرے لیے بہتر ہے تو اے خدا مجھے میرے محبوب سے ملا دے میری حالت پر رحم کر۔ مجھے اس آزمایش سے نجات دلا اور بے شک یارب العالمین تو بہتر جانتا ہے کہ انسان کے لیے کیا بہتر ہے اور اگر میرا میرے محبوب سے ملنا ٹھیک نہیں تو پھر اے خدا! تو میرے دل سے اس کی طلب اس کی آرزو کو مٹا دے۔ میرے دل میں ایسے احساسات پیدا کر دے کہ میں اس کے حق سے دستبردار ہو جاؤں اس کو بھلا دوں کیوں کہ میرے دل کا بیک وقت دو مختلف سوچوں کے ساتھ جینا بہت مشکل ہے۔ میں کبھی محبوب سے ملن کی آس میں جیتا ہوں اور کبھی تازگی قائم رہنے والی اس جدائی کی سوچ کو میری سانسیں تھم سی جاتی ہیں اور میری زندگی کی یہ کیفیت میرے لیے موت کے مترادف ہے۔ اس لیے میرے مولا مجھے اس مشکل سے نجات دلا دے میرے دل کو سکون دے دے:

"خدایا.....

مرا اُس سے ملنا مرے حق میں بہتر ہے تو مجھ کو اُس سے ملا دے

وگرنہ...

مرے دل سے اُس کی تمنا مٹا دے

بیک وقت احساس کی مختلف اور متضاد سطحوں پہ جینا تو میرے لیے موت ہے" (۴۵)

نظم "بے ہدف" کا تجزیاتی مطالعہ:

انسان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے، جس کو مد نظر رکھتے ہوئے انسان اپنی زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور اکثر خوش نصیبوں کو حسبِ منشا نتائج ضرور ملتے ہیں، مگر کچھ لوگ قسمت کے بھنور میں کچھ اس طرح پھنسے ہوتے ہیں کہ ان کی تمام کاوشیں بار آور ثابت نہیں ہوتیں۔ وہ زندگی سے مایوس ہو جاتے ہیں اور خود کو ایک بوجھ تصوّر کرتے ہیں، اُنھیں اپنی زندگی اور جینے کا کوئی جواز نہیں ملتا۔ وہ اپنے وجود کو بے مقصد اور لایعنی تصوّر کرتے ہیں۔

جب کسی انسان کی زندگی میں محبّت کا در وا ہوتا ہے، تو اس کے نرم نرم جھونکوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے، وہ اپنے سامنے ایک خاص مقصدِ زندگی متعیّن کر لیتا ہے اور اس کے حُصُول کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے، لیکن جب ناکامی کا سامنا ہوتا ہے تو آتی جاتی سانسوں کو بے معنی تصوّر کرتا ہے۔ ریاض مجید کی یہ نظم ایک طرح سے اُن نظموں کی نمایندہ ہے، جس میں خیال کی بے ربطی ایک خاص جذباتی کیفیت کے زیرِ اثر رونما ہو جاتی ہے۔ ایسی نظمیں ایک خاص رومانی فضا تو پروان چڑھانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں، لیکن اُن میں پائے جانے والی ایک کمی یہ رہ جاتی ہے:

"ایسی نظموں میں الفاظ، نقوش اور خیالات الگ الگ اہمیت، تو رکھتے ہیں، لیکن اُن کی باہم آمیزش سے ایک نقشِ کل کسی طرح صورت پذیر نہیں ہو پاتا۔"(۴۶)

"بے معدف" بھی ایک ایسی نظم ہے، جس میں شاعر نے خیالات کے ایک خاص معنوی ربط کی کوشش کی ہے، لیکن اُس سے ابھرنے والا نقش ایک وحدت کا تاثر نہیں رکھتا۔ یہ بات درست ہے کہ شاعر اپنے محبوب کے نہ ہونے کے باعث خود کو وجود کو ناکارہ نہیں نظر آتا۔ جیسا کہ شاعر بیان کرتا ہے کہ میں حیران ہوں کہ میرا محبوب، جو کہ میری زندگی کا اوّلین خواب ہے اور جس کے پورے ہونے کی میں ہر پل ہر ساعت دعائیں مانگتا ہوں، لیکن شاید میری دعاؤں میں اثر نہیں ہے، جو کہ وہ مجھے مل نہیں پایا۔ میں اس وقت بے بسی کی انتہا پہ پہنچ کر یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ جب وہ میری زندگی میں نہیں ہے تو پھر بھلا یہ دل کیوں دھڑک دھڑک کر اپنے ہونے کا ثبوت دیتا ہے اور جو میں سمجھتا تھا کہ اگر وہ مجھے نہ مل پایا تو میری سانسیں تھم جائیں گی، مگر ایسا بھی نہ ہو سکا میں سانسوں کی آمد و رفت پر حیران ہوتا ہوں کہ یہ کس لیے اب تک چل رہی ہیں اور میری نبض بھی محوِ حرکت ہے۔ جسم میں خون کی گردش بھی رواں دواں ہیں، جس پر میں حیران اور پریشان ہوں کہ یہ سب کیسے ممکن ہے ،جب کہ وہ تو اب میری زندگی میں شامل نہیں ہے۔

شاعر نے خود کو، جو مصروف رکھنے کے لیے شعر و شاعری کی دنیا میں گم کر رکھا ہے وہاں سے بھی اکتا گیا ہے اور کہتا ہے کہ میں کس کی خاطر شب و روز ان بے جان لفظوں سے کھیلتا ہوں اور ان کے مطلب ڈھونڈنے کی کوشش میں ،جو نت نئے تجربات مجھے حاصل ہوتے ہیں، جو نئے نئے جذبات اور احساسات مجھ پر آشکار ہوتے ہیں وہ میرے لیے کسی سزا سے کم نہیں ہیں یہ سب کتابوں کی دنیا، جس کے لیے ہے، وہ کہیں نہیں ہے تو جینے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی اور اگر پھر بھی میری زندگی کی کوئی شے ،جو کہ صرف مجھ سے جڑی ہوئی ہے وہ دنیا میں کہیں ہے تو کہاں ہے ؟اور کیا ہے؟ اس کی نوعیت کیا ہے؟ کیا مقصد ہو سکتا ہے اب تک جیے جانے کا؟ صبح سے شام ہو جاتی ہے اور میں کسی بے منزل مسافت کی جانب گامزن رہتا ہوں میرے پاؤں اس سفر میں چل چل کر سال ہو چکے ہیں۔ نہ جانے مجھے یہ سزا کیوں جھیلنی پڑ رہی ہے۔ جب کوئی مقصدِ حیات ہی نہیں ہے تو کوئی محور کوئی مرکز کوئی سنگِ میل کچھ بھی تو نہیں ہے، جب اتنی بڑی کائنات میں اس کے سوا میرے لیے کچھ بھی نہیں ہے تو پھر یہ سب سلسلے کس لیے ہیں کیوں میں جیے جا رہا ہوں؟ اس سب کی وجہ سے میں صرف اور صرف حیران ہوں۔ درج بالا کیفیات کا شعری اظہار یہ ملاحظہ ہو:

اگر اُس کے سوا میرے سے وابستہ کوئی شے ہے تو وہ کیا ہے؟
سحر سے شام تک پاؤں کو یوں بے سود چلنے کی سزا کیوں دی گئی ہے؟
کوئی محور... کوئی مرکز...
اگر اس کے سوا میرے لیے اتنی بڑی دنیا کے اندر کچھ نہیں ہے تو یہ

سارے سلسلے کس کے لیے ہیں؟ (۴۷)

نظم "حنابندی کی رات" کا مطالعہ:

انسان کی زندگی میں بعض لمحات اور گھڑیاں ایسی آتی ہیں کہ اس کو اپنے اندر کا غم اور اُداسی چھپا کر خود پر ہنسی وخوشی کا خول چڑھانا پڑتا ہے اور ایسا وقت انسان کے لیے کسی امتحان سے کم نہیں ہوتا۔ دل کے درد کو چھپانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

"حنابندی کی رات" ایک ایسی نظم ہے، جس میں شاعر اپنے غم و درد دل کو چھپا کر اپنے محبوب کی خوشیوں میں شریک ہے اور اس کی خوشیوں اور مُسرّتوں کے لیے دعا گو ہے۔ اگرچہ دل میں درد کی لہریں ابھر رہی ہیں، مگر پھر بھی وہ اپنے احساسات کو چھپا کر خود کو اس ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں مصروف عمل ہے۔ شاعر اپنے محبوب کی ہم، جولیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتا ہے کہ اے میری منظورِ نظر کی سہیلیو! آؤ سب مل کر اسے سجاؤ اسے دلہن بناؤ، اسے سنوارو، اپنے ہاتھوں سے اس کے خوب صورت چہرے کو سجاؤ اور اس کے گالوں کے ارد گرد بالوں کی لٹوں بناؤ کہ میرا محبوب اس روپ میں بہت دل کش دکھائی دیتا ہے اور اسے گلاب کی خُوش بُو لگاؤ، جو کہیں بھی کسی نے نہ لگائی ہو، لیکن پھر شاعر یہ بھی کہتا ہے کہ اسے اس روپ میں دیکھنا بہت دکھ کا باعث ہے۔ جب اسے اس روپ میں دیکھوں گا تو میرا دل درد کی شدّت سے ڈوب ڈوب جائے گا اور یہ درد برداشت کرنا بہت دشوار ترین ہے کہ اسے کسی ان دیکھے اجنبی کے لیے سجایا جائے گا، جو کہ اس کا ہم سفر بن جائے گا۔ ہم اس کی دلہن بنائیں گے اور کوئی اجنبی آئے گا سات سمندر پار سے اور ہمارے چاند جیسی خوب صورت دلہن اس کے نام ہو جائے گی اور ہم اس کا ہاتھ اس اجنبی کے ہاتھ میں تھما جائیں گے اور یہ منظر ہمارے لیے موت کے مترادف ہے اور پھر ہم آنکھ میں آنسو لیے اور دل میں درد لیے اپنے قبرستان جیسے اُداس اور ویران گھر کو واپس لوٹ آئیں گے اور پھر تمام عمر اُنھیں لمحات میں جیے جائیں گے اور محبوب کی یادیں ہماری ہم زاد ہوں گی۔ ہم ان یادوں کے آتے ہی زار زار روئیں گے اور یہ تڑپ تڑپ کر رونا ہماری زندگی کا حِصّہ بن جائے گا، مگر اس سب کے باوجود پھر بھی ہم اپنے محبوب کے لیے، جو کہ کبھی ہمارا سب کُچھ تھا اور اب کُچھ بھی نہیں ہے اس کی دائمی خوشیوں کے لیے دعا گو رہیں گے کہ یہی ہماری زندگی کا، جواز ہو گا۔ چند شعری مثالیں دیکھیے:

اور جب وہ دور نیل ساحلوں کی سرزمیں سے آئے

تو ہم اپنی چاند سی دُلہن کا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں تھمائیں

اور پھر...

اشک آنکھ میں بھرے

ہم اپنے (قبر سے اُداس) گھر کو لوٹ آئیں

اور ساری عمر پھوٹ پھوٹ کے، بلک بلک کے روئیں

اُس کو جو (ہمارا ہے... مگر ہمارا کچھ نہیں ہے) دیں

مُسرّتوں کی دائمی دعائیں! (۴۸)

نظم" آج پھر چاند کی گیارھویں ہے" کا تجزیاتی مطالعہ:

ریاض مجید کے ہاں تخلیقی وفور کی کمی نہیں ہے۔ ان کی تخلیقات میں جدّتِ مضامین اور نیرنگی خیال کی گل کاریاں جابجا نظر آتی ہیں۔ نئے موضوعات ان کی شاعری کا ہمہ گیر پہلو اجاگر کرتے ہیں اور اُنھیں اپنے عہد سے جڑا ہوا شاعر ثابت کرتے ہیں۔ ریاض مجید نے " انتساب" کی نظموں میں بھی جدید موضوعات کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ ان میں پرانے خیالات سے لے کر آج کے دور کے انسانی مسائل اور معاشرتی کرب کے نوحوں کی بازگشت سبھی شامل ہیں۔ ان کے ہاں ماضی کی حسین یادیں بھی ہیں، جنھیں نثایا گیا ہے اور مستقبل کی پر جمال پشین گوئیاں بھی ہیں۔ ان کا یہ سفر ایک سیاح کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے کیوں کہ یہ متخلیہ کا سفر خُوش بُو کا سفر ہے، جس کے تخلیقی پسِ منظر میں، جو سب سے نمایاں، جو ازیا تحریک دکھائی دیتی ہے، وہ فقط حُصُولِ مُسرّت اور روح کی شگفتگی کا اکتساب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بعض نظموں میں ایک شاعر کی تیز باصرہ اور ایک فن کار کی متخیلہ کی باہم آمیزش اور امتزاجی صورت نظر آتی ہے۔ ریاضؔ مجید نے "انتساب" کی نظموں کو اپنی ذات کی داخلی اور جذباتی واردات بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کے ہر ہر لفظ میں نہ صرف یہ کہ ان کی ذات کے لمس کی خُوش بُو کا احساس ہوتا ہے بل کہ وہ خود کو قاری کو نظم کی داخلی فضا میں مبتلا کر لیتے ہیں۔ اور یہی وصف ان کے اُسلُوبِ بیان کو تر و تازگی اور شگفتگی سے ہم کنار کرتا ہے، وہ خارجی ماحول کو داخلی واردات کے لمس اور داخلیت کے مناظر سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی مناظری جزئیات میں بھی ان کی ذات کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے جدید ڈکشن کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے اور زُبان و بیان کے نئے ذائقوں سے اپنی شاعری کو آشنا کیا ہے۔ یہی ان کی وسیع المشربی کا ثبوت ہے کہ وہ تمام عمر ایک ہی روش پر چلتے ہوئے ایک ہی اسلوب سے چمٹے نہیں رہے، بل کہ اپنے اُسلُوب کی زیریں تہہ میں جہاں ان کے اندر کا ریاض مجید رہتا ہے، وہاں مافی الضمیر میں بیٹھ کر اپنی شاعری کے ذیلی اُسلُوب کو موہوم زمانی تبدلات سے آشنا کیا ہے۔ جدید شاعری کے متغیر مزاج اور بھرے ہوئے تیوروں کو دیکھ کر اُنھوں نے بھی اپنی شاعری کے تیور بدلے ہیں اور اظہار کے نئے ذائقے تخلیق کیے ہیں۔ ان کی نظمیں نہایت آسان اور عسیر الفہم ہیں۔ یہی چلن جدید اُردُو نظم کا بھی ہے۔ یہاں ہمیں آل احمد سرور کی یہ بات ایک بنیادی اُصول دکھائی دیتی ہے کہ اُنھوں نے آزاد نظم کی فنی پابندیوں اور فکری ذمّے داریوں کے بارے میں کہا تھا:

"آزاد نظم فن کے قیود سے آزادی کا نام نہیں بل کہ فن کے ساتھ ایک تازہ اور دوسروں سے زیادہ گہری وفاداری کا نام ہے۔ یہ چند معمولی قیود سے آزادی اِس لیے حاصل کرتی ہے کہ بعض گہری ذمّے داریوں سے عہدہ برا ہو سکے۔"(۴۹)

ریاض مجید کی نظم کے موضوعات انتہائی تازہ اور نادر ہیں۔ وہ ذات کا کرب اگر بیان کرتے ہیں، تو ایک نئے سماجی اور عمرانی شعور کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور ان کے ہاں جذباتی صداقت موجود رہتی ہے۔ نظم کے جدید لب و لہجے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ہجر کی رات کا اگر اُنھوں نے قِصّہ نظم کیا ہے، تو وہ بھی ایک نئے انداز میں کیا ہے۔ ''آج پھر چاند کی گیارھویں ہے'' شاعر کے ناسٹلجیاتی ذہن کی عکاس ہے:

آج کی رات پھر جانے کے مُرتّبہ دل کسی جاچکی چاند کی گیارھویں رات کا قِصّہ دہرائے گا؟

جو ابھی تک مرے واسطے اک معمے کی مانند ہیں

ان پُر اسرار یادوں میں کھو جائے گا

رات بھر گزرے لمحات یاد آئیں گے

بے ثمر آرزوؤں کے دکھ تازہ ہو جائیں گے

صبح تک ہر گیا واقعہ میرے سینے میں اپنی اذیت کا خنجر چبھو جائے گا (۵۰)

نظم کا موضوع ہجر و فراق ہے، مگر لہجہ کیسا فرحت افزا ہے گویا کوئی رومانی خیال پیش کیا جارہا ہو اا اور وصل لمحوں کی مُسرّتوں کا اظہار کیا جاتا ہو۔ '' انتساب'' کا یہی نیا ذائقۂ اظہار جا بجا ہمیں ملتا ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ شاعر نے اُردُو شاعری کے بدلتے ہوئے لب و لہجے کو بھانپ کر اپنی شاعری کے اظہاریے علیٰ وجہ البصیرت بدل دیے ہیں۔ اُردُو نظم نے ارتقا کی کئی منزلیں طے کی ہیں اور اس میں کئی زمانوی مبدلات آئے ہیں۔ ریاض مجید کے ہاں نظم متنوع اور ہمہ گیر ہے، اُنھوں نے جدید موضوعات کو بہ آسانی اس میں پیش کیا ہے۔

نظم'' بعد از وقت'' کا ناقدانہ جائزہ:

''انتساب'' میں مضامینِ نو کا ایک جہان آباد کیا ہے۔ ادب میں محض برائے بحث اور الجھاؤ کے لیے چلائی گئی، نام نہاد جدید تحریکوں کے خلاف ردِ عمل کو جس خوب صورتی کے ساتھ اُنھوں نے نظموں میں پیش کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ ایسا مدلل اندازِ بیان اختیار کیا ہے، جو واقعی بڑا جاندار نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں ردِ عمل کی لہر خفیف انداز کی ہے۔ وہ اپنے شعری برتاؤ میں تہذیب اور شائستگی کو شامل کرتے ہیں۔ کرب آگہی اور اظہار کی آزادی تخلیقی انسان کے ساتھ ایک اہم مسئلے کے طور پر رہے ہیں اور رہیں گے۔ جب شاعر کے بدن میں خونِ اظہار کے راستوں کا مطالبہ کر رہا تھا، تو اس وقت مصلحت آمیز سوچ پاؤں کی زنجیر نہ بن سکی اور شاعر کے دل میں، جو آیا اس نے کہہ دیا۔ ڈاکٹر انور سدید ریاض مجید کی ''انتساب'' کی نظموں کے بارے میں رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"ریاض مجید نے "انتساب"میں حرف و صوت کا کوئی محیّر العقول معجزہ رونما کرنے اور تخلیق کو خوب صورت ، مگر بے جان لفظوں میں سمیٹنے کی کوشش نہیں کی بل کہ اس کتاب میں وہ ایک ایسی مجسّم آنکھ بن گیا ہے ، جو احساس وزیاں پر مسلسل اشکبار نے اور روح پر پڑے ہوئے بوجھ کو آنسوؤں میں تحلیل کر رہی ہے۔"(۵۱)

ریاض مجید نے آخر کار پیرایۂ اظہار میں مصلحت آمیز لب و لہجہ اپنالیا، کیوں کہ اُن کے پاس اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ یہ پچھتاوا وقت گزرنے کے بعد ہو رہا ہے کہ پہلے پہل شعری اظہار کے لمحوں میں مصلحت آمیز سوچ پاؤں کی زنجیر بنی ہوتی۔ آزادیِ اظہار رائے اور کربِ آگہی دونوں کی ممزوجہ صورت گری اس سے بہتر کسی اور شاعر نے نہیں کی۔ ملاحظہ کیجیے:

سوچ کیوں نہ مرے پاؤں کی زنجیر بنی؟

راستے کیوں کر نہ مرے واسطے مسدود ہوئے؟

آسماں کیوں نہ گرا۔۔۔اور زمیں کیوں نہ پھٹی؟

موت ہی زخم تمنا کا مداوا تھی تو کیوں مر نہ گیا؟

آج کیوں سوچ مرے پاؤں کی زنجیر بنی جاتی ہے؟

آج کیوں راستے مسدود ہوئے جاتے ہیں؟ (۵۲)

ریاض مجید کے ہاں بہت سے موضوعات نثر کا احاطہ کرتے ہیں، لیکن ان کو اس انداز سے برتا گیا ہے کہ وہ شعر میں آکر اس کا جُزِ بدن بن گئے ہیں۔ کسی واقعے کو قلم بند کرنے سے قبل اس کی تفاصیل کو نثری صورت میں دینا ایک مستحسن قدم ہے۔ یہاں قاری کی دل چسپی کا مکمل سامان موجود ہوتا ہے۔ نثر کی شگفتگی اور اس کی تر و تازگی سے قاری کی طبیعت بشاش ہو جاتی ہے اور وہ بیک وقت خشکی اور پانی کے سفر کے عواقب و عوارضات سے دوچار ہو کر مُسرّت کشید کرتا ہے۔ اس طرح بوریت کا احساس بہت کم ہوتا ہے اور وہ نہایت آسانی کے ساتھ شاعری کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور پھر شاعری سے نثر کی طرف اس کی دل چسپی بڑھتی ہے۔ اس کا یہ دوگونہ سفر لذّت افزا ہو جاتا ہے۔ یہ نظم کس قدر فکر انگیز ہے۔ کم از کم ان کے لیے ایک انتباہ کی حیثیت رکھتی ہے، جو حیات کے نادیدہ راستوں کے ناتجربہ کار مسافر ہیں اور جن کا مستقبل ابھی تشکیل کے مراحل میں ہے۔

"کیسے کہوں، کسے کہوں" کیا ادب فقط معاشرتی ناہمواریوں کے اظہار کا نام ہے؟ کیا نظم اس وقت تشکیل پذیر ہوتی ہے، جب کوئی معاشرتی ناآسودگی ایک کربناک احساس کی صورت میں سامنے آتی ہے؟ کیا ادب جذباتی جمالیات کے مجلیٰ شبدوں کا اظہاریہ نہیں بن سکتا؟ کیا جذبی جمالیات کرب آگہی کی کا نوحہ بن کر شاعر کے کلام کا جُزلاینفک نہیں سکتا؟ کیا سماجی ناہمواری کو درونِ باطن کی نفسیاتی کش مکش کا نام نہیں دیا جا سکتا؟ کیا نظم اپنے خالق کے لاشعور کی آواز نہیں بن سکتی؟ کیا نظم

جذبات سے تہی ہو سکتی ہے؟ کیا نظم شاعرانہ حسیت کے بغیر اپنا قالب متشکل کر سکتی ہے؟ حاشاً وکلا۔ ریاض مجید جدید اُردو نظم میں کار فرما سماجی شعور اور اُس سے پیدا شدہ کرب وابتلا کے اُسلوب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"جدید اُردو نظم معاشرتی احساس سے زیادہ ذاتی کرب وبلا اور مبتلاے آلام کے کم وکیف کو سماجی سوز وگداز کی سروں میں پروتی ہے۔ یہ اُسلوبِ بیان ذاتی کرب وبلا کے مطلق اظہاریے کا نمایندہ نہیں بل کہ اس میں سماجی شعور کی زیریں تہہ ساتھ ساتھ چلتی ہے، مگر جذبات کی رو میں رہ کر ایک معتدل اور متداول انداز میں کہ حشو وزوائد کا احساس نہیں ہوتا۔" (۵۳)

ریاض مجید کی اکثر نظموں میں جذبات و احساسات کے ساتھ سماجی شعور اور اس کے ممکنہ بیانیوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کا انداز جدید اُردو نظم سے قریب تر ہے۔ "کیسے کہوں، کسے کہوں" کے عنوان سے زیرِ مطالعہ نظم اسی قبیل کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کیسے کہوں، کسے کہوں، کس کے لیے اُداس ہیں؟

میرے بجھے بجھے سے دن، میری تھکی تھکی سی عمر!

کیسے کہوں کہ کیا تھا وہ، جو مرے غم کی جان تھا

فاصلے دور لے گئے جس کے بدن کی نعمتیں

کس سے کہوں وہ کون تھا جس کے بدن کی چاند رات

میرے لیے نہ تھی، مگر میری طلب کی روح تھی! (۵۴)

زیست کے زنداں خانے کی اذیتوں کو جس کربناک صورت میں ایک حقیقت پسند شاعر بیان کرتا ہے وہ بیانیہ بعض اوقات تلخ لب ولہجے میں ڈھل جاتا ہے، لیکن جس انداز سے ریاض مجید نے بیان کیا ہے وہ تلخیٔ حیات کو معروضی تلازموں کے ساتھ، جوڑنے کے باوجود ایک نشاط آور کم وکیف میں پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں اور یہی اس نظم کی کامیابی ہے۔

نظم "دہشت زدہ خواہش" کا جائزہ:

یہ نظم ہمارے سماج کے اس رخ کو پیش کرتی ہے، جو نام نہاد رسوم ورواج اور تہذیبی حد بندیوں میں انسانی جذبات و احساسات کو مقید کرتا ہے۔ نارسائی اور ناآسودگی کی ایک داستان، جو صدیوں سے اَن کہی ہے اور صدیوں سے ان سنی ہے۔ جبر و کراہ کے لمحات کا، جو خوف اور جس محبوس فضا میں سانس لینے پر مجبور کیا جا رہا ہے وہ انتہائی غیر فطری ہونے کے ساتھ ساتھ آزادیٔ اظہارِ رائے پر پابندی کے مترادف بھی ہے۔ روزِ اوّل سے لے کر آج تک انسانی المیہ ہی ایک ہے کہ نہ بات سنی جاتی ہے نہ بات کہنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کن جبر کے لمحوں میں ہوا سامنا تیرا؟

ڈر ڈر کے ترے قرب کا ارمان کیا ہے!

کب تک کٹے ہاتھوں سے لکھیں گے تجھے مکتوب

کب تک بندھے پاؤں سے تری سمت بڑھیں گے

ماحول سے سہمی ہوئی دہشت زدہ خواہش

کیا پھولے پھلے، نشو و نما کیسے ہو اس کی؟ (۵۵)

لفظ" ماحول" خارجی عوامل کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔یعنی وہ خارجی عوامل جن کی وجہ سے شاعر کے ذہن میں خوف اور دہشت کا تصوُّر پیدا ہوا ہے۔ایسے ماحول میں خواہشات کیسے پنپ سکتی ہیں، جس میں دہشت اور خوف کی فضا چھائی ہوئی ہو؟ یہ برائے نام آزادی پر ایک طرح سے گہرا طنز بھی ہے۔

یہ نظم کس قدر طنز آمیز لہجے میں وضع دار شہر کے نام نہاد مہذب حکمرانوں کے پیدا کردہ حالات کا مذاق اڑاتی ہے اور اُنھیں حدِ اعتدال میں رہنے کی طرف متوجُّہ کرتی ہے۔ریاض مجید کے ہاں محبوس صورتِ حال کے حقیقت پسندانہ اظہار موجود ہے، مگر ان کے ہاں روایت شکنی اور بے جا طور پر بے ڈھنگی وضع قطع اختیار کر کے اپنے آپ کو جدید یا ترقّی پسند کہلانے کا شوق نہیں ہے۔نہ ان کے ہاں اس امر کا کوئی سراغ ملتا ہے کہ وہ محض شہرت کمانے کے لیے اور گمنامی کے قعر سے نکلنے کے لیے تجدّد پسندوں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ریاض مجید تو ایسا شاعر ہے، جس کے شعری مجموعوں میں سے بیشتر کے مقدمے تک نہیں ہیں اور نہ ہی اُنھوں نے کسی اور شاعر، نقاد یا ادیب سے آرا لکھوا کر اپنے شعری مجموعوں کی زینت بنانے کی کوشش کی ہے۔وہ انقلاب کے حامی ہیں، مگر ایسا انقلاب، جو بے سروپا نہ ہو اور قواعد واُصولوں کے تابع ہو اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ حدِ اعتدال بھی قائم رہے۔اعتدال کی رسی کو تھامے رہنے میں ہی عافیت ہے۔وہ طرزِ کہن پر بھی نہیں اڑتے اور پچھلی وضعِ شعری اور اصنافِ شعری کے ساتھ چمٹے رہنے کو گوشۂ عافیت نہیں سمجھتے۔ان کے ہاں جدیدیت کا پختہ شعور موجود ہے۔

وہ تو خود اسی نظریے پر ایمان رکھتے ہیں کہ پچھلی وضع کو چھوڑ کر اور اعتدال کی رسی کو تھام کر اپنے آپ کو بدل دینا ہی اصل انقلاب ہے۔ان کی اگلی نظم "بدن کا مرثیہ" ملاحظہ کیجیے جس میں اُنھوں نے ادب میں طرزِ کہن پر اڑنے والے رُجعتی شعرا کی تردید کی ہے۔وہ نئی ہئیتوں اور نئی تکنیکوں کو شاعری میں آزما کر اُنھیں اعتبار بخشنے کے حق میں ہے اور اس معاملے میں وہ اظہار کے ذائقوں کو بدلنے اور طرزِ کُہن پر نہ اڑے رہنے پر ایمان رکھتا ہے۔اس کی یہ مختصر سی نثم جس کا عنوان بھی " نثم کے دفاع میں" ہے، اس پر دال ہے۔

نظم "بدن کا مرثیہ" کا ناقدانہ مطالعہ:

بقولِ غالب انسان کے ہونے کا غم ہی سب سے بڑا غم ہے۔ ہست نیست سے بڑا غم ہے۔ ہست نیست سے بڑا بوجھ ہے۔" بدن" کا مرثیہ انسان کی کائناتی تنہائی کا وہ نوحہ ہے، جسے وہ روزِ ازل سے ہی لکھنے کی کوشش میں ہے۔ یہ امر مبنی بر حقیقت ہے کہ :

"اُردو شاعری میں مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ شاعر کی شخصیت کے اظہار کے لیے زیادہ گنجایش نہیں چھوڑتے۔"(۵۶)

ریاض مجید نے بدن کے مرثیے میں اپنے شخصی اظہار کے لیے، جو امکانات تلاش کیے ہیں، وہ یقیناً قابل داد ہیں۔ اگر بہ غور مطالعہ کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی تمام جہات انسانی تسخیر کی منتظر ہیں اور انسان اپنے جیسے ہم جنسوں کی کھوج میں مصروف ہے۔ یہ تشنگی کا احساس انسانی ذات کی عدم تکمیل اور اس کے استکمالِ ذات کے وقوع پذیر نہ ہونے کا غماز ہے۔ ریاض مجید نے انسان کے بدنی قالب و بہروپ کی اسی عدم تکمیل کو اس نظم میں پیش کیا ہے۔ اس نظم کا کینوس آفاقی ہے:

کس نے لکھا، لکھے گا کون میرے بدن کا مرثیہ

گذری رتوں نے کیا دیا آتی رتوں سے کیا اُمّید

دل کی جوان موت پر پہنے سیہ لباس کون؟

میری کہانیاں لکھیں، کس کی شفیق انگلیاں

کون سے نیک دل کا ہاتھ مجھ پہ قلم اٹھائے گا؟

بانجھ زمیں کی خاک پر پھیلا ہوا لہو ہوں میں

میرے نصیب میں نہیں پھول رتوں کے معجزے

(کون سمجھ سکے مری حسرت دل کا المیہ) (۵۷)

قوسین میں دیا گیا مصرع شاعر کے داخلی رجحانات کی عکاسی کرتا ہے اور اس کے اندرونی کرب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ نظم پرانے خیالات کی نئی زمانی و مکانی آگہی و احساس میں لپٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے کیوں کہ بدن جب سے ہے بدن کا کرب بھی تب سے انسان کو لاحق ہے، مگر اس کرب و بلا کی اذیت ناکی کو کم کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ وہ اس وجہ سے بھی کہ بدن کا کرب تو چلو لذات و خواہشات کی آسودگی کم کر سکتی ہیں، لیکن اس آگہی کا کیا کیجیے، جو بڑھتی ہے تو کربناک بن جاتی ہے۔ یہی آگہی ایک نعمت بھی ہے اور ایک زحمت بھی ثابت ہوتی ہے۔ نظم نئے لب و لہجے کی حامل ہے۔ اس میں ایک فکرِ تازہ کی نئی جہت ہے، جو پڑھنے والے کی طبیعت کو شگفتہ کر دیتی ہے۔ ایک جدید احساس اور ایک نیا اُسلوبِ بیان ہے جس کی خُوش بُو بھینی بھینی

اور تیز تیز بھی ہے۔اس نظم میں قدیم وجدید خیالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ذات کی آگہی کے بابت خوب صورت خیالات کی گونج اس نظم کے دوسرے حصے کا خاصہ ہے۔انسان اگر اپنی ذات کو پہچان لے تو وہ کائنات کے اسرار ور مُوز کو پہچان سکتا ہے ۔یہ ایک قدیم تصوُّر بھی ہے کہ انسان کی ذات میں ہی در اصل کائنات کی پہچان مضمر ہے۔''من عرفہ نفسہُ فقد عرفہ ربہُ'' ایک مشہور مقولہ ہے، جس کی جڑیں اسلامی دینیات میں پیوستہ ہیں۔اسی طرح سے آج کی سائنس کی دنیانے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کے اندر در اصل کائنات کے اسرار ورموز پوشیدہ ہیں اور اس کا باطن کائنات کے خارج سے بھی زیادہ گنجلک اور پیچیدہ ہے، مگر یہاں ذات کو پہچاننے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کی تلاش کا مسئلہ بھی بیان کیا گیا ہے۔یہ احساسِ رائیگانی اور یہ احساسِ جستجو بانجھ زمین کی خاک پر پھیلا ہوالہو تو کبھی خاک پر اک نقشِ پا معلوم ہوتا ہے:

کس کی تلاش تھی مجھے ؟یہ بھی خبر نہ ہو سکی

کون تھاجان سے عزیز یہ بھی نہ بھید کھل سکا ؟

میری گلی کی خاک پر ایک بھی نقشِ پا نہیں

کس سے کہوں مرے لیے سب کالہو سفید تھا (۵۸)

لہو کا سفید ہونا رشتوں میں احساس وخلوص کے رخصت ہونے کی طرف اشارہ ہے۔اسی طرح اس بند کے مصرع اوّلیٰ میں ''کس کی تلاش تھی مجھے ؟'' لائن تلاشِ بے ثمر و منزل غیر معینہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔زندگی کا کرب اور تنہائی کا نوحہ عجیب لطف دیتا ہے۔

مادیت پرستی اور مشینی دور میں جہاں فرد تنہائی کا شکار ہوا ہے، وہاں اس کی عائلی زندگی بھی تنہا ہو کر رہ گئی ہے اور فیملی کا پرانا نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا ہے، جس کی وجہ سے ذاتِ انسانی کا کرب مزید بڑھ گیا ہے۔ان مضامین کو اگر پورے وثوق کے ساتھ کسی شاعر نے اپنے اظہاریے کا حِصّہ بنایا ہے تو وہ بلاشبہ ایک اچھّا شاعر کہلایا جا سکتا ہے۔اسی حقیقت کو وہ اپنی نظموں میں بیان کرتے ہیں۔شاعری جہاں تخلیقی کرب کی تشفی کرتی ہے، وہاں ذات کے اظہاریے سے روحانی تشفی کا باعث بھی بنتی ہے، لہٰذا شاعر بیک وقت تین طرح کی مُسرّتوں سے دوچار ہوتا ہے۔ایک تخلیقی کرب کی تشفی کی مُسرّت اور دوسری اظہارِ ذات سے روحانی مُسرّت اور تیسری فنی بلوغت کے خمیر سے اٹھنے والی مُسرّت، جو ایک شاعر کو اس وقت میسر آتی ہے ،جب وہ فن کے عوارضات کے تتمہ پر متمکن ہوتا ہے اور اس کے سامنے ہنر والا نہیں بل کہ ہنر زیادہ توجُّہ کا طالب ہو جاتا ہے۔اس کا ذہن بیک وقت اِنھی منطقوں کے اندر ایک حسین امتزاج کا متلاشی ہوتا ہے اور، جب وہ اپنی کھوج سے اس کے حُصُول میں کامران ہو جاتا ہے تو اس کے ذہن و قلب میں ایک نامیاتی تلازمہ قائم ہوتا ہے، جس کا حتمی نتیجہ تسکین ہے۔یہی تسکین فن ،اظہارِ

ذات اور تخلیقی کرب کے جزئیات کا مرکب ہے، جو قاری کے برعکس ایک سچے شاعر کو میسر آتی ہے اور صرف تخلیق کار ہی اس کا ادراک رکھ سکتا ہے۔ ایسے شاعر کا مطمع نظر مختلف ہوتا ہے۔ اور وہ اظہار میں اپنا حِصّہ ڈالتے ہوئے آگے نکلتا ہے۔ اس کی نظر حسنِ نظر کی خُوش بُو پر رہتی ہے، نہ کلام کی ظاہری حالت پر البتہ وہ اس خُوش بُو کے مزاج کے بدلاؤ کے ساتھ ساتھ اپنے اظہار میں بدلاؤ آتا ہے۔ یہی تخصص ریاض مجید کا ہے۔

نظم "بے سود انتظار کا دکھ" کا مطالعہ:

انتظار بذاتِ خود ایک تجسس آور کم و کیف کا نام ہے۔ یہ کم و کیف لمحوں کا تاوان بن جاتا ہے، جسے ہزار خلشِ دل سے سہنا پڑتا ہے۔ تجسس اور تحیر انسان کے دماغ کو جلا بخشتے ہیں اور زندگی کو آگے بڑھانے نئ حقیقتوں کو دریافت کرنے اور نئے جزیروں کی سیر کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ انسانی فکر کا ارتقا اسی کے ساتھ مخصوص ہے اگر تجسس نہ ہو تو زندگی کی چاشنی اور اس کی جمالیات کو گھن لگ جائے اور کوئی بھی کارِ نمایاں انجام نہ دیا جاسکے۔ انسان نے آج تک جتنے بھی نادیدہ حقائق کو تلاش کیا ہے اس کے پیچھے جس مرکزی محرک کا ہاتھ ہے وہ تجسس ہی ہے۔ ریاض مجید کے کلام میں جا بجا تجسس اور حیرت کا اظہار ملتا ہے۔ ان کی ایک نظم کا عنوان ہی بے ثمر انتظار کا کرب ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس طرح کے موضوعات کو شاعر نے کس درجہ اہمیت دی ہے۔ اور اہمیت کیوں نہ دی جائے کہ اس کا تعلق زندگی کے سربستہ اسرار کے مکاشفاتِ کربِ ذات اور انسان کو سمجھنے کے ساتھ لازمی طور پر ہے۔ دکھ کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ انسان کی ناآسودہ اُمنگوں کا دکھ، زندگی میں ناکامیوں کا دکھ، رائیگانی کا دکھ، نارسائی کا دکھ اور انتظار کا دکھ۔ یہی دکھ انسان بڑا دکھ ہے، جو کرب کی صورت اختیار کرتا ہے، تو رائیگانی کے احساس میں بدل جاتا ہے۔ انتظار اور وہ بھی بے سود انتظار یہ ایک ایسی صورتِ حالات ہے جس میں انسان لمحہ لمحہ جیتا اور مرتا ہے، بزُبانِ شاعر ملاحظہ کیجیے:

حیاتِ نامراد کی ادائے دل خراش کا وہ منظر اپنے واسطے بھی دیدنی نہ تھا

ہزاروں لوگ پاس سے گزر رہے تھے۔۔۔ جی اداس کر رہے تھے

لیکن ان میں ایک بھی بجھے بجھے نگاہ و دل کی روشنی نہ تھا

آتی جاتی کاروں، رکشوں اور بسوں کے شیشوں پر نظر پھسل پھسل کے رہ گئی

ایسے لگ رہا تھا جیسے بس سٹاپ پر کھڑے یونہی اُداس اُداس ساری عمر بیت جائے گی

اس کو دیکھنے کی شبھ گھڑی کبھی نہ آئے گی! (۵۹)

محبوبِ نظر کے دیدار کی شبھ گھڑی کیوں نہ آئی ؟یہ نارسائی کا وہ احساس ہے ،جو شاعر کے ساتھ ساتھ ہمیشہ رہتا ہے۔نہ جانے آنے والی گھڑیاں کیاپیام لے کر آئیں گی ؟بڑھتی ہوئی اس ہجر کی شدت کو کم کر سکیں گی یا پھر اس خلش کو اور ہی بڑھادیں گی۔اس کے متعلق حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ہمیں اپنے آنے والے کل کی حتمی خبر نہیں ہوتی اور جدید سائنس کی اس دنیا میں جہاں انسان نئے نظامِ شمسی کے سیاروں پر کمندیں ڈال رہاہے۔ وہ زندگی کے آگے کتنا بے بس ہے کہ اپنے ادھورے فیصلوں کو تکمیل تک نہیں پہنچاسکتا،اپنی آرزوؤں کو حسرتوں میں بدلتا دیکھتاہے، مگر ان کی تکمیل سے محروم رہتاہے اسی طرح دعویٰ یہ کرتاہے کہ وہ سب کُچھ جانتاہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ابھی شاید کُچھ بھی نہیں جانتا۔وہ تو ابھی تک اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان سکا۔اس نے اپنے اندر کے انسان کو صحیح معنوں میں پہچاناہی نہیں۔وہ اپنے نفس کے عرفان سے تاحال محروم ہے۔

اسے کائنات کے سربستہ رازوں کو معلوم کرنے کی آرزو ہے اور وہ اسی میں محوِ جستجو ہے، مگر وہ تکمیل یاب نہیں ہو پا رہا۔یہی اس کی سب سے بڑی بے بسی اور ناکامی ہے۔کچے جذبوں کے منھ بند صدف اور ذات کی گھڑی کے کھلنے سے ہر چیز کا بکھر جانا انتہائی معنی خیز جملے ہیں،جو علامتی سطح پر انسان کے وجودی کرب اور اس کے سامنے موجود لامتناہی چیلنجز کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

نظم ”اُسے علم ہے“ کا مطالعہ:

جذبات کی تہذیب انسان کو عظیم بناتی ہے۔یہ تہذیب اخلاقیات کا اپنا ایک نظام لے کر آتی ہے۔جذبات کی تہذیب انسان کو صحیح معنوں میں مَحبّت کی قدر و قیمت بتاتی ہے۔ریاض مجید نے اس نظم میں اسی تہذیبِ مَحبّت کی بات کی ہے۔مَحبّت کی تہذیب ہی حرمتِ معشوق کا احساس دلاتی ہے۔محبوب کو اس بات کا علم ہے کہ عاشق اس کا راستہ کبھی نہیں روکے گا اور نہ ہی اپنے اُوپر بیتے کرب وبلا کی داستان کو دہرائے گا۔یہ مَحبّت کی خاموش قربانی وایثار کی طرف اشارہ ہے:

لیکن اسے علم ہے

میں کبھی اس کا رستہ نہ روکوں گا!

میں ہم دردی وں کی طلب میں کبھی خود پہ جھیلی ہوئی سختیوں کی کہانی نہ دہراؤں گا

اُس کا دامن پکڑ کر کبھی یہ نہ جتلاؤں گا۔۔۔۔

کہ تیرے سبب مجھ کو کس طرح کانٹوں پہ چلنا پڑا ہے ؟

مجھے بے گناہی کے کس کس جہنم میں جلنا پڑا ہے ؟ (۶۰)

یہ ناکردہ گناہوں کی سزا سہنے کے بعد اختیار کی جانے والی خاموشی کی نمایندگی ہے، جو اس نظم میں رہتا ہے۔ یہ ایثار و قربانی کی اعلیٰ مثال ہے جسے ایک عاشقِ صادق قائم کرتا ہے۔

نظم " جدائی کی بیاض کا آخری صفحہ " کا ناقدانہ مطالعہ:

انسان کی محرومیاں جاوداں ہیں اور زندگی میں اس کے ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ یہ دائمی محرومیاں انسان کے اپنے وجودی قالب کے مٹنے کے بعد ختم نہیں ہوتیں بل کہ جاری رہتی ہیں۔ ہم انسانوں کا المیہ ہی ایک ہے کہ کائنات میں جس چیز کی جستجو کرتے ہیں، اس کے حُصُول کے بعد کسی دوسری شے کی آرزو پیدا ہو جاتی ہے اور پھر تیسری اور چوتھی اور اسی طرح خواہشات واُمنگوں کے حُصُول کا یہ لامتناہی سلسلہ چل نکلتا ہے، جس کی راہیں بہت دشوار گزار اور پُر خار ہیں۔ انسانی پیٹ کا جہنم کبھی بھرتا ہی نہیں اور نہ ہی اس کی حیوانی خواہشات کا سلسلہ منقطع ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بدنی ارتقا کے ساتھ بدنی خواہشات کی تکمیل کا مسئلہ در پیش آیا اور رہے گا۔ یہ بدن کے اجزا کی مکمل شکست و ریخت سے اپنے انجام کو پہنچے گا۔ یہ دائرہ در دائرہ بڑھتی ہوئی محرومیاں ہیں، جو کبھی ختم نہیں ہو سکتیں۔ اسی لیے تو ریاض مجید کہتے ہیں:

اُنہی محرومیوں کی تہہ بہ تہہ میں الجھا ہوں

جو اک مدت سے سایہ سایہ میرے ساتھ ہیں

وہی دوری کا رونا اور وہی قربت کی بن بن کر بگڑتی ایک خواہش کل بھی تھی اور آج بھی ہے

(اُنہی، احساس کی دو مختلف (متضاد) سطحوں کے کناروں پر بنے رسوں کے پل پر

خوف سے سہا کھڑا ہوں) (۶۱)

یہ نظم محرومی کے احساس کو ایک تخلیقی اپج اور فنی تمتع کے ساتھ بیان میں لاتی ہے۔ محرومی کتنی ہی ہمت شکن اور اعصاب پر بارِ گراں ہو وہ صدماتِ عشق کی خون چکاں کم و کیف سے زیادہ شدید نہیں ہو سکتیں، مگر ریاض مجید نے اسے ایک اور پیرایۂ اظہار میں بیان کرتے ہوئے شدید تر ترسیلی جذبات کا نمونہ بنا دیا ہے۔ شاعر کی اس تخلیقی اپج سے شاعری متمول ہوتی ہے اور اس میں آنے والے شعرا کے لیے نئے امکانات پیدا کرنے کی وسعتِ قلبی پیدا ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ ہماری آج کی شاعری میں کسی بھی روایت کا موجودہ برقی مواصلات کی موجودگی میں دخیل ہونا کوئی بعید از قیاس امر نہیں ہے اور، جو روایت یا ادا ایک بار رواج پا جاتی ہے، اس کے بعد مدتوں اس کا چرچا رہتا ہے اور اس کے اثرات کے تحت پوری ایک نسل آجاتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس روایت میں ایسی کشش اور جاذبیت ہو کہ نئی نسل اس کی طرف اپنے آپ کو خود بخود متوجّہ کر لے۔ اس کی مثال جونؔ ایلیا کی ہے۔ جون ہر نوجوان کا پسندیدہ شاعر ہے اور اس کی شعری روایت، الفاظ کے برتاؤ اور بطرزِ اظہار سے ایک

پوری نسل متاثر ہوئی ہے۔ اس نے اپنے لب و لہجے اور مشاعرے میں شعر کی ادائی سے لوگوں کے دل جیتے ہیں۔ اسی طرح کوئی بھی شاعر جب تک اپنی انفرادی روایت کو لے کر نہیں آتا، اس کی شاعری میں عوامی رنگ پیدا نہیں ہوتا۔ ریاض مجید کی نظمیں آفاقی احساسات کی علم بردار ہیں۔ کیوں کہ ان میں انسانی جذبات و احساسات کا، جو نصاب پیش کیا گیا ہے۔ اس کا حلقہ اثر کسی ایک خطّے تک محدود نہیں بل کہ پوری روئے زمین پر انسانی جذبات میں مکمل مطابقت و یک رنگی نظر آتی ہے۔ انسان جب مسلسل محرومی اور نارسائی میں زندگی بسر کرتا ہے تو اسے ماحول تازہ کاری سے تہی نظر آتا ہے اور اس کے سامنے تنوع اور زندگی کی نئے رنگی ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں تک الفاظ بھی ختم ہو جاتے ہیں:

نئے الفاظ کی دولت کہاں سے لائیں۔۔۔۔؟

،جو دل میں ہے اب ان کی ترجمانی کون سے الفاظ میں ہو گی!

نہیں اب کچھ بھی تو لکھا نہیں جاتا۔۔۔۔

سر بحر جدائی رنج بے حیثیتی کی ریت میں دھنستے قدم چلنے سے عاجز ہیں

کہ اب اظہار کے مسدود رستوں سے پرے بس اک غروب جاں کا منظر ہے (۶۲)

احساس کی شدت کی آخری حد بھی لکنت اور بے انتہا بے زُبانی ہے۔ احساس کی شدت جب اظہار کے راستے مسدود پاتی ہے، تو پھر اس میں لکنت اور بے زُبانی در آتی ہے۔ بے زُبانی در اصل ایک نفسیاتی کیفیت ہے، جس کے متعلق شاعر نے محرکات کی بات کی ہے اور وہ محرکات کیا ہیں؟ وہ محرکات جذبات کا وفور ہی ہے۔ اس بند الفاظ کی دولت کہاں سے لاؤں، مسدود رستے اور غروبِ جاں کا منظر خصوصی توجُّہ کے متقاضی ہیں کہ ہر نئے خیال کا وفور اور اظہار کے لیے لکنت یا بے زُبانی اور لفظی کم مائیگی کا سامنا ہوتا ہے:

میں بے الفاظ ہوں!

میرے لیے اب اس پگھلتے کھولتے احساس ناآسودگی کی منزلِ آخر فقط اک موت ہے!

(اور کیا خبر وہ بھی نہ ہو!) (۶۳)

نظم کی یہ آخری لائنیں بہت معنی خیز ہیں۔ اس میں تشکیک و لایعنیت، بے مقصدیت اور بے حیثیتی کا احساس بہت زیادہ شدت کے ساتھ سامنے آیا ہے۔ زندگی کو شاعر نے ویسا نہیں دیکھا جیسا وہ دیکھنا چاہتا تھا بل کہ جیسی دنیا ہے، ویسے اسے دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے۔ پھر اس احساس کو ناآسودہ حالتوں اور کم و کیف میں بیان کیا ہے۔

یہ آخری حصّہ اس نظم کانہایت ہی معنی خیز اور علامتی ہے۔ جس میں ایک مخصوص طبقے کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا بل کہ اس شدتِ احساس کی حیثیت آفاقی ہے۔ یہاں ہمیں ریاض مجید کی نظم کے فکر و فن کے ساتھ نبھائی جانے والے کمٹمنٹ کا اندازہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ:

''نظم کا لسانی پیکر شعری زُبان، علامتوں اور استعاروں سے مل کر پیدا ہوتا ہے اور یہ اجزا فکری نظام اور شاعر کی تہذیبی تربیت سے براہِ راست وابستہ ہوتے ہیں۔'' (۶۴)

ریاض مجید کی اِس نظم کی ایک اور نتیجہ خیزی یہ بھی ہے کہ جہاں دنیا کے سارے سیاسی ازم ناکام ہو جاتے ہیں، وہاں اخلاقیات اور انسانی ہم دردی کے اُصولوں پر مبنی معاشرہ ہی خیر کا معاشرہ ہو سکتا ہے اور وہی انسانوں کے لیے خیر اور بھلائی کا باعث بن سکتا ہے، اسی سے انسانیت کا بھرم باقی رہ سکتا ہے۔ خیر کی دنیا وہی ہے جہاں انسانیت کا مذہب تمام مذاہب پر فوقیت رکھتا ہو اور جہاں سب انسان مل جل کر باہمی ہم دردی اور خلوص و اخلاص کے ساتھ زندگی گزار رہے ہوں، ورنہ جس معاشرے میں خیر کو ایک اضافی قدر کے طور پر سمجھا جاتا ہے، وہاں امن قائم نہیں رہ سکتا۔ نظم کی یہ آخری لائنیں قطعی استنتاج کو یوں پیش کرتی ہیں:

نئے الفاظ کی دولت کہاں سے لائیں۔۔۔؟

،جو دل میں ہے اب اس کی ترجمانی کون سے الفاظ میں ہو گی

نہیں اب کُچھ بھی تو لکھا نہیں جاتا۔۔۔

سر بحر جدائی رنج بے حیثیتی کی ریت میں دھنستے قدم چلنے سے عاجز ہیں

کہ اب اظہار کے مسدود رستوں سے پرے بس اک غروبِ جاں کا منظر ہے (۶۵)

تشکیک کا یہ منظر نہایت خوب صورت بھی ہے اور جان لیوا بھی ہے۔ جان لیوا اس لیے ہے کہ اس میں ہر منزلِ فکر تشکیکِ وجود کے اگلے پڑاؤ کی جانب رستہ مہیّا کرتی ہے اور اب یہ حالت ہے کہ بے الفاظ ہو گئے ہیں، لیکن سوچنا لفظوں کے بنا بھی ہو سکتا ہے۔ انسان زُبان اور الفاظ کے بغیر بھی سوچ سکتا ہے۔ سوچ کا تعلق انسانی دماغ و عقل سے ہے اور یہ الفاظ کی محتاج نہیں البتہ اپنے اظہار میں یہ الفاظ و علائم کی محتاج ہے۔ یہ بھی حیرت ہی کا کم و کیف ہے کیوں کہ الفاظ وہاں ختم ہوتے ہیں، جہاں اظہار کے قویٰ تحیر آثار کیفیات کے سامنے عاجز ہو جائیں۔ یہ وہ حیرت ہے، جو قدیم سایہ اسناد کے زیرِ بارِ منت نہیں بل کہ اپنی معروضات میں اپنے الگ قضیوں کی حامل ہے۔ اسے اپنے وجود کے اثبات کے لیے گزشتگاں کی سند کی ضرورت نہیں۔ بل کہ تازہ کاری اور نئے ذائقوں کی ضرورت ہے۔ یہاں پر حیرت تکمیلِ ذات اور تکمیلِ خواہشات پر نہیں ہے بل کہ ان کی تشنگی اور عدم تکمیل پر ہے۔ بے الفاظی کی ساعت میں ایک سرگوشی، جو اندر کی گرہ کھولتی ہے اور اندھیرا روشنی کے سمندر کی طرف

لے کے جاتا ہے۔ اس پر یہ کہ بھروسے کا ہاتھ نادیدہ جزیروں کی طرف لے کر جاتا ہے اور وہاں پر تسلی بھرا لہجہ رہ نما بن جاتا ہے اور ساتھ آسمان راستوں کے سنگ میل لگتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ یہ سب حیرت سرائے ذات کے دائروں میں مدور ہوتے عدم تکمیل کا درد لیے ہوئے وہ بنیادی تصوّرات ہیں، جن سے انسان کی ذات قائم ہے اور اس کے مکمل ہونے کی آرزو میں زندگی کو آگے بڑھاتی ہے۔ اس سے قطع نظر تکمیلِ ذات کے لاینحل ہونے سے جس تحیر سے انسان دوچار ہوتا ہے، وہ اور بن جائیں گے تصویر، جو حیراں ہوں گے کہ مصداق حیرت سرائے ذات کے ذائقے سے آشنا ہوتا ہے۔ کسی کو یہ ذائقہ کڑوا لگتا ہے، کسی کو ترش، کسی کو شیریں، کسی کو پھیکا تو کسی کو نمکین لگتا ہے۔ پھر چکھنے کی حسیات کے اختلاف سے محسوسات و ادراک کے ذائقے میں بدلاؤ آتا ہے۔ ریاض مجید کی یہ نظمیں اسی وجہ سے اپنا بدلا ہوا ذائقہ رکھتی ہیں اور ان میں شاعرانہ اظہار کے کئی قرینے اپنی عطر بیزی سے ماحول کو معطر کر رہے ہیں۔ ریاض مجید کی اس نظم کے مختلف الذائقہ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اظہار کا قرینہ نیا نیا ہے۔ یہ لب ولہجہ جدید شعرا کے بدلتے کوئے اُسلُوب کی یاد دلاتا ہے۔ ان کے لہجے میں طنطنہ اور رعب و دبدبہ ہے، مگر آنکھوں میں مدِ مقابل کی ہزیمت کی مُسرّت کے جگنو نہیں ٹمٹمار ہے اور اپنے نقش کے پیچیدہ ہونے پر شاعرانہ تفاخر کا اظہار نمایاں نہیں ہے۔ طرزِ تخاطب کے تیور بدلے ہوئے نہیں ہیں۔ مقامِ حیرت سے آگے نکل کر بانکپن اور باغیانہ روش کی وہ کیفیت نہیں آئی ہے، جہاں انانیت اور نرگسیت کا راج ہوتا ہے اور جہاں انسان ناتواں ہونے کے باوجود بارِ گراں اٹھالانے کا دعوے دار بن جاتا ہے۔

نظم ” وہ جو مل جائے “ کا تجزیاتی مطالعہ:

رومانوی موضوعات کو حقیقت کے، جس روپ میں ریاض مجید نے اپنی نظموں میں پیش کیا ہے، وہ بہت ہی کم شعرا کے حصے میں آیا ہے۔ ایسے موضوعات جن پر تمام شعرا فکر فرما چکے ہیں، ان میں نئے پہلو نکالنا قدرے دشوار کام ہے، لیکن ”انتساب“ کے شاعر نے جابجا اس چیلنج کو بخوبی سر کیا ہے۔ ان کا اندازِ بیان ایسا ہے کہ یہ انسان کا استفسار یہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

پھول سے لمحے کھوئیں نہ یوں رائیگاں
عمر سونا سی کاٹیں نہ یوں بے ثمر
ایک محور پہ خود کو مُرتّب کریں
بکھرے بکھرے نہ ایسے پھریں در بدر
وہ جو مل جائے ،ہم بھی بنا لیں کہیں
ایک چھوٹا مگر خوب صورت سا گھر (٢٦)

درج بالا نظم میں ایک گہری جذباتیت اور سرشاری میں ڈوبی ہوئی خاموشی میں وقت گزرتا جارہا ہے، مگر اس میں ایک اُمّید و بیم کی صورت حال پائی جاتی ہے۔ یہ اُمّید کہ کاش محبوب مقصود کے قرب و وصال کے لمحے میسر آئیں۔ کبھی بدنی ہجر کی کیفیت ختم ہو اور کبھی ایک ساتھ زندگی گزرنے لگے۔ ایسے میں شاعر کے ہاں ایک معصوم سی خواہش جنم لیتی ہے، جو نظم کے آخر میں اپنے گھر کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ گھر ایک امن و قیام کا استعارہ ہے۔ یہ سکونت اور طمانیت کی علامت ہے۔ یہ انسانوں کے معاشرے کے ایک یونٹ کی نشاندہی بھی کرتا ہے اور انسان کی بنیادی ضرورت بھی ہے۔ معاصر شعرا کے ہاں یہ ایک ایسا استعارہ ہے، جو ان کی مجموعی اندازِ فکر کا پتا دیتا ہے۔ شاعر کی محسوس کرنے کی قوت اور معاصر حالات پر اس کا ردِ عمل اس کے زندہ ہونے پر استدلال کرتا ہے۔ پھر لفظ "گھر" کا شاعرانہ استعمال ہی اس کی قسمت کا فیصلہ کرتا ہے کہ اس میں کس قدر نفسیاتی جہات سماگئی ہیں۔ یہی لفظ کے استعمال کا فن ہے، جو دو سطحوں پر قائم ہے۔ پہلی اس کی نفسیاتی سطح ہے اور دوسری اس کی جمالیاتی سطح ہے۔ غزل کی یہ مجبوری ہے وہ اپنے وجہی جمالیات کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، لہٰذا غزل میں تو استعمال ہونے والا لفظ جہاں اپنا نفسیاتی جواز لے کر آتا ہے، وہاں اسے اپنا جمالیاتی جواز بھی دینا پڑتا ہے۔ جدید اُردُو شاعری میں نئے تراشے جانے والے استعارات وسیع تر مفہوم میں جدید رنگ میں استعمال ہوتے ہیں۔

نظم "آتے موسم سے آنکھیں ملانا گنہ ہے" کا تجزیاتی مطالعہ:

یہ ایک نئے انداز کی وقیع موضوع کی حامل نظم ہے۔ اس نظم میں موسم علامتی و استعاراتی سطح کی حیثیت رکھتا ہے۔ "موسم" جدید شاعری میں ایک معنی خیز علامت ہے اور ریاض مجید کی اس نظم میں " موسم" تغیرِ پیہم کا نام ہے۔ حال کی معکوسی علامت ہے۔ یہ استعارہ جدید تر موضوعاتِ شعر میں استعمال ہوا ہے۔ ان کی ایک نظم بعنوان "کوئی رت کوئی رستہ ہو" بھی اسی قسم کی معنویت کی حامل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نئی آرزو کی مسافت تو احساس کی موت ہے،

ایک اس کے علاوہ کسی کی تمنا نہ کر

کہ احساس کی ایکتا سے بڑا سکھ کسی شے کی قسمت نہیں ہے

گم شدہ موسموں کی مہک میں چھپی آرزو سے محبّت نباہ،

یادرکھ

دل کے منشور میں گذرے لمحوں کی تقدیس سب سے بڑا فرض ہے (٦٧)

یہ نظم اپنے زُبان و بیان کے مِعیار کے لحاظ سے ایک منفرد اور خوب صورت اظہاریہ ہے، جس میں شاعر نے آتے دنوں کی گزران کا جمال افروز مُرقّع پیش کیا ہے۔

ریاض مجید کی نظموں میں مضامینی تنوع اور رنگا رنگی بدرجۂ اتم ہے۔ شاعر اپنے ماضی و حال سے مکمل جڑت رکھتا ہے اور اس کے عصرِ حاضر کا گہرا شعور ملتا ہے۔ اس کتاب میں کوئی ایک نظم بھی ایسی نہیں ہے، جسے ہم فرسودہ یا محض روایتی کہہ کر یا ٹیبل ورک کہہ کر رد کر سکیں۔ ہر نظم اپنا مکمل تخلیقی جواز رکھتی ہے اور اس میں خیال کی تازہ کارہ اور مضمون کی ندرت نظر آتی ہے۔ اُسلُوب عصرِ حاضر کی نظمیہ شاعری کی غمازی کرتا ہے۔ ایسے نہیں لگتا کہ ان کی نظم ایک جگہ آ کر اپنا ارتقائی سفر ختم کر چکی ہے بل کہ اس میں بتدریج زمانے کے مزاج کے مطابق تبدیلیاں آتی جاتی ہیں اور اس میں ان نئے سماجی و عمرانی مسائل کا شعور ملتا ہے، جو آج ہمارے معاشرے کو در پیش ہیں۔ ذات اور اس کے عوارضات و مسائل نظموں کا بنیادی موضوع ہیں اسی طرح دیگر موضوعات جن میں آج کا ے عہد کا آشوب سانس لیتا ہے اور آج کا انسان جس ذہنی کرب و بلا کا شکار ہے، وہ تمام مسائل ریاض مجید کی نظموں کے اظہاریے میں موجود ہیں۔ ذات اور اس کے عوارضات کے موضوعات انسانی اظہاریے کا حِصّہ ہیں۔ ان سے صرفِ نظر نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی کوئی شاعر ان سے منھ موڑ کر بڑی شاعری کر سکتا ہے۔ یہ وہ تازگی ہے، جو بند کواڑوں اور درِ مقفل سے بھی اندر آجاتی ہے اور اس کا راستا خُوش بُو کے راستے کی طرح مسدود نہیں کیا جاسکتا۔

"انتساب" کا اُسلُوبیاتی جائزہ:

ریاض مجید عصرِ حاضر کی عبقریت کا نام ہے۔ ان کا اُسلُوب اچھوتا اور بندشِ الفاظ ندرت و نئی رنگی کی حامل ہے۔ اُنھوں نے نئے رنگی دوراں کا مشاہدہ بھی عام آنکھ سے نہیں دیکھا بل کہ ایک حساس شاعر کی نگاہ سے اسے منفرد انداز میں اپنے مشاہدہ کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔ ان کا تجرباتی اظہار اُسلُوبِ بیان کی جس قدر ممکنہ چاشنیاں ہیں ان سب کو ایک ساتھ پیش کرتا ہے۔ ان کی نظمیں مبدل بہ زمانہ اُسلُوب کی حامل ہیں اور ان میں جدّتِ طرزِ اظہار کی تمام خوبیاں موجود ہیں، مگر یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اُسلُوب کے بدلنے سے شاعری کی انفرادیت پر کوئی اثرات واقع نہیں ہوئے ہیں کیوں کہ یہ اُسلُوب کی وہ زیریں تہہ ہے، جس میں شاعر نے اپنے ذائقے میں نُدرت پیدا کی ہے اور نئے مضامین و خیالات کو جگہ دینے سے اس کی شاعری میں ایک نیا پن وجود میں آیا ہے۔ ریاض مجید کا رچا بسا اُسلوب ہمیں یہ کہنے پر مجبور کر رہا کہ اُن کا اُسلوب:

> "جدّتِ مضامین اور ابلاغِ کامل کا حسین امتزاج ہے۔" (۶۸)

انفرادیت کسی شاعر کے ہاں اس کے اُسلُوبِ شعر کے کُلی بدلاؤ کا نام ہے، جب کہ مضامین و خیال کے ساتھ اظہار کے تیوروں کا بدل جانا یہ انفرادیت کو متاثر نہیں کرتا بل کہ اس کے نقش و خال و خد اور زاویوں سے بنا کر سامنے لے آتا ہے۔ آزاد

نظموں میں عموماً شاعر کو اپنے اُسلُوبِ بیان کی دھاک بٹھانے میں مشکل پیش آتی ہے" انتساب" کی نظمیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ اُسلُوبِ بیان کو کسی بھی ہئیتِ نظم میں بر قرار رکھا جا سکتا ہے۔

ریاض مجید کے مجموعہ کلام" انتساب" کا عنوان اس کی مشمولات کی نوعیت کی مناسبت سے رکھتا ہے کہ یہاں ہر ایک نظم میں بڑی حد تک وحدت موجود ہے۔ دوم یہ کہ یہ دیگر نظموں کے مجموعوں کے عنوانات سے منفرد قسم کا ہے اور اسے پڑھ کر کسی خاص رجحان کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ان نظموں کی خاص خوبی یہ ہے کہ ان میں مَحبّت کو آفاقی سطح پر استعمال کیا گیا ہے۔ ان نثری نظموں میں لفظ" انتساب" ایک وسیع تر استعارے کے ضمن میں مستعمل ہوا ہے۔ یہ مَحبّت و صدقِ موَدت کا استعارہ ہے۔ نظم" انتساب" کی جمال آثار پرواز ہی سے ناقد کو اس کتاب کے بابت رائے قائم کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

میری آوارگی کا ہر اک عہد نامہ ترے قرب کی خواہشوں کے لہو سے عبارت ہے

دیکھ میرے شب و روز کا ہر صحیفہ ترے نیک ہونے کا اعلان کرتا ہے (کرتا رہے گا)

رُتیں مہرباں ہیں

ترا ذکر کرنے کا موقع ملا ہے

ترا نام لکھتا ہوں فرطِ عقیدت سے اپنا قلم چومتا ہوں

میں خوش بخت ہوں۔

کتنی تسکین دہ بات ہے کہ ترے واسطے ہی قلم کو زُبان اور زُبان کو ان اِظہار کی رحمتوں سے نوازا گیا ہے (۶۹)

یہ نظم ریاض مجید کی قلبی دعاؤں کا اظہاریہ ہے، جسے اُنھوں نے موثر اُسلُوبِ بیان میں پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں جذبات کی فراوانی تہذیب اور شائستگی میں آکر ڈھل جاتی ہے اور ایک نئے مہذب جذبی جمالیات کے ساتھ روبرو ہوتے رہتے ہیں۔

اُسلُوبِ بیان ایک ایسی منفرد شے کا نام ہے، جو ہر شاعر کے ہاں کم و بیش متبدل و متغیر ہوتی ہے۔ جس طرح ہر انسان کا مزاج مختلف ہوتا ہے اسی طرح ہر صاحبِ تحریر کا مزاج اور اسکا اندازِ بیاں بھی اپنی ہی چاشنی رکھتا ہے، لیکن اس میں انفرادیت پیدا کر لینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

انسانی ذات کی بے کرانی کی تحیر زا سراؤں کے ماحول میں ایسی قدرتِ تخلیق بہت کم دیکھی گئی ہے، جو ریاض مجید کے حصے میں آئی ہے۔ یہ ان کا اعزازِ فی الواقع ہے کہ طرزِ کہن سے فکرِ نو کی نمود کرتے ہیں اور روایت کے ملبے سے جدّتِ طرزِ ادا

پیدا کر لیتے ہیں۔ بے مقصدیت جیسے موضوعات کو جس اُسلُوبِ بیان کے ساتھ زیرِ تنقید کتاب میں پیش کیا گیا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتے۔ ایسا اُسلُوبِ بیان، جو انسانی فنا و بقا کے مسئلے کو بیان کرنے کے لیے اختیار کیا جائے وہ یقینی طور پر غیر معمولی ہو گا کیوں کہ ان دقیق و فلسفیانہ موضوعات تک وہی رسائی حاصل کر سکتا ہے، جو فلسفیانہ قسم کی ذہنی ساخت رکھنے والا انسان ہو۔ ریاض مجید کی ایک نظم ''نارساعصر کی آرزو میں'' اس امر کی غماز ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

میں بے مقصدیت کی ان دیکھی یکسانیت کے رہٹ میں جتا جانے کس گم شدہ نسل کا

فرد ہوں؟

مری کوئی کوئی منزل نہیں ہے

کہ میرا سفر۔۔۔۔۔۔

فقط راستوں کا سفر ہے!

مرا کوئی ساحل نہیں ہے (۷۰)

نظم کا آغاز آفرینش کی طرح ہوتا ہے۔ ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے نظم میں جا بجا سوالات کی شروعات ہوتی ہے۔ کس جہانِ رنگ و بو سے آیا کون تھا کہاں کی مٹّی کا کیسے کیوں کب یہاں آیا، جیسے سوالات قارئین کے اذہان و قلوب میں نظم کا متکلم منتقل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک کامیاب شاعر کا یہ راز ہوتا ہے کہ وہ اپنی تخلیق کے ذریعے سے قارئین کی فکر کو بیدار کرتا ہے اور ان کے ذہن میں استفہام پیدا کرتا ہے۔ یہ شاعر نے نظم میں ازل کے مدعا کو پیش کیا ہے۔ اس کا مدعا اور اس کا بیانیہ خود فراموشی نہیں خود آگہی ہے، بے دلی یا بددلی نہیں بل کہ تشکیک آمیز استفہام ہے۔ حال کے سینے پر پلنے والی بے یقینی اور بے معنویت سے اکتائے ہوئے وہ لمحہ حال میں زندہ رہنے کے بجائے ماضی کی گم شدہ ساعتوں کا متلاشی ہے، جو اس کا اپنا عصر ہو، جو اس کی اپنی گھڑیاں ہوں، جہاں وہ اپنے سکھ دکھ بانٹ سکے اور جس کے سائے میں وہ محبّت و تن درستی کا احساس اپنے ارد گرد موجزن پائے۔ شاعر نے اپنی اس خواہش کا اظہار یوں کیا ہے کہ اسے ایک اور شکلِ تازہ چاہیے، جو موجودہ شکل کی تجدید ہو تاکہ اس لیے کہ شاید اس طرح سے اس کی ذات میں، جو ازلی خلا رکھا گیا ہے وہ پُر ہو جائے، مگر یہ ازلی خلا پُر کیسے ہو گا؟ اس کی وضاحت شاعر نے نظم کے آخری حصے میں کی ہے۔ اس سے مراد کائنات و موجودات کے ارتقا کا انجماد یا انفصال ہے، جس کے دم سے لیل و نہار بنتے ہیں اور جس کی حرکت سے نئی مخلوقات تخلیق ہوتی ہیں۔ منجمد کیف کی اسیری ''کُن فیکون'' والی اسیری نہیں اور نہ کوئی عام ہے بل کہ یہ وسیع تر معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسی کن فیکون والے چاک پر انسان کی تخلیقِ مکرر کی جائے تو آج کے انسان سے استقبال کا انسان بہتر بن کر نکلے اور شاید اس طرح سے اس کی ذات کی تکمیل ہو جائے۔ یہی وہ تخلیقِ مکرر ہے، جسے شکلِ تازہ کے مرکبِ اضافی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ متذکرہ بالا لائنوں میں

تخلیقِ مکرر کی آرزو اور لوٹ اے گردش ایّامِ ماضی کی طرف کا بیانیہ ہے۔ اور اس میں ایک قوی لہجے اور مطالبانہ انداز میں اس خواہش کا ظہار کیا گیا ہے۔ شاید اس تخلیقِ مکرر اور تجدیدِ عصر سے کسی اور طرح کے استفادے کی نیّت پوشیدہ ہو۔ یہ بھی عین ممکن ہے۔ اس حوالے نظم کا آخری حِصّہ ملاحظہ ہو:

مجھے اب بھی اپنے اسی گمشدہ عصر کی جستجو ہے
جو میرا ہو۔ میرے لیے ہو
اور۔۔۔۔۔
جس کے شب وروز کا امن، سکھ، تندرستی، مَحبّت، ہر اک چیز
میں میرا بھی ایک حِصّہ ہو   (۷۱)

''انتساب'' میں لفظ ''مَحبّت'' اور '' عصر'' کو کئی جہتوں میں مستعمل کیا گیا ہے اور کئی ایک مضامین، جو آفرینش اور ارتقاے انسانی و تکمیلِ ذات سے متعلق ہیں ان الفاظ کے سہارے بیان کیے گئے ہیں۔ مَحبّت در اصل استعارہ ہے انسان کے بنیادی خمیر کا اور اس کے ازلی مادے کا جس سے اس کی صورت گری ہوئی ہے، مگر اس صورت گری میں خرابی یہ ہے کہ اس کے اندر جیتی جاگتی تکمیل کی خواہش موجود ہے جب کہ مَحبّت کی اس معروض میں تکمیل ممکن ہی نہیں ، مگر اس کی خواہش اور اس کی طرف پلٹنے ہی میں عافیت ہے۔ پرانی مَحبّتوں کے محبس سے نکلنا عافیت نہیں بل کہ اِنھی میں زندہ رہنا ہی انسان کے لیے بہتر ہے۔ ریاض مجید کی بہت سی نظمیں، جو عام موضوعات سے شروع ہوتی ہیں، مگر ان کا اختتام مَحبّت پر ہوتا ہے۔ مَحبّت کا ایک وسیع تر استعارہ ہے اور ہر نظم میں موجود ہے۔ بل کہ ہر نظم ہی مَحبّت کا شاہ کار ہے۔ مَحبّت تخلیق سے بھی ہو سکتی ہے اور ایک گوشت پوست کے انسان سے بھی ہو سکتی ہے۔ اسی طرح انسانیت سے مَحبّت، وطن سے مَحبّت اور مٹّی سے مَحبّت یہ سبھی مَحبّت کی قسمیں ہیں، جو انسان کی بقا اور امن کے لیے لازمی ہیں۔ مَحبّت کے بغیر انسان ادھورا ہے اور اس کی آرزوئیں تشنہ کام ہیں۔ مَحبّت اسے منتہاے مقصود تک پہنا دیتی ہے اور وہ بامراد اور کامران ہوتا ہے۔ انسانی زندگی میں جس جذبے کا سب سے زیادہ کردار اور اثر ہے وہ مَحبّت کا جذبہ ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریاض مجید نے اپنی نظموں میں اس جذبے کو جزی یا کلی طور پر تخلیقی محرک کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہی ان کی نظموں کی خوب صورتی بھی ہے اور ان کی ٹھوس حقیقت بھی ہے، جو ان کی زندگی میں بھی جابجا نمایاں نظر آتی ہے۔ نظم کا آخری حِصّہ اسی پس منظر میں ملاحظہ ہو:

میں زیرِ زمیں دھنس چکے شہر کے الجھے ملبے سے بچ نکلا اک شخص اب
تک اسی خیر کے سبز بادل برسنے کی اُمّید پر جی رہا ہوں
جو مری نیم جاں قدروں کو پھر ترو تازہ کر دے!
مجھے اپنے کھوئے ہوئے عصر سے پھر ملا دے!

اُسی نار ساعصر کی آرزو، جستجو میں

فضول اور بے کار۔۔۔

وقت گذرا چلا جا رہا ہے

اُداس اور مغموم۔۔۔

عمر کٹتی چلی جا رہی ہے (۷۲)

شاعر نے دقیق موضوع کو بڑی سہولت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ اس کی سہولتِ گویائی ہی ہے، جو ہر نظم میں ان کی انفرادی پہچان بن کر سامنے آتی ہے۔ اس نظم کا بنیادی کردار ایک ایسے انسان کا نمایندہ ہے، جو اپنی ذات کے حالیہ حبس خانے سے نکلنا چاہتا ہے اور ماضی کی خوب صورت وادی میں پلٹنا چاہتا ہے۔ یہ تقاضا انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ ذات کے محبس سے نکل کر انسان ایک اور محبس میں جا پھنستا ہے اور اس سے نکلنے کا ایک ہی راستا ہے اور وہ یہ کہ پرانی مَحبّتوں کی طرف لوٹا جائے۔ ان کی ایک اور نظم میں بھی اسی خیال کی بازگشت سنائی دیتی ہے، جو منفرد اُسلُوبِ بیان رکھتی ہے۔

ریاض مجید کی نظموں، جو استفہامی اندازِ بیان اپنایا گیا ہے وہ ان کے شعری اُسلُوب کی ترقّی یافتہ شکل ہے جسے غالبؔ کے بعد بہت کم شعرا کے ہاں دیکھا گیا ہے۔ "انتساب" کی ایک نظم "ایک سوال" اسی طرف اشارہ کرتی ہے:

ہمیں اپنے پہلو میں چلتے ہوئے جب بھی محسوس کرنا

تو رک کر ہماری رفاقت کی خُوش بُو سے مہکے دنوں کی صداؤں کو سننا

وہ دن یاد کرنا

کہ جب لفظ زینے تھے۔۔ آواز سیڑھی تھی

۔۔۔۔اور

آواز کا لمس اک دوسرے کے تعارف کا وہ رستہ تھا

کہ جس راستے پر طلب کی نوید افشاں رت کے سلگتے ٹھٹھرتے ہر اک ذائقے کو چکھا (۷۳)

سوال انتہائی معنی خیز ہے۔ یہ نظم ایک ہی کینوس پر پھیلی ہوئی تصویر ہے، جس میں مختلف رنگوں کے ذریعے سے ایک ایسی تصویر پینٹ کی گئی ہے، جو قاری کے ذہن میں سوالوں کی دنیا آباد کرتی ہے۔ یہ استفہام بہت معنی خیز ہے۔ موجوداتِ کائنات، ستاروں، سیاروں زمین اور آسمان کو ہم نوائے مَحبّت بنا کر جس طریقے سے پینٹ کیا گیا ہے، اس سے کئی معنی نکلتے ہیں۔ کئی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور آخر تمام صورتیں مَحبّت پر ہی آکر ختم ہو جاتی ہیں اور ایک ہی سوال ابھرتا ہے کہ مَحبّت کا سفر

کتنا طے ہو چکا ہے؟ نظم کے دیگر رنگوں میں سب سے بڑا موضوع" انسان" ہے۔انسان کی مٹّی کا ارتقائی سفر چاک در چاک ہوا ہے یا عہد بہ عہد ہوا ہے؟اس کے متعلق کوئی عام انسان تو حتمی رائے نہیں قائم کر سکتا، مگر ایک شاعر کا اس کے متعلق نقطہ نظر مختلف ہوتا ہے اور وہ ایک اور زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔انسان اور اس کے معروضات کے ساتھ جتنے بھی ریاض مجید نے مضامین نکالے ہیں، ان میں سے ہر خیال کے اندر کہیں نہ کہیں نیا پن اور ندرت موجود ہے اور وہ اپنے پیش رو سے مختلف ذائقے کا حامل ہے۔یہ شعر جس میں چاک در چاک فاصلۂ ارتقا طے کرنے کی خبر دی گئی ہے،اس پر دال ہے۔ریاض مجید نے حال سے ماضی کی جس خاکی وارضی وابستگی کا اظہار کیا ہے وہ انتہائی سوز و گداز کا حامل ہے۔ایسا اُسلُوبِ بیان بذاتِ خود ایک معجزہ ہے۔

میں ایٹم کی دنیا میں گوتم کے وقتوں کی اقدار سینے سے چمٹائے یوں جی رہا ہوں

کہ جس طرح ممتا کی ماری کوئی سر پھری ماں۔

کسی آنے والی مسیحا گھڑی کی تمنا میں مرنے پہ بھی اپنے بچّے کی میت کو

چھاتی سے چمٹائے رکھے!　　　(۷۴)

یہ استفہام و ناسٹلجیا کا وہ حسین امتزاج ہے، جو شعری جمال کی اقدار کا امین ہے۔اُسلُوبِ بیان کی حد تک بات کریں تو ایسے موضوعات پر ریاض مجید کی نظمیں شاید عصرِ حاضر میں اپنی نوعیت کی یگانہ روزگار نظمیں ہیں جن میں شاعر نے مشکل موضوعات میں بھی ایک مِعیار بر قرار رکھا ہے۔

برجستگی و روانی اور بے ساختگی:

"انتساب" کے کلام کا بنیادی خاصہ یہ ہے کہ ہر کس و ناکس کے لیے قابلِ فہم ہے۔نظموں کا بیانیہ بہت آسان ہے۔شاعر نے تسہیلِ بیان سے کام لیا ہے۔اس کتاب کی کوئی بھی نظم مشکل پسندی کا نمونہ نہیں ہے۔زُبان انتہائی سادہ اور عام فہم ہے۔ابو الاعجاز حفیظ صدیقی نے اِس ضمن میں لکھا ہے:

"ایسی تحریریں، جو قاری کو کسی دقّت یا اُلجھن میں ڈالے بغیر صفائی، روانی اور سہولت سے اپنے معانی تک منتقل کر سکیں، بے ساختگی کی حامل سمجھی جائیں گیں۔کسی شعر یا عبارت کی بے ساختگی دراصل اُس شاعر یا ادیب کے ذہن کی صفائی، موضوع پر کڑی گرفت، تجربے کے واضح شعور اور جذباتی خلوص کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔"(۷۵)

ریاض مجید کے کلام میں درج بالا جُملہ عناصر لحہ بہ لحہ اُن کے بڑے شاعر ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔سادگی و برجستگی کے ساتھ ساتھ ریاض مجید کی نظموں کا اُسلُوبِ بیان شعری جمالیات سے مملو ہے۔کوئی بھی فن پارہ جمالیاتِ شعری سے اگر تہی ہو تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اسے لوچ نہیں سوز نہیں فکر نہیں اور ادبیت نہیں، لیکن" انتساب" کی کسی بھی نظم کو اٹھا کر دیکھ

لیا جائے، تو اس میں شعری جمالیات بھی ہے اور اُسلُوبِ بیان کی سادگی اس قدر ہے کہ کوئی بات کوئی لفظ بالائے تفہیم نہیں ہے۔اس ضمن میں ریاض مجید نے امیجری اور تمثال کاریت بھی سلیس انداز میں دی ہے۔ نظم ''بے سود انتظار کا دکھ'' سے چند لائنیں اس ضمن میں ملاحظہ کریں:

حیاتِ نامراد کی ادائے دل خراش کا وہ منظر اپنے واسطے بھی دیدنی نہ تھا

ہزاروں لوگ پاس سے گزر رہے تھے۔۔۔جی اداس کر رہے تھے

لیکن ان میں ایک بھی بجھے بجھے نگاہ و دل کی روشنی نہ تھا (۷۶)

اُردُو نظم کا یہ دوسرا پڑاؤ تھا، جب ن۔م راشد اور ان کے ہم عصروں نے اس میں کئی اضافے کیے اور نئے اسالیبِ نظم خلق کیے۔ریاض مجید ان سے اگلے پڑاؤ کا شاعر ہے۔ان کی نظم اُردُو نظم کی تیسری جہت یا تیسرے پڑاؤ کی نمایندہ ہے، جس میں علامت و استعارہ سے امیجری اور تمثال کاریت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔اِس ضمن میں نظم میں استعارے اور علامت سے کار فرما حسن کاری کے بارے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''نظم جتنی زیادہ استعاراتی یا علامتی ہو گی، تہ نشین بیانیہ میں خاموشیاں اُتنی زیادہ ہوں گی یا خالی جگہیں ہوں گی یا کُچھ کڑیاں حذف ہوں گی اور ر نظم میں معنی چوں کہ کئی سطحوں پر کار گر ہو تا ہے یا طرفین رکھتا ہے،اِن سب کو کھولنا قرأت کے تفاعل یا جمالیاتی لطف اندازی کا حِصّہ ہے۔'' (۷۷)

ریاض مجید نے ادبی ریاضت اور وسیع مطالعے اور مشاہدے سے ،جو اُسلوب پیدا کیا ہے ،وہ اُن کے عصری اسالیب سے خاصا مختلف ہے۔اسی طرح کی ایک اور نظم ''کالے محاصرے میں گھری اُمّید کا روشن وطن'' کے اشعار بھی قابلِ ملاحظہ ہیں:

کس قدر فخر سے لوگ تیری مَحبّت سے اپنا تعلق جتاتے ہیں

بڑھ بڑھ کے باتیں بناتے ہیں

میں خموشی سے ہر طرح کی بات سنتا ہوں

چپ رہتا ہوں (۷۸)

ریاض مجید نے اپنی نظموں میں ،جو علامات استعمال کی ہیں ،وہ کوئی مقصود بالذّات شے نہیں ہیں۔یہ علامتیں اُن کے تجربات کے بیان میں محض ایک رابطہ کاری کا کام دیتی ہیں۔اصل مقصود ریاض مجید کے تجربے کی اکائی ہے ،جو جس کے زیرِ اثر اُنھوں نے شاعری تخلیق کی ہے۔اُنھوں نے اپنی ذات کے ہر اُس پہلو کو اجاگر کیا ہے ،،جو اُن کے ماضی کے تجربات کا عکاس

اورآئینہ دار ہے۔اِس عمل کے لیے اُنھوں نے ،جو استخراجی طریقِ کار استعمال کیا ہے، بالکل اُس کے مطابق اُنھوں نے علامتی نظام بھی وضع کیا ہے۔ وہ علامت کو فن پارے کے خوب صورت اظہار کے کامیابی سے استعمال کر جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اُنھیں علامتی تہہ داری، حسن کاری اور گہری معنویت کا صحیح ادراک ہوتا ہے۔ اُنھوں نے نظم میں تجربے کے اظہار پر علامتوں کو کبھی فوقیت نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے شعری تجربات کی اصالت کسی طرح متاثر نہیں ہونے پائی۔ ڈاکٹر وزیر آغا اِس حوالے سے رقم طراز ہیں:

"اُردو کے بعض جدید علامت پسند شعرا نے نظم میں تجربے کی اکائی کو نظر انداز کرتے ہوئے، محض نظم کی چند علامتوں کو ایگ کرکے دکھانے کی، جو روش اختیار کی ہے، اُس سے شعری تجربے کا سارا عمل مسخ ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامت، نظم کے کل کا ایک حِصّہ ہے، جب نظم کا کل، محض بے ربط تصوّرات کے ایک ڈھیر کی صورت اختیار کرے، تو اِس سے چاہے کتنی ہی لطیف علامات کیوں نہ استعمال ہوں، اُن کی فنی حیثیت صفر کے برابر ہو گی۔" (۷۹)

ریاض مجید نے فن کے اظہار کے لیے علامتوں کا استعمال ضرور کیا ہے، لیکن محض علامت سازی کے لیے وہ کسی طور پر امنی شعری فکر کو قربان نہیں کرتے ہیں۔ فکری حوالے سے ریاض مجید کی شاعری کا انسان بھی عجب مخلوق ہے۔ جذباتی ابتلا کے کم و کیف میں جس طرح کی یہ زندگی بسر کرتا ہے اس طرح کوئی اور مخلوق نہیں کر سکتی۔ خاک کا یہ پتلا خاک پر بے شمار غموں کو اپنی آغوش میں لیے پھرتا ہے۔ خاک انسان کی تخلیق کا مادہ اور روحانیّت اس کا لبادہ ہے۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں اور اپنی اپنی فطرت میں مقید ہیں۔ خاک عجُز انکساری اور بے بسی کی علامت ہے۔ اس کے مقابلے میں روح ترفع اور الوہی اعزاز کی علامت ہے۔ ہماری سرشت خاکی ہے اور اگر ہم اس سے منھ موڑ لیں گے، تو نتائج صِحّت مند بر آمد نہیں ہوں گے۔ خاک اپنی فطرت سے دُور نہیں رہ سکتی اور نہ رہی ہے، لہٰذا ہمارا اندر کا انسان اپنی بنیاد سے منھ نہیں موڑ سکتا۔ یہ خیال ایک نئی جہت کے ساتھ ایک نظم " نارساعصر کی آرزو میں" اس خیال کو یوں پیش کیا ہے:

کہ میرا سفر۔۔۔۔۔

فقط پانیوں کا سفر ہے!

میں (فنا کی سیاحت پہ نکلی ہوئی نسل کا) گمشدہ،

موت کی رہگذر کا مسافر ہوں

جانے کس مر چکے وقت سے بچ رہا ایک مظلوم باشندہ ہوں؟

جانے کس کٹ چکے عصر کی ایک اب تک ہری شاخ ہوں؟ (۸۰)

یہ سفر، جو کہکشاؤں کے درمیان اور تجسس کا سفر ہے، جہاں ساعتیں لڑھکتی جاتی ہیں اور جو انسان کے لیے لازمہ حیات سے اور اسی پر اس کے ارتقا کا مدار ہے، ہماری شاعری کا موضوع رہا ہے۔ زیست ہمیشہ امتحان میں رہتی ہے اور ایک مشکل سے نکل کر انسان اگلی میں مشکل میں پھنستا ہے۔ زندگی چیلنجز سے معمور ہے اور مسلسل جدوجہد سے تعبیر ہے۔ چاک کے ساتھ اس

سفرِ مشتِ خاک کے مضمون کو بیان کرنا واقعی اپنی جگہ ایک چیلنج رکھتا ہے۔ ریاض مجید کا کلام اس صورتِ حال کی صحیح غمازی کرتا ہے اور اس میں بدرجہ اتم تاثر کی گہرائی بھی موجود ہے۔ عدم کے کُوچ کی فکر لازم ہے، ہستی میں یہی تو وہ درس ہے، جو شعرا دیتے آئے ہیں، مگر اس میں کوئی اظہار کی جدّت یا اس میں کم از کم اپنا رنگ پیدا کرنے کی کوشش نہ ہونے کے برابر ملتی ہے۔ ریاض مجید نے نظمیہ موضوعات کے اظہار کی صورت میں اُسلُوبِ بیان کو بھی موضوع کی مطابقت سے مبدل کیا ہے۔ وہ انسان اور اس کے عوارضات کو موضوع بناتے ہیں۔ اس مشتِ خاک کے اس سفر کو مضمون بنایا ہے، لیکن اس میں اپنا انفرادی رنگ باقی رکھا ہے۔ اس سفر کو مزید یہاں تک ہی نہیں بیان کیا کہ اس کی حیثیت محض مخبر کی سی رہ جائے بل کہ اس سفر میں آنے والے حالات و واقعات اور تماشاؤں کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ یہ جو ورائے ذات کا اور ورائے انسان کا سفر ہے، اس میں درپیش مسائل کو اسی معروض میں دیکھنا اور قلبی آنکھوں سے محسوس کرنا بھی ایک نعمت ہے، جو ہر کس و ناکس کے پاس کہاں ہے! یہ وہ مضامین ہیں جن پر بہت کُچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا، مگر اس پر لکھنے کی گنجایشیں ہر دور میں رہیں گی اور لوگوں کے قلوب اذہان اس طرف ضرور مائل ہوں گے۔ لفظ 'دائرہ'' کسی اور شاعر کے ہاں اس طرح پُر معنی استعارہ بن کر سامنے نہیں آیا، جو اپنے وسیع تر وجودی معنوں میں مستعمل ہوا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ریاض مجید کے ہاں اس کے نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ اپنے اسی تخصصاتی علائم و رموز کی وجہ سے ریاض مجید کو اُسلُوبِ بیان کے حوالے سے اپنی انفرادیت قائم کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ سفر اگر زمیں کا رزق ہو جاتا تو اس کے امکانات ختم ہو جاتے اور اگر آسمان سرائی کا بھی ہو جاتا، تو امکانات کے دروا ہو جاتے۔ اس سے قطع نظر شاعر نے ایک اور تاویل نکالی ہے اور وہ یہ کہ اگر عمر ذرا اور طویل ہوتی تو ہمارے سفر کے امکان اور آگے جا سکتے تھے۔'' دائرے کی مسافت'' میں اس قسم کے خیالات کے برتاؤ میں شاعر کا اُسلُوبِ بیان ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظم نہایت معنی خیز ہے، جو ایک نئے انداز میں رائیگانی کے احساس کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہ وہ رائے گانی ہے، جس کے سوتے تشنگیِ ذات اور عدم تشفیِ ذات سے پھوٹتے ہیں۔ یہ مضمون ریاض مجید نے کئی جہتوں میں اور کئی زاویوں میں بیان کیا ہے:

وہی لفظ وہی دائرے، قوسیں، لہجے

کون سا لفظ کہاں سے لاؤں؟

جو نیا ہو، جو مرا اپنا ہو!

کون سا تجربہ کس طرح کروں؟

جو نیا ہو، جو مرا اپنا ہو! (۸۱)

یہ بے دلی کے اظہار کے ساتھ عدم تکمیلِ ذات کا نوحہ بھی ہے۔شاعر نے جس چیز کی خواہش کی ہے وہ تکمیلِ ذات کی خواہش ہے۔یہی آرزو اور اس کا اظہار اس کتاب کا مرکزی تخلیقی منطقہ بن کر سامنے آ رہی ہے۔اس میں انسان کی ازلی جستجو کا شعور بھی ہے اور شاعر کی اپنی آرزو بھی ہے کہ ایک بار تو اس درجۂ کمال نصیب ہو جائے۔

استفہامی اندازِ بیان:

شاعری میں استفہام کی روایت غالبؔ ہی سے باقاعدہ طور پر شروع ہوتی ہے۔غالبؔ نے اسرارِ کائنات پر سوالیہ نظر ڈالی ہے اور ایسے موضوعات کو استفہام کی شکل میں پیش کیا ہے۔" انتساب " کی نظموں میں سے بعض نظمیں، تو سوال ہی عنوان سے موجود ہیں۔مثال کے طور مندرجہ ذیل نظم کا عنوان " ایک سوال " ہی ہے، جس میں ازل تا ابد اور ارتقاے انسانی کے حوالے سے ذات کی تکمیل وعدم تکمیل کے جاں سوز مراحل پر استفہامی انداز میں بات کی گئی ہے۔بڑے بڑے شعرا بھی جب اس قسم کے موضوعات کو نظم کرنے لگتے ہیں تو لڑکھڑا جاتے ہیں اور اپنے لکھے کا معیار برقرار نہیں رکھ سکتے۔اس کی وجہ شاید مشکل و ثقیل موضوعات میں سہلِ ممتنع اپنانے کے معاملے میں شاعرانہ صلاحیتوں کا اختلاف بھی ہو سکتا ہے، جو ہر شاعر کے لیے منفرد اور ممیز ہوتا ہے۔یہ اُسلُوبِ بیان فکر انگیز قسم کا ہے۔ملاحظہ ہو:

تو رک کر ہماری رفاقت کی خُوش بُو سے مہکے دنوں کی صداؤں کو سننا

وہ دن یاد کرنا

کہ جب لفظ زینے تھے۔۔آواز سیڑھی تھی

۔۔۔۔اور

آواز کا لمس اک دوسرے کے تعارف کا وہ رستہ تھا

کہ جس راستے پر طلب کی نوید افشاں رت کے سلگتے ٹھٹھرتے ہر اک ذائقے کو چکھا(۸۲)

اس طرح کے دیگر مضامین و خیالات " انتساب " کا اختصاص ہیں۔اور اس کے مشمولات کے ساتھ مکمل مطابقت رکھتے ہیں۔اس میں حیرت کا استعارہ کبھی تجسس اور کبھی تحیر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔اس حیرت کی نوعیت دو طرح کی ہے۔پہلی طرح کی وہ حیرت ہے، جو نظری حیرت کہلائی جا سکتی ہے۔یعنی ایسی حیرت، جو آنکھوں سے موجودات کے مشاہدے اور ان کے عجیب الخلقت ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ذیل کی لائنوں میں حیرت کے ساتھ، جو مضامین نکالے گئے ہیں وہ اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔

استعجابی اُسلُوبِ بیان:

استعجاب انسان کے ارتقا کے اہم عوامل میں سے ہے۔ استعجاب ہی کی بدولت انسان یا تو نئی تحقیق کا راستہ اختیار کرتا ہے یا پھر وہ اس منظرِ استعجاب کی پرستش کرنا شروع کر دیتا ہے۔ انسان کے چاروں طرف ہی استعجاب ہے۔ یوں سمجھیں کہ وہ سلسلۂ استعجاب ہی کا پروردہ ہے۔ نظر کی حیرتیں انسان کائنات اور موجودات کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی دعوت دیتی ہیں۔ ہزاروں ایسی علامات اور عجائب خانے ہیں جہاں نظر رکتی ہے اور ہر آئینے میں حیرت آثار مناظر کی ایک لاما حدود سلسلہ نظر آتا ہے۔ کوئی بھی عکس ایسا نہیں ہوتا جس پر نظریں رک جائیں اور اس کی مکمل تفہیم کر لیں بل کہ اس ایک عکس کے عجائبات سے ورطۂ تحیر میں پڑ جاتی ہیں اور پریشان و سرگرداں ہوتی ہیں۔ ایسی حیرت ایک شاعر کے ہاں ہی ملتی ہے کیوں کہ ایک عام شخص مشاہدہ کی اس باریک بینی سے محروم ہوتا ہے۔ آئینے اور حیرت کے تلازمے کے ساتھ اُردُو شاعری میں بہت سے شعرا نے بہ کمال مضامین و خیال کو اشعار میں باندھا ہے اور کئی شعرا نے بڑے بڑے مضامین نکالے ہیں۔ ریاض مجید نے نظموں میں بھی حیرت کے ساتھ لائقِ توجُّہ مضامین نکالے ہیں اور ان میں اظہار کی نُدرت پیدا کی ہے۔ اظہار کے ذائقے کو بدلا ہے۔ ''انتساب'' کی بے شمار نظمیں ایسی ہیں، جن میں ریاض مجید نے استعجاب اور تحیر آثار انداز میں سرِ آدم و کائنات کے موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ایک نظم بعنوان ''بدن کا مرثیہ'' یہ لائنیں ملاحظہ ہو:

کس نے لکھا، لکھے گا کون میرے بدن کا مرثیہ
گذری رتوں نے کیا دیا آتی رتوں سے کیا اُمّید؟
دل کی جوان موت پر پہنے سیہ لباس کون؟
میری کہانیاں لکھیں، کس کی شفیق انگلیاں
کون سے نیک دل کا ہاتھ مجھ پہ قلم اٹھائے گا؟
بانجھ زمیں کی خاک پر پھیلا ہوا لہو ہوں میں
میرے نصیب میں نہیں پھول رتوں کے معجزے
(کون سمجھ سکے مری حسرت دل کا المیہ) (۸۳)

یہ حسرت یہ استعجاب کی کیفیت کا بہترین اُسلُوبِ بیان ہے، جو شاعر نے اپنی ذات کے حوالے سے کیا ہے اور یہ اُسلُوبِ بیان استعجاب کے کم و کیف کے میں گندھا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ چشمِ تماشا کی حیرت ہے، جس کا اظہار شاعر نے آنکھوں کا لفظ استعمال کر کیا ہے اور اسی حیرت سے انسان آگے کی جانب بڑھتا ہے کیوں کہ اسے نادیدہ جزیروں کو دیکھنے کی خواہش ہوتی

ہے اور اسے یہ جستجو رہتی ہے کہ وہ مظاہرِ عجائب کی حقیقتوں تک رسائی حاصل کر سکے۔ یہ حیرتیں وہ حیرتیں ہیں، جو زمان و مکان کی حدود اور اس کے ابعاد سے نکلتی جاتی ہیں۔ ان کا تعین محال ہی نہیں ناممکن ہے۔ اعداد شماری میں اس کے ابعاد کو بند نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ابعاد کی وسعتیں لامحدود ہیں اور ان کی کوئی حد نہیں۔ ایک اور نظم "ہم شکل خواہشوں کے لیے" سے چند سطور ملاحظہ ہوں:

ہماری پرانی رفاقت کی تصویر

اور گم شدہ یاد پہ ایک آنسو

تیری پلکوں سے گالوں پر گرنے کو تیار آنسو

مَحبّت کا یہ آئینہ دار۔

یہ غمخوار آنسو۔ (۸۴)

حیرت کی دوسری قسم وہ ہے، جس میں ہر کس و ناکس مبتلا نہیں ہوتا اور صرف گنے چنے لوگ ہی اس حیرت سے آشنا ہوتے ہیں۔ اس کے ذائقے میں لذاتِ تجسسات ہیں اور اس کی الجھنوں میں فکر کی شیرینی ہے۔ یہ نظری حیرت سے کئی ابعاد پر اپنا وجود رکھتی ہے اور اس کی حدودِ اربعہ وہاں سے شروع ہوتی ہیں، جہاں سے نظری حیرتیں سمٹ کر ایک نقطے میں مقید ہو جاتی ہیں۔ یہ نقطہ اور کائنات میں کہیں نہیں بل کہ انسان کے اپنے ذہن میں ہوتا ہے۔ حیرت کی موخر الذکر قسم ایک تخلیق کار اور فلسفی کے ذہن میں کی پیداوار ہے، جو ایک منطقی انداز میں عقل و خرد کے ذریعے سے اور اپنے تجربات کے استنتاج کی روشنی میں کسی مسلمہ حقیقت کو یا تسلیم کرتا ہے یا نئے سرے سے دریافت کرتا ہے یا اس کا استرداد کرتا ہے۔ یہی استعجاب جب یقینی و بے یقینی کے مابین ڈھل جائے تو بسا اوقات نتیجہ تشکیک بھی نکلتا ہے، جسے متشکانہ اُسلُوبِ بیان کے ساتھ شاعر نے ایک نظم "اندیشہ ہائے دور دراز" میں یوں پیش کیا ہے:

تری خواہش نے کس تشکیک کا ملبوس پہنا ہے؟

تری بابت کسی سے پوچھنے میں خوف آتا ہے

وہ جانے کیا کہے؟

ترے بارے میں کوئی بات بھی کرتا ہوں تو ڈرتا ہوں

جانے گفت گو کیا رنگ پکڑے؟

تری بابت کسی سے کوئی بھی رائے طلب کرتے لرزتا ہوں

وہ جانے تجھ کو کیسا نام دے!　　　(۸۵)

شاعر کے احساس کو ایک نارسا شک نے جکڑ رکھا ہے، جس کے کرب کا اسے علم ہے، مگر اس کے ماخذ و مرجع کا علم نہیں ہے۔ یہ حیرتوں کے سفر میں ایک عجیب احساس کا پڑاؤ ہے، جسے اسی کم و کیف کے حامل اُسلُوبِ بیان کے ساتھ شاعر نے پیش کیا ہے۔ شاعر کے ہاں اس کا محلِ وقوع تجربہ ومشاہدہ نہیں بل کہ متخیلہ اور وجدان ہوتا ہے۔ یہیں سے نئی پشین گوئیاں ہوتی ہیں۔ شاعر اپنے وجدان اور فلسفی اپنے تعقل سے عاجز آ کر کسی خلاف عقل امر یا واقعہ کی تفہیم سے عاجز آ جاتا، ہے تو حیرت جنم لیتی ہے۔ حیرت کی اس قسم کو ہم تعقلاتی حیرت کہہ سکتے ہیں۔ ایک اچھّے شاعر کے ہاں حیرت کی ان دونوں کا ہونا ضروری ہے کیوں کہ اس کے بغیر اس کا تخلیقی تجسس قائم نہیں رہ سکتا اور جب تخلیقی تجسس معدوم ہو جائے تو پھر شاعری محض ذہنی ریاضت رہ جاتی ہے اور اس میں شعریت کا شورِ انگیز سودا باقی نہیں رہتا۔ ذیل کے اشعار میں دیکھیے ریاض مجید نے کس خوب صورتی کی ساتھ اس حیرت کو انسانی ذات کی نا قابلِ تفہیم پنہائیوں کے طور پر پیش کیا ہے اور حیرت کے خوب صورت اور جامع مرقے اپنی نظموں میں پیش کیے ہیں۔ چند ایک لائنیں ''پر اسرار لمحہ'' سے ملاحظہ ہوں:

دل ورق سے جدا اور ورق انگلیوں سے علیحدہ

کوئی شئے نہیں ہے!

ہمہ اوست کا مرحلہ ہے

خون کاغذ کے پھیلے ہوئے راستوں کی سیاحت کو نکلا ہے

الفاظ میں دل دھڑکنے لگا ہے

ہونٹ چپ ہیں، مگر اب قلم کو زباں مل گئی ہے

ورق بولنے لگ گیا ہے!　　　(۸۶)

کیسا استعجاب انگیز اُسلُوبِ بیان ہے کہ، جس طرح شاعر اپنی محویت کو تیز کرتا جاتا ہے قاری اسی قدر اُسلُوب کی زیریں تہہ میں چھپی حیرت میں مبتلا ہوتا جاتا ہے۔ یہ شاعر کا کمالِ فن ہے کہ اس نے ایک پر اسرار لمحے کو حیرتوں سے معمور کیا ہے اور اسے ایسا جاندار اندازِ بیان دیا ہے، جو کسی اور کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔ یہ حیرت کبھی ان دیکھی دنیاؤں کی حیرت بھی بن کر سامنے آتی ہے۔ آنے والے جہان اور آنے والے زمانے کی حیرت کا ذائقہ ہی کُچھ اور ہوتا ہے۔ ریاض مجید نے مستقبل کے حیرت افزا لمحوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قاری کو دعوتِ غور و فکر دی ہے۔ یہی حیرت مابعد کی حیرت میں جب متشکل ہوتی ہے، تو اس کے لیے کرن کا جسم اور خُوش بُو کا لباس کیوں مانگا گیا ہے؟ کیا اس کی کوئی مابعد الطبیعاتی توجیہہ ہے یا نہیں؟ اس بابت شاعر کا خیال واضح نہیں ہے، مگر اتنا ضرور مترشح ہوتا ہے کہ مابعد کے سفر کے لیے بدنِ خاک نہیں بل کہ

روشنی کا بدن چاہیے۔ یہاں پر ہمیں مادے کا روشنی میں تبدیل ہونا اور روشنی کا مادہ میں تبدیل ہونے کا آئین سٹائینی نظریہ بھی یاد آتا ہے۔ شاعر کی متخیلہ نے اس شعر کی معنیات کو سائنسی انکشاف کے بہت قریب کر دیا ہے۔ ہست در اصل وہ آئینہ ہے ،جو کسی بھی رت میں صیقل نہیں ہونے پاتا اور کوئی بھی لمحہ اس کے سرِ نہاں ہو مظہریت کا جامہ نہیں پہنا سکتا۔ پنہائی کا وہ مقام ہے جہاں حیرت ہی حیرت ہے۔ انسان اسی حیرت کا مُرقّع ہے۔ اس خیال کو کس قدر فنِ اظہار کی ندرت ملی ہے۔ انسان حیرت کا پتلا ہے۔ ریاض مجید کے ہاں حیرت زندگی کی معجز نمائیوں کے لیے مخصوص لفظ ہے ،جو زندگی میں آنے والے معجزات کی نمایندگی کرتا ہے اور جہاں حیرتِ ذات میں پڑ کر انسان اپنی عقل کے ناقص ہونے کا گمان کرنے لگتا ہے۔ معجزہ کیا ہے؟ اہلِ علم اس کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ ،جو امر یا امرِ واقعہ عقل و خرد کے اُصولوں سے مبرا اور ماوراہو اسے معجزہ کہتے ہیں۔ یا پھر یہ کہ معجزہ عقلی اُصولوں کے ٹوٹنے کا نام ہے۔ ہمارے خیال میں یہ دونوں تعریفیں ناقص ہیں۔ در اصل معجزہ الوہیت کے مخفی اُصولوں کے ظاہر ہونے کا نام ہے۔ معجزات قوانینِ فطرت ہی کے تحت ہوتے ہیں اور اس سے ماوراہر گز نہیں ہوتے۔ ریاض مجید کے ہاں بھی اِنھی معجز نمائیوں پر اظہارِ حیرت ملتا ہے جن کا تعلق زندگی کے کسی نہ کسی پہلو سے ہے۔ حیرت کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر بڑھتے پھیلتے ارمان اور آرزوئیں آگے جاتیں، تو اپنی ہی گرمیِ حیرت سے جل کر راکھ ہونے کا خدشہ ہو سکتا ہے۔ ''کالی رتوں کا معمول'' سے ملاحظہ ہو:

رات دن ایک ہی شغل ہے

رات ہوتی ہے تو آسماں پر ستاروں کی گردش کا احوال پڑھتا ہوں

دن نکلتا ہے تو اپنے ہاتھوں کی پھیلی لکیروں کے اسرار پر غور کرتا ہوں

نااُمّیدی کی اس انتہاگئی گذری حالت میں بھی ایک اُمّید سی ہے

کبھی تو ستارے کسی نیک ساعت کی آمد کی خوشخبری دیں گے

کبھی تو لکیریں کسی مہرباں رت کے آنے کی پشین گوئی کریں گی! (۸۷)

یاس و نااُمّیدی کے مابین رجائیت و اُمّیدی کی کرنیں تلاش کرنا اور حیرتوں سے معمور ستاروں کی گردش کا احوال معلوم کرنا بذاتِ خود ایک تحیر زا قسم کا عمل ہے جسے شاعرانہ استعجاب کے ساتھ شاعر نے کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بظاہر مضمون بہت عجیب ہے، مگر اشعار کو دیکھنے سے لگتا ہے کہ علامتی انداز میں ہونے اور کرب آگہی کو ذاتِ انسانی کے انسلاک کے ساتھ رجائیت افزا لہجے میں بیان کیا گیا ہے۔ انسان جب کسی چیز کی اصل حقیقت کو جانتا ہی نہ اور تمام عمر ایک ایسے نظریے کے تحت بتا رہا ہو، جس عواقب اور ازلی حقائق کو وہ خود نہ سمجھتا ہو، تو اس جیسا لاادری کوئی نہیں ہو سکتا۔ مگر جب اسے کسی حقیقت کا علم ہوتا ہے تو وہ اس کو تسلیم کرنے کے بجائے اس پر اظہارِ حیرت کرتا ہے۔ آفاق میں آیاتِ الٰہی یا اللہ کی نشانیاں تو انسان کو

آج واقعی حیرت میں ڈالے ہوئے ہیں، جب کہ میڈیکل سائنس نے انسان کے اندر کی لامحدود اور لامتناہی کائنات کو بھی کسی حد تک کھنگال کر انسان کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ قرآن کا یہ قول اپنی صداقت کے اعتبار سے کتنا بے نظیر معلوم ہوتا ہے۔ اسی حیرت کا سلسلہ ریاض مجید کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری سراپا اظہارِ استعجاب ہے اور استعجاب کے لہجے میں وہ دائرے کے پس منظر میں انسان کی ہستی کو موضوع بناتے ہیں۔ دائرے کی مسافت، جو کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتی انُ کو ریاض مجید نے تحیر آثار انداز میں بیان کیا ہے۔

۲۔ "انتساب" کی نظموں کا موضوعاتی مطالعہ

سماجی و ذاتی مسائل کی نمایندگی:

شاعری اپنے عہد کی آواز ہوتی ہے۔ عہد بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق خارج سے ہوتا ہے اور دوسرا عہد وہ، جو انسان کے باطن میں پنپتا ہے۔ انسانی باطن کا عہد ماضی و حال اور استقبال کے بکھیڑوں سے آزاد ہوتا ہے۔ یہ انسان کے اندر کی آواز ہے، جسے وہ محسوس کرتا ہے اور اسی کے ساتھ سب سے زیادہ فکری انسلاکات رکھتا ہے۔ اسی طرح خارج کا عہد بھی اپنے لوازمات رکھتا ہے۔ اس کے اثر سے بھی انسان بچ نہیں سکتا۔ شاعر تو ویسے بھی حساس مخلوق کا نام ہے، لہٰذا وہ اپنے عہد سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ غزل یا نظم کا شاعر اپنے عہد کے آشوب سے بہ خوبی آگاہ ہوتا ہے اور اس کے سامنے گزرنے والا ہر واقعہ اپنے ساتھ ردِ عمل بھی ساتھ لاتا ہے۔ یہ ردِ عمل ویسے تو ہر انسان میں پیدا ہوتا ہے کیوں کہ تمام انسان حسیات ک بندے ہیں، مگر شاعر میں یہ حساسیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اور پھر شاعر کا یہ تخصص بھی ہوتا ہے کہ وہ اظہار کی قدرت سے بارور ہوتا ہے۔ اور اپنے خیالات کو فن کی اعلیٰ ترین صورت یعنی شاعری میں بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ شاعر کی آنکھ باریک بین ہوتی ہے اور وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی تبدیلی کا شاہد اور اس کا محسوس کرنے والا ہوتا ہے۔ کسی شاعر کا مشاہدہ جتنا زیادہ قوی ہو گا اس کی شاعری میں سماجی و عمرانی مسائل کی بازگشت اتنی ہی زیادہ سنائی دے گی اور جس شاعر کے ہاں تخیل کی فراوانی ہو گی اس کی شاعری میں کے پاؤں زمین پر نہیں لگیں گے اور وہ تخیل کی ہرزہ سرائیوں میں رہے گا۔ شاعر اسی زمین کا نمک کھاتا ہے لہٰذا اسے ساکنانِ ارض کی خبر گیری کرنا چاہیے۔

تخیلات میں مستغرق شعرا کے کلام میں وقتی طور پر ایک گوشۂ عافیت تو ہوتا ہے، مگر حقائقِ معروضی سے وہ کوسوں دور ہوتے ہیں۔ ایک اچھّا اور بڑا شاعر وہی ہو سکتا ہے جس نے اپنی شاعری کی بنیادیں زمیں اور اہلِ زمین کے مسائل کے ساتھ پیوستہ رکھی ہیں۔ شاخ اگر اپنے شجر سے ٹوٹ جائے تو سحابِ بہار اسے ہرا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح شاع، رجب اپنے معاشرے سے کٹ جائے تو اس کی شاعری قبولِ عام کی سند حاصل کر نہیں سکتی اور وہ ایک اچھّا شاعر نہیں کہلایا جا سکتا۔ عوام اس تحریر یا

فن پارے کو پڑھنا پسند کرتے ہیں جس میں ان کے مسائل کی نمایندگی کی گئی ہو، لہٰذا ایک اچھّے شاعر کے ہاں معاشرتی مسائل کی نمایندگی ہوتی ہے اور اس کی شاعری میں سماجی مسائل پر کُچھ نہ کُچھ کہا گیا ہوتا ہے، جو عوام کے دلوں اور ان کی سماعتوں کو اپیل کرتا ہے۔ اور جس شاعر کی روئیدگی معاشرے کی جڑوں میں نہیں رہتی اور اس کی شاعری تہذیبی شعور سے بے گانہ ہوتی ہے وہ جُز وقتی شاعر ہوتا ہے اور اس کے جانے کے ساتھ ہی اس کی شاعری بھی اس جہانِ فانی سے کوچ کر جاتی ہے۔ ریاض مجید ان شعرا میں سے ایک ہیں جن کی شاعری اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنی مٹّی سے گہری جڑت اور وابستگی رکھتی ہے، ان کی شاعری میں آج کے انسان کے مسائل کی نمایندگی موجود ہے۔ ان کی روئیدگی کا راز زمین سے جڑے رہنے میں ہے اور اسی روئیدگی کی وجہ سے وہ پھلتے پھولتے ہیں اور ثمر بار ہوتے ہیں۔ ان کی تخلیقی صلاحیّتوں کا پھلنا پھولنا ان کے اسی امر میں مضمر ہے۔ ایک حساس انسان کی طبیعت پر آج کا پُر آشوب دور جس میں جان و مال اور عزّت و آبرو کُچھ بھی محفوظ نہیں ہے، کس طرح اپنے آپ کو بے بس و لاچار محسوس کرتا ہو گا یہ تو اس کے اظہاریے ہی بتا سکتے ہیں۔ اس بے بسی و پابستگی کے عالم میں جہاں چلتے پھرتے انسان آن کی آن میں بس ایک زور دار دھماکے کے نتیجے میں چیتھڑوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور جہاں اسکول جانے والے بچّوں کی سلامتی پر سوالیہ نشان ہے کہ وہ واپس زندہ بھی آتے ہیں یا نہیں؟ یہی وجہ ہے بے یقینیت اور عدم اعتماد کی فضا روز بروز مائل بہ تخریب ہوتی جا رہی ہے اور زندہ رہنے یا اگلے لمحے صحیح سلامت ہونے کا بارے میں کُچھ نہیں کہا جا سکتا ہر طرف خوف کی حکمرانی ہے کہ انسان اپنے سائے سے بھی بعض اوقات ڈر کر بھاگنے لگتا ہے۔

یہ وحشت کا وہ عالم ہے جس کو ریاض مجید نے اپنی نظموں میں موضوع بنایا ہے۔ چند ایک نظموں سے اشعار دیکھیے، جن میں سماجی مسائل کی نمایندگی نظر آتی ہے۔ '' ویران ائیر پورٹ'' سے یہ لائنیں دیکھیں:

ایک اک کر کے سب جا چکے ہیں،

جانے والے بھی اور وہ بھی، جو ان کو جاتے ہوئے دیکھنے آئے تھے

میں رن وے سے کُچھ دور ریلنگ کو پکڑے اکیلا کھڑا رہ گیا ہوں

فضاؤں میں یوں گھورتا ہوں

کہ جس طرح پھیلے اُفق نے مری زیست بھر کی کمائی ہوئی شے نگل لی ہو،

اسی طرح کے اشعار نظم '' دکھ کی بات'' سے ملاحظہ ہو:

زندگی ہے روز و شب کا بحرِ بے پایاں۔۔۔، مگر۔۔۔۔

اپنی ذات۔۔۔

ہائے بس اک لمحۂ پراں کی موج،

ہم نے ماضی بھی نہ دیکھا اور فرد اسے بھی بے بہرہ رہیں گے (۸۸)

انسان اجتماعی اور انفرادی طور پر کرب وبلا سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ کرب وبلا ذاتی ہو تو انفرادی ہے اور اگر اس سے پورا معاشرہ دوچار ہو تو وہ اجتماعی بن جاتا ہے۔ ہمارا معاشرہ دہشت گردی اور بدامنی کے ایسے ہی کرب وبلا کے دور سے گزر رہا ہے، جہاں قاتلوں کو ہم جانتے ہیں، مگر اُنھیں کیفرِ کردار تک پہنچا نہیں سکتے۔ جہاں تعلیم پر اپنی ساری جمع پونجی خرچ کرنے کے بعد بھی صد ادھکے کھانے پڑتے ہیں۔ جہاں خونی رشتوں کا پاس نہیں۔ جہاں معاشرے کی اچھّی اقدار و روایات اپنا دم توڑ رہی ہیں، جہاں انسان محض روبوٹ کی صورت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ جہاں ہندو بنیے کا فریضہ مسلمان سود خور بن کر انجام دے رہے ہیں، جہاں ایک مسلمان کو مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ جہاں فحاشی کی دلدل میں بچّوں سے لے کر بوڑھوں تک پھنسے ہوئے ہیں۔ جہاں انسان کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور چند روپوں کے مقابلے میں اس کی قیمت ارزاں ہے۔ جہاں اپنوں کی اور اپنے خونی رستوں کی کوئی قدر نہیں۔ ایسا معاشرہ جہاں حکمران سات دہائیوں سے عوام اور ملک کو لوٹ لوٹ کر معیشت کو تباہ و برباد کر چکے ہیں۔ ایک ایسے معاشرے میں زندہ رہنے والے شاعر کے سامنے یہ سب کُچھ ہو رہا ہو اور وہ اسے اپنی شاعری کا پیرہن نہ دے، بہت ہی عجیب بات ہو گی، لہٰذا ہر اچھّے شاعر کے ہاں ان مسائل کی بھرپور نمایندگی ہونی چاہیے۔ ریاض مجید نے ان معاشرتی مسائل کو بڑی خوبی کے ساتھ اپنی شاعری کا حِصّہ بنایا ہے۔ یہ ملاحظہ کیجیے جس میں اس معاشرے کے مجرموں کو تو معزز ٹھہرایا جاتا ہے، مگر بے گناہ لب کشائی کرنے والے لوگ دھر لیے جاتے ہیں۔ موجودہ دور میں انسان کی معاشرتی زندگی کو محدود کرنے اور دوستوں سے دور کرنے میں جس چیز کا سب سے بڑا ہاتھ ہے وہ مادیت پرستی ہے یا مشینی طرزِ زندگی ہے۔ یہ اب ہمارا ایک سماجی مسئلہ بن چکا ہے، جہاں پہلے ہمارے پاس رشتہ داروں اور دوستوں کے لیے گھنٹوں وقت ہوتا تھا اب چند ساعتیں بھی میسّر نہیں ہیں۔ اور تو اور اپنے والدین اور گھر والوں کے لیے بہت کم وقت ملتا ہے۔ گھریلو زندگی اور خاندان کی زندگی اس مشینی مصروفیت کی وجہ سے کافی متاثر ہوئی ہے۔ یہ سماجی مسئلہ روز بروز گھمبیر ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے پیچھے زیادہ تر، جو عوامل کار فرما ہیں وہ مادی ترقّی کی دوڑ دھوپ ہے۔ دولت کمانے اکٹھا کرنے کی جستجو ہماری خاندانی زندگی کے اجاڑ کا سبب بنی ہے۔ ریاض مجید کے ہاں اس المیے کا اظہار بکثرت ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہ انسان ماضی کی فرصتوں کو یاد کر کے بعض اوقات اپنے دل کی تسکین کا اسامان کرتا ہے۔ ماضی کی فرصتیں اور احباب و اقارب کی بے لوث محبّتیں آج کے زمانے میں تو محض خیالی باتیں ہی معلوم ہوتی ہیں، لیکن انسان پھر بھی ہزاروں صدیوں پیچھے کی جانب پلٹنے پر تیار ہے اگر یہ دلی سکون اور تسکین اسے میسر آجائے۔ اس زمانے کے آشوب کا اور کس طرح کے سوز و گداز کے ذریعے اظہار ہو کہ ایک ہی گھر میں رہنے والے ایک ہی بستر پر سونے والے دو روح یک قالب اپنی اپنی ہتھیلی پر رکھی دنیا میں محو ہیں اور ایک دوسرے کے لیے وقت

نہیں۔ شاعر نے اسے اپنے اپنے خواب کی علامتیت کا رنگ دے کر بیان کیا ہے۔" بوڑھے لمحوں میں ملنے کی طلب" سے یہ مصرع دیکھیے:

بود پر ہست کے ایک پل کی حکومت کا عکس بقا ہے

کہ ہر آتا پل جا چکے کے لیے بے شباہت کی تکلیف دہ چھاپ ہے

گرمیوں بھر یہی شغل (بنتی بگڑتی شباہت کا) جاری رہے گا

بالآخر کسی روز ڈھلتی ہوئی گرمیوں کی کسی آخری سہ پہر، جمتی جاتی ہوئی تارکول اپنے سینے پہ اچھا۔ برا کوئی اک

آخری نقش محفوظ کر کے نئے سال میں آتی گرمی کی دوپہر تک کے لیے مطمئن۔ پر سکوں۔ شانت ہو جائے گی

جون کی جلتی دوپہر میں تپتی سڑکوں پہ پگھلی ہوئی تارکول ایسا دل

میرا تاریک دل،

نئے نت نئے نقش کا آرزو مند،

اس دائرے کی مسافت کے قیدی کو تازہ (خراشوں لکیروں سے بنتی)

شباہت کے ارمان میں بے شباہت ہوئے جانے کی جستجو ہے (۸۹)

"انتساب" کی نظمیں ہمارے عہد کی تابناک آواز ہیں، جس میں معاشرے کے ہر پہلو کو علامتی و جدید استعاراتی نظام میں جمال آفریں اور تحیر آثار اُسلُوب میں پیش کیا گیا ہے۔

ریاض مجید کی نظموں کے مجموعے "بے چہرہ کونپلیں" کا موضوعاتی مطالعہ:

"بے چہرہ کونپلیں" میں شامل نظمیں ریاض مجید کے فکری تسلسل اور موضوعاتی تنوّع کی مثالیں ہیں۔ اِس میں شامل بعض نظموں پر "انتساب" کے شاعر کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ بعض نئے موضوعات ہیں، جنھیں ریاض مجید نے خاص رومانی فکر کی نظر کیا ہے۔ ریاض مجید کی ماضی پسندی یہاں بھی اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اِس مجموعے کا پیش لفظ اپنے اندر شعری جامعیت رکھتا ہے، جس میں دوام آثار حرفوں میں چھپی حیرت کے لامتناہی تازہ تر امکانات روشن دکھائی دیتے ہیں۔ اُن تازہ کری سی بہ خوبی کام لینے کا ہنر ریاض مجید کو خوب آتا ہے۔

ریاض مجید نے "بے چہرہ کونپلیں" میں 'الف' سے 'ی' تک دائروں اور لکیروں میں ہر بدلتے عہد اور اُس کی روایت کا ایک طرح سے نوحہ بیان کیا ہے۔ وہ ماضی کی حسین یادوں کو یہاں بھی اپنا حسین سرمایا گردانتے ہیں۔ اُنھوں نے خاموش

آنسوؤں کو ایک خاص زُبان دی ہے،،جو اُن کے چہرے کو عجب تمازت سے روشناس کر گزرتی ہے، جس سے اُنھوں نے مہکتے لمس کی تصویریت سے کام لیتے ہوئے بے شباہت خواب کی تعبیر کی ہے۔اُن کی یہ نظمیں آوازوں کی بازگشت سناتے ہوئے چہروں میں ڈھل کر ایک ایسی تجسیم کرتی ہیں، جن کے ربط و تسلسل سے ریاض مجید کے خواب آور مُرقّع منظرِ عام پر آتے ہیں۔ریاض مجید نے لہو کی آنچ سے جذبوں کے لکنت خور رویّوں کو تکلّم آشنا کی ہے۔اُن کا اُسلوب بکھری خاک کو اظہار کے تازہ قرینوں کی شناسائی سے اثبات کا درس دی رہاہے۔زیرِ نظر کتاب کے پیش لفظ سے چند شعری تماثیل ملاحظہ ہوں:

سُلگتی خواہشوں کے ریت ذرّوں کو چھلکتی چھاگلوں کی شکل دیتے ہیں

ہنر کے بھید سے پُر لفظ کیسے ہیں؟

جنھیں چھو کر لہو کی آخری تہہ میں چھپے دکھ گویا ہوتے ہیں

رگوں میں پھیلے گودے کی نگاہوں میں نہ آتی انتہاؤں پر رکی حیرت بھری

گونگی اذیّت گفت گو کا اذن پاتی ہے

خموشی بولتی... تخلیق سے لبریز لکنت مسکراتی ہے (۹۰)

ریاض مجید نے اپنی نظم ''سیر چشم آرزوؤں کا دکھ'' میں اپنی دیریاب آرزوؤں کو بیان کرتے ہوئے زیست کے سفر کو مقدر کا ہم سفر قرار دیاہے۔اُنھوں نے اپنی بجھتی ہوئی آنکھوں کے بیدار خوابوں میں سیر چشم آرزوؤں کے دکھ کا نوحہ بیان کیا ہے۔اِس نوحہ بندی میں وہ اپنی خواہشات کو بالاے طاق رکھ کر بات کرنے کا ہنر سیکھ چکے ہیں،تو اُن کو احساس ہوا ہے کہ وقت کی تند و تیز اور بے رحم آندھیوں نے شب و روز کے قیمتی اثاثوں کو تہس نہس کر دیاہے۔

ریاض مجید نے اپنے گرد ہوتی ہوئی زیست کی ملگجی دھوپ میں چاہتوں کی تصویروں کے خوب صورت اور دل آویز رنگوں کو ڈھلتے دیکھا ہے،تو اُنھیں احساس ہوا ہے کہ لہو کی خنک زدہ روشنی انسانی چاہت کی ہر ایک تصویر کو دھندلا کے رکھ دیتی ہے۔ریاض مجید نے انسانی خواہشات کو وقت کے بے رحم ہاتھوں میں کھیلتے دکھا کر ایک طرح سے وقت کے دوام کو امر ہوتے ہوئے دکھایاہے۔چند مصرع بہ طور مثال ملاحظہ ہوں:

اے!

مجھے،جو تم قطبین کی دُوریوں سے صدا دے رہے ہو

مری سیر چشم آرزوؤں کا دکھ جانتے ہو؟

مری بجھتی جاتی ہوئی آنکھ میں خواب آج بھی جاگتے ہیں

مگر میرے اور اُن کے مابین خواہش کا کوئی حوالہ نہیں ہے!

وقت کی تیز رو آندھیوں میں

روز و شب کے اثاثے بکھرنے لگے ہیں (۹۱)

ریاض مجید ایسے باشعور فن کار ہیں، جنھوں نے اُردُو ادب کی جملہ اصناف کو وہ اعتبار عطا کیا ہے کہ نو واردانِ شوق اُن سے بساط بھر استفادہ کرتے ہیں۔ یہی نہیں انھوں نے ہر صنفِ سخن میں ایسا قصرِ شعری آراستہ کیا ہے کہ، جس کی ضو فشانی کا پورا عصری اُردُو ادب معترف ہے۔ نظم کے باب میں انھوں نے موضوعاتی تنوّع اور جدّتِ خیال کو شعوری طور پر برتتے ہوئے ایک نئی راہ تلاش کی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔انور جمال،ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن،اسلام آباد م۱۹۹۸ء،ص ۱۱۲

۲۔خاطر غزنوی،جدید نظمیں،یونی ورسٹی بک ایجنسی،پشاور،۱۹۷۶ء،ص۹

۳۔جابر علی سیّد،جدید شعری تنقید،بیکن بکس،ملتان،۲۰۰۲ء،ص۶۹

۴۔پروفیسر احتشام حسین،کشاف تنقیدی اصطلاحات،مُرتبہ: ابوالاعجاز حفیظ صدیقی،مقتدرہ قومی زُبان،اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص۱۹۹

۵۔عتیق اللہ،جدید نظم: ہیئت اور تجربے، مشمولہ: اُردُو نظم ۶۰ کے بعد،از زبیر رضوی،اُردُو اکادمی،دہلی۔۱۹۹۵ء،ص ۱۰۴

۶۔ڈاکٹر انور سدید،اُردُو ادب کی مختصر تاریخ،عزیز بک ڈپو،۲۰۰۶ء،ص۳۱۵

۷۔جیلانی کامران، نئی نظم کے تقاضے،مکتبہِ معیار،لاہور،۱۹۶۵ء،ص ۶۴

۸۔جیلانی کامران، نئی نظم کے تقاضے،ص ۱۵

۹۔ڈاکٹر وزیر آغا،اُردُو شاعری کا مزاج، مجلسِ ترقّیِ ادب،لاہور،۲۰۰۸ء،ص ۲۵۸

۱۰۔ریاض مجید،انتساب،رفاہ انٹر نیشنل یونی ورسٹی،فیصل آباد،۱۵اکتوبر ۲۰۱۶ء،ص ۳۲

۱۱۔ڈاکٹر وزیر آغا،اُردُو شاعری کا مزاج،ص ۲۸۲

۱۲۔ایضاً،ص ۲۸۳

۱۳۔انتساب،ص ۱۱۱

۱۴۔ایضاً،۱۶

۱۵۔شملہ ہاؤس،کچہری بازار، سرگودھا، پاکستان

۱۶۔ڈاکٹر ضیاالحسن،جدید اُردُو نظم: آغاز و ارتقا،سانجھ پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۲ء،ص ۲۸-۲۹

۱۷۔انتساب،ص ۱۰۷

۱۸۔ڈاکٹر وزیر آغا، ریاض مجید کی نظمیں، مشمولہ: انتساب، از ریاض مجید، رفاہ انٹر نیشنل یونی ورسٹی، فیصل آباد،۲۰۱۶ء، ص ۱۱۰

۱۹۔ انتساب، ص ۹

۲۰۔ ایضاً، ص ۵۶

۲۱۔ کلیم الدین احمد، اُردُو شاعری پر ایک نظر (حصّہ دوم)، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، س ن، ص ۴۸۳

۲۲۔ جیلانی کامران، نئی نظم کے تقاضے، ص ۱۵

۲۳۔ انٹرویو، ریاض مجید

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ آفتاب اقبال شمیم، مکالمہ، مشمولہ: گفت گو نما، از ڈاکٹر راشد حمید، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۴۳۷

۲۶۔ ریاض مجید، بے چہرہ کونپلیں، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۱۲۸

۲۷۔ ڈاکٹر ضیاالحسن، جدید نظم: آغاز وارتقا، ص ۱۲-۲۲

۲۸۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اُردُو شاعری کا مزاج، ص ۳۱۵

۲۹۔ ریاض مجید، انتساب، رفاہ انٹر نیشنل، یونی ورسٹی، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۶۳-۶۴

۳۰۔ ریاض مجید، بے چہرہ کونپلیں، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۱۲۸

۳۱۔ ریاض مجید، انتساب، ص ۳۷

۳۲۔ جیلانی کامران، جدید نظم کے تقاضے، ص ۲۶

۳۳۔ ریاض مجید، انتساب، ص ۳۷

۳۴۔ آل احمد سرور، نظم کی دنیا، مشمولہ: اصنافِ ادب تفہیم و تعبیر، از ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۶۷

۳۵۔ ریاض احمد، ریاضتیں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء ص ۳۴

۳۶۔ ریاض مجید، انتساب، ص ۷۶-۷۷

۳۷۔ڈاکٹر وزیر آغا، تنقید اور احتساب، جدید ناشران،لاہور،۱۹۶۸ء، ص۴۶

۳۸۔ ریاض مجید، انتساب، ص۸۴

۳۹۔ ریاض احمد، ریاضتیں، ص ۳۴

۴۰۔ن م راشد، جدید اُردو نظم: آغاز وارتقا، ازڈاکٹر ضیاالحسن، ص ۲۲

۴۱۔ ریاض مجید، انتساب، ص۷۸-۷۹

۴۲۔ بلراج کومل، جدید نظم کے امکان و آفاق، مشمولہ: اُردو نظم ۶۰ کے بعد، ص۷۶

۴۳۔ ریاض مجید، انتساب، ص۸۸

۴۴۔ جیلانی کامران، نئی نظم کے تقاضے، ص ۳۴

۴۵۔ ریاض مجید، انتساب، ص۸۹

۴۶۔ کلیم الدین احمد، اُردو شاعری پر ایک نظر (حِصّہ دوم)، ص۵۸۹

۴۷۔ ریاض مجید، انتساب، ص۹۰

۴۸۔ ریاض مجید، انتساب، ص۱۰۷

۴۹۔ آلِ احمد سرور، پہچان اور پرکھ، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص۲۹

۵۰۔ ریاض مجید، انتساب، ص۶۵

۵۱۔ڈاکٹر انور سدید، ریاض مجید کی نظمیں _____ انتساب، مشمولہ: ریاض مجید ایک مطالعہ، مُرتّب: علی مجید، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء، ص۱۱۵

۵۲۔ ریاض مجید، انتساب، ص۶۶

۵۳۔ ریاض مجید، قلمی بیاض نمبر ۲، ص ۴۳

۵۴۔ ریاض مجید، انتساب، ص۶۷

۵۵۔ ایضاً، ص۶۹

۵۶۔ آل احمد سرور، ایضاً، ص ۸۹

۵۷۔ ریاض مجید، انتساب، ص ۷۰

۵۸۔ ایضاً، ص ۷۰

۵۹۔ ریاض مجید، انتساب، ص ۷۲

۶۰۔ ایضاً، ص ۷۳

۶۱۔ ایضاً، ص ۷۴

۶۲۔ ایضاً، ص ۷۵

۶۳۔ ایضاً

۶۴۔ جیلانی کامران، نئی نظم کے تقاضے، ص ۱۰۸

۶۵۔ ریاض مجید، انتساب، ص ۷۵

۶۶۔ ایضاً، ص ۷۷

۶۷۔ ایضاً، ص ۷۸

۶۸۔ عابد علی عابد، دیباچہ، اُسلوب، مجلسِ ترقّیِ ادب، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص

۶۹۔ ریاض مجید، انتساب، ص ۹-۱۰

۷۰۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۷۱۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۷۲۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۷۳۔ ایضاً، ص ۹۸

۷۴۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۷۵۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی، مُرتّب: کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زُبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۲۳

۷۶۔ ریاض مجید، انتساب، ص ۷۲

۷۷۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جدید نظم کی شعریات اور بیانیہ مشمولہ: اُردُو نظم ۶۰ کے بعد، ص ۴۰

۷۸۔ ریاض مجید، انتساب، ص ۹۴

۷۹۔ ڈاکٹر وزیر آغا، اُردُو شاعری کا مزاج، ص ۳۹۷

۸۰۔ ریاض مجید، انتساب، ص ۱۰۲

۸۱۔ ایضاً، ص ۹۱

۸۲۔ ایضاً، ص ۹۸

۸۳۔ ایضاً، ص ۷۰

۸۴۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۸۵۔ ایضاً، ص ۸۶

۸۶۔ ایضاً، ص ۴۹

۸۷۔ ایضاً، ص ۸۸

۸۸۔ ایضاً، ص ۵۹-۴۵-۶۰-۴۶

۸۹۔ ایضاً، ص ۴۱-۴۲

۹۰۔ ریاض مجید، بے چہرہ کونپلیں، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰

۹۱۔ ایضاً، ص ۱۱-۱۲

باب چہارم:

ریاض مجید کی نعت گوئی کا مطالعہ

نعت اُردو زُبان و ادب کی ایک ایسی دل آویز صنفِ سخن ہے ، جس میں نہ صرف مسلم شعرا نے مقدور بھر شعری آرایش کا اہتمام کیا ہے بل کہ غیر مسلم شعرا نے بھی حضور ﷺ سے قلبی ارادت کا اظہار کیا ہے۔ یوں اُردو زُبان و ادب میں نعت کا سرمایہ وقت کے ساتھ ساتھ نئے امکانات اور جدید موضوعات کے اعتبار سے معرضِ اظہار ہو تا جارہا ہے۔ کسی بھی ادب کے مسلمان شعرا نے اپنے لیے بالخصوص اور غیر مسلم شعرا نے بالعموم نعت شاعری کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار جانا ہے۔ یوں اس مخصوص صنفِ شاعری میں خاطر خواہ پیش رفت کے ساتھ ساتھ شعرا نے دینی فریضے کی انجام دہی کو بھی یقینی بنایا ہے۔ بہ طورِ اصطلاح نعت کے بارے میں ابو الاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

”سرورِ کائنات ﷺ کی بارگاہ میں شاعر کا نذرانۂ عقیدت نعت کہلاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر نعت اُن اشعار کو کہتے ہیں، جن میں نبیِ عربی ﷺ کی مدحت وستایش اور اُن کے اوصاف و شمائل کا تذکرہ ہو۔“(۱)

جہاں تک نعتیہ شاعری کے آغاز کا تعلق ہے ،تو یہ دینی فریضہ اور مدحتِ پیغمبر ﷺ حضورِ اکرم ﷺ کے دورِ مبارک میں ہی فروغ آشنا ہو چکا تھا۔ آپ ﷺ کے سامنے نعت گوئی کو رواج دیا گیا، جسے حضورِ اکرم ﷺ نے از خود پسند بھی فرمایا تھا۔ چناں چہ فن نعت گوئی کی ابتدا اور اوّلین نعت گو شاعر کے بارے میں ریاض مجید رقم طراز ہیں:

”نعتیہ شاعری کی تاریخ کا آغاز حضورِ اکرم ﷺ کے عہدِ مبارک میں لسانی جہاد سے ہوا تھا۔ حضرت حسان بن ثابتؓ اِس قافلے کے سرخیل ہیں، جنھیں خود دربارِ نبوی ﷺ سے کفارِ مکہ کی ہجو کے جواب میں اِس لسانی جہاد پر مامور کیا گیا تھا ۔یوں ہر زمانے کا نعت گو حضرت حسانؓ کی شعری روایات، نعتیہ مضامین اور سیرتی موضوعات کے تذکرے سے کسی نہ کسی طور وابستہ ہے اور اپنی اِس وابستگی پر فخر و مباہات کا اظہار کرتا ہے۔“(۲)

ریاض مجید کی علمی و ادبی کارکردگی کا نمایاں پہلو نعت سے متعلق ہے۔ نعت کے حوالے سے ان کے اوّلین نعتیہ نمونے ساٹھ کے عشرے میں ملنا شروع ہو جاتے ہیں ،یعنی اُن کے کالج نے زمانے سے ان دنوں اُن کی ایک فارسی نعت روزنامہ عوام لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں چھپی اس سادہ سی زمین میں لکھی گئی نعت کا مقطع ہے:

ریاض التفات تو خواہد جیسی
کرم کن پراؤ خسروئے کوئی یثرب (۳)

اس میں رنگ و بوے یثرب، روے یثرب، سوے یثرب کے قوافی و ردیف تھے۔ بعد میں ریاض مجید نے یثرب کی جگہ طیبہ کر لیا تھا۔ یہ نمونہ نعت ان کی کتاب خلا آثار میں موجود ہے۔

اسی زمانے میں 'طلوع اسلام' کے عنوان سے ریاض مجید کی ایک نعتیہ نظم عید میلاد النبیؐ کے حوالے سے روزنامہ عوام لائل پور میں شایع ہوئی اس کی نوعیت ترکیب بند کی تھی تین تین مصرعوں کے بعد ایک مصرع ٹیپ ولاے قافیہ وردیف میں تھااس کا آخری بند تھے:

ہوائے توحید رہ گزارِ عرب میں انوار بو رہی ہے
تقدس کعبہ پر اچھالی ہوئی غلاظت کو دھو رہی ہے
طلوع اسلام ہو رہا ہے جہالت اب ختم ہو رہی ہے
ادب سے صف بستہ سب کشید میلاد گا رہے ہیں
رسُول اکرم، حضور انور زمیں پہ تشریف لا رہے ہیں (۴)

اس زمانے کی شعری فضا کے حوالے سے یہ نعت کُچھ مختلف رنگ لیے ہوئے تھی، اُسے ریاض مجید نے ٹاؤن ہال کے نعتیہ مشاعرہ (بہ سلسلہ عید میلاد) پڑھا اور بڑی داد سمیٹی 'عوام' کی آیندہ کی اشاعت میں خلیق قریشی نے، جو اس مشاعرے کے سٹیج سیکرٹری تھے شایع کر دی۔ یوں ایک محتاط اندازے سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریاض مجید کی نعت گوئی قریب قریب پچیس سالوں پر پھیلی ہوئی ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اوّلین کُچھ نمونوں کے بعد ایک بڑا عرصہ ریاض مجید کی تخلیقات کا غزل و نظم میں گزرا۔

نظم کی طرف ان کا باقاعدہ رجوع ۱۹۷۵ء میں ہوا جب اُنھوں نے پی ایچ۔ڈی کے لیے 'اُردو نعت' کے موضوع کے لیے اپنا خاکہ تیّار کیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی نگران میں یہ خاکہ ۱۹۷۶ء میں منظور ہوا اور اُنھوں نے ۱۹۸۰ء میں اپنا مقالہ ناظم امتحانات پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے پاس جمع ہوا، جس کا زُبانی امتحان ۱۹۸۷ء میں ہوا اور اُنھیں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ ریاض مجید کا نعت کی طرف رجوع، اسی زمانے اور پی ایچ۔ڈی کے مقالے کی عطا ہے، اُنھوں نے اسی دوران مدح پر، جس نعت گوئی کا آغاز کیا، وہ ایک مختلف انداز کی نعت گوئی تھی تاحال غزل کی ہئیت میں، ان کے درج ذیل پانچ نعتیہ مجموعے شایع ہو چکے ہیں:

۱۔اللھم صل علی محمدؐ

۲۔اللھم بارک علی محمدؐ

۳۔سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم(نعتیہ دیوان)

۴۔سیدنا رحیم صلی اللہ علیہ وسلم

۵۔سیدنا کریم صلی اللہ علیہ وسلم

اِن پانچ دیوانوں پر مشتمل ریاض مجید کی ''کُلیّاتِ نعت'' بھی نعت اکادمی فیصل آباد سے اکتوبر ۲۰۱۹ء میں شایع ہو چکی ہے۔

جیسا کہ اُوپر نشاندہی کی گئی ہے ریاض مجید کی یہ مطبوعہ کتابیں صرف نعت کی اس ہئیت میں ہیں، جو غزل کی صنف میں ہیں ان کے علاوہ ان کے نعتیہ قصیدہ، آزاد اور معرّا نظم، نظم میں نعتیں، قطعات، رباعیات، ہائیکو اور دوسری اصناف میں نعتوں کا ذکر آگے آئے گا یہاں ہم ان کے مطبوعہ نعتیہ مجموعوں (بہ ہئیت غزل) کا جائزہ لیتے ہیں۔ریاض مجید کے پہلے نعتیہ مجموعے اللھم صلی علی محمد کے بارے میں حفیظ تائب کہتے ہیں:

''پچھلی صدی میں ڈاکٹر ریاض مجید نے تخلیق، تنقید اور تدوین کے میدانوں میں اتنے وافر کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں کہ ان احاطہ کرنا، خُوش بُوؤں اور رنگوں کے شہر کو کسی باڑھ میں قید کرنے کے مترادف ہے۔اُنھوں نے جدید غزل اور نظم میں اپنا انفرادی لب ولہجہ تسلیم کروایا... پی ایچ۔ڈی کا مقالہ ''اُردو میں نعت گوئی'' ؛لکھتے ہوئے، اُرُدو نعت کی پانچ سو سالہ روایت کو جذب کرنے کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی پنجابی وغیرہ کے نعتیہ ادب کا بھی مطالعہ کیا۔ دربارِ رسُولؐ حاضریوں سے عشقِ حبیبِ ربِ کائنات کے ادب آداب سیکھے۔اس پس منظر سے اُبھرنے والی ان کی اپنی اُردُو نعت غایت درجہ منفرد،، دل آویز، توانا اور پُر تاثیر ہے۔اُنھوں نے مضامینِ نو بہ نو کے انبار لگادیے ہیں اور اندازِ بیاں ایسا اختیار کیا ہے کہ دل و دماغ دونوں کو جگمگاتا چلا جاتا ہے۔زمینوں کی ایجاد واِنتخاب میں طرفہ تازہ کاری ہے۔اُنھوں نے مطالعہ نعت ہی پر انحصار نہیں کیا بل کہ نسبتِ اویسیؓ، شغل درود و مراقبات کی بدولت میّسر آنے والے مشاہدات کو بھی موضوعِ نعت بنایا ہے۔ حضوری کی کیفیات کا بیان ایسے نئے پیرایے میں کیا ہے کہ آنے والا کل بھی اُسے پرانا نہیں کر سکے گا۔اُنھوں نے نعت کے ذریعے عرفان وایقان کی دولت عام کرنے کی سعیِ تبلیغ کی ہے۔موسم حُبّ رسُول ﷺ میں پھولتے پھلتے غنچوں اور حضُورِ اکرم ﷺ کا اسمِ مبارک، جوان ہونے والی نسل کے خواب دیکھے ہیں اور یوں فروغِ دینِ محمدی کی تمناؤں سے نعت کو تابناک مستقبل کا آئینہ بنادیا ہے۔''(۵)

گورنمنٹ کالج فیصل آباد کے شعبہ اُردُو سے ڈاکٹر ریاض مجید کی وابستگی محکمۂ تعلیم کے لیے موجب فخر ومباہات ہے۔اس کا ایک فطری امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ اکرام مجید کا بھائی ہے او یہ اعزاز موٴخر الذکر کے لیے بھی سرمایہ ناز ہے۔ قرابت دارانہ انتساب کو اگر فکر و نظر کی ہم آہنگی بھی میسر آجائے تو یوں سمجھو کہ مرزا غالب نے کسی عام مضمون کو تصوُّف کی آنچ دے کر خاک سے تابہ افلاک پہنچا دیا ہے۔حافظ محمد افضل فقیر ریاض مجید کی نعتیہ شاعری کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''ریاض مجید اُرُدُو اور پنجابی کا قادر الکلام نعت گو شاعر ہے۔غزل نے بھی اس کی، جولائی طبع دیکھی ہے۔شعر کی کوئی صنف اس سے ناآشنا نہیں۔ جاپانی نژاد ہائیکو نے اسے اپنا مربی تسلیم کیا ہے۔ ہمارے شاعر نے وعجمی الاصل رباعی کو وہ پذیرائی بخشی ہے کہ اس صنف سخن کو اپنی انفرادیت کے ساتھ ساتھ عظمت کا احساس بھی ہونے لگا ہے ریاض مجید نے صنف رباعی میں ندرت فکر کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ ان کی مثال رباعی کے معرض وجود میں آنے کے بعد سے تاعصر رواں بہ مشکل ملے گی۔ رباعی جیسا کہ مسلم ہے، اخراب وخرم کے چوبیس اوزان پر متفرع ہے۔ شعراے متقدین ومتاخرین نے

اس کے تمام اوزان پر طبع آزمائی کی ہے، مگر ریاض مجید نے اسے ایک انوکھے انداز سے اپنایا ہے۔ وہ یوں کہ اس نے چوبیس اوزان میں سے ہر وزن پر ایسی رعباعات کہی ہیں، جن کے چاروں مصروں میں ایک خاص وزن کا التزام کیا ہے، اس اہتمام میں وہ یقینی طور پر اسبق ہے۔ پھر بعض رعبایات، اساتذہ فن کے تتبع میں ایسی بھی لکھی ہیں، جن کے مصرعے مختلف اوزان میں ہیں۔ یہ امر اس کی موزونیت طبع، قادر الکلامی اور عبور فن پر دال ہے۔"(٦)

اکرام مجید کے پنجابی مجموعۂ غزل "نویاں زیناں" پر اظہار خیال کرتے ہوئے حافظ محمد افضل فقیر نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ پنجابی کلام، جو اڑتالیس اوزان پر مشتمل ہے میں اوزان کی نشاندہی اس نیت سے کی گئی ہے کہ ممکن ہے مستقبل کا کوئی نعت گو شاعر ان اوزان کو اپناتے ہوئے بارگاہ نبوی میں مختلف رنگوں کے گلدستہ ہائے ارادت پیش کرنے کی سعادت حاصل کرے۔ اِس تبصرے سے متاثر ہو کر ریاض مجید نے مذکورہ اڑتالیس اوزان میں نعتیہ کلام لکھنے کے بعد ان پر دیگر اوزان کا معتدبہ اضافہ قریباً ۱۵۰ تک بھی کیا یہ نعتیہ کلام ہنوز، منظر عام پر نہیں آیا۔ حافظ محمد افضل مزید لکھتے ہیں:

"وہ ایک کثیر الجہات ادیب اور صاحب فن شاعر ہے۔ اس نے بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کے بچّوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک سو چوالیس صفحات پر مشتمل ایک منظوم کتاب پڑھ "بسم اللہ" بھی تالیف کی، جس میں اسلام کے زریں اُصولوں پر تہذیب اخلاق کی تدریس مغربی ممالک میں آباد پنجابی دان مسلمان طبقہ نے اسے خاصی قدر افزائی سے دیکھا جاتا ہے۔"(۷)

نعت کے سوتے صفائے باطن سے پھوٹتے ہیں۔ ایک مُرقّع مصعیت کلمہ گو بھی نعت لکھے گا تو فضائے نعت میں سانس لیتے وقت فکری طور پر باطن کی موجِ تنویر کسی نہ کسی صورت میں ضرور محسوس کرے گا۔ اِس ضمن میں مزا محمد منور نے درست لکھا ہے:

"نعت کے ہر شعر میں نعت کا ایسا قرینہ موجود ہونا چاہیے کہ وہ عام مضامینِ غزل سے متمیّز ہو اور ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں۔ اِس کے لیے خالی قادر الکلامی ہی نہیں مزاج کے داخلی رکھ رکھاؤ اور دل دماغ کی بیداری درکار ہے۔"(۸)

نعت کہنا کوئی آسان کام نہیں ہے اِس میں شاعر کو انتہائی احتیاط سے قلم اُٹھانا پڑتا ہے۔ گویا ایک طرف شرک سے دامن کشائی درکار ہوتی ہے اور دوسری طرف مقام رسالت کا بھی خصوصی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ سیّدہ حنا نے اِس حوالے سے درست لکھا ہے:

"نعت شہ کونین ﷺ شیفتگی چاہتی ہے، آشفتگی نہیں؛ شپردگی چاہتی ہے، دیوانگی نہیں؛ ہوش چاہتی ہے، بے ہوشی نہیں؛ تہذیب چاہتی ہے، دیوانگی نہیں۔"(۹)

نعت سے متعلق فنی باریکیوں اور فکری ریاضت کو اِس طرح سمجھا جا سکتا ہے، جس طرح سیل اشک بلا تردّد اپنی روانی کی خاطر آنکھوں کا رخ کرتا، اس طرح محرکِ نعت، دیدہ دل کو تطہیر عطا کرتا ہو، الفاظ و معانی کو پیکر یکرنگی میں ڈھال دیتا ہے۔ بہر حال موضوع کی عُلی و لمی دونوں ایمان افروز ہیں۔ حافظ محمد افضل فقیر کے مطابق:

''اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک ﷺ کو رحمت عالمیاں کی مبارک شان سے نواز کر بھیجا۔ عوام کی حد بندی محال ہے۔ اس بنا رحمت اور اس کے لوازم و متعلقات کا احصا بھی ناممکن ہے، مضامینِ نعت بھی اسی سے مستفاد ہیں۔ لہٰذا وہ بھی اپنے تنوع کے اعتبار طراز ابدیت ٹھہریں گے۔ یوں تو چمن رازِ حیات کی رنگارنگی اور بوقلمونی کا احاطہ بھی مشکل ہے۔ زمینی روئیدگی کا یہ عالم ہے کہ مسلمات نباتات کی رُو سے اگر ایک درخت دس ہزار پتوں مشتمل ہو تو ایک پتے کے ریشے دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ کائناتِ ارضی کی بے شمار اکائیوں کے لیے رحمتِ عالم کی شیونات ایک کل کی حیثیت رکھتی ہیں گویا محامدِ نبویہ ﷺ کے مضامین دوسری نہایتوں کا منبوع و مصدر رہیں۔'' (۱۰)

نعت کے اندر پائے جانے والے ادبی سرمایے اور مضامینِ نعت کی اس لامتناہی شان کو ریاض مجید نے وجدانی طور پر نہایت قریب سے دیکھا ہے اور جدید نسل کے دل و دماغ کو ان سواطع الہام سے قریب تر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ریاض مجید کو نعت سے باطنی ارادت اور نعت گو حضرات سے دلی انس ہے۔ اس کی ہمیشہ آرزو رہتی ہے کہ نعت گو شعرا کی ملاقات کے بعد ان کی خاطر مدارت کرے۔ اس جذبہ خدمت نے اسے خلوص ایثار سے حظِ وافر عطا فرمایا ہے۔ اس کا اپنا نعتیہ کلام، تقریباً پانچ چھے دوواین پر مشتمل ہے، ہنوز زیرِ طباعت ہے، جب کہ اس نے معاصر نعت گو احباب کے مجموعہ ہائے کلام کو بہ طیب خاطر چھاپا ہے۔ ظاہر ہے اس بے لوثی و نفسی کے پس منظر میں خوشنودی جنابِ رسالت ماب ﷺ کا حُصول ہی مضمر ہے کہ اصل ثنائے الٰہی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ ثنائے، جوحق تعالیٰ آخرت میں یقیناً عند اللہ ماجور ہو گا، مگر قدرت خداوندی نے اس کے جذبہ ایثار کا اجر آخرت سے پہلے ہی عطا فرمایا ہے وہ مدحانِ حضورِ ختمی مرتبت ﷺ کی مہمان نوازی میں دل و جاں مشتغل رہتا ہے اور معنوی فیوصنات اس کی مہمان نوازی کرتے رہتے ہیں۔ چناں چہ اُن ہاں مضمون و بیاں کے نادرات پیرانہ نعت کے مانوس اجزاے ترکیبی مشہور ہیں۔

نعت سے ریاض مجید کا والہانہ ربط و ضبط ہر آن اس کے فکر کی تربیت میں مصروف رہتا ہے پھر فکر کا معاملہ بھی کچھ اس قسم کا ہے کہ طبعی میلانات میں مرجح رکن کی جانب لپکتا ہے۔ ریاض مجید کو احباب کی ہزار انجمن آرای میسر ہو اس کا فکر لاشعوری طور پر ارتقائَ نعت کے محرکات کی دریافت میں مستغرق رہتا ہے اور یوں اس کی روح کی خلوت در انجمن سے متکیف رہتی ہے۔ درج بالا مباحث کو اگر سمیٹا جائے تو شمس بدایونی کی نعت کے بارے میں قائم کردہ درج ذیل رائے صادق آتی ہے:

''نعت دراصل ایک مضمون یا موضوع کا نام نہیں، لہٰذا جب لفظ نعت کا استعمال کیا جائے، تو وہ تمام ذخیرہ مراد لیا جاتا ہے، جو آنحضور ﷺ کے فضائل و مناقب اور شمائل پر مشتمل ہوتا ہے، خواہ نثر میں ہو یا نظم میں۔''(۱۱)

ریاض مجید کا اوّلین مجموعہ نعت "اللھمّ صلّ علیٰ محمد" بارگاہ نبوی میں اُن کا نذرانہ ارادت ہے۔ مسلمات امر میں سے ہے کہ ثنائے مصطفوی کا کما حقّہ ادراک، ورائے فکرِ بشری ہے۔ یہ مجموعہ نعت مقتضیاتِ نعت عرفاں کی جانب ایک مبارک اقدام ہے۔ عنوان کتاب کا ایک عمومی تاثر کُچھ اس طرح ابھرتا ہے کہ یہ نعتیہ مجموعہ درود شریف اور اس کے فیوض و برکات ہی کو محتوی ہو گا۔ بہر حال یہ نظریہ بھی مستحسن ہے، مگر صورت حال اس طرح ہے کہ برکات صلوٰت و سلام ریاض مجید کے کلام میں یوں جاری و ساری ہیں، جس طرح نسبت اویسہ تمام سلاسلِ طریقت کے پیکر میں مانندِ قلب موجزن ہے۔ یوں دیکھا جائے تو ریاض مجید کی نعت پر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کی یہ رائے صادق آتی ہے:

"نعت فرد کا نغمۂ تنہائی اور استغاثۂ شخصی بھی ہے اور ایک مسلم معاشرے میں ایک اجتماعی سرگرمی اور تقریبوں کی بنیاد اور اساس بھی ہے۔"(۱۲)

اِس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ صنفِ نعت کا، جو ربط و ضبط انسانی حیات سے ہے، اس کا متبادل دیگر اصناف سخن میں موجود نہیں۔ ایک کاملِ فن نعت گو محامدِ نبویہ پر اظہارِ ارادت کے وسیلے سے حقائق عالم اور مسلمّاتِ حیات کی چہرہ کشائی کرتا ہے۔ وہ اپنے اشعار میں اس جلیل القدر ہستی کا ذکرِ جمیل کرتا ہے، جو مقصود کائنات اور اصلِ ممکنات ہے۔ دیگر اصنافِ سخن کی اثر انگیزی بہ وسائط ہے۔ جب کہ نعت تعظیم و توقیر نبوی کے باعث مقصدیت کی امیں ہے۔ تذکارِ سیرت نعت گوئی کی شکل میں ہو یا نعت خوانی کے رنگ میں، دونوں صورتیں تطہر فکر و عمل کی داعی اور اصلاح معاشرہ پر منتج ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کے مطابق:

"جہاں تک نعت میں سیرت نگاری کا تعلق ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ اس کا ظہور اپنی جمیل اور جامع صورت میں جدید نعت میں ہوا ہے۔ جدید نعت گو شاعر نعت کے ذریعے حضور ﷺ کی بعثت کو آئینہ کرتا ہے اور یوں ہمیں ذاتِ حضور ﷺ سے قریب تر کرتا چلا جاتا ہے۔"(۱۳)

ریاض مجید کی نعت کا ایک وصفِ خاص یہ بھی ہے کہ وہ نعت میں حضور ﷺ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو برملا بیان کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اُن کی نعت جدید نعتیہ رنگ کا مکمل سراغ دیتی ہے۔ قوت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی سیرت کے تمام تر پہلوؤں کو عام مسلمان کے جذبۂ ایمانی کی تسکین کے لیے عمدگی اور مہارت کے ساتھ دل نشین پیرایے میں بیان کیا جائے۔ ریاض مجید کی نعت سیرت نگاری کے ضمن میں جدید نعت میں اپنی ایک الگ تھلگ پہچان رکھتی ہے۔ سیرت سے آراستہ جدید نعت کی بابت حفیظ تائب رقم طراز ہیں:

"نعت کو نقوشِ سیرت سے آراستہ کرنے کا رجحان دورِ حاضر کا خصوصی امتیاز و اعزاز ہے۔ سیرتِ اطہر سے استفادہ نعت نگاری کو وقار و اظہار عطا کرتا ہے، مگر جمالیاتی اظہار کے بغیر واقعاتِ سیرت کا بیان مرتبۂ شعر تک نہیں پہنچتا۔"(۱۴)

نعت نگاری کا عموی انداز کُچھ اس طرح سے ہے کہ ایک نعت نگار حضورؐ کی سیرت مبارکہ کے مختلف گوشوں پر اظہار کرتے ہوئے نعت کی تکمیل کرتا ہے۔ اس مجموعہ نعت میں یہ اُسلُوبِ نظر بھی موجود ہے، مگر ریاض مجید نے ایک جداگانہ راہ بھی اختیار کی ہے، وہ یہ کہ فیضان نبویؐ اوراس کے متعلقات میں سے کسی ایک موضوع پر مسلسل اشعار لکھتے ہوئے شاعر نے یک رنگئ جذبات کو نظم کیاہے کہ اس کی بعض نعتوں میں ایک باطنی کیف کی جزئیات نگاری دامن دل کھینچتی ہے اور پیرایہ اظہار پر قلبی واردات کے تسلسل بیاں کی چھاپ خاصی نمایاں نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر دُرود شریف ہی لیجیے۔ وہ نص قطعی کے حکم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے جناب رسالت ماب ﷺ پر دُرود شریف پڑھتے ہیں اور اہل ایماں کو آپ کی ذاتِ اقدس پر صلوٰت و اسلام پڑھنے کی حکم دیا گیاہے۔ صفاے باطن، جیسا کہ مذکور ہوُا مصدرِ نعت ہے۔ اس ہیولیٰ کو ریاض مجید نے کثرت دورد پاک سے، جوہر بنادیاہے اور یہ وہ، جوہر ہے، جس سے مضامین نعت شعاعوں کی صورت میں پھوٹتے ہیں۔ چناں چہ احسان دانش کے نزدیک:

> ”نعت حضور ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کا ایسا بیان ہے، جس میں امت سے اُن کی مَحبّت اور شفقت کے علاوہ ذات وصفات کے محاسن اور اُن سے والہانہ عشق کا اظہار ہوتاہے۔“(۱۵)

ریاض مجید کی نعت کے ذریعے سے قاری کے دل میں حضور ﷺ کی ذاتِ بابرکات کے مختلف پہلوؤں کا ادراک ہوتا ہے اور وہ اُن کے عشق میں کیف و سرمستی کا اظہار کرتے ہوئے نذرانہ عقیدت پر اتر آتا ہے۔ چناں چہ دُرود شریف کے فیوض وبرکات اُس کے قلب وروح پر چھاجاتے ہیں، جن سے متاثر ہوکر وہ ایک رات میں کئی نعتیں لکھ لیتاہے۔ اہل اللہ ہاں یہ کیفیت بار انِ انوار سے موسوم ہے۔ اِس مقام کلامِ شاعر کے اثرات قاری کے دل ودماغ میں متمکن ہوجاتے ہیں اور یوں شاعر اقدار سیرت نبوی کے ابلاغ کا عظیم ترین فریضہ انجام دیتاہے۔ درود شریف کی ترغیب بہ طریقِ احسن ریاض مجید کے اس مجموعہ نعت میں واضح ہوتی ہے، خصوصی طور پر ان نعتوں میں ردیفیں دُرود پڑھ، دُرود پڑھتے ہوئے اور دُرودوں کا ہیں۔ ہم ایصناحِ مطلوب کے مذکورہ بالا نعتوں کے درج ذیل اشعار پر اکتفا کریں گے:

اپنی ہر التجا کو دُرودوں کے پر لگا
ہر اک دعا کے اوّل و آخر درود پڑھ (۱۶)

سلام کہتے ہوئے بادِ شام چلتی ہے
سحر کو آتے ہیں طائر ، درود پڑھتے ہوئے (۱۷)

ہوائیں مغفرت آثار ہوتی جاتی ہیں
رواں ہے سوئے نبی قافلہ درودوں کا (۱۸)

اس قسم کی تمام نعتوں کا آہنگ ملکوتی ہے۔ان کے علاوہ ریاض مجید کی ایک اور نعت بھی اس مجموعے کی زینت ہے، جس کی ردیف گنبدِ خضرا ہے۔ اس نعت کے تمام اشعار بے پناہ روانی اور برجستگی کے حامل ہیں اِن میں ارادت و دردمندی کا ایک لطیف امتزاج ہے، جب کہ ردیفِ نعت بھی مضمون کے استحکام کو مؤید ہے۔ مجموعی تاثیر اس امر کا شاہد ہے کہ تمام اشعار ایک ملہم کیف کے آئینہ دار ہے۔ بطور تبرّک اس نعت کے دو شعر پیش خدمت ہیں کہ بصیرت سے بصارت کا سب نور ہو:

کسی مکاں میں بھی ایسا مکیں نہیں ہوگا
اس افتخار میں یکتا ہے گنبد خضرا
دعا ، جو مانگتے ہیں آپ کے وسیلے سے
ہتھیلیوں پر چمکتا ہے گنبدِ خضرا (۱۹)

ریاض مجید درود غم کے عالم میں عصرِ حاضر کے باطنی اضطراب پر نظر دوڑاتا ہے تو نغمہ ہائے نعت کی طرف افرادِ اُمّت کے قلوب کا میلاں پاتا ہے، جس کے باعث وہ روحانی طور پر ایک گونہ تسکیں محسوس کرتا ہے اور یوں ذاتی کرب کا کتھارسس میسر آتا ہے۔ وہ بارگاہِ نبوی نسلِ جدید کے لیے اس کرمِ خاص کی خاطر کیا بھرپور رجائیت کے انداز میں ملتجی ہے۔اِس مقام پر انسان کو سمجھ آتی ہے:

”نعت اُس کیفیت کا نام ہے، جس میں شاعر ذاتِ رسالت مآب کی طرف ر،جوع کرتا ہے۔ یہ فکری حضوری جسے نصیب ہوتی ہے وہی اُس کی لذّت کو جانتا ہے۔ جوں جوں شاعر اِس کیفیت میں ڈوبتا ہے اُس کے لیل ونہار اور سے اور ہو جاتے ہیں۔ یہ فکر و کردار پر بھی گہرے اثرات مُرتّب کرتی ہے۔شاعری کی یہی کیفیت، جب کسی شاعر کی پہچان بن جائے تواُسے ایک عجیب رفعت سے ہم کنار کر دیتی ہے۔“(۲۰)

ریاض مجید کی درج بالا نعتیہ کیفیات کے ضمن میں شعری مثال دیکھیے:

موسمِ حُبِ نبی میں پھلیں غنچے میرے
ذکر سُن سُن کے ترا ، نسل جواں ہو میری (۲۱)

سوز و گداز ایک غیر مترقبہ روحانی نعمت ہے۔ وہ لطافتِ سخن کی محرک ہے اور اس سے کلام میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ مگر سوز و گداز فی نفسہ کیا ہے؟ اسے بیان کرنا بے حد مشکل ہے۔ معارف و محسوسات ریاض مجید کے آئینہ وجدان میں مرئی ہیں اواس نے بڑی قادر الکلامی سے اُن کی تصویر کشی کی ہے۔ چناں چہ مشاہدات، حضوری، مراقبات، اویسی نعمتوں اور اس طرح کی دوسری متصوّفانہ اصطلاحات اس کے نعتیہ کلام میں اپنے معنوی حسن کے ساتھ جلوہ ریز ہیں۔ ریاض مجید نے عرفانیات کے اس تذکرے سے عارف و عامی کے لیے سامانِ محبّت مہیا کیا ہے۔

ریاض مجید کی نعت ہمارے سامنے ایک ملّی تشخص کے روپ میں آتی ہے، جس میں ہمیں انسانیت پوری آب و تاب سے جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔ احمد ہمدانی کی یہ راے ریاض مجید کی نعت کی بابت درست نظر آتی ہے:

''نعت گوئی صرف ہماری شاعری کی ایک صنف ہی نہیں بل کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا ایک منفرد عنصر بھی ہے۔ تہذیب و ثقافت کا عنصر ہونے کی حیثیت سے اس میں تہذیبی و ثقافتی تبدیلیوں کے ساتھ مسلسل تبدیلیاں بھی آتی رہی ہیں۔ ان مسلسل تبدیلیوں کو دیکھتے ہوئے ہم نہایت وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ نعت گوئی ایک زندہ صنف ہے، جو اسلامی تعلیمات کی طرح زندگی کے ہر موڑ پر بھرپور معنویت کے ساتھ ہمیں اپنی طرف متوجّہ رکھتی ہے۔(۲۲)

ارتقاے نعت کے سلسلے میں بھی ریاض مجید کی خدمات گراں بہا ہیں۔ اس نے نعتیہ مضامین میں رفعتِ فکر، پاکیزگی ارادت اور گدازِ جاں کو شامل کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پیکرِ الفاظ کو معانیِ بُلند سے ہمنوا کرنے کے لیے ترتیب سازی بھی کی ہے۔، مگر ترکیب سازی کرتے ہوئے اُن الفاظ کا اِنتخاب کیا ہے، جو اسلامی تہذیب و ثقافت کے امیں اور شعائرِ الٰہیہ کے علم بردار ہیں۔ یوں ریاض مجید کی نعت کے بارے میں کہنا درست ہوگا:

''نعت عظمت و شوکت کے دنوں کی واپسی کا تمہید نامہ بھی ہے اور عظمتِ رفتہ کی بازیابی کی ایک شعوری سعی بھی۔ نعت ہمارے ثقافتی تشخص کا سب سے مربوط، محفوظ اور مضبوط حوالہ ہے۔'' (۲۳)

ریاض مجید ہاں الفاظ کی یہ توسیع و تعبیر کسی تکلفِ یا غرابت کی غماز نہیں۔ شاعر نے جُملہ تراکیب کو الفاظ کی معنوی شان سے قریب تر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ پیشِ نظر نعتیہ مجموعہ کے درج ذیل اشعار میں جبریلِ لفظ، ثمرِ اشتیاق، اشک نصیب اور گریہ مقدر جیسے مرکبات ہمارے قول کا بین ثبوت ہیں:

ٹھہر ٹھہر کے مدینے کا راستہ طے کر
کُچھ اور بھی ثمر اشتیاق پک جائے (۲۴)

ہو نشوونما رات کی ، رِقّت کی فضا میں
ہوا اشک نصیب آنکھ تو دل گریہ مقدر (۲۵)

ریاض مجید نے نعت میں ، جس سپردگی اور دلّی موانست کا اظہار کیا ہے، وہ ان کے جذبِ دروں کی عمدہ مثال ہے۔ اُنھوں نے حضورِ اکرم ﷺ کی مدحت سرائی میں جس عرق ریزی کا مظاہرہ کیا ہے، اُس کے بارے میں حافظ محمد افضل فقیر رقم طراز ہیں:

''ریاض مجید کی یہ عرق ریزی بہ سلسلہ ارتقاے نعت دیدنی ہے، اس کی افادیت کے دوسرے پہلو بھی قابل ستایش ہیں ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ ہمارے شاعر نے عامستہ النّاس کے ذوق نعت کی سطح کو بُلند تر کرنے کی کوشش کی ہے اس نے کلاسیکی شعرا کی اقتدا میں خلق کی پسند و ناپسند سے مستغنی ہو کر زمزمہ پیرائی کی ہے۔ جیسا کہ ''اللھم صلِّ علیٰ ''محمد

سے متبادر ہے۔ ریاض مجید نے ہنگامِ نعت گوئی یہ امر ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا ہے کہ لفظ و معنی اور مضمون و بیاں کا رخ خلق کی بجائے موجب خلق کی طرف۔" (۲۶)

ریاض مجید معاصر شعرا کی ژولیدگی فکر اور پریشان خیالی پر تنقید کرتے ہوئے اُنھیں نعت نگاری کی دعوت دیتے ہیں۔ ترویج نعت کے سلسلے میں یہ سعی مشکور ہے۔ جس میں ایک فن کار کے ذہنی و قلبی انتشار کا علاج بھی مضمر ہے اور زادِ آخرت بھی ہے۔ جب کہ قوم وملّت کی رہبری و غم خواری اس پر مستزاد ہے۔ چناں چہ ریاض مجید نعت گوئی کو حرمِ شعر و سخن میں اذاں سے موسوم کرتا ہے:

کم سوادوں سے کہوں "حیّ علی النعت" ریاض
حرمِ شاعری میں نعت اذاں ہو میری (۲۷)

راجا رشید محمود نعت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"نعت معراجِ فہم و شعور ہے۔ کشفِ حقیقتِ جمالِ محمدی ﷺ ہے۔ دل کے بنجر کھیت میں جذبوں کی فصل پکتی ہے، تو نعت ہوتی ہے۔ یہ انسان کی محسنِ انسانیت کے حضور ہدیہ تشکر و امتنان ہے۔" (۲۸)

راجا رشید محمود نے نعت کے بارے میں جن خیالات کا درج بالا حوالے میں ذکر کیا ہے، اُن کی روشنی میں اگر ریاض مجید کی نعت کو بالعموم اور زیرِ نظر مجموعے کو بالخصوص دیکھا جائے تو اس حقیقت کو مانے بغیر یارا نہیں ہے کہ ریاض مجید نے حضورِ اکرم ﷺ کی مدحت سرائی میں شعور کی بلندیوں اور فکر کی جولانیوں کو، جو اوج عطا کیا ہے، وہ یقیناً داد طلب ہے۔ ریاض مجید کی نعت کے بارے میں پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر ریاض مجید عصرِ موجود میں اُردو نعتیہ شاعری کا ایک معتبر نام ہے۔۔۔ ریاض مجید کو قدرت نے شعر گوئی کا سلیقہ اس فیاضی سے عطا کیا ہے کہ وہ عروض و قوافی کی حدود کا ادراک بھی رکھتا ہے اور اِنتخاب کلمات کے قرینے سے بھی بہرہ مند ہے۔ محتاط الفاظ، صیقل کی ہوئی تراکیب اور شعورِ شریعت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے مفاہیم ریاض مجید کی شاعری کو عصرِ حاضر کا ممتاز اور لائقِ حوالہ مقام عطا کرتے ہیں۔" (۲۹)

ریاض مجید کی نعت کے بارے میں اگر فکری اکملیت کی بات کی جائے تو حق بہ جانب ہو گی۔ اُنھوں نے نعت قرینوں کی ادائی اور جذبوں کی پیش کش میں اس خلوص کا اظہار کیا ہے، جس کی مثال اُن کا نعتیہ کلام ہے۔ اُنھوں نے ایسے نو بہ نو اشعار تخلیق کیے ہیں کہ قاری کی نظر مختلف زاویوں سے پھرتی پھراتی ہوئی ورطۂ حیرت میں پڑتی ہے۔ وہ نعت کے عظیم موضوع اور مقامِ رسالت کے نبض شناس تھے ہی تب جا کر اُن کی نعت میں یہ شان پیدا ہوئی ہے۔ اُنھوں نے کمال ہنر وری سے تاریخِ اسلام کے روشن ابواب کو اپنے گہرے تاریخی شعور سے آمیخت کرتے ہوئے نعتیہ اشعار رقم کیے ہیں۔ کامل نعت کے لیے جس فکری ترفع کی ضرورت در پیش ہوتی ہے، وہ ریاض مجید کی نعت کا زیور رہے۔ اِس ضمن میں پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی لکھتے ہیں:

" ریاض مجید کا شعور بڑا توانا ہے، ملّت کے درد، مسلم امت کی زبوں حالی، روحانی رشتوں کے ضعف اور جسدِ قوم کی ناتوانی نے ہر شعر میں ایک کرب انگیز لرزش پیدا کر دی ہے۔ ملیّ جذبوں کی یہ واسوخت قاری کے دماغ پر ہی نہیں دل پر بھی دستک دیتی ہے اور ایک کیف آمیز پکار نفس کے تار تار کر لرزاتی ہے، درد کی یہ چیخیں محرومیوں کی جلن کو تیز تر کر دیتی ہے۔۔۔ صنعتِ لفظ کی پختگی اس قدر شعوری ہے کہ کبھی آورد کا گمان ہونے لگتا ہے کہ جیسے کوئی ماہر سنگ تراش پتھروں سے مورتیاں نکالتا ہے، مگر اُن کی اثر آفرینی کی شدت اور جذب و انجذاب کا والہانہ پن آمد کے وقار کا حامل ہوتا ہے۔"(۳۰)

ریاض مجید بلا شبہ ہمارے عہد کے بڑے نعت گو شاعر ہیں۔ اُنھوں نے نعت کے ضمن میں، جو کام کیا ہے، وہ واقعی قابلِ صد تحسین ہے۔ اُن کا معجز نما قلم فکر کی اُن بُلندیوں کو چھوتا ہے، جہاں دیگر نعت گو شعرا بڑی ریاضت کے بعد پہنچتے ہیں۔ اِس کی بنیادی وجہ ریاض مجید کا گہرا شعور اور تاریخی مطالعہ ہے۔ وہ دینی اعتبار سے بھی گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ صرف یہاں تک بس نہیں، وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہیں اور اُن کا عقیدہ نری تقلید مندی کا متعامل نہیں رہا ہے، اُن کے عقیدے کے در پردہ گہرا دینی شعور اور سیرتِ محمد ﷺ کے ایک ایک پہلو کا مطالعہ کار فرما ہے۔ آپ کی نعت بیسویں صدی میں اپنا اعتبار قائم کر چکی تھی۔ اب تو اُن کا نعتیہ کُلیّات بھی زیورِ طباعت سے آشنا ہو چکا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے نعت کے بارے میں درج ذیل حوالے میں، جو بات کی ہے، ریاض مجید کی نعت اُس کا عملی نمونہ معلوم ہوتی ہے:

"بیسویں صدی میں نعت نے حیرت انگیز ترقّی کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے اس صنفِ شعر پر بھرپور بہار آگئی۔ یقیناً رسمی نعتیں بھی بہت تعداد میں لکھی جا رہی ہیں، مگر ایسی صورتِ حال ہر صنفِ شاعری کو در پیش ہے۔ میں صرف ایسی مِعیاری نعت کی بات کر رہا ہوں، جس میں حضور ﷺ کے ارشادات اور تعلیمات کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔"(۳۱)

ریاض مجید کی نعت کو یقینا مِعیاری نعت کہا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے بڑی ریاضت، دِقّتِ نظر اور خلوص سے نعت کی تخلیق کا فریضہ انجام دیا ہے۔ وہ حضور ﷺ کی مدحت سرائی میں اُن کی سیرتِ طیبہ ﷺ اور تعلیمات کے عناصر کو دخل دیے بغیر بات نہیں کرتے۔ اُن کی نعت کو سنتِ نبوی ﷺ کے پیرایے میں اگر پرکھا جائے، تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ شعوری طور پر نعتیہ پیکر میں سیرتِ نبوی ﷺ کو ڈھالنا چاہتے ہیں۔ اُنھوں نے بھی مدحتِ پیمبر ﷺ کو اپنی نعت کا موضوع بنایا ہے، جس میں اُن کی ذاتی اُمنگیں بھی واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں، تاہم اُن کا مقصودِ خاص نعت کے ذریعے ایک خاص پیغام رسانی رہا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی ریاض مجید کے نعتیہ مجموعے اللھم بارک علیٰ محمد کے بارے میں لکھتے ہیں:

" ریاض مجید کو اس فیض فراواں پر سراپا سپاس ہونا ہے کہ ایسا کرم ہر کسی پر نہیں ہوتا، دُعا یہ چاہئے کہ پروردگارِ عالم اس کرمِ خاص کو سنبھالنے کی توفیق دے کر نعت، زُبان و بیان ہی کی نہیں سیرت و کردار کی بھی معراج ہے، درود پاک کے عنوان کے ساتھ ترتیب پانے والے اس مجموعۂ نعت کا خیر مقدم کرنا میری خوش بختی ہے۔"(۳۲)

درج ذیل شعر میں متذکرہ بالا کیفیت دیدنی ہے:

'بلیٰ' کے ساتھ ہی 'صلِّ علیٰ' کہا ہم نے
درُود خواں ہیں ، یہ عادت ازل سے رکھتے ہیں (۳۳)

ریاض مجید کا نعتیہ کلام بلاشبہ نعت کے میدان میں من حیث الفکر و فن ایک خوب صورت باب کا اضافہ ہے اور اس میں گل ہائے رنگارنگ کھلے ہوئے ہیں جن کی خُوش بُوے لطیف سانسوں کو معطر اور دماغ کو فرحت افزا خیالات بخشنے کا کام کرتی ہے۔ریاض مجید کی نعت میں نبی کریم ﷺ سے قلبی ارادت کے ساتھ داخلی جذبات کی ایک خاص کیفیت بھی نمو پاتی ہے۔بقول انور جمال:

''جدید شعراے نعت نے صنفِ نعت میں بیان کے نئے موضوعات اورر اظہار کے اسالیبِ نو تلاش کیے ہیں۔چناں چہ نعت میں ذات کا کرب ،آشوبِ عصر اور غمِ حالات کے موضوعات بھی شامل ہو چکے ہیں۔''(۳۴)

ریاض مجید کے نعتیہ کلام میں ہر طرح کے مضامین زیرِ بحث لائے گئے ہیں اور سیرت کے ہر پہلو پر خیال باندھنے کی کاوش نظر آئی ہے۔ آپ ﷺ کی بعثتِ بابرکت ہو یا دمِ عطاے رسالت کی کیفیات ہوں، آپ ﷺ کی ذاتِ پاک کا قبل از زمان و مکاں موجود ہونا یا آپ ﷺ کی روح مبارک کا رب جلیل کے ساتھ مکالمہ ہو، حرب و قتال، جنگ اور امن، شعبِ ابی طالب ہو فتحِ مکہ ، معراج کی رات ہو یا واقعہِ شق الصدر کا مضمون ہو، اصحابِ رسُول ﷺ کے مکالمے ہوں یا خاتونِ جنتؑ کا ذکر ہو، عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی آگ ہو یا فراقِ رسُول ﷺ کی کسک ہو روزِ محشر شفاعت کا بیان ہو یا آپ کی رحمت اللعالمینی کا تذکار ہو، آپ ﷺ کے اسوہِ حسنہ کا ذکر ہو یا شاہِ مرداں امامِ کبیر حضرت علی کی آپ ﷺ کے ساتھ وارفتگی اور جاں نثاری کا بیان ہو، حسنؓ و حسینؓ کے ساتھ آپ کی محبّت اور وارفتگی ہو، فاطمہؓ کے ساتھ پدرانہ شفقت کا اظہار، صورتِ رسُول ﷺ کا بیان ہو یا سیرتِ رسُول ﷺ کا تذکار ہو، غرض آپ ﷺ کی سیرت اور صورت کے ہر ہر پہلو کو ریاض مجید نے اپنے نعتیہ کلام میں سمونے کی کوشش کی ہے اور اس حوالے سے خیالات کو جس طرح سے باندھا ہے وہ بھی ایک لطیف قرینہ ہے، جو بڑے بڑے نعت گو شعرا کے حصّے میں اس وقت تک نہیں آ سکتا، جب تک کہ عشقِ رسُول ﷺ کی آگ سینے کو جلا کر کندن نہ کر دے۔شاعر لکھنوی کے مطابق:

''نعت گوئی حضور ختمی المُرتبت ﷺ کی عقیدت و محبّت کے عمیق اور بیکراں جذبوں کو نقشِ فریادی کی طرح کاغذی پیراہن میں سجانے کا عمل ہے۔''(۳۵)

ریاض مجید کی نعت میں عشقِ رسُول ﷺ پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔اُنھوں نے سوزِ دروں سے نعت میں ایک خاص قسم کی رقعت آمیزی ما عنصر پیدا کیا ہے۔یہی درد و کرب قاری کے سینے میں بھی اتارنے پر وہ قدرت رکھتے

ہیں۔ علاوہ ازیں نزاکت و رفعتِ خیال کو باہم آمیخت کرنے کے ہنر سے بھی وہ عہدہ برا ہوئے ہیں۔ عبد اللہ قریشی نے نعت گو شاعر کے لیے، جن لوازم کا ذکر کیا ہے، وہ تمام تر ریاض مجید کی نعت میں واضح طور پر جھلکتی ہیں:

"نعت گو جب تک عشقِ رسول ﷺ میں ڈوب کر توعید و رسالت اور عبودیت کے نازک رشتوں میں کامل ہم آہنگی پیدا نہ کرے، جذباتِ عالیہ، درد، سوز و گداز، رفعتِ بیان اور حسنِ ذوق سے آشنا نہ ہو، اُس وقت تک وہ نعت گوئی کے منصب سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔" (۳۶)

ریاض مجید نے نعت میں عشق آفرینی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اُن کے دل میں عشقِ رسول ﷺ موجزن ہے تب ہی وہ نعت کے فن کی طرف کامل طور پر راغب نظر آتے ہیں۔ اُن کا دلِ درد مند انسانیت نوازی کے لیے تڑپ اُٹھا ہے تب ہی جا کر اُنھوں نے نعت میں اپنا رنگ جمانا شروع کیا ہے۔ وہ نعت کی جمالیت سے پوری طرح واقف ہیں، اس لیے اُن کا معجز نما قلم فکر کی، جولانیاں دکھاتا ہے۔ ریاض مجید کی نعت کو فنِ نعت گوئی کی جس کڑے سے کڑے معیار پر پرکھا جائے، وہ یقیناً پورے اترتے دکھائی دیں گے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے نصف صدی سے زائد عرصے سے ریاضتِ شعر کی ہے اور یہی حال اُن کی نعت کا بھی ہے۔ اس بات کا بین ثبوت اُن کی نعت اور اُن کے نعتیہ موضوعات ہیں، جہاں اُنھوں نے اپنا ایک مستقل باب قائم کر رکھا ہے۔ اُن کہ یہ مسند اُن کے علاوہ خالی نظر آتی ہے۔ کیوں کہ اُن کا منفرد اُسلوب ہیں، اُنھیں اس مسند خاص پر براجماں رکھتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ:

" نعت عشق کی تخلیق بھی ہے اور عشق آفرین بھی، حسنِ نعت دل میں مَحبّتِ رسُول کی شمع فروزاں کر دیتا ہے اور اس شمع کا سوز اثر میں قرۃ العین ہوتا ہے، جس کے لیے میں جمالیاتی ٹھنڈک کی تعبیر بھی اختیار کرتا ہوں۔"(۳۷)

ریاض مجید نے مضامینِ نعت میں وسعت اختیار کرتے ہوئے آپ ﷺ کی زندگی کے ہمہ پہلوؤں کو نعت میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے، جو اپنے میں بھی ایک نہایت مستحسن اقدام ہے۔ اللہ عز و جل نے کائنات میں آپ ﷺ کو وجہِ تخلیقِ کائنات بنا کر مبعوث کیا ہے اور آپ ﷺ سے پہلے آنے والے تمام انبیا و رسلِ عظامؑ سے آپ ﷺ کی رسالت کا عہد لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موسیٰؑ جیسا جلیل القدر رسُول بھی آپ کا اُمّتی ہونے کا شرف حاصل کرنے کی آرزو کرتا ہے اور تمام انبیا آپ ﷺ پر درود و سلام بھیجتے آئے ہیں۔ بات صرف یہاں تک ہی نہیں بل کہ اللہ نے خود ہی کہہ دیا کہ اللہ اور اس کے فرشتے اس کے رسُول ﷺ پر درود و سلام بھیجتے ہیں، لہٰذا تم بھی رسُول ﷺ اور اس کی اولاد پر درود و سلام بھیجا کرو۔ یہ تحکیم معمولی نہیں ہے۔ جہاں پر درود و سلام کی بات ہوئی ہے وہاں پر اہل بیت علیہا الصلوٰۃ و سلام پر درود و سلام کا حکم بھی موجود ہے، لہٰذا آدھا درود و سلام بھیجنے کے بجائے پورا درود و سلام ہی مستحسن اور مستوجب عند اللہ ہے۔ اس حوالے سے ریاض مجید کی نعت میں آپ ﷺ کی آلِ پاکؑ کا بھی ذکر ہے اور ان پر درود و سلام کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ ان کی نعات میں نئے مضامین بھی آئے

ہیں، جو ما قبل نعت گو شعرا کے ہاں نہیں ملتے۔ اور اگر ملتے بھی ہیں تو بہت کم کم شعرا کے ہاں ممکن ہیں، جو نعت میں اتنا بڑا نام تو نہیں رکھتے، مگر ایک مسلمان ہونے کے ناطے عشقِ رسُول ﷺ میں نعت کہتے ہیں:

"نعت ہر مسلمان کے اعماقِ قلب سے نکلتی ہوئی ایک ایسی آواز ہے،، جو دامن میں عقیدت کی گرمی کے ساتھ ساتھ آنسوؤں کی نمی بھی لے آتی ہے۔" (۳۸)

ریاض مجید کی نعت میں ہمیں ایک ایسا شاعر ملتا ہے ، جو اپنی زندگی کی تمام چاہتوں کو آخر کار حضور ﷺ پر فریفتہ کرنے میں اپنی کامرانی کا راز پاتا ہے۔ اُن کی نعت میں ایک خاص قسم کی سپردگی پائی جاتی ہے، جو قاری کو بھی اپنی لپیٹ میں لیے بغیر دم نہیں لیتی۔ وہ معاشرے کی تضادات کا جہاں کہیں نوحہ بیان کرتے ہوئے دامنِ نبوی ﷺ میں پناہ لیتے ہیں، وہاں دوسروں کو بھی اسی قسم کا درس دیتے ہیں۔ ریاض مجید کی نعت میں ہمیں بہت سے اوصاف دکھائی دیتے ہیں۔ عشقِ رسُول ﷺ اُن کی نعت میں ریڑھ کی ہڈی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ وہ اس کے بغیر نعت کے باب میں ایک شعر بھی تخلیق نہیں کر پاتے۔ علاوہ ازیں اُنھوں نے حضور ﷺ کی سیرت و کردار کے ہر ہر نمونے کو بڑے بلیغ انداز میں سمویا ہے۔ اُن کی نعت کو درج بالا قرینوں کے بغیر سمجھنا محال ہے:

"حُبِّ رسُول کے ساتھ نبوت کے اصلی کمالات اور کارناموں، اسلام کی صحیح روح، عہدِ رسالت کے واقعات اور آیات واحادیث سے واقفیت ضروری ہے، جو کم شعرا کو ہوتی ہے۔ اس کے بغیر صحیح نعت گوئی ممکن نہیں۔" (۳۹)

ایسے نعت گو شعرا کا کلام عام نعت گو شعرا سے ہٹ کر ہوتا ہے اور ان کے سامنے ماسوائے حبِ رسُول ﷺ کے اور کُچھ نہیں ہوتا۔ اس حوالے سے ایسے شعرا کے ہاں اگر نعتیہ مضامین آتے بھی ہیں، تو وہ روشِ عام سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ زیرِ مطالعہ مجموعہ نعت میں بھی ایسے مضامین ہیں، جو نعت میں آزمائے جانے والے مضامین سے ہٹ کر ہیں اور ان کو پہلی ریاض مجید کے ہاں ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان مضامین میں ندرت کی ایک وجہ مضامین میں نئی معنویت پیدا کرنا اور ایسے گوشے تلاش کرنا، جو نعت میں پہلے سے بیان نہ ہوئے ہوں۔ وصالِ رسُول ﷺ کی آرزو تو ہر صاحبِ ایمان شخص کو ہوتی ہے، مگر اس میں جذبہِ عشقِ مصطفوی ﷺ کی وہ آگ کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے، جو دلوں کو جلا کر کندن کر دیتی ہے اور اس نئی نعمتِ متبرکہ کی فضیلت کا اندازہ صرف صاحبِ علم لوگ ہی لگا سکتے ہیں۔ اس کتاب میں جذبہ عشقِ مصطفوی ﷺ کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے اور خلوص اور وفا کا پاس دکھائی دیتا ہے۔ محسن احسان کی درج ذیل رائے ریاض مجید کی نعت پر مِن و عَن صادق آتی ہے :

"نعت میں نہ عبارت آرائی کام آتی ہے نہ مضمون آفرینی اور نہ ہی نری عقیدت اور تنہا وفورِ محبّت۔ اس صنف میں کامیابی کی اوّلین شرط یہ ہے کہ ممدوح کی ذات وصفات کا صحیح عرفاں حاصل ہو؛ اس کی عظمت و رفعت کا گہرا نقش لوحِ دل پر ثبت ہو

اور، جو کچھ وہ کہے وہ کسی لمحے کی ترنگ یا خیال کی اُمنگ میں نہ کہے بل کہ اپنے تمام تر فکری سرمایے اور قلبی جذبات کے رنگ میں ڈوب کر اعترافِ عظمت اور شکرانۂ نعمت کے طور پر علم و عمل کی گواہی کے ساتھ کہے۔"(۴۰)

ریاض مجید کی نعت کے فکری محاسن کا آغاز اسی جذبے کے تجزیاتی مطالعے سے ہوتا ہے۔ اُن کا فکری اختصاص یہ ہے کہ اُنھوں نے اس جذبۂ عشقِ مصطفوی ﷺ کو وصال کے باطنی احساس کے ساتھ ملتزم کر کے پیش کیا ہے اور ان کے ہاں روضہ رسُول ﷺ پر حاضری، جو تڑپ اور کسک ہے وہ دیدنی ہے۔ ایسے میں اُنھوں نے مظاہرِ فطرت کو تجسیمی اور تمثیلی سطح پر جذبے کی ترسیل میں معاون بنا دیا ہے اور جس طرح کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے آبِ حیات میں " محنت پسند خرد مند" کی تمثیل میں باطنی جذبات و احسات کی کرداد نگاری کی ہے اسی طرح موصوف نے نعت میں تاثیرِ دروں پیدا کرنے کے لیے تماثیل بیان کی ہیں۔ عشقِ احمد ﷺ کی ضیا پاشی ہی سے کائنات میں تمام نور کی جلوہ گری اور عشوہ گری ہے۔ اس خیال کو نئی فکری منہاج کے ساتھ ریاض مجید نے بڑی عمدگی کے ساتھ اپنایا ہے اور شعر کے قالب میں ڈھال کر فصاحت کا مِعیار قائم کیا ہے۔ عشقِ احمد ﷺ وہ جذبہ ہے، جو آنکھوں کو ضیا اور زیست کو اک نیا مزا دیتا ہے۔ یہ جینے کا سلیقہ اور مدِ مقابل کو تدبیر کے ساتھ زیر کرنے کی بُلند ہمتی عطا کرتا ہے۔ یہ وہ آگ ہے، جو جلاتی ہے تو انسان اشرف المخلوقات اور نیابتِ الٰہی کے درجے پر متمکن ہو جاتا ہے۔ فضیلتِ انسانیت کے مدارج کو بہ احسن انداز طے سے کیا جاتا ہے اور انسان علی منہاجِ الاولیا زیست کرتا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے کہ جس کی آب و تاب کے سامنے بڑے بڑے سر جھکا دیتے ہیں۔ یہاں پر شاہ و سلطان سبھی منگتے ہیں اور سبھی کی آس و اُمّید اور نجات کا ذریعہ یہی عشقِ مصطفوی ﷺ ہے۔ کائنات میں اسی جذبے کے دم سے دم ہے اور آنکھوں میں نئی آس اسی جذبے کی دین ہے۔ یہ خوب صورت مضامینبہ تمام و کمال" اللھم بارک علیٰ محمدِ ؐ" میں جا بجا ملتے ہیں اور فنِ شاعری کے حوالے سے ان کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کلام میں خیال کی بُلندی اور فکری منہاج ملاحظہ کیجیے:

اپنی توقیر گدائی کی وراثت پر ہے ناز
ہم ازل سے نسل در نسل آپ کے سائل ہوئے (۴۱)

غلام ازل سے ہیں ہم اُس نبیؐ کے نسل بہ نسل
یہ سلسلہ یہ روایت اَزل سے رکھتے ہیں (۴۲)

مشاہدات سے کرتے ہیں عکس و لحن کشید
ثنا میں طرح نئی ہم نواؤ! ڈالتے ہیں (۴۳)

ریاض مجید نعت کے میدان میں محسن کاکوروی اور حفیظ تائب کے قبیلے کا شاعر ہے۔ اُنھوں نے نعت میں حضور ﷺ کے محامد و محاسن کا، جس خوب صورتی کے ساتھ خیال رکھا ہے، شاید کسی اور شاعر کے ہاں یہ التزام نظر نہیں آ سکتا۔ نعت واقعی

ایک کٹھن اور نازک مزاج کارِ سخن ہے۔ یہ کارِ سخن بظاہر جس قدر سہل دکھائی دیتا ہے اسی قدر غایت درجہ نزاکت آفرینی اور حذم واحتیاط کی احتیاج رکھتا ہے۔

(الف) موضوعی وفکری جائزہ:

نعت میں فکر و موضوع کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ سیرت کے موضوعات کو نعت میں بہت کم آزمایا جاتا ہے کیوں کہ جذباتیت کی غایت درجہ موجودگی کسی اور پہلو کی طرف شاعر کے دھیان کو منقلب ہونے ہی نہیں دیتی۔ سیرت ایک اہم موضوع ہے جسے بہت کم شعرا نے اپنایا ہے، مگر ریاض مجید کے ہاں اس حوالے سے قاری کو مایوسی نہیں ہوتی۔ قاری مضامین کی رنگارنگی کے ساتھ ایمان افروز موضوعات سے اپنے باطن کی تطہیر بھی چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صورت نگاری اور سراپا کشی سے زیادہ وہ مضامین وخیال، جو مبنی بر سیرت ہیں وہی زیادہ دیرپا اور مقبول ہوتے ہیں۔ اُردو میں جس قدر بھی نعت گو شعرا آئے ہیں اُنھوں نے اپنے جذبات اور عقیدت کا نذرانہ الفاظ کی کم مائیگی کے باوجود بارگاہ رسالت ﷺ میں پیش کیا ہے، مگر پیش کش کا انداز ہر کسی کا مختلف ہے اور دوسروں سے ممیز ہے:

> ''اچھّی نعتیہ شاعری دو بنیادی عناصر سے وجود میں آتی ہے۔ عشقِ رسُول ﷺ اور شاعری کے ضروری لوازمات اورر تقاضوں کی تکمیل۔''(۴۴)

ریاض مجید کی شاعری عملی سطح پر عشقِ رسُول ﷺ کا نمونہ او اظہاریہ ہے۔ وہ شعر کی فنی لطافتوں سے بھی بہ خوبی آشنا ہیں۔ اس لیے وہ نعتیہ شعر کی بنت میں کمال ہنروری دکھاتے ہیں، جس کی مثال اُن کی نعتیہ شاعری ہے، جس میں ہمیں ایسے ایسے نشتر اشعار ملتے ہیں،، جو اُن کی نعتیہ قادر الکلامی پر دل ہیں۔ ریاض مجید کی نعت کو بہ غور پڑھنے اور وجد کرنے کے بعد یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے:

> ''نعت ایک صنفِ سخن نہیں ایک وظیفۂ حیات ہے۔ یہ وزن، ردیف اور قافیہ کا دروبست نہیں، عقیدتوں، محبّتوں اور ارادتوں کا حرفی اظہار ہے۔ عقیدت متوازن نہ ہو، محبّت درِ محبوب کی عظمتوں سے آشنا نہ ہو تو نعت کی توفیق نہیں ملتی۔ یہاں حرف حرف منتخب ہوتا ہے۔ ہر لفظ، ہر سطر اور ہر خیال نکہت بار ہے۔''(۴۵)

ریاض مجید نے اپنے نعتیہ کلام میں، جس دل گداز انداز میں مدینے جانے اور درِ رسالت ﷺ پر حاضری دینے کے مضامین بیان ہوئے ہیں ان سے شاعرات کے مطہر جذبات اور پاکیزہ خیالات کی شدت اور خلوص کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح کا پُرخلوص انداز ایک ایسے شخص کا بیانیہ ہو سکتا ہے، جو سراپا عشقِ مصطفیٰ ﷺ میں مستغرق ہو اور اسے ہر شے سے آپ ﷺ کی محبّت ہی زیادہ عزیز ہو۔ درِ مصطفیٰ ﷺ پر حاضری دینے اور وہاں محبوبِ خدا ﷺ کی گلیوں کی خاک چھاننے کی آرزو اور جستجو ہر شاعر اور شاعرہ کے کلام میں نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید کی نعات میں اس حوالے سے بہت سے اشعار قابلِ ملاحظہ

ہیں، جن میں مدینے میں قیام کرنے اور زیادہ طویل عرصے تک قیام کرنے کی آرزو کو نئے فکری پیرہن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ثنا و سیرتِ شاہِ امم کے راستے کتنے؟
درِ فردوس تک پہنچے قلم کے راستے کتنے!
جلاتے ہیں چراغِ نعت ماحولِ تہجد میں
ہیں یاد طیبہ میں ، تزئینِ غم کے راستے کتنے! (۴۶)

اس انداز کے شعر ریاض مجید کی نعتیہ شاعری میں بھی نظر آتے ہیں، جن میں مضامینی اُپج اور فکری منہاج بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ریاض مجید نے اپنے جذباتِ عشق کے اظہاریے سے قبل جذبات کی تطہیر کا کام خوب لیا ہے، جس کی وجہ سے ناقد کو کہیں بھی کوئی لغزشِ شعری نہیں دکھائی دیتی۔ریاض مجید کی نعات کے یہ اشعار اسی حوالے ملاحظہ کیجیے:

ما قبل کے مابعد کے اسرار نمودار
فن میں ہوئے انوارِ حُب آثار نمودار
اک سجدۂ شکر اپنی سواری سے اتر کر
جب ہوں حرم شاہ کے مینار ، نمودار (۴۷)

عمر بھر موجۂ انفاس میں رہنے والی
ہے مہک طیبہ کی احساس میں رہنے والی
اک بھیگی ہوئی تصویرِ حرم ، رخصت کی
ہے ہمیشہ دلِ حساس میں رہنے والی (۴۸)

درج بالا نعتیہ اشعار میں مدینہ منورہ جانے کی آرزو اور وہاں پر خاکِ پائے رسُول ﷺ میں مل جانے کی خواہش نظر آتی ہے۔اس مقدس جذبے کو لفظوں کے پیرہن میں پوری شدت کے ساتھ ظاہر کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔مدینے سے بچھڑنے قلق اور شہر نبی ﷺ کی یاد کے آنے کو بھی شاعر نے اپنی نعات میں مضمونِ شعر بنایا ہے اور تماثیل و استعارات اور تشبیہات و لفظی شان و شوکت کے ساتھ خوب صورت پیرایے اظہار پیش کیا ہے۔نعت کے یہ اشعار اس پر دال ہیں:

رسُولِ خیر ، وہ تزئین گر مری جاں کے
ازل کے دن سے ہیں نزدیک تر ، مری جاں کے
وہ نام لکھا ہے دیوار پر ، مری جاں کے
حرم کی یاد سے بجلی سی کوند جائے ریاضؔ

چمک چمک اٹھیں دیوار و در ، مری جاں کے! (۴۹)

ریاض مجید کی نعت اُن کا داخل بھی ہے اور خارج بھی۔ اُن کا منفرد اُسلوب بھی اُن کی جدا پہچان کا باعث ہے۔ وہ اپنی الگ لفظیات کے بھی مالک ہیں، جو اُنھیں ایک اعتبار عطا کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ریاض مجید کو بہت سی گوناں گوں صلاحیتوں سے مالا مال کر رکھا ہے۔ نعت کے مسلسل لکھاری ہونے اور نعتیہ مضامین اور شعری مجموعوں کی اشاعت سے ایک قلبی اور خصوصی تعلق رکھنے کی بدولت نعت ایک اعتبار سے اُن کا اوڑھنا بچھونا ہو چکا ہے، لہٰذا اُن کی مخصوص لفظی پہچان، جذبے اور احساس کی کارفرمائی، اُن کی ایسی ایسی نادرہ کار تصاویر بنانے میں معاونت کرتی ہے، جس کی مثال اُن کا پورا نعتیہ کلام ہے ،، جو مکمل طور پر رجوع چاہتا ہے۔ اگر اس بحث کا ملخص پیش کیا جائے، تو یہ کہا جا سکتا ہے:

> ”نعت وہ آئینہ ہے جس میں نعت گو شاعر کا عکس بھی نظر آتا ہے، یعنی جس طرح کے الفاظ، خیالات اور جذبات عقیدت اور محبّت کی ترجمانی کرتے ہیں، اس سے شاعر کے ادراک و احساسات کی تصویر بھی اس آئینہ میں محسوس کی جا سکتی ہے۔“(۵۰)

ریاض مجید کی نعت میں ان کے دلی جذبات اور اُمنگوں کا ایک جہان آباد ہے، جس میں وہ اپنی تڑپ کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ شہنشاہِ کائناتؐ کے شہر میں قیام کرنے کی آرزو کے ساتھ ہی نعت میں آپ ﷺ سے روحانی ہجر و فراق کے مضامینِ خیال بھی نئے تجربے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں ۔یعنی جہاں پر مدینہ جانے کی آرزو اور جستجو ہے وہیں ہمیں آپ ﷺ کے ساتھ شاعر کے روحانی اتصال کی آرزو بھی دکھائی دیتی ہے اور اس معاملے میں بندشِ الفاظ بھی داد کی مستحق ہے کے وہ نعات کے محامد و محاسن کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ ریاض مجید کے ہاں یہ نعتیہ اشعار اس بات کی دلیل ہیں کہ ہجرِ رسو ﷺ در اصل آپ ﷺ کے روحانی اتصال کی حسرت ہی کا محرک ہے:

کوئی دامانِ تہی، کوئی سوالی ہاتھ
لوٹ سکتا ہی نہیں طیبہ سے خالی ہاتھ (۵۱)

آنکھ تکتی ہے ہر اک راہ پہ انوار عجب!
قریۂ خیر شہر ہے وہ شہر آثار عجب! (۵۲)

عشقِ مصطفی ﷺ مشیت کی وہ عدالت ہے جہاں مقدر اپنی قسمت کا فیصلہ سننے آتا ہے۔ آسمان والے بھی سائل بن کے آتے ہیں اور زمین والے بھی۔ عشق مصطفی ﷺ میں جنوں کی سوختہ سامانیاں اور آپ ﷺ سے وصال کی آررزو یہ سبھی پاکیزہ جذبات کی عکاسی کرتے ہیں، جو ریاض مجید کے کلام میں ان کے ایمان اور آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس سے محبّت کی علامت ہے۔ یہ وہ عشق ہے کہ جس سے مقدر کے ستارے چمک اٹھتے ہیں اور آنکھوں کو ضیا ملتی ہے۔ اِس ضمن میں محمد عبد اللہ قریشی نے بجا لکھا ہے:

"نعت گو جب تک عشقِ رسُول ﷺ میں ڈوب کر توحید و رسالت کے نازک رشتوں میں کامل ہم آہنگی پیدا نہ کرے، وہ نعت گوئی کے منصب سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔"(۵۳)

عقیدت اور محبّت اپنی جگہ، لیکن آدابِ نعت اور احترامِ نبیؐ بھی الگ معنی رکھتے ہیں اور اس معاملے میں شاعر کا نعتیہ لب و لہجہ بہت پُر اعتماد، مطمئن، محتاط، متشکر، حساس اور مہذب ہے کہ اُنھوں نے حد درجہ احتیاط سے کام لیا ہے اور کہیں بھی سوے ادب کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ورنہ بہ فرطِ جذبہ عشق حزم و احتیاط کا معیار قائم نہیں بھی رہتا اور کبھی کبھی زیادہ بے تکلفی بھی آ پہنچتی ہے، مگر اس اِنتخاب میں ایسا کُچھ نہیں ہے عشقِ رسُول ﷺ کا ایک مہذب اور شایستہ طرزِ اظہار نعت کو چار چاند لگا رہا ہے۔ ریاض مجید نے نعت کی روایت کا بھی خیال رکھا ہے۔ وہ مضامین کی جدّت سے بھی بہ خوبی کام لینا جنتے ہیں۔ نعت کے بیان میں اُنھوں نے احتیاط کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اُنھوں نے حتی الامکان حقیقت کے آئینے کو سامنے رکھ کر نعت تخلیق کی ہے۔ البتہ اپنی اُمنگوں کے اظہار میں اُنھوں نے دل کھول کر اپنی حسرتوں کو تسلسل سے شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ وہ ایک غزل گو شاعر بھی ہیں۔ وہ عشق کے اسرار و رُموز کے بھی شناور ہیں۔ وہ عشق میں عام محبوب اور نبی ﷺ کی ارادت و محبّت کے بیان کا قرینہ بہ خوبی جانتے ہیں۔ اسی سلیقہ مندی کے طفیل اُن کی نعت ہمیں سب سے الگ تھلگ نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی نعت کے بارے میں درج ذیل رائے کے باب میں ریاض مجید کی نعتیہ شاعر واقعی اپنی مثال آپ ہے:

"نعتیہ شاعری کی مشکل یہ ہے کہ اگر ایک طرف مذہبی شاعری ہے، تو دوسری طرف اس کے رشتے عاشقانہ شاعری سے ملتے ہیں اور اس کے باوجود حق یہ کہ یہ نہ مذہبی شاعری ہے اور نہ عاشقانہ شاعری، بل کہ یہ ایک ایسی صنف ہے، جو ایک عجیب قسم کے، مگر گہرے روحانی تجربے سے ابھرتی ہے۔ یہ خدا سے محبّت کی شاعری نہیں کہ جس کا مخاطب کسی کو بھی نظر نہیں آتا، اگرچہ وجدان میں ہے۔ اس لیے اس شاعری کی ساری رمزیں ماورائی ہیں، مگر نعت کا موضوع ایک پیکرِ محسوس کی محبّت ہے۔ اس لیے نعت کی رمزیں اور اس کے استعارے مبالغہ و اغراق کی تاب نہیں لا سکتے۔ نعت گو اس کی مدح میں حقیقت گوئی پر مجبور ہے ورنہ ہر گام سوے ادب کا خطرہ ہے اور اس پر یہ محبّت کے پر احترام جذبے کو ادب کی قیود میں سنبھال کر لے جانا پڑتا ہے، لیکن اس کے باوصف گداز اور گھلاوٹ شرطِ لازم ہے۔"(۵۴)

ریاض مجید کی نعت میں جذبۂ عشقِ رسُول ﷺ ہر رنگ میں اپنی تمازت دکھاتا ہے۔ اُن کے ہاں عشقِ رسُول ﷺ کی ایک خاص تڑپ شہرِ مدینہ کے حوالے سے ملتی ہے۔ اس موضوع پر اُنھوں نے سب سے زیادہ لکھا ہے۔ ریاض مجید کی نعت کا یہ من پسند موضوع ہے، جس پر وہ جا بجا لکھتے ہیں، یہاں تک کہ اس نوع کے اشعار کو اگر الگ سے دیکھا جائے، تو باقاعدہ ایک شعری مجموعے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ تحقیقی حوالے سے ریاض مجید کے اس موضوع پر ایم فل کی سطح کا کام بڑی کامیابی سے ہو سکتا ہے۔ اس عشق میں شہرِ مدینہ کو دیکھنے اور وہاں قیام کرنے کی آرزو بھی شامل ہے اور آپ ﷺ کا خواب میں دیدار بھی

شامل ہے۔ اور ایسے میں ریاض مجید کے ہاں حزم و احتیاط اور آدابِ رسالت کا اتنا پاس ہے کہ وہ تو ثنا لکھنے والے قلم کو بھی اشکِ عقیدت سے باوضو کرنے کے استعمال کرنے پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

غلام آیا ہے " حیّ علی الثنا" لے کر
حضورِ شاہؐ وِلا کی کتاب حاضر ہے (۵۵)

بخش نعتِ ریاضؔ کو حیرت
سدرۃ المنتہٰی سے آگے کی (۵۶)

سب سے پہلا نعت خواں ہونے کا شرف حضرت حسان بن ثابتؓ کو حاصل ہے، جنھوں نے آپ ﷺ کی مدحت سرائی کی اور وہ مشہورِ زمانہ اشعار کہے، جو اپنی فصاحت و بلاغت کی مثال خود آپ ہیں۔ اس مضمون کے حوالے سے ریاض مجید کے نعتیہ کلام میں اگر کوئی نیا خیال باندھا گیا ہے تو وہ جذبہ رشک ہے، جو ان کی نعت میں نعت میں ملتا ہے۔ یعنی شاعر ایک نئے انداز میں حضرتِ حسان بن ثابتؓ کی طرح نعت کہنا چاہتا ہے۔ اسی لیے تو کبھی عمرؓ و علیؓ اور کبھی اویسؓ و بلالؓ کی صورت میں نعت کو دیکھتا ہے:

کہیں پہ صورتِ عثماںؓ کہیں پہ شکلِ علیؓ
کہیں حیا پہ ، کہیں فقر کے کمال میں نعت
کہیں فراقِ دوامی ، کہیں حضورِ مدام
کہیں اویسؓ ، کہیں صورتِ بلالؓ میں نعت (۵۷)

یہ نئے انداز کی نعت ہے جسے پہلے اس طرح کسی شاعر نے متذکرہ بالا مضامین کے ساتھ نہیں نبھایا ہے۔ یہ جو جذب و عقیدت ہے وہی ان سے نعت لکھواتی ہے۔ ایک طرح سے جذبۂ رشک کا اظہار کیا جاتا ہے کہ کاش ایسی نعت ممکن ہو، جو مِعیار و مقدار میں لامثال و بے نظیر ہو۔ نعت میں یہ مقام پانے کی جستجو دراصل شاعر کا عشقِ رسول ﷺ ہے، جو اسے بُلند درجے پر متمکن کرتا ہے، یہ تمنا قابلِ ملاحظہ ہے:

کیا زندگی افزا ہے لہک صلِّ علیٰ کی
ہر قطرۂ خوں میں ہمک صلِّ علیٰ کی
بالائے فلک نور میں ہو جاتی ہے تبدیل
آواز جو ہے زیرِ فلک صلِّ علیٰ کی (۵۸)

ڈاکٹر ریاضؔ مجید کی نعات میں عشقِ رسول ﷺ کا اظہار کئی رنگوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ عشقِ رسول ﷺ میں مستغرق ہو کر وہ ہدیہ نعت جب بجالاتے ہیں، تو تاثر کی ہمہ گیر گہرائی اور گیرائی آگے بڑھ کر ان کے سامنے جبین نیاز کو سجدہ ریز

کر دیتی ہے۔ ایسے میں لفظ اشکِ تمنائے جلوۂ مصطفی ﷺ سے باوضو ہو کر سوالی بن جاتے ہیں اور نعت سراپا درورد بن جاتی ہے۔ سلام سے لے کر درود تک اور درود سے ولیل کی زلفوں کی فضیلت وخُوش بُو کے تذکار تک سبھی اسی جذبے کی تخلیق ہیں، جس کے رنگ اور روپ متفارق صورتوں میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ درود وسلام کی اسی تعظیمی پیش کش کو دیکھیے:

جاوداں صبحِ ازل سے شامِ محشر تک ہے یہ
اے خوشا! شاہِ دو عالم کی عطا کا سلسلہ (۵۹)

کوئی لمحہ نہ بغیر اُن کی حضوری کے کٹے
ٹوٹنے پائے نہ یہ سلکِ پُر انوارِ درود (۶۰)

عشق کے اس جذبے کی تطہیر سے گزرے ہوئے ریاض مجید کے ہاں مختلف الجہات مضامین بکھرے پڑے ہیں، جو روانی اور سلاست میں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ نعات کے ان متفرق اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں شعر میں مضمون کو مختلف الذائقہ نباہنے کی کس قدر صلاحیّت موجود ہے اور یہ صلاحیّت کسی بھی اُردُو کے بڑے نعت گو شاعر سے کم نہیں ہے۔ عام طور پر ہر شاعر کی نعت کو وہ درجۂ استناد دیا نہیں جاتا، جو ایک قادر الکلام شاعر کو ملتا ہے۔ ریاض مجید بلاشبہ ایک قادر الکلام اور جامع الخیالات شاعر ہیں جن کے ہاں الفاظ دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ اُنھیں جہاں چاہتے ہیں پکڑ کر مرصع کر دیتے ہیں۔ زیرِ نظر اشعار میں متذکرہ عام خیال کی تردید اور اوّل الذکر خیال کی توثیق ہو گی:

تصوُّرِ گنبدِ خضرا ہی کا مہمیز ہوتا ہے
قریبِ طیبہ آتے ہی سفر کُچھ تیز ہوتا ہے
حُدی خواں کی صدا کُچھ اور ہوجاتی ہے وارفتہ
اثر آثار لہجہ اور حب انگیز ہوتا ہے (۶۱)

شعر کے فنی وفکری محاسن بقدرِ مقصدیت موجود ہیں اور فنِ شعر میں کسی سے کم نہیں۔ نعت کی جُملہ پابندیوں کے ساتھ ساتھ اس کے اعلیٰ مِعیار کا بھی پاس موجود ہے۔ نعت کے جُملہ محاسن اور شعری جمالیات منصۂ شہود پر لاتے ہوئے نقاد بلا خوفِ تردید نقاد یہ رائے قائم کر سکتا ہے کہ ''اللھم بارک علیٰ محمد□'' میں انفرادی اُسلُوبِ بیان اور شعر میں مضامین باندھنے کا ہنر نظر آتا ہے۔ کبھی طوافِ شہر مدینہ محبوب کی یہ خواہش انگڑائیاں لیتی نظر آتی ہے، جو عاشقِ صادق کے دل کی مراد ہوتی ہے اور محبوب کا فقط ایک جلوہ اس کی زندگی کا مول ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''نعت عشق کی تخلیق بھی ہے اور عشق آفرین بھی۔ حسنِ نعت دل میں محبّتِ رسُول ﷺ کی شمع فروزاں کر دیتا ہے اور اس شمع کا سوز اثر میں قرۃ العین ہوتا ہے، جس سے جمالیاتی ٹھنڈک اپنا روپ دھارتی ہے۔''(۶۲)

نعتِ رسُولِ مقبول ﷺ کا عشق وہ پاکیزہ عشق ہے، جس کی تائید خود اللہ تعالیٰ نے کی ہے اور اسی تائید میں ساتھ سلامی و درود کی تحکیم بھی لگا دی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا اجر بے شمار قرار دے دیا اور اس کا صلہ حیرت انگیز طور پر ناقابلِ حساب رکھا ہے۔ اور کبھی اس عشق کی ضیا پاشی بے کسوں کے آسرے، یتیموں کی کفایت، حاجت مندوں کی حاجت روائی اور امت کی بھلائی میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس کی روشنی جلا بخشتی ہے اور اس کا نور زیست کی سانسیں دراز کرتا ہے۔ یہ نسلوں کو سنوارتی اور قبائلِ منتشرہ کو ایک منظم قوم بناتی ہے۔ نعت منزہ، مطہر اور مجلہ شبدوں کا آئینہ ہوتی ہے۔ یہ زم زم اشکِ عشقِ پیمبرؐ سے باوضو ہو کر کہی جاتی ہے اور پلکوں سے الفاظ چن کر گوہر بنا دیے جاتے ہیں تا کہ جمالیاتِ معنوی و لفظی کا ایک جہانِ پُر شکوہ، جو قلب و ذہن کو فرحت افزا اور ایمان افروز بوستانِ احساس سے خیرہ کر دے اور قوائے ایقان کو درست سمت عطا کر دے:

سرِ فلک مرے لفظوں کا سر لگاتا ہے
ترا وسیلہ دعاؤں کو پر لگاتا ہے
وہ سینچتا ہے مجھے اپنی حب کے زم زم سے
خیال اس کا مژہ پر گہر لگاتا ہے
گلے سے اپنے ریاضؔ ایسے زشت روؤں کو
وہی پیمبر والا گہر لگاتا ہے (۶۳)

ریاضؔ وقتِ تہجد ہے اور میں سوچتا ہوں
حرم کے باب ہیں آنکھوں سے دور کھلنے کو (۶۴)

(ج) نعت کی فنی جمالیات اور داخلی رجحانات:

نعت جیسی صنفِ سخن جہاں حد درجہ حزم و احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، شاعر کے لیے بہت سارے چیلنجز لے کر سامنے آتی ہے۔ ہر نعت گو شاعر اس سے مختلف انداز میں نبرد آزما ہوتا ہے کیوں کہ کارخانۂ عالم میں ہر انسان کی طبعِ خام کا خمیر دوسرے انسان سے مختلف ہے اور ہر انسان کی طبیعت اور مزاج میں دوسروں کی نسبت اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہی اختلاف حسنِ نعت کا باعث بھی بنتا ہے اور باعثِ نزاع بھی بنتا ہے۔ ہر شخص بذاتِ خود اپنی اور دوسروں کی کہانی ہوتا ہے۔ دوسروں کی کہانی اس لیے کہ اس کی زندگی میں دوسرے لوگوں کے کردار بھی بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ نعت کے میدان میں بھی کلاسیکی آن

بان کے ساتھ جدّت کے آثار نمودار ہوئے ہیں۔ آج کی نعت صرف مدحت پیمبر ﷺ کا نمونہ نہیں بل کہ اپنے اندر تہذیب و ثقافت کے آثار جھلکتے ہیں۔ تحسین فراقی نے نعت گوئی کی اسی کیفیت کے بارے میں یوں لکھا ہے:

"جدید اُردو نعت گوئی نے ہماری کلاسیکی نعت گوئی سے ایک الگ اور منفرد راستہ نکالا ہے۔ کلاسیکی نعت گوئی کا ایک بڑا مقصد حصُولِ ثواب وبرکت تھا اور یہ زیادہ تر حضورِ اکرم ﷺ کے شمائل اور معراج و معجزات کے ذکر سے وابستہ تھی۔ جدید نعت اپنے عہد کے تہذیبی اور معاشرتی آشوب سے جڑی ہوئی ہے۔"(۶۵)

جدید نعت کے اس پھیلے ہوئے کینوس کو دیکھ کر یہ کہنا بجا ہو گا کہ انسانی زندگی اپنی اور دوسروں کی کہانی ہوتی ہے۔ یوں تو ہر شخص کی کہانی الگ ہوتی ہے اور کسی نہ کسی طرح سے دل چسپ بھی ہوتی ہے اور دوسروں کے لیے اس میں مُسرّت و عبرت کا سامان بھی ہوتا ہے، لیکن ہر نعت اپنی زندگی میں نعت جیسے پاکیزہ خیالات کی ترجمانی پر قادر نہیں ہو سکتا۔ لکھنے کا ملکہ ہر کسی کے پاس نہیں ہوتا اور اس پر مستزاد یہ کہ صحیح لکھنا تو خداداد صلاحیت ہے، جو فی زمانہ بہت کم لوگوں میں موجود ہے۔ بھلے لوگ نعت لکھتے وقت صلے یا معاوضے کا مطلق لحاظ نہیں رکھتے، جب کہ کُچھ لوگوں پر خبطِ عظمت کا بھوت بھی سوار ہو جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نعت کہنا انتہائی دشوار گزار کام ہے:

"نعت کی کیمیا کی تیّاری کا عمل اتنا آسان نہیں کہ، جو چاہے اس سے سونا تیّار کر لے۔ اس عمل میں احترام وعقیدت، احتیاط و اعتدال، توازن و تائل، تفصیل و اجمال، اظہار و اخفا اور وجدان و عرفان کے لیے ایسے ایسے نازک، دشوار اور تلوار کی دھار پر چلنے والے مرحلے سے گزرنے کا ہنر اُنھی کے حصے میں آتا ہے، جو معرفتِ رسُول ﷺ کا ادراک رکھتے ہیں۔"(۶۶)

نعت کہنا واقعی جان جوکھوں کا کام ہے، جس میں جگہ جگہ پر اُسلُوبِ بیان میں فنی نزاکتوں کا خیال دامن گیر رہتا ہے اور شاعر کی جان سولی پر لٹکتی رہتی ہے، مگر ان سب مشکلات کے باوجود بہترین نعت وہ ہے، جس میں فنی جمالیات اور داخلی جذباتیت کی طہارت اور اخلاص موجود ہو اور جس میں کسی شائبے کی گنجایش باقی نہ ہو۔ ریاض مجید کی نعات میں فنی جمالیات بھر پور موجود ہیں۔ ان کے ہاں نعات کے فن کا جمال ان کی منتخب کردہ زمینوں، ابحار اور قوافی وردیفوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ ان کی نعات کی زمینیں بھی بہت رواں اور سلیس ہیں۔ ان میں زیادہ تر غزل کا لطف موجود ہے:

خیال پاک، ہنر کا مگار کرتے ہیں
خوشا! جو نعتِ نبیؐ اختیار کرتے ہیں (۶۷)

ہمیشہ اس شفیق آقا ﷺ کی شفقت ساتھ رہتی ہے
ہزاروں ماؤں سے بڑھ کر وہ رحمت ساتھ رہتی ہے (۶۸)

فنِ شعر کی جمالیات کلیک اور پہلو ردیف اور قافیہ کا بہتر استعمال ہے۔غزل عموماً قافیہ کی بنا پر تعمیر ہوتی ہے۔مترنم قوافی غزل میں موسیقیت کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں اور ردیف شاعر کے خیال کو محدود یا لامحدود کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے، لہٰذا غزل میں ردیف اور قافیہ بنیادی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ردیف سے زیادہ قوافی کی اہمیت ہے۔قافیہ خیال اور بحر کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔اور مضمون یا خیال پر اثرانداز ہوتا ہے۔قافیے کا انتخاب اہم موڑ ہوتا ہے۔"اللّٰھم بارک علیٰ محمدٍ" کی نعات میں نئ قبیل کی ردیفیں اور تازہ کاری کا احساس لیے ہوئے قوافی نعت کے باب میں ایک جمالیاتِ شعر کا نیا ہفت رنگ آئینہ ہیں۔

(د) سیرت رسول ﷺ کا نعتیہ اظہار اور محاسنِ نعت:

نعتیہ کلام میں عشقِ مصطفیٰ ﷺ کے علاوہ آپ ﷺ کے حسن وجمال کو موضوعِ شعر بنایا جاتا ہے اور صورت کے ساتھ ساتھ سیرتِ طیبہ ﷺ کو بھی اجاگر کیا جاتا ہے۔احمد اور احد میں قدرِ مشترک توحید کے حوالے سے یہ بھی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ صانع اور خالقِ کل کائنات وموجودات ہے اور اپنے باطنی وخارجی حصار میں لامحدود ولامنتہی اور لاثانی وبے مثال ہے۔بالکل اسی طرح حضرتِ محمدِ مصطفیٰ ﷺ کی ذات مبارک تمام مخلوقات وموجودات میں حسن وجمال اور خوب صورتی میں بے مثل ولامثال ہے۔دوسرے لفظوں میں احد اپنی صناعی وخلاقی اور معبودیت میں واحد ویکتا ہے اور احمد اپنے خِلقی حسن و جمال اور عبودیت میں واحد ویکتا ہے۔احمد اور احد اپنی اپنی صفات میں احدیت کے حامل ہیں۔اللہ جیسا کوئی خالق نہیں ہے اور احمد جیسا کوئی عبد نہیں ہے۔انسانیت کی معراج ہی نہیں بل کہ محمد ﷺ کی ذات تمام مخلوقات اور موجودات کی جمالیاتی اور وجودی منہاج کا نام ہے۔ازل کا نور اور ابد کا سرور اسی ذات کے دم سے ہے۔خورشید جہاں تاب جس نور کو لیے جہاں میں بانٹتا پھرتا ہے وہ آپ ﷺ کی ذات ہی کی جمالیات ومنہاجِ حسن کا پرتو ہے۔اس کا بات پر استدلال کہ کائنات میں نور آپ ﷺ کی ذات ہی کی جمالیات کی پرتو ہے، شیخ الاکبر حضرت علّامہ محی الدین ابن العربی کی کتاب فصوصِ الحکم میں موجود ہے۔یومِ الست اللہ نے اپنی نور کی تجلی آپ ﷺ کی روحِ مطہر پر ہی ڈالی تھی، جس سے نور کی شعاعیں جمالِ احمدی ﷺ بن کر کائنات میں تمام موجودات کو روشن کیے دیتی تھیں۔بس ذکرِ جمالِ محمد ﷺ ازل سے ہے اور ابد کے بعد بھی ہے۔ہبوطِ آدم سے لے کر سقوطِ آدم تک تمام انس وجاں آپ ﷺ ہی کے جمال سے کسبِ فیض کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ازل کا نور اس وقت نور ہی نہیں کہلایا جب تک احد نے اسے جمالِ احمد ﷺ کی ضیانہ بخشی۔ریاض مجید کی نعات میں اس موضوع پر اشعار ملتے ہیں۔اس حوالے سے ان کی نعت کا یہ شعر بہت ہی قابلِ تحسین ہے جس میں اُنھوں نے اتنے بڑے مضمون کو حیرت انگیز فکری منہاج کے ساتھ پیش کیا ہے:

'بلیٰ' کے ساتھ ہی 'صلِّ علیٰ' کہا ہم نے
درود خواں ہیں ، یہ عادت ازل سے رکھتے ہیں (۶۹)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت جیسی صورت نہ کائنات میں کہیں اور موجود ہے اور رحمان کی دکان میں کوئی ایسی صورت موجود ہے۔ یہ وہ شاہ کار ہے جس پر رحمان خود ناز کرتا ہے اور مظاہرِ فطرت حیران رہ جاتے ہیں۔ وہ صورتِ طیبہ جس کے جمال کو اگر یوسفؑ عشاق مصر کی عورتیں دیکھ لیتیں، تو انگلیاں کاٹنے کے بجائے جمالِ احمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمِ محویت میں اپنی گردنیں اُڑا دیتیں۔ اس خیال کی طرفہ ُفن سے شاعر نے نقش گری کی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے:

"کامیاب نعت نگاری کے لیے قرآنِ حکیم اور سیرتِ طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمیق، بسیط اور تجزیاتی مطالعہ نہایت ضروری ہے۔" (۷۰)

ریاض مجید نے اس خیال کو جس کا ذکر علّامہ ابنِ عربی نے فصوص الحکم میں کیا ہے قابلِ ستایش انداز میں نعت میں برتا ہے، جس کا حوالہ اُوپر دیا جا چکا ہے۔ ریاض مجید کی نعات میں سراپا نگاری اور حسن و جمال کو شعری حسن و جمال سے آراستہ و پیراستہ کر کے پیش کرنے کے رجحان سے زیادہ سیرت النبیؐ کا بیان زیادہ ہے، کیوں کہ اُنھوں نے نعت میں رسُولؐ کے عملی پہلوؤں کی طرف زیادہ توجّہ دلائی ہے۔ وہ عاشقِ رسُولؐ ہیں، اسی لیے سیرت کے افادی پہلوؤں اور انسانیت کے لیے سراپا بہبود کے پہلوؤں کی طرف توجّہ دلاتے ہیں۔ اس قسم کے خیالات کے پیچھے شاعر کا اپنا وجدان اور عشقِ رسُول صلی اللہ علیہ وسلم ہے، جو اسے باطن کی آنکھ کے ذریعے اعیانِ ثابتہ کے کشف و ظہور کا ہنر بخشتا ہے:

ہے نورِ فن ، وہی عالمؐ پناہ نعتوں میں
خوشا ! تسلسلِ تذکار شاہؐ نعتوں میں
اک ایک جذبہ ہے جنت مثال و عرش نظیر
مجھے ملی ہے مدینے کی راہ ، نعتوں میں (۷۱)

لفظ دراصل اس قدر کم مایہ ہیں کہ حضورِ پاکؐ کا سراپا اقدس بیان کرنے پر قادر ہوں۔ جگہ جگہ لفظوں کی تنگ دامانی کا خیال دامن گیر ہو جاتا ہے۔ شاعر کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ بہ تمام و کمال سراپا نگاری کر سکے، البتہ معصوم ہی یہ کام کر سکتا ہے، جو آلِ رسُولؐ کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اسی سلسلے میں حضرت امام زین العابدینؓ کا قطعہ درج کیا جاتا ہے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مجسم حسن کا بیانیہ ہے۔ کیا خوب صورت نقشہ کھینچا ہے، جو افصح بھی ہے بلیغ بھی:

مَن وجہُ الشمسُ الضحیٰ
من خدہُ بدر الدّجیٰ

من ذاتہٗ نور الھدیٰ
من کفّہٗ بحرُ الکَرَم (۷۲)

"یعنی وہ (محمد ﷺ) جن کا چہرہِ انور مہرِ نیم روز ہے اور جن کے رخسارِ تاباں ماہِ کامل ہے، جن کی ذات نورِ ہدایت ہے اور جن کی ہتھیلی سخاوت کا دریا ہے۔"

یہ بات طے ہے کہ اس کائنات کی وجہ تخلیق صرف اور صرف محبوبِ ربّ کائنات رحمت اللعالمین خاتم الانبیا سیّد المرسلین حضرت محمد ﷺ کا ظہورِ بابرکات تھا۔ بل کہ روایت یہ کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے بلاواسطہ طور پر اپنے حبیب کا نور ہی پیدا کیا۔ پھر اسی نور کو خلقِ عالم کا واسطہ قرار دیا۔ یہ بھی مروی ہے کہ ربّ ذوالجلال نے عالمِ ارواح میں ہی سرکار کی روحِ انور کو اعزازِ نبوت سے سرفراز فرمایا۔ ترمذی میں مذکور ہے کہ خود آپ ﷺ نے فرمایا میں اس وقت نبی تھا، جب کہ آدم کی روح نے جسم سے تعلق نہ پکڑا تھا۔ بعد ازاں اسی عالم میں اللہ تعالیٰ نے دیگر انبیا کرام کی ارواح سے نبوتِ محمدی ﷺ کا عہد لیا۔ تب ہی انبیاے عظامؑ کی ارواح میں فیضانِ نورِ محمدی ﷺ کے واسطے سے وہ قابلیتیں پیدا ہوئیں کہ دنیا میں اُنھیں اپنے اپنے وقت میں اُنھیں منصبِ نبوت عطا ہوا۔ "سیرتِ رسُولِ عربی" کے مصنف علّامہ نور بخش توکلی اپنی شہرہ آفاق کتاب" وفا الوفا فی فضائل المصطفیٰ" میں لابن الجوزی اور حضرت کعب الاحبارؓ کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو پیدا کرنا چاہا تو جبرئیل کو حکم دیا کہ سفید مٹّی لاؤ۔ پس جبرئیلؑ بہشت کے فرشتوں کے ساتھ اترے اور آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کی جگہ سے مُٹھی بھر خاک چمکتی دمکتی اُٹھالائے۔ پھر وہ مشتِ خاک سفید بہشت کے چشمہِ تسنیم کے پانی سے گوندھی گئی یہاں تک کہ سفید موتی کے مانند ہوگئی، جس کی بڑی شعاع تھی۔ بعد ازاں فرشتے اسے لے کر عرش و کرسی کے گرد اور آسمانوں اور زمین میں پھرے۔ یہاں تک کہ تمام فرشتوں نے آپ ﷺ کو حضرت آدم علیہ السلام کی پیدایش سے پہلے پہچان لیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا کیا تو اپنے حبیبِ پاک ﷺ کے نور کو ان کی پشت مبارک میں ودیعت کردیا۔ اس نور کے انوار ان کی پیشانی میں یوں نمایاں تھے جیسے آفتاب، آسمان میں اور چاند اندھیری رات میں اور ان سے عہد لیا گیا کہ یہ نورِ انور پاک پشتوں سے پاک رحموں میں منتقل ہوا کرے۔ اسی واسطے جب وہ حضرت حواؑ سے مقاربت کا ارادہ کرتے تو اُنھیں پاک و پاکیزہ ہونے کی تاکید فرماتے۔ یہاں تک کہ وہ نور حضرت حوا علیہا السلام کے شکم مبارک میں منتقل ہوگیا۔ جب حضرت شیثؑ پیدا ہوئے تو وہ نور ان کی پشت میں منتقل ہوگیا۔ یہ حضور ﷺ کا معجزہ تھا کہ حضرت شیثؑ اکیلے پیدا ہوئے۔ اور آپ کے بعد اگلی پشتوں کے بطن سے محض ایک ہی جوڑا پیدا ہوتا رہا۔ اس طرح یہ نورِ پاک، پاک پشتوں سے پاک شکموں میں منتقل ہوتا رہا یہاں تک شکمِ آمنہ سے تک منتقل ہوا۔ یعنی ثابت یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے سرکارِ دوعالم ﷺ کو تمام عالموں کے لیے باعثِ رحمت بنا کر زمین پر بھیجنے کے لیے شکمِ مادر اور پیدایش کے مروجہ طریقہ کار ہی کو استعمال کیا۔ ورنہ اگر پروردگار چاہتا تو سرکارِ دوعالم ﷺ براہِ

راست مبعوث فرمائے جاسکتے تھے۔ حضرت آدمؑ سے حضرت آمنہؓ تک اس نور کے پہنچنے کے سلسلہ ہی کو سرکارِ دوعالمؐ کا شجرۂ نسب کہا جاتا ہے:

" صنفِ نعت میں کامیابی کی اوّلین شرط یہ ہے کہ ممدوح کی ذات وصفات کا صحیح عرفان حاصل ہو؛ اس کی عظمت ورفعت کا گہرا نقش لوحِ دل پر ثبت ہو اور، جو کچھ وہ کہے وہ کسی لمحے کی ترنگ یا خیال کی اُمنگ میں نہ کہے بل کہ اپنے تمام تر فکری سرمایے اور قلبی جذبات کے رنگ میں ڈوب کر اعترافِ عظمت اور شکرانۂ نعمت کے طور پر علم وعمل کی گواہی کے ساتھ کہے۔" (۷۳)

درج بالا کیفیات کا گہرا شعور اور مطالعہ رکھنے والا شاعر مکمل طور پر نعت کی پیش کش کے لیے ان سے کماحقہٗ عہدہ بر آ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح اگر درج بالا مباحث کو آگے بڑھایا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ حضور ﷺ کی جسمانی انتقال کا تسلسل کی مختصر تاریخ ہے، جو قریب قریب تمام ائمہ وعلما میں سند کا درجہ رکھتی ہے اور اس میں کسی کو کوئی شک وشبہ کی گنجایش نہیں ملتی۔ آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی قدر کی نورانی تشکیل امام زین العابدین کے درج بالا اشعار میں بھی بیان ہوئی ہے، جس کی فصاحت وبلاغت بنی ہاشم کی فصیح الالسانی کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ ریاض مجید کے مجموعہ نعات میں حضورؐ کے علمی استکمال و فیضانِ سیرت کے موضوعات بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں، پر ان موضوعات کو نبھایا بڑے احسن انداز سے گیا ہے۔ ایک جسمانی سطح جس میں آپ ﷺ کی صورت وحسن اور جمالِ تسنیمی ورحمانی ہے۔ اور اس کے ساتھ نظری جمال بھی وابستہ ہے ، جب کہ دوسری سطح عملی وسیرتی ہے، جو ازل سے ابد تک اور ابد کے بعد بھی جاری وساری ہے ، جو زمان ومکان کی حدود قیود سے ماورا ہے:

" نعت کو نقوشِ سیرت سے آراستہ کرنے کا رجحان دورِ حاضر کا خصوصی امتیاز واعزاز ہے۔ سیرتِ اطہر سے استفادہ نعت نگاری کو وقار واظہار عطا کرتا ہے، مگر جمالیاتی اظہار کے بغیر واقعاتِ سیرت کا بیان مرتبۂ شعر تک نہیں پہنچتا۔" (۷۴)

ریاض مجید نے ان موضوعات کو کمالِ فن کے ساتھ اپنی نعتیہ شاعری میں سمیٹا ہے۔ بعض اشعار تو ماقبل نظریات کی جمالیاتی توضیح لگتے ہیں اور ان میں ذرا فرق محسوس نہیں ہوتا کہ یہ شعوری طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ یہ سیرتِ رحمت اللعالمین ہی کا فیضان اور حضورؐ کی چارہ سازی ہی کا کمال ہے کہ ہر انس وجن ان کی شفاعت کا حب دار ہے، جس کو شاعر نئے اُسلوبیاتی پیراہن میں بیان کرتا ہے:

بروزِ حشر کرم کی نگاہ میں رکھنا
تُو اپنے سایۂ عالم پناہ میں رکھنا (۷۵)

سیرتِ رسُول ﷺ کا سب سے ہمہ گیر پہلو عقائد نہیں بل کہ انسانیت ہے۔ انسانیت کا وہ درس، جو تمام انبیائے کرام اور دنیا کے ہر چھوٹے بڑے مذہبِ انسانیت کے علمبردار اہلِ فلاسفہ وحکمت نے دیا ہے، وہ ہی حضور ﷺ کی سیرت کا ہمہ گیر

پہلو ہے ۔ریاض مجید نے اپنی نعات میں مختلف زاویوں حضورؐ کی سیرت کے اسی ہمہ گیر پہلو کی طرف منزہ جذبات سے لبریز بیانیے میں اشارہ کیا ہے:

ثنا و سیرتِ شاہِؐ امم کے راستے کتنے؟
درِ فردوس تک پہنچے قلم کے راستے کتنے!
رسُولِ خیر کا ہر نقشِ پا ہے خیر کی منزل
پہنچا ہے اگر تم کو ،حرم کے راستے کتنے! (۷۶)

سیرتِ رسُولؐ ہی وہ راستہ ہے، جس سے انسان دنیا و آخرت کی کامیابی کو سمیٹ سکتا ہے۔ قربِ خداوندی کے حُصُول کے باب میں حضورؐ کی سیرت سحر خیزی کا درس دیتی ہے، جس پر سب سے زیادہ زور علّامہ اقبال نے اپنی شاعری میں دیا ہے اور اس کے افادی پہلوؤں کی طرف توجُّہ دلائی ہے۔ اقبالؒ یقینِ کامل کے ساتھ یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ وقتِ سحر اُٹھ کر خدا کے حضور سجدہ کرنے، گریہ وزاری کرنے اور اپنی حاجات پیش کرنے سے حقیقی کامیابی ممکن الحُصُول ہو جاتی ہے۔ اقبال کے ہاں سحر خیزی کی بہت زیادہ اہمیت ہے کیوں کہ یہ سنتِ وسیرتِ مصطفی ﷺ ہے:

" جہاں تک نعت میں سیرت نگاری کا تعلق ہے، تو واقعہ یہی ہے کہ اس کا ظہور اپنے جمیل اور جامع صورت میں جدید نعت میں ہوا ہے۔ جدید نعت گو شاعر نعت کے ذریعے حضور ﷺ کی بعثت کے مقاصد کو آئینہ کرتا ہے اور یوں ہمیں ذاتِ حضور ﷺ سے قریب تر کرتا چلا جاتا ہے۔" (۷۷)

آپ ﷺ کی سیرت کا یہ اہم پہلو ہے کہ آپ ﷺ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اپنے رب کے حضور بہ اندازِ عجز اظہارِ مناجات کیا کرتے تھے، لہٰذا سحر خیزی سے نفسیاتی طور پر بھی انسان کی شخصیت نکھرتی ہے اور اس میں یقینِ محکم، متانت، وقار اور سنجیدگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ وہ دولتِ قلب ہے، جو صبح کے وقت اپنی جبین نیاز کو اللہ کے سامنے جھکا کر مناجات سے حاصل ہوتی ہے۔ گویا عرفانِ ذات کے لیے یہ صراطِ مستقیم ہے جس کی منتہاے مقصود انوار و تجلیاتِ ذاتِ الٰہی اور کشفِ اسرارِ خداوندی ہے۔" اللھم بارک علیٰ محمدٍ " کی نعات کے بہے سے اشعار سرمایۂ گداز و اشک کے ساتھ سر بہ سجود ہونے کی اسی نعمت کے بیان کی تاثیر لیے ہوئے ہیں، جو حضورؐ کی دین ہے:

سرمایۂ گداز ، مناجات کا ہے حق
اشک ، التجا کے آہ ، دعا کے سپرد کر
یادِ حرم میں وقتِ تہجد ریاض ، رو
پھر اپنے اشک ، بادِ صبا کے سپرد کر (۷۸)

اس نعت کے چوتھے شعر میں " سلکِ نعت " کی لفظی ترکیب کا جواب نہیں ہے۔ ترکیبات شعر کے معنوی و داخلی حسن کی ضمانت فراہم کرتی ہیں بشرطیکہ ترکیب و استعارہ کو مناسب و موزوں جگہ پر استعمال کیا جائے۔ ریاض مجید نے " سلکِ نعت " کی انوکھی اور اچھوتی ترکیب کو اس انداز میں استعمال کیا ہے کہ لفظِ " سلک " بمعنی ریشم کسی اور زُبان کے بجاے اُردُو زُبان کو معلوم ہوتا ہے۔ یہی شعر میں لفظ کا نفسیاتی برتاؤ ہوتا ہے، جو اسے ممیّز اُسلُوبِ بیان سے ہم کنار کرتا ہے۔ اسی طرح ان کے ہاں قرآنی تلمیحات فنی نکتہ نظر سے بامِ عروج پر نظر آتی ہیں۔ جامع کلام اسے سمجھا جاتا ہے، جو تلمیح و استعارہ کے ذریعے سے مفصل کو جامجمل، مگر جامع بنادے اور تلمیح میں یہ قوت بدرجۂ اتم ہوتی ہے کہ وہ بہت طویل بات کو انتہائی ایجاز و اختصار کے ساتھ یوں بیان کر رتی ہے کہ واقعہ بھی آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے اور لفظی کفایت شعاری کا بھی شعر نمونہ بن جاتا ہے۔ " احسنِ تقویم " کی تلمیح دیکھیے، جو انسان کو بہترین شکل و صورت دیے جانے کی طرف اشارہ کناں ہے:

احسنِ تقویم میں شاہ کارِ احسن ہے وہ ذات
صنعتِ تخلیق کا حاصل مدینے کی طرف (۷۹)

سیرتِ رسُول ﷺ کے حوالے سے زیرِ بحث مجموعہ نعات میں حضورؐ کے جس پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے، وہ ہے فیضانِ درِ مصطفیؐ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے رسُولِ مقبولؐ کسی سائل کو کبھی خالی ہاتھ اپنے در نہیں لوٹاتے تھے۔ سائل چاہے طالبِ نان و نفقہ ہوتا یا طالبِ علم ہوتا یا طالبِ عدل ہوتا یا طالبِ رحم ہوتا یا طالبِ عفو ہوتا یا طالبِ دیدارِ مصطفوی ﷺ ہوتا یا طالبِ رضاے الٰہی ہوتا یا طالبِ مالِ دنیا ہوتا یا یا طالبِ کشف و جدان ہوتا، غرض سائل کی طلب کی ہر قسم کے اعتبار سے سرکارِ دو جہاں ابو القاسم محمد ﷺ اس کی داد رسی ضرور فرمایا کرتے تھے اور ایسی مُروّت و محبّت کے ساتھ سائل کی طلب خود فیضان و سخاوت پر فریفتہ ہو جاتی تھی۔ اِنھی منزہ حقائقِ سیرہ کی نمایندگی ریاض مجید کے کلام میں ملتی ہے:

مجسم آیۂ تطہیر ہو تو ایسا ہو!
ہمہ صحیفۂ تنویر ہو تو ایسا ہو! (۸۰)

خطا کاروں کو بھی محروم رحمت وہ نہیں رکھتے
گنہ گاروں پہ بھی پیہم کرم فرمائے جاتے ہیں (۸۱)

ا۔ ریاض مجید کی نعات میں اَدب و عقیدتِ رسُول ﷺ کا اظہار:

درِ شاہِ اممؐ سراپا عقیدت و احترام کی جاہ ہے۔ یہاں آواز اگرچہ اونچی ہو جائے تو صحابی کے اعمال بھی حبط ہو سکتے ہیں۔ چہ جاے کہ اُمتی کا معاملہ، جو اصحابِ رسُولؐ کی نسبت رسُولؐ سے کم ترین علائق رکھتا ہے، لہٰذا جب نامِ محمدؐ لبوں پر آئے تو دل کو پاک کر کے زُبان سراپا باوضو ہو کر با ادب با ملاحظہ ہو تا کہ وگرنہ ذرا سی لغزش عمر بھر کی نیکیوں کی کمائی برباد کر سکتی ہے۔ یہی

وجہ ہے حضورؐ کی نعت کہنے والے شاعر کو ادبِ محمد ﷺ کا خیال قدم قدم دامن گیر رہتا ہے۔ اسے علم رہنا چاہیے کہ یہ مقامِ محمدؐ تو دائرِ سدرہ سے کے پرِ پرواز سے بھی بُلند و بالا ہے۔ ریاض مجید کی نعات میں رسُولِ مقبولؐ سے حد درجہ عقدیت واحترام کا اظہار کیا گیا ہے اور جس طرح وہ خود باوضو رہتے ہوئے نمازِ پنجگانہ ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے قلم سے نکلنے والے الفاظ بھی باوضو ہو کر نعت کی صورت گری کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں عقیدت و احترام میں جذبے کی تاثیر کے ساتھ کھینچی گئی وہ تصویر نظر آتی ہے ، جو عملی و نظری دونوں سطح پر اپنا ،جواز رکھتی ہے اور اس میں نعتیہ لوازمات بھی ہیں اور شعریت کا کامل رچاؤ موجود ہے:

جبین سجدہ پہ خاکِ مدینہ ضو فگن ہے
زمینِ بندگی پر آسماں رکھا ہوا ہے (۸۲)

اُس شہنشاہ معظم کی حضوری میں رہے
روح ہر پل ایک استغراقِ نوری میں رہے (۸۳)

زُبان اور نظامِ فکر کے اعتبار سے یہ نعت اُردُو میں نعت گوئی کے میدان میں ایک اہم اضافے کی اہمیت رکھتی ہیں۔ مزید یہ کہ ریاض مجید کی نعات کے معنوی نظام میں کئی تہہ داریاں موجود ہوتی ہیں۔ معنی سپاٹ نہیں ہوتے بل کہ تہہ در تہہ ہوتے ہیں اور آفاقی وسعتوں کے حامل ہوتے ہیں۔

''کیفِ لاشعوری'' کی ترکیب اپنی جگہ انتہائی پُر معنی و جمال آثار ہے۔ شاعر اپنی ذات کو منہا کر کے حضور ﷺ کی ذات کو اپنا محور و مرکز مانتا ہے۔ شاعر کے نورِ وجدان کا واحد ذریعہ اور منبع چوں کہ جمالِ محبوبؐ خدا ہیں، لہٰذا نعت میں وہ آقاؐ کی قدم بوسی کرتے ہیں۔ گویا مطرب نے سازِ ہستی کو چھیڑ دیا اور اس کے تاروں میں نغماتِ زندگی کی لہروں دوڑ اٹھیں۔ یہ لہریں زندگانی کی رگوں میں حررات اور قوت کو پھر سے بیدار کرنے کے کام آئیں، جس کے بغیر زندگی کا تصوُّر بھی ناممکن تھا۔ گویا جہانِ ہستی کی سرد اور منجمد رگوں کے اندر نورِ مصطفوی ﷺ دوڑنے سے حرارتِ زیست پیدا ہوئی اور افسردہ اور تھکی ہوئی نگاہوں کو تسکین اور مضطرب دلوں کو قرار آ گیا۔ یہی قرار یہاں عقیدت و احترام میں بدل جاتا ہے۔ وہ محض دعویٰ حبِ نبیؐ نہیں کرتے بل کہ اشکوں سے آنکھ باوضو کر کے اور زُبان مطہر کر کے نام لیتے ہیں:

دعوٰی حبّ نبیؐ سے چاہ کب سچی ہوئی؟
اشک جب آنکھوں میں آئے ، تب طلب سچی ہوئی (۸۴)

اسمِ محمد ﷺ کی تابانی اور اس کا جلال خورشیدِ جہاں تاب کے مثل ہے اور اللہ نے سب سے پہلے اسے لوحِ محفوظ پر مرقوم کیا تھا۔ یہ نعت تطہیرِ قلب کا شاہ کار ہے اور شاعر نے محبّتوں کا ایک جہان آباد کیا ہے، جو کسی گلزار کے مانند ہے، جس میں گل ہائے رنگا رنگ فضائے بسیط کو معطر کر رہے ہیں۔

سیدنا محمد (ﷺ):

ڈاکٹر ریاض مجید کی نعتیہ تازہ کاری کے عنوان سے حکیم شریف لکھتے ہیں:

> ''آج سے تقریباً پون صدی۔۔۔۱۹۲۶ء۔۔۔کی بات ہے شدھی تحریک (مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کر کے ہندو بنانے کی تحریک) کے بانی سوامی شردھانند کو ایک مسلمان نوجوان نے قتل کر دیا۔ مخالفین اسلام نے ایک نوجوان کے اس انفرادی فعل کی ذمّے داری اسلام اور قرآن پر ڈال کر ان کے خلاف بہتان تراشی شروع کر دی اور یہ تک کہا جانے لگا کہ جب تک دنیا میں قرآن موجود ہے، امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اس طوفان کی شدت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ گاندھی جی، جو اس زمانے میں ہندو مسلم اِتّحاد کے بڑے پرچارک خیال کئے جاتے تھے بھی یہ کہہ اٹھے کہ ''اسلام کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے۔'' (۸۵)

مسلمان اہل علم و قائدین اور جرائد و رسائل کی طرف سے اس سلسلہ میں وضاحتیں کی گئیں، لیکن اسلام کے خلاف یہ طوفان تھمنے میں نہ آیا۔ ان حالات میں ایک روز مولانا محمد علی، جوہرؒ نے جامع مسجد دہلی میں تقریر کرتے ہوئے اپیل کی کہ کوئی مسلمان نوجوان محقق اٹھے اور اسلامی جہاد کو اپنی تحقیق کا موضوع بنائے اور علمی انداز میں اس کی مفصل اور مدلل توضیح و تشریح کر کے اس کی اصل حقیقت دنیا کے سامنے پیش کرے۔ سیّد ابوالاعلی مودودیؒ اس جلسے میں موجود تھے۔ اُنھوں نے سوچا میں ہی یہ نوجوان محقق کیوں نہ بنوں۔ کُچھ عرصہ بعد ان کی تقریباً ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ایک کتاب ''الجہاد فی الاسلام'' کے نام سے وجود میں آگئی۔ جس کی تعریف علّامہ اقبالؒ اور سیّد سلیمان ندویؒ جیسے عظیم لوگوں نے بھی کی اور جسے آج بھی اس موضوع پر سند کی حیثیت حاصل ہے۔ حکیم شریف احسن ریاض مجید کے ضمن میں مزید رقم طراز ہیں:

> ''کسی درجہ میں کُچھ اسی طرح کی صورت حال سے پروفیسر ریاض مجید بھی دوچار ہوئے۔ ان کے برادر کبیر اکرام مجید کے پنجابی غزلوں کے دیوان ''نویاں زیناں'' کو پڑھ کر حافظ محمد افضل فقیر مرحوم بہت متاثر ہوئے۔ اس دیوان میں شاعر کے تخلیقی ذہن نے بحور و اوزان کے نئے نئے تجربات کئے ہیں۔ اس کا دیباچہ لکھتے ہوئے فقیر صاحب نے آخر میں دعا کی ''تجربات کی یہ اساس نوجوان نسل کے ہاتھوں استحکام پائے، پاکیزہ مضامین سے اس کی تعمیر ہو اور مدحت سرایانِ جناب رسالت مآب ﷺ اپنی ارادت سامانی سے ان بحور و اوزان کو لازوال حسن و جمال عطا کریں۔'' (۸۶)

اس حقیقت سے کس کو انکار کی جرأت اور رائے انحراف ہے کہ عروض ایک مشکل فن ہے۔ مشکل بحور و اوزان خصوصاً رباعی کے ۲۴ اوزان میں شعر کہنا تو ایک طرف ان کے پڑھنے میں بھی بعض اوقات بڑے بڑے اہل علم ٹھوکر کھا جاتے ہیں اور خود شعرا بھی بحر رجز میں بحر رمل ڈال کر شاعری کی کھچڑی پکا دیتے ہیں۔ ریاض مجید قادرالکلام شاعر ہونے کے ساتھ عروض پر بھی کامل دسترس رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ مشکل پسند انسان ہیں۔ مشکل پسند عام معنی میں نہیں غالبؔ کے معنی میں۔ یعنی مشکل کام بھی ان کے لیے آسان نکلتا ہے اور شعر کے ساتھ تو ان کا معاملہ کُچھ ''کُن فیکون'' کا سا ہے۔ کسی بھی

بحر، وزن، قافیہ، ردیف میں وہ شعر کہنا چاہیں تو کہتے ہیں "ہو جا" اور وہ ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں حکیم شریف احسن کا ریاض مجید کی شاعری اور زیرِ نظر نعتیہ مجموعے کی عروضی حیثیت کے بارے میں موٴقف یہ ہے:

> فقیر مرحوم کو غالباً اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ ان کی دعا بھی غالب کی اس دعا کی طرح کہ دعا قبول ہو۔ یارب کہ عمر خضر دراز دعاؤں کے اس قبیل سے ہے، جو مانگنے سے پہلے شرفِ قبولیت حاصل کر چکی ہوتی ہیں۔ ریاض مجید نے فقیر مرحوم کی اس دعا کو "دعا کے روپ میں" اپنے لیے ایک چیلنج سمجھا اور اس چیلنج کو قبول کر لیا۔ اس کے بعد وہی ہُوا، جو ہونا تھا یعنی "نویاں زیناں" کی تمام بحور و اوزان میں کہی ہوئی نعتوں پر مشتمل وہ مجموعہ وجود میں آگیا، جو اس وقت "سیدنا محمد ﷺ" کے نام سے، آپ کے ہاتھ میں ہے۔" (۸۷)

یہ کام بھی آسان نہ تھا، لیکن عروض پر دسترس رکھنے والا شاعر بحور و اوزان کی ان پابندیوں کے ساتھ شاعری نہیں تو، تک بندی تو پیش کر سکتا ہے۔ یہاں اصل دشواری یہ تھی کہ کام تخلیقی سطح کا ہو۔ شعر میں جبر نہیں چلتا۔ پہلے سے بنی بنائی زمینوں اور بحور و اوزان کی قید سے اختراعی پہنائیاں سکڑ جاتی ہیں اور تخیّل کا طائرِ بلند پرواز پھڑ پھڑا کر رہ جاتا ہے۔ خود ریاض مجید کے الفاظ میں:

> "بحور سازی اور اوزان پیمائی کو کسی زمانے میں بھی تخلیق ادب کے لیے مستحسن نہیں سمجھا گیا۔ تخلیق خالص اظہار صنعت و کمال فن سے کہیں بُلند درجہ کی چیز ہے۔" (۸۸)

حقیقتاً یہ چیلنج پہلے چیلنج سے بھی بڑا چیلنج تھا اور اگرچہ یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ یہ پابندیاں شاعر کے تخلیقی ذہن کو متاثر کرنے میں کلیتاً ناکام رہی ہیں تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مجموعہ میں نعت گو ریاض مجید قریب قریب اپنی ان تمام خصوصیات اور امتیازات کے ساتھ موجود ہیں، جو ان کی نعت کی پہچان ہیں۔

تعجب اس بات پر ہے کہ ریاض مجید کی مشکل پسند طبیعت نے بحور و اوزان کی پابندی پر قناعت نہیں کی، لزوم ملزوم کے طور پر ایسی ایسی ردیفوں میں نعت کہی ہے کہ اس پر صرف حیرت کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً: ضائع کر دیے، لیتے وقت، کڑ مڑ، روز نئی وغیرہ۔

نعت کے مضامین میں بڑا تنوع ہے۔ یہ تنوع ریاض مجید کے ہاں بھی موجود ہے۔ البتہ بعض مضامین کو دیگر مضامین کی بہ نسبت ان کی نعت گوئی میں زیادہ جگہ ملی ہے، جن میں درود و سلام، اس کی برکات، درد مہ، جوری اور کیف حضوری سر فہرست ہیں۔ خصوصاً کیفِ حضوری اس موضوع پر تقریباً ہر نعت گو شاعر نے نعتیں کہی ہیں اور حافظ لدھیانوی مرحوم کے تو ایک نعتیہ مجموعہ کا نام ہی "کیفِ حضوری" ہے، لیکن اس کے بیان میں سرور، سرخوشی اور وارفتگی سے لبریز، جو وجد آفریں اُسلوب ریاض مجید کے ہاں ملتا ہے، اُردو کی نعتیہ شاعری میں اس کی مثالیں زیادہ نہیں ہیں اور میرے خیال میں یہ عطا بڑی حد تک

نسبت اویسیہ کی ہے۔ وہ اپنے ساتھ قاری کو بھی بار گاہِ نبوت میں پہنچا دیتے ہیں۔ جب وہ حضوری کی کیفیات بیان کرتے ہیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے ہوں۔

طریقت میں انسان ایسے مراحل سے دوچار ہوتا ہے، جہاں بھٹکنے کے بڑے امکانات ہوتے ہیں، لیکن ریاض مجید کسی بھی مرحلے پر بے خود نہیں ہوئے۔ ان کے نزدیک طریقت تابع شریعت ہے اور شریعت شریعتِ محمدی ﷺ سے عبارت ہے:

مری طریقت کی رہ کو ، اس کی شریعت اپنی اماں میں رکھے
سلوک کی ابتدا محمدؐ ، سلوک کی انتہا محمدؐ (۸۹)

منزل رضا کی جب جستجو میں نکلو
اتباع کا رستہ اختیار کرنا (۹۰)

درج بالا شعری کیفیات اور شاعرانہ عقیدت مندی کے جذبات پر مبنی اشعار کو دیکھ کر یہ کہنا حق بجانب لگتا ہے کہ ریاض مجید نے نعت کی بنت میں، جس سچائی اور ارادت کا اظہار کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نعت کے خصوص میں رقم طراز ہیں:

''نعت گوئی اپنے وجود کی سچائیوں کے ساتھ آپ ﷺ کی خدمتِ عالیہ میں حاضری کا نام ہے، شاید حضوری کا یہ لمحہ حرف و صوت کی دنیا میں بھی کبھی مل جائے۔'' (۹۱)

ریاض مجید کی نعت پر بعض موضوعات چھائے ہوئے ہیں اور وہ ان میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن اس محویت نے اُنھیں اپنے گردوپیش کے احوال سے بے خبر نہیں کیا۔ بحیثیت ایک نعت گو شاعر وہ یہ بات کبھی نہیں بھولتے کہ وہ محض ایک فرد نہیں بل کہ اس ذات قدسی صفات کی امت کے ایک فرد ہیں، جن کی محبّت ان کے فکر و خیال کا محور و مرکز ہے اور جن کی اطاعت انسانیت کا اوّلیں تقاضا اور تمام سعادتوں کا سرچشمہ ہے۔ وہ اُمت کی زبوں حالی پر کڑھتے ہیں اور فریاد بھی کرتے ہیں:

موج ہوا کی زد پر تنکے کے ہیں آشیاں ، یہ
دے اِتّحاد مولا امت شکستہ صف ہے (۹۲)

ہے خیر امم سخت مصیبت میں پھنسی
کرتا ہے شب و روز یہ فریاد حرم (۹۳)

ریاض مجید کی نعت گوئی کے بارے میں حکیم احسن شریف لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر ریاض مجید بھی حافظ لدھیانوی مرحوم کی طرح ان شعرائے کرام میں سے ہیں، جو غزل سے نعت کی طرف آئے اور اس طرح آئے کہ اسی کے ہو کے رہ گئے۔ غزل ایک دلآویز صنف سخن ہے۔ اس کی خوب صورتی اور زیبائی دامن دل کو کھینچتی ہے اور قلبی واردات کو زُبان دینے کا یہ ایک نہایت پر تاثیر ذریعہ

ہے، لیکن غزل کی ان تمام خوبیوں کے باوجود اُنھوں نے اس کی طرف زیادہ توجُّہ نہ کی۔ حافظ صاحب کو جب ان کے ایک نام وَر ادیب اور شاعر دوست نے اس کی ترغیب دی تو ان کا، جواب تھا: چھوڑ کر وادی گل کون بیاباں میں رہے۔ ریاض مجید کو بھی ان کے اِنھی محترم بزرگ نے ایک خط کے ذریعہ غزل کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی تو اس کا تحریری، جواب اُنھوں نے جابجا اپنی نعتوں میں دیا۔ وہ تغزل کو شہ پر شاعری پر پڑی وہ مٹّی قرار دیتے ہیں جس کے جھڑنے کے بعد ہی نعت کی بُلندیوں پر پرواز ممکن ہوتی ہے۔" (۹۴)

ریاض مجید کے لیے شعر کوئی جُز وقتی مشغلہ نہیں رہا۔ نعت نے ان کے فکر و فن کو پوری طرح اپنے اندر جذب کر لیا ہے اور وہ محویت کے اس مقام پر ہیں، جہاں ان کے تصوُّر و تخیّل کی تمام جولانیاں اور رعنائیاں اسی کے لیے وقف ہو کر رہ گئی ہیں:

"لفظ و معنی کی بنت کا کام جُز وقتی نہیں ہے۔ انتساب فن ہمہ اوقات ان کے نام پر ہے اور ایسا کیوں نہ ہو۔ وقتی کاروباری ذہن سے الگ ہو کر سوچا جائے تو بات بالکل صاف ہے۔ جو نہال سدرہ کی شاخ بن سکتا ہو وہ خار و خس چمن کیوں بنے۔ جسے کنگرۂ عرش سے بلاوا آرہا ہو وہ ارضی کثافتوں کا اسیر کیوں رہے۔" (۹۵)

نعت گوئی کے لیے جس ریاضت اور ذہنی آسودگی کی ضرورت رہی ہے، یہ وہ کارِ مبارک ہے، جس کے لیے یکسوئی یقیناً احسن عمل ہے۔ اس کا اجر جو آخرت میں ملے گا وہ تو ملے گا۔ کُچھ صلہ اُنھیں اس اس دنیا میں بھی مل گیا ہے۔ ریاض مجید سیکڑوں نعتیں کہہ چکے ہیں اور مزید سیکڑوں نعتیں کہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اب آخر میں عام دستور کے بر عکس مختلف نعتوں کے متفرق اشعار کی بجاے ایک ہی نعت کے کُچھ اشعار جن کا شمار نعتیہ ادب کے شہ پاروں میں کیا جاسکتا ہے) اندازہ کرنے کے لیے کہ ریاض مجید کیا کہتے ہیں اور کس طرح کہتے ہیں:

طیبہ سے پلٹ آیا ہوں مگر وہ یاد ابھی ہے آنکھوں میں
وہ صحنِ حرم ہے سوچوں میں وہ شہر نبیؐ ہے آنکھوں میں
احساسِ سپاس سراسر ہے ہر سانس تشکر کی صورت
تاحدِّ نظر سرشاری کی جنّت پھیلی ہے آنکھوں میں

یاد ماحول مدینہ ہے جس سے پرنور یہ سینہ ہے
اک اک کوچہ ہے دل میں ریاضؔ ،ایک ایک گلی ہے آنکھوں میں (۹۶)

بیسویں صدی کے پہلے نصف تک عالمی تنقید میں یہ نظریہ راسخ تھا کہ تخلیقی تجربہ انفرادی اور شخصی ہوتا ہے۔ تخلیق کار کی منفرد اور جداگانہ شخصیت ہی تجربے کی جہت اور معنیاتی حدود کا تعیّن کرتی ہے۔ چناں چہ کسی متن کا مطالعہ، متن کے خالق کی ذہنی سوانح کے طور پر کیا جاتا تھا، مگر بیسویں صدی کے دوسرے نصف کے ابتدائی سالوں میں ہی اس نظریے کو ایک دوسرے نظریے نے ردّ اور بے دخل کر دیا۔ نیا نظریہ ادبی متن کو مصنّف کا انفرادی کارنامہ قرار دینے کے بجاے اسے

"اجتماعی نشانیاتی / ثقافتی نظام" کا زائیدہ گردانتا ہے۔ یہ نیا نظریہ ساختیات کی دین تھا۔ ساختیات ہر معنی خیز عمل بشمول تخلیقی تجربے کو ایک لاشخصی تجریدی نظام کے اندر اور تحت دیکھتی ہے۔ یہ نظام کسی ثقافت کے ان ضابطوں، کوڈز، رسومیاتی اعمال سے عبارت ہے ،جو ہمیں اشیا کو ایک خاص نہج سے، مخصوص زاویوں سے اور مخصوص حدود کے اندر دیکھنے اور ان کا تجربہ کرنے اور ان کے معانی طے کرنے کا پابند بناتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے تجربات اور معنی یابی کے اعمال حقیقی طور پر انفرادی نہیں ایک لاشخصی ثقافتی نشانیاتی نظام کا حِصّہ ہوتے ہیں اور اسی نظام کی رُو سے تجربات مخصوص بُوباس اختیار کرتے ہیں۔ یہ اُصول نعت کی صنف پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ڈاکٹر ناصر عباس نیرؔ ریاض مجید کی نعتیہ تصنیف "سیّدنا محمد ﷺ" کے ساختیاتی زاویے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> "ہر چند نعت ایک مخصوص آدمی سے سرزد ہوتی ہے،، مگر نعت کی مزاج بندی اس مخصوص آدمی کے انفرادی فعل کی محتاج نہیں، بل کہ ہمارے اس ثقافتی سسٹم کا تفاعل ہے، جس کی بُنیاد میں بعض مذہبی لسانی ضابطے کام کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نعت میں پیش ہونے والے تمام مضامین ،کیفیات، اظہارات اور تجربات ہمارے "مذہب اساس ثقافتی لسانی نظام" کی طے کردہ (مگر لچک دار)حدود کے اندر واقع ہوتے اور معنی حاصل کرتے ہیں۔ ہر نعتیہ تجربہ دراصل مذکورہ نظام کے کوڈز اور ضابطوں سے صورت پذیر اور کنٹرول ہوتا ہے۔"(۹۷)

پُرانی تنقیدی زُبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر صنف میں کُچھ کلیدی استعارے ہوتے ہیں،، جو اپنے علّتی، تلازماتی اور مماثلتی رشتوں سے متعدّد دوسرے استعاروں کی تخلیق کرتے ہیں اور یہ سب باہمی نظم و ارتباط کے ذریعے اس صنف کی شعریات مرتّب کرتے ہیں۔ صنفِ نعت کا ایک کلیدی استعارہ سفر ہے۔ڈاکٹر ریاض مجید کے نعتیہ دیوان "سیّدنا محمدؐ" سے اس استعارے کی کارفرمائی کی چند صورتیں دریافت کریں اور دیکھیں کہ کس طرح نعت کے متعدد اور متنوّع مضامین اس استعارے کی عمل آرای سے وجود پذیر ہوئے اور نعت کے صنفی مزاج اور شعریات کے نقوش ابھارتے چلے جاتے ہیں۔اس مختصر تجزیے کی ابتدا ایک شعر سے:

ہو سفر ریاضؔ کا ، پھر سے جانبِ حرم
راستے میں ذکر ہو ، گام گام آپ ﷺ کا (۹۸)

ڈاکٹر ناصر عباس نیرؔ کے مطابق:

> " نعت میں سفر کی ابتدائی معنویت "جغرافیائی" اور لغوی ہے۔ مُسلمان دُنیا کے مختلف جغرافیائی خِطّوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ حرم پاک اور روضۂ رسُول ﷺ پر حاضری کے لیے اُنھیں بہت دور سے آنا ہوتا ہے۔یعنی عاشق رسُول ﷺ اور روضۂ رسُول ﷺ کے تعلق میں "سفر" ایک بدیہی حقیقت ہے۔ سو ابتداًنعت میں لفظ "سفر" اپنے لغوی مفہوم روانگی اور کُوچ میں برتا جاتا ہے، مگر چوں کہ یہ عام سفر نہیں، اس کا محرّک ایک عظیم مذہبی وژن ہے۔ اس لیے جب سفر مدینہ اختیار کیا جاتا ہے تو یہ وژن سفر کی معنویت کو تہ در تہ بناتا چلا جاتا ہے۔" (۹۹)

ریاض مجید کے ہاں نہ صرف خارجی سفر ایک داخلی سفر کو تحریک دیتا اور زائر سوے طیبہ کے ساتھ ساتھ سوے باطن بھی سفر پیما ہوتا ہے بل کہ یہ سفر اجتماعی اور ملّی معانی کا استعارہ بھی بن جاتا ہے۔ اس ضمن میں چند شعری مثالیں دیکھیے:

زائرِ مدینہ دیکھ! پاؤں کس زمیں پر ہیں
دل بہشت پیما ہے آسمان کے اُوپر (۱۰۰)

روشن روشن دیکھ نظر کے آثار
پھر طیبہ کی سمت سفر کے آثار (۱۰۱)

نشانِ اقلیم روشنی کا نظر میں رکھنا
ریاض سوئے مدینہ خود کو سفر میں رکھنا (۱۰۲)

سفر کی لغوی، علّتی، تلازماتی، استعاراتی، دلالتی سے متعلق ڈاکٹر ریاض مجید کی نعتوں میں درجنوں اشعار موجود ہیں۔ یہ چند اشعار یہ بات ظاہر کرنے کی خاطر منتخب کے گئے ہیں کہ کس طرح سفر کا کوڈ نعت کی شعریات کو مُرتّب اور اُجاگر کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر ناصر عباس نیرؔ:

> ''باہر اور اندر کے سفر میں ایک علّتی (اور منطقی) رشتہ ہے،، جو دراصل مذہبی اور عقیدتی وژن کی تحریک پر وجود میں آتا ہے۔ زائر جب طیبہ کی سمت جارہا ہوتا ہے تو وہ جسمانی سطح پر ہی متحرک نہیں ہوتا، تخیّلی اور روحانی سطحوں پر بھی فعال ہوتا ہے، اُس کے پاؤں زمین پر، مگر دل آسمان پر بہشت پیما ہوتا ہے۔ وہ اوّلین طور پر سرشاری پاتا، اپنی دیرینہ آرزو کی متوقع تکمیل سے حظ اندوز ہوتا ہے۔ وہ 'محبوب' سے جدائی کے کرب سے رفتہ رفتہ آزاد ہوکر وصل کے نشاط کی کیفیت سے گزرتا ہے۔، مگر اس سفر کی محض یہی دین نہیں، وہ جب متخیلہ میں مُرتبۂ رُسول ﷺ کو لاتا ہے تو ایک پورا استعاراتی نظام اس کے اندر روشن ہوجاتا ہے، وہ اقلیمِ روشنی کے تصوّر سے رُوحانی تجربے، تقلیبِ باطن اور کشف سے گزرتا ہے۔ وہ باطنی سطح پر آلایشوں سے خود کو پاک محسوس کرنے لگتا، ارتفاع کی کیفیت سے فیض یاب ہوتا اور اپنی ہستی کی معنویت اور شناخت کا عرفان پاتا ہے۔ یہ ساری چیزیں دراصل سفر کے تلازمے اور تماثل سے پیدا ہوتی ہیں۔''(۱۰۳)

زائرِ مدینہ جب اقلیمِ روشنی میں آکر اپنی ہستی کی شناخت کے عمل سے گزرتا ہے تو اس پر یہ کشف ہوتا ہے کہ اس کا ہونا ایک نسبت کے تحت ہے، وہ اس نسبت سے الگ، معدوم یا بے معنی ہے۔ یعنی زائرِ طیبہ اوّلاً اپنی انفرادی ہستی کا اثبات کرتا اور بعد میں اپنے ملّی وجود کا ادراک کرتا ہے۔ سو وہ خود کو ہی نہیں پورے کاروانِ ملّت کو سفر میں محسوس کرتا ہے۔ نتیجتاً نعت میں محض نعت گو کی دلی کیفیات کا ہی بیان نہیں ہوتا بل کہ پوری امّت محمّدیہ کے لیے درخواست و دُعا ہوتی ہے، چوں کہ ملّتِ اسلامیہ گزشتہ کئی صدیوں سے غلامی، ادبار، پستی، زوال، بے توقیری اور کم مائیگی کا شکار چلی آرہی ہے، اس لیے اس عرصے میں لکھی جانے والی نعت میں دعا و درخواست کے مضامین کثرت سے آئے ہیں۔ (یوں نعت نے اجتماعی ملّی مسائل پر توجّہ کرنے کی

تحریک مسلمانوں کو مُسلسل دی ہے) ریاض مجید کے نعتیہ دیوان میں یہ تمام مضامین بکثرت پیش ہوئے ہیں۔ڈاکٹر سرور کامران ریاض مجید کے نعتیہ دیوان کی بابت رقم طراز ہیں:

> ''ڈاکٹر ریاض مجید نے نعتیہ دیوان لکھ کر کارِ کوہ کنی انجام دیاہے۔ ایسے کام ہو جاتے ہیں کئے نہیں جاسکتے۔ اپنی کم علمی اور بے خبری کا اعتراف کرتے ہوئے مَیں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ معاصر ادب کا پہلا نعتیہ دیوان ہے اور اگر اس سے پہلے لکھے جا چکے ہیں تو تبرکات کی کڑیوں میں یہ ایک اور کڑی کا اضافہ ہے۔''(۱۰۴)

اُردُو اصنافِ سخن میں حمد اور نعت، نہایت محتاط اور مشکل میدان ائے سخن ہیں بالخصوص نعت رسالت مآبؐ نے اوّل روز ہی کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر اپنی پوزیشن واضح کر دی سختی کہ وہ سرحد دید وفا دید پر متمکن نہیں۔ گر ہم، اِس طرف، نہ اُس طرف۔ اس اعتبار سے نعت گو شاعر پر ایک کڑی ذمّے داری عائد ہو جاتی ہے۔ریاض مجید نے صرف قادر الکلامی کی احتیاجات کو ہی نہیں نبھایا بل کہ یا محمدؐ ہوشیار کا شعور رکھتے ہوئے۔ فن کی نزاکتوں، ایمانیات کی احتیاطوں اور سلیقۂ اظہار کی جہتوں سے بھی کماحقّہ، عہدہ برائی کی ہے۔ جذب و ہستی اور غلو میں بے شمار نعت گو شعرا کو قلم اور اظہار کے ساتھ ڈگمگاتا ہوا دیکھا گیا ہے، لیکن ریاض مجید نے جس طرح اپنے آپ کو سنبھالے رکھا اُس کا نعتیہ دیوان اس شہادت کی مستند دستاویز ہے۔ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے:

> ''نعتِ رسُولِ مقبول ﷺ کا حق تو کسی سے ادا نہیں ہو سکتا۔ کوئی شاعر کتنا ایجاد پسند ہو، جب تک وہ نعت کا حق ہی ادا نہ کر سکے تو مبالغہ کیسا؟ یہاں تو مبالغے کے بیان کی بھی گنجایش نہیں۔'' (۱۰۵)

آج کے دور میں، مرثیہ کو تصنیف کی طرح، نعت بھی، نعت ہائے نو تفیف کا تقاضا کرتی ہے۔ریاض مجید نے ثناخوانی مصطفیؐ میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ اس پائے کی اس شیفتگی اور وارفتگی کی نعت لکھی جا چکی ہے، جنھیں پڑھ کر نو وارُدوں کے قلم گر پڑتے ہیں۔ کیا مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آج اس سے بہتر نعت لکھی جانی چاہیے۔ نہیں ایسا نہیں بل کہ ایسا تو ممکن بھی نہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آج کی نعت، اُسلُوب، لفظیات، علامتوں کے اظہار اور نعت کے منظر نامے کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہے۔ امام احمد رضا خاں بریلویؒ کی مشہورِ زمانہ نعت:

واہ کیا جود و کرم ہے شہِ بطحاؐ تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا (۱۰۶)

اسی کے تناظر میں جب احمد ندیم قاسمی کی اُسی زمین میں کہی گئی نعت:

ایک بار اور بھی یثرب سے فلسطین میں آ
راستہ دیکھتی ہے مسجدِ اقصیٰ تیرا (۱۰۷)

جب ہم نعت پڑھتے اور سنتے ہیں تو ہمارے دل رسالت مآب ﷺ کی محبّت میں ایک اور ہی انداز میں دھڑکنے لگتے ہیں۔ رئیس امروہوی کے مطابق:

"نعت گوئی ایسی صنفِ سخن نہیں، جس کو خشک لہجے اور روایتی آہنگ کے ساتھ ادا کیا جا سکے۔ نعت گوئی کا کمال یہ ہے کہ نعت کو اس طرح برتا جائے، جس طرح کلاسیکی شاعری کو تمام فنی محاسن اور جمالیاتی اور نغمہ سرائی کے ساتھ برتا جاتا ہے۔" (۱۰۸)

ہمارے آج کے اکثر باشعور نعت گو شعرانے نبی کریمؐ کی سیرت نگاری اور سراپا نگاری کو جن جن تلمیحات، استعاروں، علامتوں سے منظوم کیا ہے وہ اُسلُوب یقیناً اُنھیں منفرد، مختلف اور ممیز کر دیتا ہے۔ ریاض مجید ان میں ایک معتبر نام ہے۔ ڈاکٹر سرور کامران کے مطابق:

" نعتیہ مجموعہ کلام اور نعتیہ دیوان میں، جو فرق ہے وہ تو واضح ہے ریاض مجید نے یقیناً اس دیوان میں تدوین سے کام لیا ہو گا۔ نعتیہ مجموعہ کلام میں فنّی طور پر، جو آسانی اور سہولت میسّر ہے وہ نعتیہ دیوان میں میسّر نہیں۔ دیوان میں، جو مصرع ہائے ثانی کسی نہ کسی حرفِ تہجی پر ختم ہوتا ہے۔ اس طرح شاعر پر فنّی اعتبار سے ایک کٹھن ذمّے داری آن پڑتی ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو وہ حرفِ تہجی کو کسی نہ کسی طرح نبھائے، مگر بات تو جب بنے گی جب یہ فریضہ، معنویت، جذبے اور شوق کے ساتھ ادا ہو۔" (۱۰۹)

ڈاکٹر سرور کامران کی بیان کردہ درج بالا تصریح کے باب میں حرف "ژ" والی نعت ملاحظہ ہو:

نعتِ شہٗ طیبہ میں، ہر لحن ہے شرمندہ، ہر سعی زباں کژمژ
لکنت زدہ سب لہجے، ہر طرز ہنر ناقص، ہر حرف بیاں کژمژ (۱۱۰)

ریاض مجید کی قادر الکلامی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا کہ ریاض مجید نے اپنے دس نعتیہ دیوان میں چند بحور و اوزان پر اکتفا یا تکیہ نہیں کیا۔ بہت ادق بحروں میں بھی اس نے نعتیں کہیں ہیں۔ جن میں سے بعض کو پڑھنے میں دِقّت محسوس ہوتی ہے۔ اس سے اس کی عروض دانی پر دسترس اور آگاہی کا پتا چلتا ہے۔ یوں لگتا ہے ریاض مجید کے اندر عشق رسُول ﷺ کا ایک خفتہ آتش فشاں ہے، جو انھیں نِت نئے استعارے تخلیق کرنے پر اعادہ کار رکھتا ہے۔ یہ نعتیہ دیوان، نعت کے سلسلے کی اس کی چوتھی کتاب ہے۔ لگتا ہے یہ نعت گوئی کا یہ سلسلہ لامتناہی ریاض مجید کی آخری سانس تک چلے گا۔ وہ سنتِ نبیؐ میں بہت کُچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ بہت کُچھ ریاض مجید نے تو بخشش کا سامان فراہم کر لیا۔ ریاض مجید کے اشعار اپنی عجز بیانی کا بین ثبوت ہیں:

سرِ عرصۂ قیامت ، رہے ساتھ تیری رحمت
مِری جلتی روح پر ہو ترا سائبان مولا! (۱۱۱)

وارداتِ قلبی و تجرباتِ روحانی کے ابلاغ و ایضاح کی متعدد صورتیں ہیں، جن میں سے سب سے زیادہ لطیف و بلیغ صورت شاعری کے روپ میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ شعر کی تعریف کئی حوالوں سے کی جاسکتی ہے۔ڈاکٹر جانسن شاعری کو ایک ایسا ادبِ مقفّٰی قرار دیتا ہے، جو صداقت کے ساتھ مُسرّت کا پیوند لگاتا ہے۔ افلاطون کے نزدیک ادب مظاہرِ قدرت کی نقالی کا نام ہے جب کہ ارسطو شاعری کو حیاتِ انسانی اور فطرت کی ترجمانی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ کولرج شعر کو روحانی مُسرّت کے حُصُول کا باعث گردانتا ہے جسے بقول اس کے صداقت سے مشروط قرار نہیں دیا جاسکتا۔ سینٹ آگسٹین کہتا ہے ''نہ پوچھو تو مَیں جانتا ہوں کہ شعر کیا ہے اور اگر پوچھو تو مجھے یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہ ہو گا کہ مَیں نہیں جانتا'' ورڈزورتھ نے شعر کی بہت عمدہ تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب انسان اور فطرت کا باطن اُمڈ پڑتا ہے تو اس سے شاعری جنم لیتی ہے۔ شعر کے بارے میں اہلِ علم کی ان جُملہ آرا کی روشنی میں ایک بات واضح طور پر اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ شاعری تجربات و مشاہداتِ انسانی کے لطیف پیرایۂ اظہار کا نام ہے اور جب موضوعِ سخن ہی وہ پیکرِ جمیل ذات قرار پائے کہ، جس کی سیرت کا ایک ایک ورق لطافت در آغوش ہے ،تو کیا شاعری نور فوق نور کی کیفیت پیدا نہ کر دے گی؟ محمد افضل خاکسار ریاض مجید کے نعتیہ دیوان کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''ہماری آج کی زیرِ تبصرہ کتاب ڈاکٹر ریاضؔ مجید کا نعتیہ دیوان ''سیّدنا محمّد ﷺ'' ہے۔ڈاکٹر ریاضؔ مجید کا نام ہمیں فیصل آباد کے معاصر ادبی منظر نامے میں سب سے زیادہ نمایاں مقام کا حامل نظر آتا ہے۔یوں تو اُنھوں نے ہر صنفِ سخن میں اپنے علوِّ فکر اور جودتِ طبع کے جوہر دکھائے ہیں، مگر مدحتِ رسُول ﷺ اُن کا وہ تخلیقی افتخار ہے، جس نے اُن کے نام اور مقام کو اعتبار بخشا ہے۔ اُنھیں خود بھی اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ اُنھیں یہ سر فرازی درِ رسُولِ ﷺ پر جبہ سائی کی بدولت نصیب ہوئی ہے اور ان کے کلام کا لہجۂ شیریں دراصل آقاے نام دار ﷺ کی عنایاتِ باطنی کا مرہونِ منّت ہے۔''
> (۱۱۲)

شعری دنیا میں تعقّل، جذبہ اور فن شاعری کے اساسی ارکان ہیں۔ نعتیہ شاعری کے تناظر میں ہم تعقّل کو رفعتِ خیال کے ساتھ ساتھ لوازم و متعلقاتِ نعت کے شعور وادراک سے تعبیر کریں گے۔ جذبے کی صداقت شاعری کی اصل قرار پائے گی، جب کہ فن پر عبور سخن میں متضمّن بہ ترفّع و کمال ہو گا۔ اس ضمن میں محمد افضل خاکسار مزید لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر ریاضؔ مجید کے مجموعہ نعت ''سیّدنا محمّدؐ'' میں ہمیں اِنھی ہر سہ عناصر یعنی تعقّل، جذبہ اور فن کی کرشمہ سازیاں جابجا کارفرما نظر آتی ہیں۔ کہیں تعقّل نے فکر کے گلزار سجا رکھے ہیں، تو کہیں جذبے کی آنچ نے درد کے الاؤ دہکائے ہوئے ہیں۔ کہیں زُبان و بیاں کے نادرات دامنِ دل کو کھینچتے ہیں، تو کہیں فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ اُن کی ہنر کاری کا مرکز و محور آنحضرت ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات ہے۔'' (۱۱۳)

تعقّل، جذبے اور فنی کرشمہ سازی کے حوالے سے ریاض مجید کا یہ نعتیہ شعر بہ طورِ مثال ملاحظہ ہو:

تجھ سے سرِ آغازِ ہنر ، تُو مرے
شوق کے قرآں کا الف لام میم (۱۱۴)

درِ حبیب ﷺ پر حاضری کی تمنّا ہر مسلمان کے لیے جزِ ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔ ریاضؔ مجید کے کلام میں اس آرزو کا رنگ کتنا گہرا ہے، چند اشعار بہ طور مثال ملاحظہ ہوں:

سدا کی آرزو ہے رہیں جا کر مدینے
کہیں نزدِ حرم ہی بنائیں گھر مدینے
نظر آئے وہ گنبد ، ،جو کھولیں گھر کی کھڑکی
ہو کوئی وقت ، دیکھیں یہی منظر مدینے (۱۱۵)

روضۂ اقدس کی جالی مبارک اور گنبدِ خضریٰ کو ہر نعت گو شاعر نے اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے۔ ریاضؔ مجید کے آئینۂ سخن میں گنبدِ خضریٰ اور جالی مبارک کا عکسِ جمیل کس آب و تاب سے منعکس ہُوا ہے، ملاحظہ فرمایے:

نگاہوں میں ہے عکس گنبد خضرا
سجا ہے قریۂ مہتاب آنکھوں میں (۱۱۶)

آنسوؤں کی اوٹ سے جالیوں کو دیکھنا
ہجر کی ماری ہوئی زندگی کی چاہ ہے (۱۱۷)

خاکِ طیبہ، خاکِ رہِ مدینہ، حضورؐ کے نقشِ قدم، حضورؐ کی خاکِ پا، حضورؐ کے نعلین مبارک، ریاضؔ مجید کے کلام میں کس شان سے جلوہ گر نظر آتے ہیں، بصد ارادت پڑھیے اور اپنے ذوق کو تازہ کیجیے:

چمک اٹھے گی شبِ حیات اس کی روشنی سے
یہ خاکِ طیبہ ہے اس کو دستارِ سر میں رکھنا (۱۱۸)

منزل میرے شوق کی ، اُس شہؐ کے نعلین
با جگزار ریاستیں ، جس کی ہیں کونین (۱۱۹)
ترے پاک نعلین کی برکتوں سے ، گلیاں وہاں کی جان مثال آقاؐ
لختِ جگر مدینے کے سنگ ریزے ، نورِ نظر مدینے کی دھُول تجھ سے (۱۲۰)

ریاض مجید کے کلام کے مرجع ارکان اور ان کی مرغوب لفظیات کا سرسری انداز میں جائزہ پیش کیا جائے، تو ''سیّدنا محمد ﷺ'' کے شاعر کے چند درج ذیل موضوعات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مواجہ پر حاضری کی کیفیت:

عجب تھی پیشِ مواجہ کی کیفیت
دلوں کے خواب نظر سے بیاں ہوئے (۱۲۱)

اشک بہاتے ہوئے زائر عجب
دیکھ مواجہ پہ مناظر عجب (۱۲۲)

موجِ ہَوا کی زد پر ، تنکے ہیں آشیاں پہ
دے اِتّحاد مولا ! امت شکستہ صف ہے (۱۲۳)

ڈاکٹر ریاضؔ مجید نے نعتیہ ترکیبات، لفظیات اور مرکّبات میں معتد بہ اضافہ کیا ہے اور یوں اس صنفِ سخن کو مزید ثروت مند بنایا ہے۔ وطنِ عزیز میں فروغِ نعت کے حوالے سے اُن کی ذات ایک تحریک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُن کا اپنا ہی ایک شعر ہے:

کم سوادوں سے کہوں حیَّ علی النّعت ریاضؔ
حرمِ شاعری میں نعت اذاں ہو میری (۱۲۴)

''سیّدنا محمد ﷺ'' میں شامل تمام نعتیں اُن کی طبع زاد زمینوں میں لکھی گئی ہیں۔ جُملہ ترکیبات اور مرکّبات اُن کے ذاتی اجتہاد کا نتیجہ ہیں۔ چند ترکیبات اور مرکّبات بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

ہجومِ نور، عرش سرشت، ثنائے عرش مُرتّبت، قدس آثار لمس، وادیِ ایمن، قریۂ مہتاب، نعت آمادہ ، اساسِ ظہور، شہرِ اظہار، زرِ برکات ، ولا سرشت، درود مست، تختِ کُن کا شاہؐ، شفاعت بخش ضو، شاخچۂ آشیاں ، خیر خیز، خیر یاب، لوحِ جان، سکینت خیز، نعت نہاد، مدینہ زاد، درود نژاد، نرم خرامی، پاک نگاہی، آہستہ گفتاری، اہلِ ولا، یمِ روشنی، خیر سرشت، پردہ دارِ عیوب، چہرہ پوشِ ذنوب، گہر پاش خزینے، جنّتِ گوش، فردوسِ دل، صنفِ ہزار رنگ۔

ریاض مجید کے نعتیہ کلام کا بہ غور جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اُن کا نعتیہ کلام کسبی سے کہیں زیادہ مذہبی ہے، جسے بلاشبہ موہبتِ الٰہیہ قرار دینا درست ہو گا۔ ریاض مجید کے نعتیہ کلام کے بارے میں محمد افضل خاکسار لکھتے ہیں:

> ''یوں تو وطنِ عزیز میں ہر نعت گو شاعر کا اپنا ایک جداگانہ اندازِ سخن ہے اور ہر گُلے را رنگ و بوئے دیگر است، کے مصداق ہر مدّاحِ رسول ﷺ نے مختلف انداز سے بارگاہِ رسالت مآب ﷺ گل ہائے عقیدت پیش کئے ہیں مگر ، جو جامعیت ڈاکٹر ریاضؔ مجید کی نعتیہ شاعری میں نظر آتی ہے، وہ صرف اِنھی کا حِصّہ ہے۔ دورِ حاضر میں بے شمار مجموعہ ہائے نعت شایع ہوئے ہیں، مگر ''سیّدنا محمد ﷺ'' وہ پہلا نعتیہ مجموعہ ہے، جسے نعتیہ دیوان

کہلانے کا اعزاز حاصل ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ اس میں، جو نعتیں ہیں وہ تمام کی تمام مختلف الاوزان ہیں
۔ نعتِ نو بہ نو کا یہ احداث ڈاکٹر ریاضؔ مجید کو محدِّثِ نعت کے مقام پر فائز کرتا ہے۔ مَیں ڈاکٹر ریاضؔ مجید کو اس
منفرد ''دیوانِ نعت'' کی تخلیق پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔'' (۱۲۵)

اس حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ ریاض مجید کی نعتیہ شاعری کب کا اعتبار قائم کر چکی ہے۔ اب تو اُن کے نعتیہ کلام میں نو بہ نو رنگ پائے جاتے ہی، جن کو اُن کی اپنی زُبان میں صنفِ ہزار رنگ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بقول ریاض مجید اُن کا یہی رنگ اُن کے نعتیہ کلام کی پہچان بن چکا ہے:

مست رہے ریاضؔ اس صنفِ ہزار رنگ میں
نعتِ رسُولِ پاکؐ کی ، طرز ،جو نَو بہ نَو ملی (۱۲۶)

پاکستان کے نعتیاتی ادب کی تخلیق و تحقیق اور تنقید ہر سہ ابواب میں کارہائے سعید کے ذریعے خدماتِ جلیلہ انجام دینے والی عبقری شخصیت ڈاکٹر ریاض مجید کی ادبی کاوشوں اور نعتیہ نگارشوں پر قلم اٹھانا، جہاں میرے لیے باعث شرف و وقار ہے، وہیں مجھ ایسی مبتدیہ کے لیے کار مشکل بھی ہے کہ فن کی بُلندیوں پر فائز اس شاعر نعت کی حکایت دل کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے فن شناس نظر اور فکر شناس ذہن ضروری ہے۔ ریاض مجید کی نعتیہ شاعری کی عظمت کیبابت شمائلہ صدف عزیزی رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر ریاض مجید کی نعتیہ شاعری اکتسابی اور وہبی صلاحیّتوں کے امتزاج کا خوب صورت ظہور ہے اور زیر مطالعہ کتاب ''سیدنا محمدؐ'' فنی نقطۂ نگاہ سے اس منزل اوج پر فائز ہے، جہاں پہنچنے کو محض فن نہیں بل کہ عشق صادق اور اخلاص ہی رخت راہ بنتے ہیں، عشق واخلاص سراسر باطنی کیفیات ہیں، جن کو ماپنے کو بظاہر کوئی آلہ نہیں، مگر ڈاکٹر ریاض مجید کے حمدیہ ونعتیہ سرمایے میں عشق کی سرشاری اور خلوص کی اُستواری جابجا محسوس کرتی ہے۔'' (۱۲۷)

ریاض مجید نے درج بالا جُملہ کیفیات کو اپنے درج ذیل شعر میں سمیٹ دی ہے:

ہم اہل نعت فروعات میں الجھتے نہیں
ہمیں تو ان کی محبّت کو عام کرنا ہے (۱۲۸)

ڈاکٹر ریاض مجید بلاشبہ فروعات میں الجھے بغیر شب و روز عشق شہ بطحاعام کرنے کے مشن میں مصروف عمل ہیں، وہ تحقیقی و تنقیدی مضامین ہوں، مجموعہ ہائے نعت کی اشاعت ہو یا جامعات کی سطح پہ نعت کو بطور موضوع ترویج دینے کی عملی کاوش، آپ ہر میدان کے سرخیل رہے ہیں یہ تمام ترقلی و علمی کاوشیں آپ کی سچی لگن، جانفشانی اور نعت رسُول سے گہری وابستگی کی مظہر ہیں۔ ملک بھر کے معتبر اہل نقد و نظر آپ کے معترف فن ہیں۔ ممتاز سکالر اور محقق نعت پروفیسر اکرم رضا لکھتے ہیں کہ:

> ”ڈاکٹر ریاض مجید کا شمار ان سر بُلند شعر اور نثر نگاروں میں ہوتا ہے، جنھوں نے عصر حاضر میں اپنی صلاحیتوں کو خوب منوایا۔ فکر و فن کے حوالے سے ادبستان فکر میں دوامی اجالے بکھیرے، مگر جب ایوان نعت میں آئے، تو ان کی نثری اور شعری صلاحیتوں سے ہر طرف اجالے سے بکھیر گیے۔ نعت میں آئے تو پھر ہمیشہ کے لیے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ آپ صاحب تحقیق و تنقید ہیں، خاموش اور گنگ لفظوں کو نعت کے حوالے سے گویائی بخشنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی متعدد نعتیہ کتب شایع ہو کر اصحاب فن سے خراج تحسین حاصل کی چکی ہیں جن میں اُردُو کا نعتیہ دیوان ”سیدنا محمدﷺ“ ، ”اللھم صل علی محمدﷺ“، (اُردُو نعت) اور ”سیدنا احمد ﷺ“ (پنجابی نعتیہ دیوان)۔“ (۱۲۹)

دیوانِ نعت ”سیدنا محمدﷺ“ میں مہارت فنی، نکتہ آفرینی کے ساتھ ساتھ تازگی فکر و خیال کا دل آویز عنصر آپ کی نعت کو وہ جامعیت عطا کرتا ہے، جو ہر نعت کار کا نصیب نہیں ہوتی۔ اس حوالے سے ریاض مجید خصوصی مبارک باد کے حامل ہیں۔ اُن کا یہ مجموعہ اُن کی نعتیہ شاعری کا ایک روشن مینار ہے، جس کی ضو فشانی سے اُدرو نعت منور و تاباں رہے گی۔ اصغر علی تبسّم ریاض مجید کے بارے میں اپنے دیرینہ تعلق اور یادوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ”ریاض مجید میرے ان دیرینہ دوستوں میں شامل ہیں، جن سے مل کر مجھے زندگی کے میلے کا احساس ہوتا ہے اور نصف صدی سے زیادہ پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں ۔“(۱۳۰)

ان دنوں ملک بھر کے تعلیمی اداروں کی طرح گورنمنٹ کالج دھوبی گھاٹ لائل پور کی فضائیں بھی علم و ادب اور شعر و شاعری کی خُوش بُو سے معطر تھیں۔ یہی دور تھا جب اسلامیہ کالج لاہور میں ہر سال شمع تاثیر کے فورم پر آل پاکستان انٹر کالجیٹ طرحی مشاعرہ ہوتا تھا۔ ان مشاعروں میں ریاض مجید، کشور ناہید، عزیز انجم، عدیم ہاشمی، سلیم بے تاب، اقبال سروش بھی ذوق و شوق سے حِصّہ لیا کرتے تھے۔

آج کے ایک فقیر منش اور درویش صفت انسان ریاض مجید کالج کے زمانے میں اپنے انداز و اطوار میں کافی رکھ رکھاؤ رکھتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی دنیا بدلتی رہتی ہے۔ یہی جہ ہے کہ آج، جو بے نیازی ان کی شخصیت کا حِصّہ بن چکی ہے کالج کے زمانے میں نہیں تھی۔ اصغر علی تبسم ریاض مجید کے اُس دور اور شاعری کے بارے میں مزید رقم طراز ہیں:

> ”ریاض مجید اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسی کالج سے منسلک ہو گئے اور پرنسپل عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔ میں بھی زندگی کی جھمیلوں میں الجھا رہا اور کالج کے سب ساتھیوں اور دوستوں سے بچھڑ گیا بہت عرصے بعد ۱۹۸۸ء میں لودھراں بہاول پور میں ہونے والے ایک مشاعرے میں ریاض مجید سے میری ملاقات ہوئی تو تھوڑی دیر کیلیے کالج کے زمانے کی خوش گوار فضائیں تصوُّر میں آگئیں ۔“ (۱۳۱)

ریاض مجید خوش قسمت ہیں کہ ان کی ساری زندگی علم وادب کے گھوارے میں گزری اور اُنھیں اپنے من پسند شعبے میں ابھرنے کا موقع ملا۔ وہ صدارتی ایواڈ یافتہ ہیں۔ یہ اُن کی محنتِ شاقہ کا ثمر ہے کہ وہ ۳۰ سے زیادہ کتابوں کے مصنف

ہیں۔ اُن کی یہ اختصاصی حیثیت ہے کہ وہ علم کے ڈاکٹر ہیں، مگر ہمیشہ کسرِ نفسی سے کام لیتے ہیں۔ اپنے آپ کو ڈاکٹر ریاض مجید نہیں بل کہ ریاض مجید لکھتے ہیں۔ ان کی سادگی کا یہ عالم ہے کہ بازار سے گزرتے ہوئے کوئی اجنبی شخص اُنھیں دیکھے تو وہ ایک مجذوب لگتے ہیں اپنے انداز و اطوار سے ملنے والوں پر اپنے عالم فاضل ہونے کا تاثر دینے سے گریز کرتے ہیں۔ سب کے ساتھ عاجزی اور انکساری سے پیش آتے ہیں، مگر جب ادب پر بات کرتے ہیں تو ان کی زُبان سے علم و ادب کے پھول جھڑتے ہیں۔

ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہر محبِ رسُول کے دل میں عقیدت و احترام کا جذبہ تو وہی ہوتا ہے، جو مسلمانوں کے دل میں موجزن رہتا ہے، مگر اطاعت اور مدحت کے اظہار کے لیے محبان رسُول ﷺ ہمیشہ نئے نئے اُسلُوب تلاش کرتے آئے ہیں۔ ان سے اظہار محبّت میں رطب اللسان ہونے، اپنے دل کے حال کے حقیقت بیان کرنے اور ان ﷺ کی مدح کرنے میں نئے نئے انداز اور نئے نئے لہجے اختیار کرتے ہیں ریاض مجید بھی اسی کیفیت سے گزرے ہیں۔ ریاض مجید کی اس ریاضت کے بارے میں اصغر علی تبسم لکھتے ہیں:

> " ریاض مجید حبّ رسُول ﷺ میں مکمل طور پر ڈوبا ہوا ہے۔ اس کیفیت میں وہ مقناطیس کی طرح اپنے رہبر کی طرف خود بخود کھنچا چلا جاتا ہے۔ شام کے وقت سارا دن کے تھکے ہارے پرندوں کا اپنے اپنے آشیانوں کی طرف لوٹنے کا منظر کتنا دلفریب ہوتا ہے! کتنا نیچرل ہوتا ہے۔" (۱۳۲)

ریاض مجید کے نعتیہ اشعار پڑھ کر قاری کا دل اس کی گرفت سے نکل کر حضورؐ کے قدموں میں نچھاور ہونے کے لیے اڈ چلا جاتا ہے، وہ اشعار پڑھتے پڑھتے خود بخود شاعری کی جذباتی اور روحانی کیفیت میں ڈوب جاتا ہے۔ اُن کے جذبِ دروں کی اس کیفیت کو درج ذیل اشعار میں ملاحظہ کیجیے:

کشش اک نسبت عالی کی رہبر اپنی
کوئی کھینچے لیے جاتا ہے ، کھینچے جاتے ہیں (۱۳۳)

ریاضؔ اپنی ثنا ، عرض داشت بھی ہے کہ ہم
قرینے نعت کے ، لہجے دعا کے رکھتے ہیں (۱۳۴)

ریاض مجید نے کہیں کہیں مشکل گوئی اختیار کی ہے۔ تخیّل اور جذبے کے ساتھ ساتھ اس کے پاس الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ وہ مشکل ردیف اور قافیہ اشعار کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ وہ کہیں زمین پر طبع آزمائی کرتا ہے مدحت رسُول ﷺ میں اس کا ادراک اوج پر پہنچ جاتا ہے۔ اندازِ بیان میں ریاض مجید، احمد ندیم قاسمی سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں اصغر علی تبسم مزید لکھتے ہیں:

"سیدنا رحیم ﷺ کے مطالعہ کے بعد قاری کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کتاب کا خالق ایک عالم فاضل شخص ہے۔ ریاض مجید دیکھنے میں ایک سادہ سا آدمی لگتا ہے، مگر جب اس کے کلام کا مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ وہ علم کا ڈاکٹر ہے، جس کی کہی ہوئی بات سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ مدحت رسول ﷺ کے بیان میں تخیل، ادراک، عقیدت، احترام اور عالمانہ بصیرت کو یکجا کر دیتا ہے۔" (۱۳۵)

ریاض مجید رسول اللہؐ کے بے پایاں رحم و کرم سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس کا خزانہ لازوال ہے یہی وجہ ہے کہ مانگتے مانگتے ریاض مجید کا دل نہیں بھرتا۔ وہ مسلسل مانگتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ایک نعت کے اشعار ملاحظہ ہوں:

زہے نصیب یہ سرشاریاں مدینے کی
جگائیں بخت کو بیداریاں مدینے کی
جو پونچھے اشک ہوا ، خاک ڈھانپے زخموں کو
خوشا نصیب یہ غم خواریاں مدینے کی (۱۳۶)

ان اشعار میں کیا سرشاری اور کیف و سپردگی کی کیفیت ہے کہ شاعر کے ساتھ ساتھ قاری بھی مدینے کی فضاؤں میں پہنچ کر اسی کیف میں ڈوب جاتا ہے:

ہے آسمان منوّر اس ایک نسبت سے
اُفق اُفق میں ضیا باریاں مدینے کی
ریاض جنّہ کا ہو اعتکاف قسمت میں
نصیب عمر ہوں افطاریاں مدینے کی! (۱۳۷)

شاعر احترام رسول ﷺ سے غافل نہیں ہے، مگر مدحت رسول ﷺ کے بیان میں اس کی تسلی نہیں ہوتی۔ نئے نئے الفاظ، نئے نئے پیرایے، نئے نئے انداز اختیار کرنے کے باوجود اسے اپنی کم مائیگی کا احساس رہتا ہے۔ اتنا کُچھ کہنے کے باوجود وہ اپنے آپ کو بے بس سمجھتا ہے کہ اس شان رسول ﷺ میں کُچھ کہنا نہیں آتا:

جو ہو شایاں ترے سوغات کہاں سے لاؤں؟
نعت کے واسطے جذبات کہاں سے لاؤں؟
میرے الفاظ کو جو منزلت اعجاز کی دیں
میں ریاضؔ ایسے کمالات کہاں سے لاؤں؟ (۱۳۸)

ثناخواں وجد میں آ کر تصوُّر میں اپنے محبوبؐ سے شرفیاب ملاقات ہو چکا ہے۔ اب ہر وقت مدینے کی یادوں میں کھویا رہتا ہے۔ بچھڑ جانے کا غم اس کی آنکھوں کی نمناکی کبھی ختم نہیں ہونے دیتا:

کوئی ساعت ہو شہر محترم آنکھوں میں رہتا ہے
مدینہ ہے خیالوں میں حرم آنکھوں میں رہتا ہے (۱۳۹)

ریاض! اس دور میں اہلِ ولا کی نعت کے صدقے
دلوں سے نفرتیں‘سینوں سے کینے جانے والے ہیں! (۱۴۰)

اصغر علی تبسم ریاض مجید کی نعت گوئی کو داد دیتے ہوئے کہتے ہیں:

”ریاض مجید کی نعتیں اتنی دل نشین ہیں کہ رسُول اللہؐ کی عقیدت کے پیش نظر دل نہیں چاہتا ان ہر تبصرہ لکھا جائے پھول گلاب کی ٹہنی پر مہکتا رہے، تو اچھا لگتا ہے، خوب صورت لگتا ہے، پھولوں سے پیار کرنے واال اگر پھول کی پتیاں کھول کر یا بکھیر کر اس کے اندر جھانکنا چاہیے تو وہ پھول نہیں رہتا۔”سیدنا رحیم“ ایسی کتاب ہے بس اسے پڑھتے جاؤ، سرور اور وجد میں آ کر سر ہلاتے جاؤ، اللہ نے یہ سعادت ریاض مجید کو بخشی۔ ریاض مجید نے ”سیدنا رحیم“ لکھ کر عبادت کی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی عبادت قبول کرے۔ آمین، جزاک اللہ، سبحان اللہ۔“ (۱۴۱)

”سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم“ عصرِ حاضر میں اُردو کا پہلا نعتیہ دیوان ہے۔ نعت کے باب میں ڈاکٹر ریاض مجید کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ نعت گوئی کا حوالہ ہو یا نعت کے باب میں تحقیق کا ذکر ہو، وہ ہر قدم پہ سرِ فہرست نظر آتے ہیں۔ ”اُردُو میں نعت گوئی“ (تحقیقی مقالہ از ڈاکٹر ریاض مجید) کے حوالے سے اُنھوں نے نعت گوئی کے معیارات اور روایت کو نہایت احسن طریقے سے یک جا کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ، جو اُصول وضوابط مقرر کرتے ہیں اُن کا پاس بھی نہایت خوبی سے کرتے ہیں۔ نعت گوئی اُن کی سرشت میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ نعت کہتے ہیں تو ایک تسلسل اور سہولت کے ساتھ اپنے جذبات کو الفاظ کا پیرایہ عطا کرتے ہیں۔ ریاض مجید کی نعت کے مطالعے کے بعد قاری اُن کی نعت کے لوازم کو دیکھ کر عارف عبدالمتین کی اس راے کو اُن کی نعت گوئی کے مماثل قرار دیتا ہے۔ کیوں کہ ریاض مجید نے یقیناً کامیاب نعت گوئی کا فریضہ انجام دیا ہے:

”کامیاب نعت گوئی کے لیے قرآنِ مجید اورر سیرتِ طیبہ کا عمیق ،بسیط اور تجزیاتی مطالعہ نہایت ناگزیر ہے۔“
(۱۴۲)

نعتیہ دیوان ”سیدنا محمد ﷺ“ کا ایک اہم وصف یہ بھی ہے کہ اس میں ۱۴۰ سے زائد مختلف بحور میں نعتیں کہی گئی ہیں۔ ”سیدنا محمدؐ“ میں ۱۴۵ کے قریب نعتیں موجود ہیں اور چند ایک کو چھوڑ کر باقی تمام نعتیں ایک دوسرے سے الگ بحر میں ہیں۔ اس حقیقت کے انکشاف سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان قاری کو عروض کی بھول بھلیوں میں الجھا کر رکھ دے گا ،لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ اگرچہ ہر نعت جداگانہ بحر میں لکھی گئی ہے، لیکن نعت کے تسلسل چاشنی اور ترنم میں کسی بھی مقام پر کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ریاض مجید کی نعت میں سوز وگداز اور اثر آفرینی کی یہ خوبی عطیۂ خداوندی نہیں تو اور کیا ہے۔

اس دیوان کا ایک بڑا حِصّہ دو تین ماہ کے مختصر عرصہ میں تخلیق ہُوا۔ یہ نعتیں اُن خوش گوار ساعتوں کی عطا ہیں، جن کا شکر واجب ہے۔ ریاض مجید کی طبیعت نعت گوئی پر مائل ہوئی تو ہر نعت اپنا پیر ہن لے کر اُتری۔ اس دیوان میں اس سلسلہ کی ایک چوتھائی نعتیں شامل کی گئی ہیں۔ در حقیقت ان نعتوں کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے اور اسی تعداد کا اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں۔ واضح رہے کہ مَیں ریاض مجید کی تمام نعتوں کا حوالہ نہیں دے رہی بل کہ صرف اُن نعتوں کی بات کر رہی ہوں، جو مختلف بحور میں کہی گئی ہیں اور، جن میں عروض کے حوالے سے مختلف تجربات کئے گئے ہیں، جو نہایت خوش گوار ثابت ہوئے ہیں۔ مستقبل میں اِن شاء اللہ یہ تمام نعتیں بھی منظرِ عام پر آئیں گی۔ ان کی اشاعت نعت گوئی کے باب میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اصغر علی تبسم ریاض مجید کے زیرِ نظر نعتیہ مجموعے کی عروضی حیثیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ’’ ریاض مجید نے نعت گوئی کے حوالے سے بحور کے، جو تجربات کئے ہیں وہ ان تجربات میں قاری کو بھرپور طریقے سے شریک کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ اس حوالے سے ایسے سنجیدہ قارئین کی تعداد بہت کم ہو گی، جو بحور میں دل چسپی رکھتے ہوں گے، مگر ایسے لوگ جہاں اور جتنی تعداد میں بھی موجود ہیں اُن کی معلومات میں اضافے اور ان کی رہ نمائی کی غرض سے ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس منفرد نعتیہ دیوان کے آخر میں نعتوں کی تخریج بھی کر دی ہے۔۔ ۔وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ تخریج دو تین مقامات پر نامکمل ہے۔ یہ مقامات ہیں جہاں نعتوں کو دو یا دو سے زیادہ مختلف طریقوں سے پڑھا جا سکتا ہے۔‘‘ (۱۴۳)

ریاض مجید کے خلوص، صداقت اور محنت کا اندازہ ہوتا ہے کہ اِس نعتیہ دیوان کی تخلیق، ترتیب اور تشکیل کے ضمن میں، جو صرف ہوئی ہے۔ ریاض مجید کی تمام تر عاجزی اور انکساری کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کا یہ نعتیہ دیوان عصرِ حاضر میں نعت گوئی کا اہم حوالہ ہے۔

بحور کے تجربات کے ساتھ ساتھ اس نعتیہ دیوان کی ایک اہم خوبی خوب صورت اور، منفرد ردیفوں کا استعمال ہے۔ ان کی نعت کے مضامین میں تنوع، سرخوشی اور سرشاری کی اسی کیفیات ملتی ہیں، جو کسی بھی دوسرے نعت گو شاعر کے ہاں بہت کم نظر آئیں گی۔ سلسلۂ اویسیہ سے نسبت اور حضوری کی کیفیات ریاض مجید کی نعتوں کے دو نمایاں رنگ ہیں۔ ان کی نعت شریعت کی تابع ہے اور وہ محویت کے عالم میں بھی اپنے گرد وپیش سے بے خبر نہیں ہوتے۔ اس دیوان کی ہر نعت ایک علیحدہ رنگ اور تاثر کے ساتھ وجود میں آئی ہے اور یہ منفرد رنگ نعت کی تاثیر میں اضافہ کا باعث ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی نعتیں قاری کو رشک کی کیفیت میں مبتلا کرتی ہیں اور وہ عالمِ وجد میں بھی ان نعتوں کی تعریف پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بہ طورِ مثال نعت کے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

اللہ اکبر، اے خوشا! صلِّ علیٰ
دے دل کی ہر دھڑکن صدا، صلِّ علیٰ

دل جاگتا ہے روز اسی آواز سے
کانوں میں کہتی ہے صبا ، صلِّ علیٰ
موت آئے جب، لب پر ریاضؔ اُس وقت ہو
صلِّ علیٰ! صلِّ علیٰ! صلِّ علیٰ (۱۴۴)

ریاض مجید کی پنجابی نعت گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے امین راحت چغتائی لکھتے ہیں:

'' ریاضؔ مجید نے پنجابی ہائیکو میں نعت کہنے کی سعادت بھی حاصل کی ہے۔ بنیادی طور پر ہائیکو جاپانی صنفِ سخن ہے۔ جاپانیوں کے نزدیک ہائیکو مثبت رویّوں کی شاعری ہے ،جو معاشرے کی فکری تربیت بھی کرتی ہے۔ اسی کو جاپانی مفکرین ''زین بدھ ازم'' کا نام دیتے ہیں۔'' (۱۴۵)

ریاض مجید پنجابی ہائیکو میں نعت کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ ''حیّ علی الثناء'' میں وہ جس طرح دربارِ رسالت مآبؐ میں اپنی عقیدت کے پھول پیش کرتے ہیں وہ متاثر کن بھی ہیں اور نعت گوئی کے لیے ایک بہترین نمونہ بھی۔ '' حیّ علی الثناء'' کی ہائیکو عجز انکساری، تاریخ اور قرآنی حوالوں سے راستہ ہیں۔ فخر موجودات کی بارگاہ میں عجز انکسار کی کیفیت نے شاعر کے قلب کو گداز کر دیا ہے۔ شاعر آپ ﷺ کی اطاعت کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی سعادت تصوّر کرتا ہے۔

ریاضؔ مجید ان غیر ممتاز رویّوں سے بچ کر چلتے ہیں، جو بعض اوقات اتباعِ شریعت کے آداب کو متاثر کرتے ہیں اور یہی رویہّ اُن کی فکر و فن کی جلا کا باعث ہے۔ امین چغتائی لکھتے ہیں:

''حیّ علی الثنا'' کی شاعری میں سادگی و پُرکاری ہے۔ لب و لہجہ میں دل آویز دھیما پن ہے۔ آرزوؤں کے اظہار کا جامہ ایسا شائستہ کہ تحسین کی نگاہیں اس کی طرف بار بار اٹھیں۔ دعائیں ایسی معصوم و مقام آشنا کہ عرش سے با مراد لوٹیں۔''(۱۴۶)

ریاضؔ مجید نعت گوئی کے حضور اکرم ﷺ کی رحمت کا اعجاز سمجھتے ہیں اور اپنی ذات تک اس رحمت کے نزول کا شکر ادا کرتے ہوئے اس سلسلے کے قیامت تک جاری و ساری رہنے کے آرزو مند ہیں۔ ان کی نعت گوئی کا مقصد حضور اکرم ﷺ کی رضا حاصل کرنا ہے۔ اُنھوں نے ہائیکو کا خیال جاپان سے لیا ہے اور چڑھتے سورج کی سرزمین کو نعتیہ ہائیکو کا انمول تحفہ عطا کیا ہے۔ امین راحت چغتائی کے مطابق:

''قرآنی حوالوں اور سیرتِ نبوی ﷺ کی خوبیوں کے ساتھ اُنھوں نے نعتیہ ہائیکو میں ہر مضمون خلوصِ نیّت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ ان کے لہجے میں نیاز و ناز، محبّت، بصیرت، صداقت اور تازگیِ خیال ایک ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں اور پنجابی زُبان کو نعتیہ ہائیکو کی نعمت سے مالامال کرتے چلے جاتے ہی ۔''(۱۴۷)

نعتیہ ہائیکو کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اس مجموعے کو منظرِ عام پر لانے کا انداز بھی نہایت معتبر ہے۔ وہ لوگ، جو ریاض مجید کی نعت کے اسیر ہیں، لیکن پنجابی شاعری سے مکمل طور پر آشنا نہیں ہیں اُن کے ذوق کی خاطر ریاض مجید نے کتاب کے آخر میں قارئین کی آسانی کے لیے متن کا اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔ ریاض مجید نعت گوئی کے ضمن میں اظہار و بیان کے مزید نئے در کھولنے کے آرزو مند ہیں۔ اُن کی یہ کاوش وقت کے ساتھ ساتھ ضرور رنگ لائے گی۔ ریاضؔ مجید کی نعتیہ ہائیکو کے چند نمونے ملاحظہ کیجیے:

ویلا ، بندے ہوا ، زمین ، اسمان
عرش جیہّاں بنا کے چیزاں ، رب
نعت اپنے حبیب ﷺ دی آکھی (۱۴۸)

کالے موسم اُجال دے میرے
میں تری ﷺ دید نوں ترسدا واں
روشنی بخش اپنی رحمت دی (۱۴۹)

دل نوں چمبڑے گناہ کالک وانگ
ڈیرہ لایا اے بدیاں ساہواں وچ
چانناں خیر دا دکھا مولا! (۱۵۰)

بخش عثمانؓ دی حیا وچوں
حیدریؓ زور دے خزانے چوں
اِکّو لَپ اَج فِر اپنی امت نوں (۱۵۱)

اُردو میں نعت گوئی:

”اُردُو میں نعت گوئی“ ڈاکٹر ریاض مجید کا تحقیقی مقالہ ہے، جس کی تکمیل پر اُنھیں پنجاب یونی ورسٹی کی طرف سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔ بعد ازاں یہ مقالہ کتابی صورت میں شایع کیا گیا۔ یہ مقالہ چھے ابواب، ضمیموں اور کتابیات پر مشتمل ہے۔ بابِ اوّل (نعت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم اور موضوع و فن) میں نعت کے لغوی، اصطلاحی مفہوم، نعت کے موضوعات، اختتام، انداز و اسالیب کے بیان اور اُردُو نعت کے مضامین اور فن پر ہندوستانی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں ہندوستانی دیومالا، اساطیر، مذہب اور معاشرت کا جائزہ شامل ہے۔

باب دوم (محرکات و ماخذات / عربی فارسی پس منظر) میں نعت کے اساسی اور ذیلی محرکات اور اس کی مقبولیت کے اسباب پر بحث کی گئی ہے، جب کہ نعت کے ماخذات و منابع (قرآن، احادیث، کتب، سیر و مغازی، الہامی، صحائف اور مذہبی کتابیں، اسماے رسُول مقبولؐ) کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے۔ نعت کے پس منظر میں عربی نعت کے ابتدائی نمونے، ما قبل بعثت کے مبشرات کا تذکار، وحی اوّلیٰ سے ہجرت مدینہ تک نعت گوئی، برِّصغیر پاک وہند کی فارسی نعت گوئی کے موضوعات کو قلمبند کیا گیاہے۔

باب سوم (اُردُوے قدیم کے نعتیہ نمونے اور جنوبی ہند میں نعت گوئی کا جائزہ) میں جنوبی ہند میں اُردُو نعت گوئی کا سیاسی، تہذیبی اور لسانی پس منظر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اُردُوئے قدیم کے نعتیہ نمونوں کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ جس میں اُردُو نعت کا اوّلین نمونہ / صوفیاے کرام کی جکریوں، دوہروں اور شعری تصانیف میں نعتیہ عناصر، جنوبی ہند کی نعتیہ شاعری کا پہلا دور (قلی قطب شاہ سے ما قبل ولی دکنی)، دکنی معراج ناموں، میلاد ناموں، وفات ناموں وغیرہ کا جائزہ، ولی دکنی اور اس کے بعد کی نعت گوئی کا جائزہ اور پھر اس دور کے اثاثۂ نعت پر تبصرہ شامل ہے۔

باب چہارم (شمالی ہند میں اُردُو نعت گوئی کا جائزہ) میں تمہید کے بعد صوفیاے کرام کی نعت گوئی کے نمونے اور ان کا مجموعی جائزہ لیا گیاہے۔ سودا اور میر کے عہد میں (سودا، میر تقی میر، مصحفی، مومن اور دیگر شعرا) نعتیہ کلام کا جائزہ شامل ہے۔ اُردُو نعت کے تشکیلی دور کا سیاسی پس منظر بیان کرنے کے بعد کرامت علی شہیدی، کفایت علی کافی مراد آبادی، غلام امام شہید، حافظ لطف علی خاں لطف بریلوی اور تمنّا مراد آبادی کی نعت گوئی کا جائزہ لیا گیاہے۔ امیر مینائی اور محسن کاکوروی کی نعت گوئی پر بحث کی گئی ہے اور آخر میں شمالی ہند کی نعت گوئی کا اجتماعی طور پر جائزہ لیا گیاہے۔

باب پنجم (عصرِ جدید کی نعت گوئی) میں تمہید کے بعد جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے اثرات، نعت گوئی میں فریاد و استمداد کا اُسلُوب، جدید اندازِ نعت میں حالی، شبلی، احمد رضا خاں بریلوی، نظم طباطبائی، علّامہ اقبال، ظفر علی خاں اور حفیظ جالندھری کے اندازِ نعت گوئی کا جائزہ لیا گیاہے۔ دیگر نعت گو شعرا میں شائق، یزدانی، ممتاز، حمزہ، معلی، مضطر اور جلیل کی نعت گوئی کا جائزہ بھی لیا گیاہے۔ اس کے بعد علماو صوفیہ کے نعتیہ شاعری اور عصرِ جدید کے دورِ آخر میں اقبال سہیل، امجد حیدر آبادی، عزیز لکھنوی، زائرِ حمید صدیقی کی نعت گوئی کا خاص طور پر ذکر کیا گیاہے۔ آخر میں عصرِ جدید کے نعت گوئی کا مختصراً جائزہ لیا گیاہے۔

عصرِ جدید کی نعت گوئی کا ایک بڑا حِصّہ گراموفون ریکارڈ، گیتوں، ٹھمریوں، راگوں اور ہندی انداز کی غزلوں پر مشتمل ہے۔ جس کے ذکر کے ساتھ ساتھ فروغِ نعت میں مجالسِ میلاد اور محافلِ سماع کے اثرات کا جائزہ بھی اس باب کے آخر میں شامل ہے۔

باب ششم (عصرِ حاضر کی نعت گوئی) میں تمہید کے بعد قیامِ پاکستان کے جذبہ محرکہ، عصرِ جدید کی توسیع اور پھر ماہر القادری اور بہزاد لکھنوی کی نعت گوئی کا خصوصی اور دیگر شعرا کا عمومی ذکر کیا گیا ہے۔ عبد العزیز خالد کی طویل نعتیہ منظومات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ حافظ لدھیانوی، حفیظ تائب، راسخ عرفانی اور متفرق نعت گو شعرا کے کلام پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس دور کے خاص موضوعات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اس باب میں غزل کے پیرایے میں کی گئی نعت گوئی کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر ریاض مجید:

> ''ان میں قومی و ملکی مسائل، سقوط ڈھاکہ، فلسطین اور امت مسلمہ کو درپیش مسائل و آشوب کا ذکر نمایاں ہے۔ ردِّ اشتراکیت اور ردِّ قادیانیت کے موضوعات کا حوالہ بھی اس دور کی نعت میں نظر آتا ہے۔'' (۱۵۲)

اس کے بعد رفتارِ نعت کا مطالعہ کیا گیا ہے اور پھر عصرِ حاضر کی نعت گوئی کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ غزل کے علاوہ معریٰ، آزاد اور نثری نظم میں، جو نعت لکھی گئی ہے اس پر نعت گوئی کی ہیئتوں میں تنوع کے حوالے سے گفت گو کی گئی ہے۔ مقالے کے آخر میں سات ضمیمے ہیں، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ احادیث نبوی میں لفظ نعت کا استعمال

۲۔ اسماے رسُولِ مقبول ﷺ

۳۔ شروح بردہ

۴۔ میلاد نامے

۵۔ غیر مسلسم شعرا کا نعتیہ کلام

۶۔ خواتین کی نعت گوئی

۷۔ نعتیہ ریکارڈ اور فلمی طرزوں پر لکھی گئی نعتوں کا جائزہ

کتابیات میں قرآن وحدیث، کتب سیرت، لغات، کتب حوالہ، کلیات، دیوان، مثنویات، کتب معاون و نعتیہ دیوان / شعری مجموعے، جرائد کے خصوصی شمارے، عام اشاعتیں اور فہارست وغیرہ کے حوالے دیے گئے ہیں۔ چوں کہ اس مقام کی تکمیل، جون ۱۹۸۳ء تک ہو گئی تھی۔ اس لیے اس کا دائرہ کار ۱۹۸۰ء تک محدود ہے ماسوا، ان چند حوالوں کے، جو بعد کے سالوں سے متعلق ہیں:

"موضوع کے اعتبار سے یہ مقالہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ ابواب کی تقسیم بندی سے لے کر اشاریہ سازی تک کا کام نہایت توجُّہ اور محنت کا متقاضی تھا اور اس ضمن میں مقالہ نگار کی محنت مقالے کے ہر لفظ اور سطر سے عیاں ہے۔۔۔کسی صنفِ سخن کی مکمل روایت کا بیان اور دورِ حاضر تک اس کا جائزہ یقیناایک مشکل امر ہے اور اس سلسلے میں بہت سے کٹھن مراحل کا سامنا کرناپڑتاہے۔" (۱۵۳)

ریاض مجید نے اپنے مقالے کی تکمیل کے سلسلے میں، جس خلوصِ نیت سے کام کیاہے اس نے مقالے کو تحقیق نگاری کی صف میں ایک معتبر مقام عطا کیاہے۔ مقالہ نگار نے بے جا طوالت اور غیر موزوں اختصار سے گریز کیاہے اور معلومات کے گراں قدر ذخیرے کو نہایت مہارت کے ساتھ پیش کیاہے۔

سیّدنااحمد صلی اللہ علیہ وسلم:

ریاض مجید کا پنجابی نعتیہ دیوان "سیدنا احمد ﷺ" غالباً عصرِ حاضر کا پہلا پنجابی نعتیہ دیوان ہے۔ یہ دیوان دو حمدوں اور ایک سو اُنیس نعتوں پر مشتمل ہے۔ ریاض مجید بارگاہِ الٰہی میں سر بہ سجدہ ہیں کہ مدتوں بعد ان کا قلم رواں ہُوا ہے اور انہیں حمد رقم کرنے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔ ہر میدان میں شرف اور عزت اسی ذاتِ باری کی عطا ہے چناں چہ "سیدنا احمد" کے حمدیہ اشعار میں اللہ تعالیٰ کی بے کراں نعتوں، مہربانیوں اور کرم کا نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ شکر ادا کیا گیاہے اور پہلی حمد کے ردیف "شکر ترا" سے اشعار کے مفہوم اور دل پذیری میں خاصا اضافہ ہُوا ہے:

ساہواں وچ ، لفظاں دے وچ ، سوچاں دے اندر مولا
رات دن کردا رہواں اِکو ای کم ، شکر ترا
جیس سفر وی، میں جس راہ تے وی ٹردا ہوواں
دھیان وچ طیبہ ولے رہن قدم ، شُکر ترا
دتی توفیق ریاض اپنے نوں حمد آکھن دی
سجدے وچ جھکیا اے اج اوہدا قلم، شُکر ترا (۱۵۴)

ریاض مجید کو احساس ہے کہ انسان اپنی تمام تر کوششوں اور خواہشات کے باوجود اللہ تعالیٰ کی حمد کے حق ادا کرنے سے قاصر ہے۔ تبھی تو وہ کہتے ہیں:

لوبھ، مکر، ریاچ ڈبیا دل، کرے کیس طراں تری شان ربا!
کرے حمد دا حق ادا کیویں ؟ مری حرص چ بھجی زُبان ربا!
کریں نظر سولی تے جنتاں دے کھلن در اہناں قبر نیہریاں وچ
ٹریا سدا گناہاں دی لیک اُتے بندی تیرا میں نافرمان، ربا! (۱۵۵)

ریاض مجید نے اپنے اس دیوان کی نعتوں میں نعت کا رسمی انداز اختیار نہیں کیا بل کہ ان نعتوں کا شمار حقیقی نعت گوئی کے ضمن میں ہوتا ہے۔ خیال رہے کہ رسمی نعت سے مراد وہ نعت ہے، جو محض شعری روایت کے طور پر لکھی گئی ہو۔ اکثر دواوین اور شعری مجموعوں کے آغاز میں، جو نعتیں ملتی ہیں اُنھیں رسمی نعت کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ رسمی نعت میں بھی حضورؐ سے مَحبّت و عقیدت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، لیکن حقیقی نعت کی تو تخلیق کا محرک ہی یہی جذبہ ہوتا ہے۔ یعنی حقیقی نعت محض کوئی ادبی روایت نہیں بل کہ نعت گو کے دل کی آواز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "سیدنا احمد ﷺ" کی نعتوں میں حضور اکرمؐ کی سیرت و تعلیمات، غزوات و معجزات، عادات اور خصائلِ مبارکہ کا ذکر جذب و مستی اور، جوشِ مَحبّت سے عبارت ہے۔

نعت کی ادبی اور فنی حوالے سے ایک منفرد اور معیاری مقام عطا کرنے کے سلسلہ میں ریاض مجید کا نام سرِ فہرست ہے۔ حضور اکرمؐ کی ذاتِ مبارکہ سے مَحبّت اور عقیدت اہلِ ایمان کی زندگیوں کا لازمہ ہے اور ریاض مجید کی نعتوں کا ایک اہم وصف بھی۔ پروفیسر سحر انصاری کے مطابق:

"ہر لکھنے والا اپنے ذہنی رجحان اور ذاتی و اجتماعی پس منظر کی روشنی میں اپنے لیے اکابرِ عالم سے اِنتخاب کرتا ہے اور اپنی ذات اور اپنے عہد کے لیے اس سے کسبِ نور کرتا ہے_____ ظاہر ہے ان میں سب سے بڑا مرتبہ ختمی مرتبت حضرت محمدؐ کا ہے آپ ﷺ کی تعلیمات، اسوۂ حسنہ اور علمی زندگی ایک انقلاب کی نقیب بنی، جس نے زیردستوں کی آقائی کو مقسومِ انسانی بنا دیا، جن افراد کا آپ ﷺ سے دین یا عقیدت کی بنیاد پر کوئی تعلق نہیں وہ بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے عظمتِ بشر کی ایسی راہیں سجھائی ہیں، جو اس سے پہلے چشمِ زمانہ سے اوجھل تھیں۔" (۱۵۶)

حضورؐ کی ذاتِ اقدس کی نسبت سے مدینے کی فضاؤں، گلی کوچوں سے مَحبّت ریاض مجید کی نعتوں کا نمایاں موضوع ہے:

مدینے تے مکا اپنی حیاتی دا سفر ، گھر آ!
کوئی شہ رگ چہ واجاں ماردا اے بے خبر! گھر آ

زندگی کی بے ثباتی اور وقت کی بے مہری کا شدید احساس ان کے دل میں مدینے حاضری کی تڑپ پیدا کرتا ہے۔ اُداسی کی یہ کیفیت نعت کی تخلیق کا محرک بنتی ہے تو ایسے اشعار وجود میں آتے ہیں:

کِری جاندی اے چاندی عمر دی کدھرے کراہے وچ
مکی جاندا اے تیزی نال ایہہ ساہواں دا زَر گھر آ!
دلیں گردان کردا اے مسلسل اوہ نگر ، گھر آ!
تری آ! آپ دی آل ، آپ دی اصحاب دی راہے
ریاضؔ آجا! مدینے جاندیاں واواں مگر ، گھر آ! (۱۵۷)

حضورؐ سے عقیدت و محبّت اس امر کی متقاضی ہے کہ نعت میں گستاخ، غیر شایستہ اور سوقیانہ الفاظ کے استعمال سے گریز کیا جائے۔ مرزا محمد منوّر کا کہنا ہے:

"نعت کے ہر شعر میں نعت کا ایسا قرینہ موجود ہونا چاہئے کہ وہ عام مضامینِ غزل سے متمیز ہو اور ظاہر ہے کہ یہ آسان کام نہیں اس کے لیے خالی قادر الکلامی کی ہی نہیں مزاج کے داخلی رکھ رکھاؤ اور دل و دماغ کی بیداری درکار ہے۔" (۱۵۸)

کسی بھی زُبان و ادب کے وہ شعرا یقیناً خوش نصیب ہیں، جنھیں نعت گوئی کا ایسا قرینہ اور سلیقہ ودیعت کیا گیا ہے۔ ریاض مجید کی نعتوں میں رکھ رکھاؤ اور تہذیب و شایستگی کا وصف ایک لازمی عنصر کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ رسُول ﷺ سے محبّت اور شیفتگی کے بیان میں ان کا قلم احترام کے دائرے کا پابند رہتا ہے اور موزوں، مگر محتاط انداز میں ان کے جذبات کی موئثر عکاسی بھی کرتا جاتا ہے۔ ریاض مجید کی نعت کے چند اشعار بہ طورِ مثال ملاحظہ ہوں:

دل شیشے تے بے حد لکھیا
اِکو لفظ "محمد ﷺ" لکھیا
بسم اللہ دی برکت نال ای
ذہن چ "احمد احمد" لکھیا
رشک تے ریس چ اِک دوجے دی
قلم تے ساہواں وَدھ وَدھ لکھیا (۱۵۹)

حضور پاکؐ کی ولادت باسعادت کو اکثر نعت گو شعرا نے اپنی نعتوں کا موضوع بنایا ہے۔ ریاض مجید نے بھی اپنی نعتوں میں آپ ﷺ کی ولادت باسعادت اور اس کائنات پر اس مبارک واقعے کے اثرات کی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ کریں:

دُور سمے دے جثّے اندر جمیا نھیرا ہویا
تُوں آیا تے جگ دے اندر نور سویرا ہویا
سوچ رہیا واں ، تیرے شہر دیاں گلیاں دے اندر
چودہ صدیاں بعد ریاض مجید دا پھیرا ہویا (۱۶۰)

مدینے حاضری کے خواب، حضوری کی کیفیت اور روضہ رسُول ﷺ کی سنہری جالیوں کے سامنے دعا کا تصوُّر، ریاض مجید کے گرد روشنی اور نور کا ایسا ہالہ تعمیر کر دیتا ہے کہ پھر دنیا کے اندھیروں کا کوئی خوف اور غم باقی نہیں رہتا۔

درود پاک کے ورد کا معمول عاقبت میں بخشش کا سبب بھی ہے اور دنیا میں کامیابی اور فلاح کا راستہ بھی۔ ریاض مجید کی درود پاک سے مَحبّت ان کے نعتیہ اشعار میں نمایاں ہے۔ جب وہ کہتے ہیں:

ترا کلمہ چتار دی اے جیبھ
عاقبت اِنج سنوار دی اے جیبھ
مٹّی نوں ذکر وچ بدل دیندی
نفرتاں نوں سنوار دی اے جیبھ (۱۶۱)

دل درود کے معجزات اور بابرکت کرشموں کی جانب بے اختیار کھنچتا چلا جاتا ہے۔ حضور پاکؐ پر درود بھیجنے کی تلقین اور نعت لکھنے کی ترغیب کے حوالے سے اس نعتیہ دیوان کی دو نعتیں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ جن کے مطلع درج ذیل ہیں:

جان ایہنوں ای جین دا مقصد، جان ایہنوں ای اصل حیات
چڑھدے لہندے پاک نبیؐ تے بھیج دروداں دی سوغات!
لکھ توں سوہنے دی سرکار دی نعت
ساری اُمت دے غمخوار دی نعت (۱۶۲)

مدینہ کی پاک زمین سے مَحبّت کا یہ عالم ہے کہ اس نگر سے ہو کر آنے والا ہر خوش نصیب قابلِ صد احترام ہو جاتا ہے۔ زائروں سے ملاقات کے بعد اپنی بے بسی کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے۔ ریاض مجید زائرین سے ملاقات اور گفت گو کو باعثِ فخر قرار دیتے ہیں۔ وہ جب کسی زائر سے مصافحہ کرتے ہیں تو ان کے ہاتھوں میں مدینے کی مہک رچ بس جاتی ہے اور اسی کیفیت کے باعث وہ دوری میں حضوری کی سعادت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

نعت نگر دا شاعر:

ریاض مجید دی کتاب ''حی علی الثناء'' میرے سامنے اے تے میں سوچ رہیاداں کہ گل کتھوں شروع کراں۔ کیوں جے ایہہ اجیہی کتاب اے کہ ایدے بارے چہ گل کرن دے کئی پہلو نیں۔ نعت دی شاعری صرف شاعری نہیں بل کہ ایہہ ساڈے دین تے ایمان دا اِک حِصّہ وی اے تے امیر ھاٹڈھ اوہدوں ای بج گیا سی جدوں اللہ پاک نے اپنے نور پتوں آپ ﷺ دا نور پیدا کیتا۔ تے اللہ پاک نے اپنی پچھان دا پہلا ذریعہ آپ ﷺ دی پاک ذات نوں بنایا۔ اوس ویلے توں لے کے اج تیک تے ایس توں بعد قیامت دے دیہاڑے دی جدوں سب لوکاں نے پناہ منگنی اے تے آپ ﷺ دی پاک مصستی دے تکناں اے اوس ویلے آپ ﷺ کولوں مدد طلب کرنا وی نعت دا دی اک انداز ہووے گا۔ مختصر اے کہ اللہ پاک نال آپ ﷺ دی ذات پاک دا اجیہا تعلق اے کہ آپ ﷺ دی تعریف دی کوئی حد مقرر نہیں کیتی جاسکدی تے آپ ﷺ دی نعت دا سلسلہ بھی کدی ختم نہیں ہو سکدا۔

نعت دی شاعری برّصغیر وچ بڑی دیر توں کیتی جارہی اے تے شاعراں نے آپ ﷺ نال محبّت دا اظہار کدی میلاد پاک لکھ کے کدی آپ ﷺ دی ذات پاک دے نور دی تعریف کر کے کہ تے کدی آپ ﷺ دے شہر و اپنے جان دی تاھنگ دا ذکر کر کے کیتا اے۔ تے ایس ریت نوں بڑی دیر تک عام تے خاص لوکاں نے بڑا پسند کیتا تے شاعراں نے وی عقیدت نال اپنی ہر کتاب دا اڈھ صحّت تے نعت نوں بعد سنبھیا۔ پر اچانک اک نویں طرز دی نعت سامنے آئی۔ جیھدا آغاز الطاف حسین حالی مرحوم نے کیتا تے اوہناں نے آپ ﷺ نوں اپنے دکھاں دا حال سنایا تے اوہناں دیاں برکتاں تے رحمتاں اوہنوں توں منگیاں۔ ایس رنگ نے لوکاں دے دلاں وچ ایسا اثر کیتا کہ اوہناں دے دلاں وچ اللہ دے حبیبؐ دی سچی محبّت فیر پیدا ہو گئی تے ساری دلاں دا رُخ مدینے ولے مڑ گیا۔ تے ساری قوم ایس محبّت دے پاروں سرخ رو ہوئی۔

ایس توں بعد دی دوسرے آن والے شاعراں نے دی نعت دی خدمت نویں تو نویں انداز نال کیتی تے کر دی رہے ہیں۔ خاص طور تے پچھلے دس بارہ درہیاں توں شاعراں تے جس شدت نال حضورؐ نال محبّت دا اظہار کیتا اے اوہ بل کہ شہر نعتیہ شاعری دا سنہری دور قرار دتا جا سکدا اے۔ ایسے ای نور دے چاننے وچ ریاض مجید ہوران ولوں نعتیہ شاعری کرن دی دعوت اک بہت وڈھی گل اے کیوں جے اے دین وچ پورے پورے داخل ہون والی گل اے تے ایہہ سعادت بہت گھٹ خوش نصیباں دے ہتھ آوندی اے۔ ریاض مجید ہوراں دی نعتاں اینھیاں کو چاں منفرد تے حقیقی نہیں کہ انج لگدا اے کہ جیویں حضورؐ پر نور دی نعت ریاض مجید دے دل تے پوری طرح اتار دتی گئی۔ اے ہن اوہ نعت لکھ نہیں رہے بل کہ نعت وچ زندگی گزار رہے ہیں اوہنوں نوں کائنات دی ہر چیز دا حضور نبی کریمؐ دے نال اک مضبوط حوالہ لبھ گیا اے۔ ایس لئی اوہناں واسطے نعت کہن لئی بڑی آسانی ہو گئی اے۔ کیوں جے ایتھے شاعر کو نوں ہمہ محمدؐ والی صورت نظر آون لگ پئی اے۔

اوہناں نے حضورؐ دی بارگاہ وچ ہائیکو صنف وچ نعتاں لکھ کے اپنے دل دی گل جس طرح کیتی اے۔ اوہناں دی نعت نال سچی تے سچی لگن دا ثبوت اے۔ اوہناں نے ایسے ایسے خیال جذبے تے مفہوم اپنے کلام راہیں ساڈھے تک پہنچائے نہیں جیہڑے صرف ہر ویلے اپنے آپ ﷺ نوں حضورؐ دے سامنے سمجھ دار ہووے۔

حوالہ جات:

۱۔ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زُبان، اسلام آباد، ۱۹۸۴ء، ص ۲۰۰

۲۔ریاض مجید، لالہ صحرائی کی نعت گوئی، مشمولہ: نعتیہ مطالعات، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء، ص ۳۶۹

۳۔روزنامہ عوام، لائل پور (فیصل آباد)، ۱۴/ فروری ۱۹۷۲ء

۴۔ریاض مجید، قلمی بیاض نمبر ا، ص ۱۳۳

۵۔حفیظ تائبؔ، پشتی فلیپ، اللھم صلے علیٰ محمد، از ریاض مجید، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۱۹۹۴ء

۶۔حافظ محمد افضل فقیر، مشمولہ: کُلیّاتِ نعت، از ریاض مجید، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۴۱

۷۔ایضاً، ص ۴۲

۸۔مرزا محمد منور، مشمولہ: نعت اور آدابِ نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص ۴۰

۹۔سیّدہ حنا، مشمولہ: نعت اورر ادابِ نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص ۴۸

۱۰۔حافظ محمد افضل فقیر، مشمولہ: کُلیّاتِ نعت، از ریاض مجید، ص ۴۲

۱۱۔شمس بدایونی، مشمولہ: نعت اورآدابِ نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص ۴۳

۱۲۔ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، طور سے حرا تک، اُردو اکادمی، سندھ، س ن، ص ۱۴

۱۳۔ڈاکٹر تحسین فراقی، مشمولہ: نعت اورر ادابِ نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص ۲۸

۱۴۔حفیظ تائبؔ، مشمولہ: نعت اورر ادابِ نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص ۲۸

۱۵۔احسان دانش، مشمولہ: نعت اورر ادابِ نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص ۶۸

۱۶۔ریاض مجید، اللھم صلّ علیٰ محمد ﷺ، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۱۳

۱۷۔ایضاً، ص ۱۳

۱۸۔ایضاً

۱۹۔ ریاض مجید، اللھم صل ّعلیٰ محمد ﷺ، ص ۱۴

۲۰۔حفیظ تائبؒ، مشمولہ: نعت اورر ادابِ نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص۱۰۸

۲۱۔ریاض مجید، اللھم صل ّعلیٰ محمد ﷺ، ص ۱۴

۲۲۔احمد ہمدانی، مشمولہ: نعت اور آداب نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص۴۷

۲۳۔(ریاض حسین چودھری، مشمولہ: نعت اور آداب نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص۵۹)

۲۴۔ریاض مجید، اللھم صل ّعلیٰ محمد ﷺ، ص ۱۵

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔حافظ محمد افضل، تقدیم، مشمولہ:۔کُلّیاتِ نعت از ریاض مجید، ص۴۸

۲۷۔ریاض مجید، اللھم صل ّعلیٰ محمد ﷺ، ص ۱۶

۲۸۔راجارشید محمود، مشمولہ: نعت اور آداب نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص۹۰

۲۹۔پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، اللھم بارک علیٰ محمد، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۰۵ء، ص۷

۳۰۔ ایضاً، ص۷-۸

۳۱۔احمد ندیم قاسمی، مشمولہ: نعت اور آداب نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص۸۳

۳۲۔پرفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، اللھم بارک علیٰ محمد، ص۸

۳۳۔ریاض مجید، الھم بارک علی محمد، نعت اکادمی فیصل آباد، یکم جنوری ۲۰۰۵ء، ص۱۵

۳۴۔انور جمال، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص۱۱۴

۳۵۔شاعر لکھنوی، مشمولہ: نعت اور آدابِ نعت گوئی، مرتب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص۳۸

۳۶۔محمد عبداللہ قریشی، مشمولہ: نعت اور آدابِ نعت گوئی، مرتب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص۳۹

۳۷۔ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، مشمولہ: نعت اور آدابِ نعت گوئی، محولہٰ بالا، ص۳۸

۳۸۔مرزا ادیب، مشمولہ: نعت اور آدابِ نعت گوئی، محولہ بالا، ص۴۰

۳۹۔ شاہ معین الدین ندوی، مشمولہ: نعت اور آدابِ نعت گوئی، محولہ بالا، ص ۴۱

۴۰۔ محسن احسان، مشمولہ: نعت اور آدابِ نعت گوئی، محولہ بالا، ص ۲۷

۴۱۔ اللٰھم بارک علی محمد ﷺ، ص ۱۴

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۵

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۹

۴۴۔ ذوالفقار احمد تابش، مشمولہ: نعت اور آدابِ نعت گوئی، محولہ بالا، ص ۴۸

۴۵۔ ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، مشمولہ: نعت اور آدابِ نعت گوئی، محولہ بالا، ص ۹۷

۴۶۔ اللٰھم بارک علی محمد ﷺ، ص ۳۲

۴۷۔ ایضاً، ص ۴۶

۴۸۔ ایضاً، ص ۵۰

۴۹۔ ایضاً، ص ۵۷-۵۶

۵۰۔ ادیب رائے پوری، مشمولہ: نعت اور آداب نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص ۲۹

۵۱۔ اللٰھم بارک علی محمد ﷺ، ص ۱۱۵

۵۲۔ ایضاً، ص ۵۸-۵۹

۵۳۔ محمد عبداللہ قریشی، مشمولہ: نعت اور آداب نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص ۳۹

۵۴۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ، مشمولہ: نعت اور آداب نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص ۷۶

۵۵۔ اللٰھم بارک علی محمد ﷺ، ص ۱۲۵-۱۲۴

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۲۲-۱۲۳

۵۷۔ ایضاً، ص ۱۲۰-۱۲۱

۵۸۔ ایضاً، ص ۹۷

۵۹۔ اللّٰھم بارک علی محمد ﷺ، ص۹۹

۶۰۔ ایضاً، ص۱۰۸

۶۱۔ ایضاً، ص۱۴

۶۲۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، مشمولہ: نعت اور آداب نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص۳۸

۶۳۔ اللّٰھم بارک علی محمد ﷺ ، ص۲۰-۲۱

۶۴۔ ایضاً، ص۱۲-۱۱

۶۵۔ تحسین فراقی، مشمولہ: نعت اور آداب نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص۶۱

۶۶۔ شاعر لکھنوی، مشمولہ: نعت اور آداب نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص۳۴

۶۷۔ اللّٰھم بارک علی محمد ﷺ ، ص۹۷

۶۸۔ ایضاً، ص۳۷

۶۹۔ ڈاکٹر، ریاض مجید: "اللّٰھم بارک علیٰ محمدؐ" (نعت اکادمی، فیصل آباد) ۱۹۷۳ء، ص۱۵

۷۰۔ عارف عبدالمتین، مشمولہ: نعت اور آدابِ نعت گوئی، محولہ بالا، ص۵۰

۷۱۔ اللّٰھم بارک علی محمد ﷺ ، ص۱۷

۷۲۔ سیّد غلام حسین رِضا: نہج الاسرار: کلامِ معصومین، غازی پبلیشرز، حیدر آباد دکن، ۱۹۷۸ء، ص۶۵

۷۳۔ محسن احسان، مشمولہ: نعت اور آدابِ نعت گوئی، محولہ بالا، ص۲۷

۷۴۔ حفیظ تائب، مشمولہ: نعت اور آدابِ نعت گوئی، محولہ بالا، ص۲۸

۷۵۔ اللّٰھم بارک علی محمد ﷺ ، ص۴۸

۷۶۔ ایضاً، ص۳۲-۳۳

۷۷۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، مشمولہ: نعت اور آدابِ نعت گوئی، محولہ بالا، ص۲۸

۷۸۔ اللّٰھم بارک علی محمد ﷺ ، ص۳۰-۳۱

۷۹۔ اللٰھم بارک علی محمد ﷺ، ص ۲۶

۸۰۔ ایضاً، ص ۲۸

۸۱۔ ایضاً، ص ۳۴-۳۵

۸۲۔ ایضاً، ص ۵۴

۸۳۔ ایضاً، ص ۳۶

۸۴۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۸۵۔ علی مجید، مرتب: ریاض مجید ایک مطالعہ، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء، ص ۴۱

۸۶۔ ایضاً، ص ۴۲

۸۷۔ ایضاً، ص ۳۴

۸۸۔ ریاض مجید، شانِ نزول، مشمولہ: سیّدنا محمد ﷺ، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۵

۸۹۔ ریاض مجید، سیّدنا محمد ﷺ، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۱۱

۹۰۔ ایضاً

۹۱۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، مشمولہ: نعت اور آدابِ نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص ۶۳

۹۲۔ ریاض مجید، سیّدنا محمد ﷺ، ص ۱۱

۹۳۔ ایضاً

۹۴۔ حکیم احسن شریف، ڈاکٹر ریاض مجید کی نعتیہ تازہ کاری، مشمولہ: سیّدنا محمد ﷺ از ریاض مجید، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۰۳ء، ص ۴۵-۴۶

۹۵۔ ایضاً، ص ۴۷

۹۶۔ ایضاً، ص ۱۴-۱۳

۹۷۔ڈاکٹر ناصر عباس نیرّ ،سیّدنا محمد ﷺ پر چند باتیں ساختیاتی حوالے سے، مشمولہ: ریاض مجید ایک مطالعہ، مُرتّب: علی مجید، ص۵۰

۹۸۔ریاض مجید، سیّدنا محمد ﷺ، ص۲۲

۹۹۔ڈاکٹر ناصر عباس نیرّ، سیّدنا محمد ﷺ پر چند باتیں ساختیاتی حوالے سے، مشمولہ: ریاض مجید ایک مطالعہ، ص۵۱

۱۰۰۔ریاض مجید، سیّدنا محمد ﷺ، ص۷۵

۱۰۱۔ایضاً، ص۹۰

۱۰۲۔ایضاً، ص۳۹

۱۰۳۔ڈاکٹر ناصر عباس نیرّ، سیّدنا محمد ﷺ پر چند باتیں ساختیاتی حوالے سے، مشمولہ: ریاض مجید ایک مطالعہ، ص۵۳

۱۰۴۔ڈاکٹر سرور کامران، نعتیہ دیوان اور ریاض مجید، مشمولہ: ریاض مجید ایک مطالعہ، ص۵۴

۱۰۵۔مرزا محمد منور، مشمولہ: نعت اور آدابِ نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص۴۵

۱۰۶۔امام احمد رضا خاں بریلوی، نعتیہ دیوان، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور، س ن، ص۴۷

۱۰۷۔احمد ندیم قاسمی، نعت، مشمولہ: اُردُو (لازمی) برائے جماعت ہشتم، خیبر پختونخواہ ٹیکسٹ بک بورڈ، پشاور، ۲۰۰۶، ص۷

۱۰۸۔رئیس امروہوی، مشمولہ: نعت اور آدابِ نعت گوئی، ص۴۰

۱۰۹۔ڈاکٹر سرور کامران، نعتیہ دیوان اورر ریاض مجید، ص۵۶

۱۱۰۔ریاض مجید، سیّدنا محمد ﷺ، ص۱۰۱

۱۱۱۔ایضاً، ص۳۱

۱۱۲۔محمد افضل خاکسار، صنفِ ہزار رنگ اور ڈاکٹر ریاض مجید، مشمولہ: ریاض مجید ایک مطالعہ، ص۵۹

۱۱۳۔ایضاً

۱۱۴۔ریاض مجید، سیّدنا محمد ﷺ، ص۳

۱۱۵۔ایضاً، ص۲۲۸

۱۱۶۔ ریاض مجید، سیّدنا محمد ﷺ، ص۱۴۸

۱۱۷۔ ایضاً، ص۲۷۲

۱۱۸۔ ایضاً، ص۳۹

۱۱۹۔ ایضاً، ص۱۶۷

۱۲۰۔ ایضاً، ص۲۱۹

۱۲۱۔ ایضاً، ص۲۲۵

۱۲۲۔ ایضاً

۱۲۳۔ ایضاً، ص۱۱

۱۲۴۔ ایضاً، ص۲۹۳

۱۲۵۔ محمد افضل خاکسار، محولہ بالا، ص۶۹

۱۲۶۔ ریاض مجید، کلیّاتِ نعت، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء، ص۲۶۵

۱۲۷۔ شمائلہ صدف عزیزی، سیّدنا محمد ﷺ ایک منفرد المثال نعتیہ دیوان، مشمولہ: ریاض مجید ایک مطالعہ، مُرتّب: علی مجید، ص۶۹

۱۲۸۔ ایضاً، ص۳۴

۱۲۹۔ پروفیسر اکرم رضا، محولہ بالا، ص۷۰-۷۱

۱۳۰۔ اصغر علی ندیم، سیّدنا رحیم ﷺ: ریاض مجید کا نعتیہ کلام، مشمولہ: ریاض مجید ایک مطالعہ، ص۷۱

۱۳۱۔ اصغر علی تبسم، سیّدنا رحیم ﷺ: ریاض مجید کا نعتیہ دیوان، ص۷۲

۱۳۲۔ اصغر علی تبسم، سیّدنا رحیم ﷺ: ریاض مجید کا نعتیہ دیوان، ص۷۴

۱۳۳۔ ریاض مجید، سیّدنا رحیم ﷺ، رفاہ انٹرنیشنل یونی ورسٹی، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء، ص۵۹-۶۰

۱۳۴۔ ایضاً، ص۷۹-۸۰

۱۳۵۔اصغر علی تبسم، سیّدنا رحیم ﷺ: ریاض مجید کا نعتیہ دیوان، ص۷۵

۱۳۶۔ریاض مجید، سیّدنا رحیم ﷺ، ص۷۱

۱۳۷۔ایضاً، ص۷۲

۱۳۸۔ایضاً، ص۷۵-۷۶

۱۳۹۔ایضاً، ص۷۷

۱۴۰۔ایضاً، ص۱۲۵-۱۲۶

۱۴۱۔اصغر علی تبسم، سیّدنا رحیم ﷺ: ریاض مجید کا نعتیہ دیوان، ص۷۸

۱۴۲۔عارف عبدالمتین، مشمولہ: نعت اور آدابِ نعت گوئی، مُرتّب: پروفیسر محمد اقبال جاوید، ص۵۰

۱۴۳۔اصغر علی تبسم، سیّدنا رحیم ﷺ: ریاض مجید کا نعتیہ کلام، ص۸۰

۱۴۴۔ریاض مجید، سیّدنا محمد ﷺ، ص۱۹-۲۰

۱۴۵۔امین راحت چغتائی، اوہدی چھاں بخت دے تھلاں اُتے، مشمولہ: حی علی الثنأ، از ریاض مجید، نعت اکادمی فیصل آباد، ۱۹۹۱ء، ص۱۳

۱۴۶۔ایضاً، ص۱۵

۱۴۷۔ایضاً، ص۲۰-۲۱

۱۴۸۔ریاض مجید، حی علی الثناء، نعت اکادمی فیصل آباد، ۱۹۹۱ء، ص۳۰

۱۴۹۔ایضاً، ص۶۶

۱۵۰۔ایضاً، ص۱۲۰

۱۵۱۔ایضاً

۱۵۲۔ریاض مجید، اُردُو میں نعت، مشمولہ: ریاض مجید ایک مطالعہ، مُرتّب: علی مجید، ص۸۸

۱۵۳۔ایضاً، ص۸۹

۱۵۴۔ ریاض مجید، سیّدنا احمد ﷺ، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۱۴۱۹ھ، ص ۱۶

۱۵۵۔ ایضاً، ص ۱۷

۱۵۶۔ پروفیسر سحر انصاری، سیّدنا احمد ﷺ، مشمولہ: ریاض مجید ایک مطالعہ، مُرتّب: علی مجید، ص ۹۲

۱۵۷۔ ریاض مجید، سیّدنا احمد ﷺ، ص ۲۲-۲۳

۱۵۸۔ مرزا محمد منور، مشمولہ: ریاض مجید ایک مطالعہ، مُرتّب: علی مجید، ص ۹۳-۹۴

۱۵۹۔ ریاض مجید، سیّدنا احمد ﷺ، ص ۲۷-۲۸

۱۶۰۔ ایضاً، ص ۲۸-۲۹

۱۶۱۔ ایضاً، ص ۳۳

۱۶۲۔ ایضاً، ص ۳۶-۳۷

باب پنجم:

ریاض مجید کی قطعہ نگاری

قطعہ کا شمار بھی صنفِ نظم پر ہی ہوتا ہے۔ ادبی اصطلاح میں قطع سے مراد دو یا دو سے زائد اشعار پر مشتمل ایسی نظم، جس کا پہلا شعر مطلع نہیں ہوتا اور یہ اُس کی عمومی کیفیت ہوتی ہے۔ شاعر کو یہ استثنا حاصل ہوتا ہے کہ وہ پہلے دونوں مصرعوں کو اپنی منشا کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ چناں چہ وہ چاہے، تو دونوں مصرعوں کو مقفّیٰ اوع مردوف بنا لے اور اگر چاہے ،تو عمومی شعر رہنے دے۔ بسا اوقات دو اشعار والے ایسے قطعے اور رباعی میں بظاہر فرق نہیں معلوم ہوتا، لہٰذا اوزان و بحور کے شناور ہی اس میں فرق و امتیاز کر سکتے ہیں کہ رباعی اپنے مخصوص اوزان اور بحر کے علاوہ نہیں کہی جا سکتی۔ دو سے زائد اشعار والا قطع پابند نظم یا غزل کی طرح اپنی ظاہری شناخت رکھتا ہے۔ جہاں دوسرے مصرعے میں قافیہ اور ردیف کا اعادہ ہوتا ہے۔ ابتدا میں قطع غزل کے دوران میں مسلسل مضامین کی بندش کے لیے استعمال ہوتا تھا اور قطعہ بند کہلاتا تھا۔ بعد ازاں قطع غزل سے الگ ہو کر ایک الگ صنفِ نظم کی حیثیت اختیار کر گیا۔ مضمون کی بندش اور فکری آزادی کے باب میں قطع کوئی خاص حدود و قیود کا پابند نہیں ہے، لہٰذا جدید دور کے قطعات میں مضامین کی بندش کے حوالے سے پوری زندگی اِس کے دامن کا حصّہ ہے، لہٰذا حمد، نعت، سیاست، معاشرت، مذہب، معیشت، مناظرِ فطرت، حالاتِ حاضرہ اور اخلاقیات جیسے جُملہ موضوعات قطعہ کے دامن کا حصّہ ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قطع کہنے کے لیے کسی خاص بحر کی ضرورت در پیش نہیں ہوتی۔ بحر کی اس آزادی کے پیشِ نظر قطعہ میں ہر قسم کے مضمون کی بندش قدرے آسان ہو جاتی ہے۔ شاعر کسی بھی وزن اور بحر میں قطعہ کہہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔ سے لے کر اب تک کے تمام شعرا نے قطعات کہے ہیں۔

ہیئت اور معنی کے اعتبار سے قطعہ قصیدہ یا غزلِ مسلسل خیال کیا جاتا ہے۔ صرف یہ اختلاف ہی ہے کہ قصیدہ اور غزل میں مطلع کی قید ہوتی ہے، جب کہ قطعہ عموماً مطلع سے بری ہوتا ہے۔ گویا کسی نظم کے اوّلین شعر کے مصرعِ اوّلیٰ میں قافیہ نہ لانا قطع کی مد میں آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قطعہ کے جُملہ اشعار قصیدہ اور غزل کی طرح ایک ہی وزن میں ہوتے ہیں اور قصیدہ، غزلِ مسلسل یا مثنوی کی طرح اس میں معنوی ربط ہوتا ہے۔ قطعہ کے کم از کم اشعار کی تعداد دو متعیّن ہے، جب کہ زیادہ سے زیادہ اشعار کی کوئی قید نہیں، یہ موضوع کے اختتام پر منحصر ہے۔ گویا قطعہ کے اشعار کے لیے کسی بحر یا وزن کی کوئی قید نہیں، البتہ رباعی سے مختلف ہونا ضروری ہے۔ ڈاکٹر محمد خواجہ ذکریا کے مطابق:

> ''بہترین قطعہ وہ ہے، جس کا ایک شعر پڑھ کر ہم رک نہ جائیں بل کہ فوراً اگلے اشعار کی طرف متوجّہ ہوں، حتیٰ کہ قطعے کو ختم کر کے ہی دم لیں۔ یہ اُس صورت میں ممکن ہے جب خیالات کی کڑیاں واضح ہوں۔ زُبان نہ صرف صاف اور رواں ہو بل کہ شگفتہ اور برجستہ بھی ہو، تا کہ خشکی اور سپاٹ پن پیدا نہ ہو سکے۔ نہ خیال میں کہیں کمی محسوس ہو اور نہ خواہ مخواہ کی طول کلامی کی گئی ہو۔ اشعار کے درمیان خیالات کے کھانچے نہیں ہونے چاہئیں، بل کہ ایک شعر دوسرے پر چسپاں ہونا چاہیے۔''(۱)

اُردُو نظم میں قطعہ نگاری کی صنف خاصی اہم ہے۔ اس میں غزل یا نظم کے مظاہر یا تو ہم کنار ملتے ہیں یا پھر الگ الگ قطعوں میں رونما ہوتے ہیں۔ قریب قریب ہر شاعر نے قطعہ کہا ہے۔ دورِ حاضر میں قطعہ نگاری کے باب میں ایک اہم نام ریاض مجید کا بھی ہے۔ اُنھوں نے بھی دیگر اصناف میں شعری ریاضت کے ساتھ ساتھ قطعہ نگاری میں بھی مقدور بھر شعری پیکر تراش رکھے ہیں۔ ریاض مجید کا یہ کمال ہے کہ وہ بھی پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی طرح:

"ضرورت پڑے یا سوجھ جائے، تو میں نئے لفظ یا مرکب گھڑ لیتا ہوں۔"(۲)

نئے الفاظ و تراکیب کی ترواش کا بہ خوبی اہتمام کر لینے پر مکمل مہارت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے دیگر اصنافِ سخن کی طرح قطعہ نگاری میں بھی اپنی ایک خاص انفرادیت قائم کی ہے۔ یہاں بھی ریاض مجید کا رنگِ سخن سب سے ممتاز اور الگ تھلگ دکھائی دیتا ہے۔

ریاض مجید کے قطعات کے دو مجموعے خبر اخبار اور ذکر اذکار کے نام سے منصّۂ شہود پر آ چکے ہیں۔ اوّل الذکر مجموعے میں اُنھوں نے بالترتیب یکم/ اکتوبر ۲۰۱۵ء تا ۲۳/ ، جون ۲۰۱۶ء تک لکھے جانے والے ہر تاریخ کے مطابق تاریخ وار قطعات کو شامل کیا ہے۔ مؤخر الذکر مجموعے میں ریاض مجید کے تاریخ وار بالترتیب ۱۶/ مارچ ۲۰۱۷ء تا ۱۳/ دسمبر ۲۰۱۷ء تک یومیہ بنیادوں پر تخلیق کردہ قطعات شامل ہیں۔ دونوں مجموعہ ہاے قطعات میں ریاض مجید نے اڑھائی اڑھائی سو کے تناسب سے کل پانچ سو قطعات تخلیق کرتے ہوئے نہ صرف مِعیار بل کہ مقدار کا بھی اعتبار قائم کیا ہے۔

ان قطعات کی خوبی یہ ہے کہ ریاض مجید نے اُن ایّام میں رونما ہونے والے تاریخی واقعات اور سال کے مخصوص ایّام کے تناظر میں رونما ہونے والے عالمی معاملات کو بھی نذرِ شعر کیا ہے۔ قطعے کی روانی اور موزونی کے باعث ریاض مجید کسی بھی موضوع پر فی البدیہہ قطعہ کہنے پر قادر ہیں۔ یہاں اُن کے کمالِ فن کے سامنے بڑے بڑے قادر الکلام شعرا سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ ریاض مجید نے حالاتِ حاضرہ سے لے کر زندگی کے تمام شعبہ جات میں طبع آزمائی کی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو گا، جس پر ریاض مجید نے قلم نہ اُٹھایا ہو۔ اُن کے قطعات اُن کی بصیرت اور وسیع مطالعے کے ساتھ ذی رکی کا پتا دیتے ہیں۔

ریاض مجید حالاتِ حاضرہ اور عصری سیاست پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ جب سے اُنھوں نے تاریخ وار قطعات بندی کا اہتمام کیا ہے، شاید ہی کوئی ایسا سیاسی منظر نامہ ہو گا، جو ریاض مجید کے بیانیے سے دامن کشاں ہو سکا ہو گا۔ اُن کے دونوں مجموعوں میں کثیر تعداد میں سیاسی حوالے سے قطعات موجود ہیں،، جو اُن کی سیاست پر گہری نظر کا بین ثبوت ہیں۔ وہ عدالتی نظام کی کمزوریوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے، حقیقی احتساب کی روح دیکھنے کے آرزو مند ہیں۔ وہ بلدیاتی نظام کے قائم کرنے کے لیے سیاسی رہ نماؤں کے تابڑ توڑ حربوں اور دوسروں کی چت کرنے کی ریشہ دوانیوں کا ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں بڑا

کامیاب نقشہ اُتارتے ہیں۔اُنھوں بڑے شیریں انداز میں سیاسی نمایندوں کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔دوسرے الفاظ میں اُن کے اس قبیل کے قطعات زُبانِ خلق کا انداز رکھتے ہیں۔اِس ضمن میں ریاض مجید کا چند قطعہ ملاحظہ کیجیے:

احتساب:

عدالت آشنا ، روشن نصاب جیسا ہو
ہر ایک فیصلہ اب انقلاب جیسا ہو
تقاضے سارے ہوں انصاف و عدل کے پورے
عدالت ایسی ہو اور احتساب ایسا ہو (۳)

پاکستانی سیاست کا دنیا کی کسی بھی سیاسی نظام سے مقابلہ ممکن نہیں ،کیوں کہ یہ سیاست کم اور منافقت زیادہ ہے۔اِنتخاب کے دوران میں عوام سے جس انداز میں ترقّی اور خوش حالی کے وعدے کیے جاتے ہیں،وہ کسی پاکستانی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔دوسری طرف جھوٹ کا بیج بیوپار جس انداز میں کیا جاتا ہے،وہ عوام کو اُلّو بنانے کی کامیاب کاوش ہوتی ہے۔ریاض مجید نے ایسے سیاسی رہ نماؤں کا مزاحیہ انداز میں کچا چٹھا نکال کر رکھ دیا ہے۔اِس ضمن میں اُنھوں نے کامیاب، مگر تلخ حقیقت نگاری کا فریضہ انجام دیا ہے۔اسی طرح وہ ملکِ پاکستان کے بجٹ برائے ۱۸-۲۰۱۷ء میں محض لفظی ردوبدل سے سالانہ تخمینہ زنی کی جارہی ہے۔ حکومتی نمایندوں کی کاہلی اور تن آسانی کا رونا روتے ہوئے اُن کی ادائے خود پسندی کا نوحہ بیان کیا ہے۔ ریاض مجید کے ان قطعات کے ذریعے سے گزشتہ ایّام کی سیاسی تاریخ مُرتّب کی جاسکتی ہے۔اِن ضمن قطعہ دیکھیے:

ہمارے سیاسی لیڈر:

جی رہے ہیں فقط اپنی خاطر
ہیں بظاہر یہ زمانے کے لیے
بولتے جاتے ہیں یہ جھوٹ پہ جھوٹ
اِک عیاں سچ کو چھپانے کے لیے (۴)

ریاض مجید نے پاکستانی سیاست کی پورے منظر نامے کو شگفتہ پیرایے میں ایسی ہنر وری سے رقم کیا ہے کہ اُن کی ماہرانہ رائے سے اتفاق کے بغیر یارہ نہیں ہے۔وہ مقامی نمایندوں کی جانب داریوں اور آپسی ریشہ دوانیوں کو ایسی خوب صورتی سے پیش کرتے ہیں کہ اُن کے دشمن بھی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا موجودہ سیاسی نظام ہی اِن چیزوں کے گرد گھومتا ہے۔عوام کے سامنے اور رویّہ اور اندرونِ خانہ اور کہانی جیسی دُہری سیاست اور منافقانہ طرزِ عمل سیاست کا وطیرہ بن چکا ہے۔ریاض مجید نے عوام میں شعور بیدار کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔وہ عوام کو بیدار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کے

مزاج میں غفلت کی نیند لکھ دی گئی ہے، یہ کبھی بیدار نہیں ہو سکتے اس لیے عوام کو ہی مجبوراً بیدار ہونا ہو گا، تب جا کر کچھ تبدیلی کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں الیکشن کے درپردہ کوئی ایسے محرکات ضرور ہوتے ہیں،، جو پورے نئے نظام کے لیے بساط بچھائے ہوتے ہیں۔ ریاض مجید نے بھی ۲۰۱۵ء کے بلدیاتی نظام کے درپردہ ایسی ہی ریشہ دوانی کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ ساتھ ساتھ سیاسی حوالے سے ایک ایسی غیر جانب دار تاریخ مُرتّب کیے جاتے ہیں،، جو اُس وقت کی اصل کہانی کو عوام کے سامنے لانے میں کامیاب رہے گی، ورنہ ہمارا صحافتی نظام تو اس قدر اپاہج ہو چکا ہے کہ سیاسیوں کی بے ساکھیوں کے سہارے چلنے پر مجبور ہے۔ ریاض مجید نے ایسے ہی اِنتخابی اکھاڑوں، الیکشن کے ہنگاموں کا تذکرہ کیا ہے۔ کیوں کہ جب یہ قطعات رقم کیے جا رہے تھے، تو اُن دنوں بلدیاتی نظام کی فعالی کے لیے اِنتخابات ہو رہے تھے۔ اِس ضمن میں قطعہ ملاحظہ ہو:

ہماری عوام:

تو اپنے خواب ہنر میں پرو رہا ہے کیا؟
تجھے یہ علم نہیں کہ ہو رہا ہے کیا!
یہ زلزلوں سے بھی بیدار ہونے والے نہیں
تو اِن کو طنز کے نشتر چبھو رہا ہے کیا؟ (۵)

ہمارا سیاسی نظام کچھ اس طرح کا ہے کہ ملکی مفاد کی خاطر اُمور کی انجام دہی یقینی نہیں بنائی جاتی بل کہ اپنے ذاتی مفادات کی خاطر فیصلے کیے جاتے ہیں، پاکستان میں ایسی صورتِ حال سے کون واقف نہیں ہو گا کہ سیاسی زُعماجب بھی عوام کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اُن کے اپنے ذاتی دوستوں اور رشتہ داروں کی بات کرتے ہیں۔ اسی طرح جب کبھی ملک کی بات کی جاتی ہے، تو اس کے درپردہ اپنے ذاتی مفادات کار فرما ہوتے ہیں۔ عوام کا کسی کو خیال نہیں ہوتا، یہ سب کہنے کی باتیں ہوتی ہیں، ہونے کو وہی کچھ ہوتا ہے، جو ہمارے سیاسی رہ نماؤں کے مفاد میں ہوتا ہے، ملکی مفاد کی بات کرنے والوں کو سیاست میں یہ بھیڑیے کب ٹکنے دیتے ہیں۔ ملکی نظام کو چلانے کے لیے ہمارے رہ نمابظاہر کسی بھی معاملے کی تفتیش کے لیے، جواز پیدا کرتے ہوئے اکثر کمیٹیاں تشکیل دیتے ہیں۔ ایسی کمیٹیوں میں فی الحقیقت عوام کے جذبات کو وقتی طور پر انصاف دہی کے نام پر ٹھنڈا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ ان کمیٹیوں کے نتائج دراصل جرائم میں ملوث لوگوں کا ایک طرح سے دفاع کرنا ہوتا ہے۔ ریاض مجید نے ایسے افراد کی قلعی کھولنے کی بھرپور کوشش کی ہے:

پانامہ کیس:

ایسا عجب کیس نہیں آج تک سُنا
جنگیں بہت دلیلوں کی جس میں لڑی گئیں

کیا کیا مکالمے طرفین میں ہوئے؟
کیا کیا کہانیاں نہیں اس میں گھڑی گئیں (۶)

ریاض مجید نے اپنے قطعات میں سیاست کی ایک مکمل تاریخ مُرتّب کر رکھی ہے۔ اُنھوں نے الیکشن میں کامیاب ہونے کے بعد قائدِ ایوان کے اِنتخاب کے لیے تیّاری اور اراکینِ اسمبلی کے گٹھ، جوڑ کی کہانی کو بھی شگفتہ انداز میں قطعات کی زینت بنایا ہے۔ ان کی یہ شعوری کاوش آج کے دور میں ہمیں سیاسیات کے باب میں بے لاگ تبصرے اور ایک مکمل تاریخ کے طور پر جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ ورنہ عمومی طور پر تو تاریخ پر ہمیشہ جانب داری کا الزام عائد ہوتا آرہا ہے۔ اُنھوں نے اس امر کی انجام دہی کے لیے خصوصی طور پر قطعہ کا اِنتخاب کیا ہے۔ کیوں کہ قطعہ میں بڑے لطیف اور شگفتہ پیرایے میں اکبر الہ آبادی جیسے شاعر نے زندگی کے جُملہ مسائل اور بو قلمونیوں کو بہ طریقِ احسن رقم کرتے ہوئے اس صنف کی سمائی کے امکانات روشن کر دیے تھے، جس پر آنے والے شعرا نے شعوری تتبع کیا اور بڑی کامیابی سے معاشرتی مسائل کو قطعات کے روپ میں پیش کیا ہے۔ ریاض مجید اس قبیل کے ایسے انوکھے فرد کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں، جنھوں نے تاریخ وار واقعات کو ایک ماہرِ فن کے روپ میں بڑی شگفتگی سے فن میں ڈھالا ہے۔

پاکستانی سیاست کا یہ ایک بڑا مسئلہ رہا ہے کہ ملک مالی معاملات کی بے ضابطگیوں اور کرپشن کی وجہ سے ہمیشہ بین الاقوامی سطح پر مقروض ہی رہا ہے۔ ہمارے حکمران ہمیشہ ورلڈ بینک کی طرف ہی دیکھتے رہتے ہیں، لہٰذا ایسی صورت میں سیاسی زُعما کو اپنی خود مختاری دوسروں کے پاس گروی رکھنی پڑتی ہے۔ ریاض مجید کی نگاہِ تیز گام نے ایسی ہی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے حکم رانوں کو خبر دار کیا ہے کہ اگر وقت کے ساتھ ساتھ اس روش کو بدلا نہ گیا تو ہماری آزادی محض نام ہی کی رہ جائے گی۔ اُنھوں نے اپنے منفرد انداز میں ایک طرح سے سیاسی منظر نامے پر چرکے لگائے ہیں۔ ریاض مجید نے ملکی سیاسی حالتِ زار اور حکمرانوں کی نااہلی کو واشگاف انداز میں بیان کرتے ہوئے آنے والے وقت کی راگنی بجائی ہے، جو ایک ماہر سیاست دان کی پیش گوئی معلوم ہوتی ہے۔ وہ سیاسی نظام میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کے مزاج میں بھی تبدیلی کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ کیوں کہ صرف یہی ایک صورت ہے، جو ہمارے ملک کو طویل مالی بحران سے نکالنے میں کامران ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں ریاض مجید کا قطعہ ملاحظہ کیجیے:

ہمارے رہنما:

عظمتِ رفتہ کا پندار لیے پھرتے ہیں
سر نہیں ، ہاتھ میں دستار لیے پھرتے ہیں
وقت ہنستا ہے ہماری خرد افروزی پر
خواب میں دیدۂ بیدار لیے پھرتے ہیں (۷)

ریاض مجید ہمارے ملک کے سیاسی نظام کے چشم دید گواہ اور ایک اعتبار سے مکمل تبصرہ نگار بھی ہیں۔اُنھوں نے سارے منظر کو ایک ناقد کی طرح اُوپر بیٹھ کر بہ خوبی جائزہ لیا ہے۔ان کی مثال اس شاہ کی ہے ، جس کی آنکھوں کے سامنے سارے مہرے ہوتے ہیں اور وہ ہر کسی کی چال پر گہری نظر رکھتا ہے اور ہر مہرہ اس کی شاطرانہ چال سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے اپنی باری سے استفادہ کرتا ہے۔ایسی صورتِ حال میں کوئی بھی مہرہ شاہ کی نگاہ سے بچ نہیں سکتا۔بالکل اسی طرح ریاض مجید نے بھی ہمارے سیاسی نظام میں کیے جانے والے ڈراموں کا نظّارہ کیا ہے۔وہ ایسے ہی سارے منظر نامے کے شاہد ہیں۔وہ اسمبلی کی کارستانیوں، اجلاس کی کارروائیوں اور ان کے نتیجے میں ہونے والی عملی تبدیلیوں اور اقدامات کے بارے میں ایک ایک کرکے ہر موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔اُنھوں نے اسمبلی کے فلور پر کی جانے والی تقریروں اور ان پر کی جانی والے میڈیائی سرگرمیوں اور کھیل کے ساتھ عملی اقدامات کو بھی بڑے بے لاگ انداز میں قطعات کی زینت بنایا ہے۔وہ کراچی کی موجودہ صورتِ حال اور اس کے در پردہ محرکات کو بڑی مہارت سے بیان کر گئے ہیں۔ان کا بیان شگفتہ انداز میں کراچی کے حکمرانوں اور میئر کراچی کے لیے کسی تازیانے سے کم نہیں ہے۔

ریاض مجید پاکستان کے حُصُول کے لیے دی جانے والی قربانیوں اور وطنِ عزیز کے حُصُول کے بنیادی نصب العین سے کسی طرح بے خبر نہیں رہے ہیں۔ان کا دلِ درد مند ایسی صورتِ حال میں خون کے آنسو روتا ہے ،جب وہ اس ناؤ کو بربادی کی طرف گامزن دیکھتے ہیں۔وہ ملکی سیاسی نظام کی آڑ میں کیے جانے والے بھیانک کاروبار کو دیکھ کر نااہل حکمرانوں کے گٹھ ،جوڑ اور کم زور سیاسی چالوں اور ذاتی مفادات اور اوچھے ہتھکنڈوں کو دیکھ کر ملکی سلامتی اور بقا کو خطرے میں پڑا دیکھتے ہیں، تو ایک ماہر تجزیہ کار کی طرح مستقبل کی ایسی بے وقعت صورتِ حال کا رونا روتے ہیں۔اُنھیں اس بات کا کامل یقین ہے کہ ہمارے رونے دھونے سے کام نہیں چلے گا جب تک سیاسی رہ نما اپنی مفاد پرستی کو ملکی مفاد پر قربان نہیں کریں گے۔وہ قومی اسمبلی کے فلور پر لائی جانے والے معمولی سی تبدیلی کو بھی خوش آئند قرار دیتے ہیں، حال آں کہ اُنھیں یقین ہے کہ عملی سطح پر وہ نتائج بر آمد نہیں ہو سکیں گے ،جو ملکی ترقّی اور سلامتی کے لیے ضروری ہیں۔ان کے یقین کی یہ کیفیت دیدنی ہے کہ آنے والے دور میں یقیناً ہمارا سیاسی نظام واضح طور پر تبدیل ہو جائے گا۔کیوں کہ ایسے فرسودہ نظام کے ساتھ دنیا میں اپنا وجود قائم نہیں رکھا جا سکتا۔

ریاض مجید نے ایسے انداز میں عوام کے جذبات کی بھی نمایندگی کی ہے اور ساتھ ہی پڑھے لکھے طبقے کے لیے بھی تسلی بخش انداز میں اپنا ایک خاص بیانیہ اپنایا ہے:

اسمبلی میں:

کریں باتیں سب احتیاط کے ساتھ
کوئی دُشنام کے نہ درپے ہو

اختلافی جو کوئی مسئلہ ہے
ادب اور احترام سے طے ہو! (۸)

یہ کون نہیں جانتا کہ پاکستانی جمہوریت جمہوری اقدار کے نام پر ایک کڑا وار اور دولت بٹورنے کا ایک موئثر آلہ کار ہے۔جمہوریت کی اصل روح پاکستانی جمہوریت سے الگ تھلگ ایک اور طرح کی شے ہے، جس سے پاکستانی جمہوری نظام کے دور کا بھی تعلق نہیں ہو سکتا۔ریاض مجید ایسے جمہوری نظام کی خرابیوں کو ہلکے پھلکے انداز میں بیان کرنے پر ہمیشہ قدرت رہے ہیں۔ان کا چوں کہ ملکی عملی سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی وہ ایسا سیاسی مزاج رکھتے ہیں، لہٰذا وہ سیاسی منظر نامے میں ہونے والی تبدیلیوں اور معرکوں کو جس طرح محسوس کرتے ہیں، اسی رنگ میں بے کم و کاست بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔وہ تو اس طبقے کی بھی نمایندگی کرتے ہیں، جنھیں ان میں پایا جانے والا حکمران چاہیے، جو ان کی زندگی کے بہت سے معاملات سے بغیر بتائے ہوئے باخبر ہو۔عوامی نمایندہ عوام کے مسائل سے بڑی حد تک آگاہ ہوتا ہے کیوں کہ وہ عوام میں سے ہوتا ہے، اس نے ان مسائل کو از خود بھی محسوس کر رکھا ہوتا ہے۔ہمارے عوامی نمائندگاں ایسے ہیں، جو منھ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوتے ہیں، تو وہ کیسے عوام کے مسائل سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔اُنھوں نے سیاست کو بہ طورِ پیشہ اور کاروبار اختیار کر رکھا ہوتا ہے۔ایسی صورت میں محض رٹی رٹائی تقریروں کے علاوہ سیاست کی مبادیات کا بھی اُنھیں معلوم نہیں ہوتا۔قوم ایسے رہ نماؤں پر ایک آدھ بار اگر اعتبار کر بھی لے تو دوسری بار ان کا اعتبار خود ہی خاک ہو جاتا ہے۔ہمارے فرسودہ جمہوری نظام میں بہت سی خرابیاں ہیں۔اب کس کس کا رونا رویا جائے۔ہم جب تک خود کو ٹھیک نہیں کریں گے ہمارا سیاسی منظر نامہ کبھی بھی درست نہیں ہو پائے گا۔ایک بات تو دیدنی ہے کہ عوام کا نظام خواص کی سوچ کے مطابق ہو ہی نہیں سکتا اور عوام کا تعلق زیادہ تر پست اور کمزور طبقے سے ہوتا ہے، اس لیے ان کے پاس اپنے ایسے ہی آقاؤں کے سوا کسی اور کو سامنے لانا ان کے لیے کسی وبالِ جان سے کم بھی نہیں ہوتا۔ایسی صورت میں نمایاں تبدیلی لانا اتنا آسان بھی نہیں۔ایسے میں ریاض مجید کی طرح ہر حساس فن کار اپنا رونا روتا رہتا ہے۔البتہ تاریخ ان کے الفاظ کو ضرور اپنے دامن میں جگہ دے رہی ہے، جب آنے والے وقتوں میں کوئی اس طرف رجوع کرے گا، تو اسے معلوم ہو گا کہ اس عہد کے سارے لوگ ہی بھیڑ بکریوں کا ریوڑ نہیں تھے بل کہ ان میں ایسے افراد بھی ہو گزرے ہیں، جنھوں نے ایسے فرسودہ نظام کے خلاف قلمی اور نظری جہاد کیا تھا۔تاریخ ایسے لوگوں کے بارے میں ضرور فیصلہ کن نتائج مُرتّب کرنے میں کامیاب رہے گی۔ریاض مجید کی درج بالا کیفیات کو شعری آئینے میں دیکھیے:

پاکستانی جمہوریت:

مجموعہِ اضداد یہ جمہوریت
ہے کیا ستم ایجاد یہ جمہوریت

ہو جاتی ہے ناراض نصیحت سے بھی
مادر پدر آزاد یہ جمہوریت! (۹)

ریاض مجید نے عمران خان کے تبدیلی کے نعرے کے بارے میں اور نعروں کی طرح تبصرہ کیا ہے۔ اُنھیں بھی لگتا تھا کہ یہ ایک نیا شہرہ ہے، جو بڑی محنت اور لگن سے پاکستان کو اس بڑے بحران سے نکالنے کا خواہاں ہے۔ اس لیے وہ اس کی تبدیلی کی خواہش کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لیکن وہ اس امر سے بھی بہ خوبی آگاہ ہیں کہ تبدیلی لانے کے لیے عمران خان کو بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج عمران خان کو اقتدار ملتے ہی حکمرانی کی رہ میں حائل مسائل کا ادراک ہوتا جارہا ہے اور وہ بھی دوسروں کی طرح مافیاز کے سامنے بے بس دکھائی دیتا ہے۔ ریاض مجید نے بھی عمران خان کی تبدیلی کی اس خواہش کو ضرور خیر مقدم کہا تھا۔ یہ وہی دور تھا جب عمران خان نے اپنی حکومت بنانے کے لیے طاہر القادری سے اِتّحاد قائم کر رکھا تھا اور علّامہ طاہر القادری سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ ان کے سانحۂ ماڈل ٹاؤن کے قاتلوں کو ضرور سزا دلوائیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج عمران خان کو اپنا وعدہ یاد نہیں رہا ہے۔ ایسے منظر نامے میں طاہر القادری کا مطالبہ قصاص پر مبنی تھا، جو آج تک پورا نہ ہو سکا۔

ریاض مجید نے ہمارے اس عہد کے سیاسی رہ نماؤں کی حالتِ زار کا بھی کامیابی سے نقشہ کھینچا ہے کہ اُنھیں جس کام کے لیے عوام نے منتخب کیا ہے وہی کام ان کے بس میں نہیں ہے۔ اپنے سیاسی منصب کی انجام دہی کے علاوہ وہ ہر طرح کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ وہ کوٹ کچہریوں کے خواہ مخواہ کے چکر کاٹنے سے باز نہیں آتے، دوسروں کے کاموں میں بے جا دخل اندازی ہماری آج کی سیاست کا ایک وطیرہ بن چکا ہے۔ ریاض مجید نے عوامی نمائندگان کی یومیہ کارگزاری کو شعری پیکر میں ڈھال کر ایک محفوظ تاریخ رقم کر دی ہے، جو کسی بھی وقت سیاسی نظام پر کیے جانے والے بے لاگ تبصرے ہوں گے، جن میں ہمیں سارا سیاسی منظر نامہ دکھائی دے گا اور اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار آنے والی نسل کو ہو گا۔ اس حوالے سے دیکھا جائے، تو ریاض مجید کے قطعات اپنی وقعت کو دوچند کر جاتے ہیں۔ ریاض مجید کے درج بالا بیانیے کا شعری اظہار ملاحظہ ہو:

پی ٹی آئی:

اِنتخابات ہوں قومی کہ ہوں وہ بلدیہ کے
جیتنے کے لیے درکار مشقّت ہے ابھی
چند سیٹوں سے تو تبدیلی نہیں آسکتی
اور کُچھ اور تگ و دو کی ضرورت ہے ابھی (۱۰)

ریاض مجید نے وقت پر ہونے والے الیکشن کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے اس کے لیے پیدا شدہ ساز گار فضا کا نوحہ بیان کیا ہے۔ چناں چہ وہ کہتے ہیں کہ وقت پر الیکشن کروائے جانے کی خواہش کی تکمیل کے لیے سیاسی پارٹیوں کو ذاتی طور پر امن

و امان کی بحالی کا فریضہ انجام دینا ہو تا ہے ،اس کے لیے سیاسی پارٹیوں میں سے کوئی بھی تیّار نہیں ہو تا۔ کراچی کے بلدیاتی نظام میں ہونے والی غیر اخلاقی سر گرموں اور اوچھے ہتھکنڈوں کے بارے میں بھی ریاض مجید نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے اس میں اِنتخابات کا درست انعقاد ایک طرح سے پاکستان کے دوسرے علاقوں کے درست اِنتخاب کے لیے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

پاکستان میں وفاقی بجٹ کی پیش کش ہو یا منی بجٹ پیش کیا جائے، یہ ایک ایسا اندازہ ہو تا ہے، جو عوام پر بے جا ٹیکسوں کا بوجھ بڑھاتا ہے۔ پاکستان میں سیاسی رہ نما آئی ایم ایف سے ملنے والے سودی قرض پر عوام کو میڈیا پر مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ جیسے ان کا ڈوبا ہوا قرض واپس مل گیا ہو۔ قوم کو مالی بے ضابطگیوں اور بڑھتے ہوئے کرپشن کے رجحانات سے نجات دلانے کی اشد ضرورت ہے ، جس طرف کوئی بھی خاطر خواہ توجُّہ نہیں دیتا۔ الٹا عوام کو ٹیکسوں کے بوجھ تلے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بد قسمتی سے موجودہ حکومت ہمیشہ قومی خزانے کو خالی پانے کا پانچ سال تک ڈھنڈورا پیٹتی رہتی ہے۔ اپنی تمام تر ناکامیوں کا ذمّے دار سابقہ حکومتوں کو قرار دینا پاکستان کی ہر آنے والی حکومت کا طرزِ عمل رہا ہے۔ ایسی صورت میں عوام کی گلو خلاصی کسی طور ممکن نہیں ہو سکے گی۔ یوں جمہوریت کا بوجھ عام انسان پر پڑتا ہے اور عوام فلاح و بہبود کے بجائے آئے دن نت نئی مشکلات کا شکار ہوئے جاتے ہیں:

جمہوریت کا بوجھ:

عجیب طاقتِ گفتار کے ہیں مالک یہ
دفاع کرتے ہیں ہر جرم کا قرینے سے
بنے ہوئے ہیں یہی بوجھ ایک مدت سے
مگر اُترتے نہیں قوم کے سفینے سے (۱۱)

کرپشن ہمارے ملک میں ایک ناسور کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ بڑے بڑے سیاسیوں سے لے کر افسرانِ بالا کیا عام ملازمین تک اس بری لت کو برائی نہیں سمجھتے۔ ایسے میں کرپشن سے پاک پاکستان ایک نئی دنیا کا خواب معلوم ہو تا ہے۔ کرپٹ افراد پر ہاتھ ڈالنے کے لیے، جس سیاسی طاقت اور حکومتی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارا ملک اس کا ابھی متعامل نہیں ہو سکتا، کیوں کہ یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ اس امر کی انجام دہی کے لیے ایک جنونی لیڈر کی ضرورت ہے، جو کسی قسم کی سیاسی مصلحت کا شکار نہ ہو اور بغیر کسی جانب داری کے کرپشن کے خلاف مہم چلائے۔ ایسے حالات میں پاکستان سے کرپشن کا خاتمہ ایک دیوانے کی بڑ معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ ہمارا سیاسی اور اشرافیائی نظام اس میں بُری طرح پھنسا ہوا ہے، ایسا کرنا ان کے لیے سانپ کے منھ کی چھچھوندر بننے کے مترادف ہو سکتا ہے۔ کرپشن کو مٹانے کے لیے ریاض مجید نے ایک طنز آمیز نسخہ بتایا ہے کہ وہ لوگ، جو کرپشن میں ملوث ہوں ان کے نام کرپٹ لوگوں کی فہرست سے نکالتے جانے سے کرپشن کا

خاتمہ ممکن ہو سکتا ہے۔اُنھوں نے حکمرانوں کی جانب داریوں پر ایسے طنز کے نشتر اور تازیانے برسائے ہیں،جو ہمارے ملک کی تاریخ میں ایک معمولی بات سمجھی جاتی ہے۔

ریاض مجید نے حکومت سندھ کی ہٹ دھرمی کو موضوع بناتے ہوئے ،کراچی کی عوام سے حقوق کی بات کی ہے۔سندھ کی حکومت کا یہ ہمیشہ سے وطیرہ رہا ہے کہ پاکستان کے سب سے بڑے اور دنیا کے ساتویں بڑے شہر کے حقوق کی جب بھی بات کی جاتی ہے،تو سندھ حکومت ان کے حقوق پر ڈاکا ڈال جاتی ہے۔یہ آج کی بات نہیں بل کہ گزشتہ کئی دہائیوں سے پی پی پی کی حکومت ایسا کرنا اپنا ایک طرح سے حق جانتی ہے۔

ریاض مجید نے پلی بار گین کی سیاسی کوششوں کو کرپشن کا ایک چور دروازہ قرار دیا ہے۔ایسے راستے سے اپنا کالا دھن آسانی سے سفید کیا جا سکتا ہے۔دوسرے معنوں میں اپنی کرپشن ثابت کروانے کی یہ ایک اہم سیاسی دلیل بھی ہو سکتی ہے۔پاکستان میں کیے جانے والے احتساب کی سنجیدہ کوشش صرف وہی کر سکے گا،جو کرپشن سے پاک پاکستان چاہتا ہو گا اور جس کا دامن کرپشن سے بالکل صاف ہو گا۔یہاں احتساب کا نظام دوسرے ملکوں کی طرح کیسے صاف وشفاف ہو سکتا ہے۔یہاں احتساب کرنے والے سیاسی انتقام کے طور پر احتساب کرتے ہیں۔پھر آنے والی حکومتوں میں انتقامی کارروائیوں سے ڈر کی بنا پر بھی صاف و شفاف احتساب ممکن نہیں ہو پاتا۔ایسی صورتِ حال کا ریاض مجید نے تسلسل سے رونا رویا ہے۔

اس ضمن میں ان کا قطعہ بہ طورِ مثال دیکھیے:

کرپشن کا ناسور:

صرف تبدیلیِ منشورِ چمن کا کیا ہے؟
خوں بھی ہے ہر رگ و ریشتہ کا بدلنے والا
پوری کشتی ہی شکستہ ہے گلہ کس سے کریں
کیا کہیں ” کون سا ہے تختہ بدلنے والا“؟ (۱۲)

ریاض مجید نے سیاسی جماعتوں کے ایک دوسرے سے اِتّحاد قائم کرنے اور الیکشن میں واضح برتری کے حُصول کی کوششوں کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے۔اُنھوں نے بڑے شیریں اور مضحکہ خیز انداز میں سیاسی رہ نماؤں کے اپنے اپنے مفادات کی خاطر ایک دوسرے کو گلے لگانے اور پاؤں پڑنے کی کیفیت کو بیان کیا ہے۔

دوسری طرف سسٹم کو بچانے کے بڑے نعرے لگانے والے سیاسی رہ نماؤں کے بارے میں ریاض مجید نے حقیقت واضح کی ہے۔انصاف کا قیام اوّلین شرط ہونی چاہیے تھی،جو سسٹم کو بچانے کے نام پر برباد کی جارہی ہے۔ایسی صورتِ حال میں ملکی مفادات پر ذاتی مفادات کی جنگ کو ترجیح دی جاتی ہے۔عوام کے بد حالی اور غربت کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو دیکھ کر عام

انسان کا دل خون کے آنسو روتا ہے، مگر دولت مند طبقہ آئے دن امیر سے امیر ہوتا جا رہا ہے۔ کسی کو بھی عوام کی بدحالی کی فکر نہیں ہے۔ ہر کوئی اپنی اپنی کرسی بچانے کے درپے ہے۔ دوسری جانب کراچی میں بگڑتے ہوئے نظام سے حکمرانوں کے لیے کچرا وبالِ جان بنتا جا رہا ہے۔ ریاض مجید نے بڑے موئثر انداز میں اس پر طنز کیا ہے کہ کراچی کے میئر کے سر پر کچرا سوار ہو چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کراچی کے عوام کے لیے کچرا کی صفائی واقعی ایک بہت بڑا مسئلہ بنتا جا رہا ہے اور آئے دن اس میں روز افزوں اضافے عمل میں آ رہے ہیں۔ کراچی کی ایسی فضا کے پروان چڑھنے کے ساتھ ہی، میڈیا پر یہ بات گرم ہونے لگی کہ سیاسی رہ نما انتخابی اصلاحات کے نفاذ کے درپے ہیں۔ الیکشن کمیشن کی کوششوں اور سیاسی رہ نماؤں کی کوششوں کے باوجود ایسی اصلاحات کا نفاذ ممکن نہیں ہو سکا، جن کی بدولت سیاسی نظام کی حقیقی بحالی کی رہ میں رکاوٹیں حائل نہ ہو سکیں۔ ریاض مجید جیسا حساس فن کار ایسی سیاسی صورتِ حال کو بڑی بے باکی سے بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے، جو ایک مکمل سیاسی تاریخ کا ترجمان بن کر سامنے آتا ہے۔ اس حوالے سے ریاض مجید کا قطعہ بہ طورِ مثال ملاحظہ کیجیے:

سسٹم یا انصاف:

کر دے تمام لوگوں کی ،جو اصل بے نقاب
انصاف کی اس آخری حد تک بھی جایا جائے
وہ شخص کر رہا ہے فضا عدل کی خراب
جو شخص چاہتا ہے کہ سسٹم بچایا جائے (۱۳)

ریاض مجید نے ایوان میں سیاسی رہ نماؤں کے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے کی کیفیت کو سندھ اسمبلی کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے، پورے ملکی نظامِ سیاست کی ناگفتہ بہ حالتِ زار کو بیان کیا ہے۔ ایسے پڑھے لکھے سیاسی رہ نما جب ایسے مقدس فلور پر ایک دوسرے کے دست و گریباں ہوں گے، تو قانون سازی اور قانون کی بالا دستی عوام کے لیے کیسے مثال بن سکے گی۔ ریاض مجید نے سیاسی رہ نماؤں کے ایک دوسرے پر لگائے جانے والے الزامات اور سیاسی چالوں کو بیان کرتے ہوئے ایک دوسرے کے لیے پائی جانے والی عدم برداشت کی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ وہ ایک ایسی تاریخ کے چشم دید گواہ کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں، جس کے سامنے ایک مکمل تاریخ اپنے تمام تر مراحل سے گزر رہی تھی۔

پاکستانی سیاست کا یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ وزرا کا رویّہ ہمیشہ حکومتی نااہلی کو چھپانے میں پیش پیش رہتا ہے۔ کوئی بھی وزیر اس حوالے سے شاہ پرستی کی بدترین مثال دکھائی دیتا ہے۔ وزیرِ اعظم یا پارٹی رہ نما، جو کُچھ بھی کہہ جائے، خواہ اس نے بے خبری کے عالم میں سیاسی بیان بازی ہی سے کیوں نہ کام لیا ہو، وزرا اس کا دفاع کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ یہ صرف ایک پارٹی کی بات نہیں بل کہ یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ یہ کہنا بالکل درست ہو گا کہ پاکستانی سیاست شاہ پرستی کی عمدہ مثال ہے، جس کا باوا آدم ہی نرالہ ہے۔

پاکستان کے سیاسی نظام سے پیدا شدہ حکمرانوں سے توقعات رکھنا خیالِ خام ہے، کیوں کہ ہمارے سیاسی نظام میں اس قدر خامیاں پائی جاتی ہیں کہ وزرا کا کسی قسم کا بھی بیان عوام کو محض دھوکا دہی کے سوا کچھ اور معلوم نہیں ہوتا۔ آج کی عوام اتنی باشعور ہو چکی ہے کہ وزرا کا بیان اُنھیں محض سیاسی بیانیہ ہے۔ ہمارا سیاسی نظام اپنے اندر اتنی خامیاں رکھتا ہے کہ ایک عام آدمی ان پر اعتبار کرنے کو تیّار نہیں ہے۔ مثال دیکھیے:

شاہ پرست:

ہیں بڑھ کے شاہ سے بھی خیر خواہ شاہ کے،،جو
حماقتوں پہ ہیں اُس کی ، ستائشیں کرتے
وہ ،جو بھی بولتا ہے جھوٹ روز و شب ،اس کی
حواری تھکتے نہیں ہیں وضاحتیں کرتے (۱۴)

سیاست کے میدان میں سیاسی فیصلوں کے تحفُّظات کے لیے بااختیار کمیشن قائم کیے جاتے ہیں، جو حتمی جانچ پڑتال کے بعد معاملات پر آئینی فیصلے صادر کرتے ہیں۔ پاکستان میں جب کسی معاملے کو جان بوجھ کر طوالت اور کھٹائی میں ڈالنا مقصود ہوتا ہے، تو ایک کمیشن بنایا جاتا ہے، جس کے بااختیار ہونے کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ اس کے بااختیار ہونے کی دلیل ہی اس کا سب سے بڑا اختیار ہوتی ہے۔ ایسا کرنے سے عوام کو بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کمیشن کا قیام ہی معاملات سے عوام کی توجُّہ ہٹانے کے مترادف ہے۔ معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ عوام کو اب حکمرانوں کے مقابلے میں عام لوگوں پر زیادہ یقین ہوتا جا رہا ہے۔

عوام کی بدحالی اپنی جگہ قائم ہے، لیکن حکمرانوں کے شاہی معاملات اور ملکی خزانے پر کی جانے والی شاہ خرچیاں آئے روز بڑھتی جا رہی ہیں۔ ایسا واضح طور پر دکھائی دے رہا ہے کہ پاکستان کی عوام اور از خود پاکستان کا کتنا درد حکمرانوں کے دلوں میں پایا جاتا ہے۔ اتنا تو پاکستان کو بیرونی طور پر خطرات لاحق نہیں ہیں جتنے وطنِ عزیز کے اندرونی ڈاکوؤں سے لاحق ہیں۔ بالکل ایسی ہی ملی جلی کیفیات کا اظہار ریاض مجید کے قطعات سے ہوتا ہے۔ دوسری جانب عوام کا یہ حال ہے کہ اُنھیں آزمائے ہوئے چہروں کو بار بار آزمانا پڑ رہا ہے۔ ہمارے سیاسی نظام کی بساط پر وہی چہرے ہیں، جو بار بار دکھائی دے رہے ہیں۔ ایسے حالات میں کس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟ ایک اور طرزِ عمل دیکھنے میں آ رہا ہے کہ سیاسی جماعتیں اپنی اپنی سکّہ شاہی کے لیے ہارس ٹریڈنگ میں بھی ملوث دکھائی دیتی ہے۔ ایسے میں وہ نااہل سیاسی رہ نما، جو ماضی میں ایک جماعت کے ساتھ اپنے ذاتی مفادات کی جنگ لڑتے رہے ہیں، وہ عوام کے مفادات کے نام پر دوسری جماعوں میں نئی بساط سجانے کے لیے تیّار بیٹھے ہوتے ہیں۔ گویا پاکستان کی قسمت دیکھیے عوام وہی ہے، لیکن سیاسی رہ نما رنگ بدل بدل کر عوام کو دھوکا دہی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ہمارے ملک کی بدنصیبی دیکھیے کہ یہاں ایک سیاسی جماعت اقتدار میں آتی ہے، جو پانچ سال لگا کر دوسری جماعت کو موقع دیتی ہے۔ اسی طرح

ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا جاتا ہے۔جمہوریت کی بقا کے نام پر ذاتی مفادات کی ظاہری صورت میں میثاقِ جمہوریت کا ڈراما رچایا جاتا ہے۔ تبدیلی کے بڑے نام پر عوام کئی بار آزمائی جاچکی ہے اور آزمایش کا یہ لامتناہی سلسلہ کبھی ناتمام ہونے کا نام نہیں لے رہا۔یہ وہ حقائق ہیں، جن سے ہم سب اچھّی طرح باخبر ہیں، لیکن پھر بھی شاہ کے نام پر ہر اِنتخاب میں بکنے کے لیے ایک سے ایک آگے آتے ہیں۔ریاض مجید نے اپنے قطعات میں زمانی یومیہ اعتبار سے اس منظر نامے کو بھرپور انداز میں سجا کر ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے۔اس حوالے سے وہ یقیناداد کے مستحق ہیں۔سیاسی حوالے سے قطعہ بہ طورِ مثال ملاحظہ ہو:

ایک سیاسی لیڈر کے نام!:

آج ،جو تیرا ہے اس طرح کا اندازِحیات
کب رہا تھا کبھی ماضی کے شہنشاہوں کا ؟
کُچھ توجُّہ تری اس سمت بھی ہو،میڈیا نے
گرم کر رکھا ہے بازار جن افواہوں کا (۱۵)

پاکستانیت، فوج اور مختلف ادارے:

ریاض مجید نے قطعات پر مبنی دونوں مجموعوں ''خبر اخبار'' اور ''ذکر اذکار''میں زمانی اعتبار سے یومیہ بنیادوں پر وقوع پذیر ہونے والے معاملات اور واقعات کو قطعات کے وسیع کینوس میں پیش کیا ہے۔اُنھوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے متعلق قطعات لکھے ہیں،جو ان کے وسیع مطالعے ،حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر اور ممکنہ شعری ریاض کی عمدہ دلیل ہیں۔ریاض مجید کو وطنِ عزیز سے بہت پیار ہے،وہ اس کے چپے چپے سے اظہارِ الفت کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ پاکستان کے مختلف اداروں سے پاکستانیت کی طرح مَحبّت کرتے ہیں۔یہی ان کی وطن دوستی کی بین دلیل ہے۔وہ پاکستان سے دلی لگاؤ رکھتے ہیں،اس لیے پاکستان کا ہر ادارہ اُنھیں وطن کی طرح عزیز ہے۔وہ پاکستان کی ترقّی کے لیے قومی اداروں کو فعال دیکھنے کے خواہش مند ہیں،مگر جب بھی ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ادارے قومی مفاد کے بجائے ذاتی مفاد کے لیے سرگرم ہیں،تو اُنھیں ازحد افسوس ہوتا ہے۔وہ اداروں کو بہر طور مضبوط و توانا دیکھنا چاہتے ہیں۔پاکستان کی سالمیت و ترقّی اسی بات میں مضمر ہے کہ وطن کی مَحبّت کو سب چیزوں پر مقدم رکھا جائے۔ہمارا ملک ہے تو ہم اس کی وجہ سے دنیا میں اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ملک پر آنچ آنا دراصل اپنے آپ کو بے وجود کرنے کے مترادف ہے، لہٰذا ہماری کامیابی اور شناخت کا راستہ وطن کے مرغزار سے ہو کر گزرتا ہے۔ریاض مجید بس ہمیں یہی ایک نکتہ سمجھانا چاہتے ہیں۔

پاکستان کی سلامتی اور سالمیت کے لیے صرف یہاں رہنے والے پاکستانی ہی دعائیں نہیں کرتے بل کہ غیر ملکی پاکستانی بھی اس کی دن دگنی رات چگنی ترقّی کی دعائیں کرتے ہیں۔ان کے اندر پاکستانیت اور وطن دوستی کا جذبہ ہم سے کہیں زیادہ پایا

جاتا ہے۔ یہ محض کہنے کی باتیں نہیں ہیں وطن دوستی کا جذبہ انسان کی رگ و پے میں اس وقت دکھائی دیتا ہے، جب وہ عملی سطح پر ملکی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیتا ہے۔ ریاض مجید نے ایسی ہی نفسیاتی کیفیت کو اپنے وطن دوستی پر مبنی قطعات میں پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں ریاض مجید کا قطعہ بہ طورِ مثال ملاحظہ کیجیے:

قومی اداروں کی سست روی:

مسئلہ کیسا ہے!،جو حل نہیں ہونے پاتا
دوزخ احساس کا جل تھل نہیں ہونے پاتا
کہیں رستے ہی میں ہو جاتے ہیں غائب کردار
کوئی بھی قصّہ مکمل نہیں ہونے پا تا (۱۶)

ریاض مجید نے وطن سے والہانہ محبّت کے جابجا ترانے گائے ہیں۔ وہ قومی تہوارات کے ساتھ ساتھ قومی ایّام پر بھی وطن دوستی اور ملّی لگن کے گیت گاتے ہیں۔ چناں چہ یومِ آزادی ہو یا، یومِ پاکستان، یومِ دفاع ہو یا یومِ تکبیر وغیرہ، وہ بڑے موثر اور بھرپور انداز میں وطن کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ یہی ان کی ملّی شناخت بھی ہے اور مادرِ وطن سے پیار کا عملی اظہار بھی۔ وہ ہر حوالے سے خود کو وطن کے لیے پیش پیش رکھتے ہیں۔

ریاض مجید افواجِ پاکستان کو بھی خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک پاکستانی فوج ملکی سالمیت کی سب سے بڑی دلیل اور ضامن ہے۔ وہ پاکستانی عوام کو بھی صدقِ دل سے چاہتے ہیں۔ اُنھیں پاکستانی دنیا کے کسی بھی کونے میں ضرور وطن کی خدمت میں مصروفِ کار دکھائی دیتے ہیں۔ ریاض مجید کا دل درد منداس وقت خون کے آنسو رونے پر مجبور ہوتا ہے، جب پاکستان میں اُنھیں پاکستانیت کے آثار ذاتی مفادات پر حاوی دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے حالات میں وہ اپنے دل کی بات کہے بغیر کسے رہ پاتے ہیں۔ وہ سیاسیوں کی طرح کھوکھلے نعرے بازی سے گریز پائی اختیار کرتے ہیں، لیکن ان کا دلِ درد مند ضرورت خون آشام ہوتا ہے۔ اسی ضمن میں شعری اظہار دیکھیے:

۲۳ر مارچ:

سینچنا ہے اپنے خوں سے ارضِ پاکستان کو
خون دے کے اس کے صحراؤں کو کرنا ہے چمن
آیئے مل کر بڑھائیں اس کی عزت،اس کی شان
یہ وطن ، میرا وطن ، تیرا وطن،سب کا وطن (۱۷)

ریاض مجید نے آرمی چیف کے بیان کو سراہتے ہوئے پاک ایران تعلقات کو بیان کیا ہے۔ وہ برادر ممالک کے ساتھ پاکستان کے مثالی تعلقات کو کھلے دل سے بیان کرتے ہیں۔ وہ پاکستانی ترقّی کے لیے حائل ہونے والی سازشوں کو بیان کرتے ہیں کہ یہ سارا منظر نامہ سی پیک کی ناکامی کے لیے تیّار کیا جارہا ہے۔ کیوں کہ بھارت کو کسی طرح بھی پاکستان کی ترقّی ہضم نہیں ہو سکتی۔ کون نہیں جانتا کہ پاکستان میں ہونے والی دہشت گردی کے درپردہ کس کا ہاتھ ہے؟ پاکستان کا دفاع ناقابلِ تسخیر ہے اس لیے بھارت کو یہ جان لینا چاہیے کہ ایسے اوچھے ہتھکنڈوں سے ہماری ترقّی کی راہیں روکی نہیں جاسکتی۔ اس میں کُچھ کلام نہیں کہ پاکستان دشمن کے کسی بھی قسم کے جارحانہ عزائم کا منھ توڑ جواب دینے کی صلاحیّت رکھتا ہے:

پاکستانی دفاع زندہ باد:

ملکی دفاع کے لیے میزائلوں سے لیس
افواج کے سپرد ہوئی ہے عظیم ڈھال
دشمن بُری نظر سے نہ دیکھے اب اس طرف
آئے نہ اس کے دل میں برا اب کوئی خیال (۱۸)

ریاض مجید ملکی وحدت اور اتّحادو یکجہتی کی سب سے بڑی ضمانت قومی زُبان کو قررار دیتے ہیں۔ اُنھیں یقین ہے کہ پاکستان کے اِتّحاد کو اگر کوئی شے پارہ پارہ ہونے سے بچاسکتی ہے، تو وہ اُردُو زُبان ہی ہے۔ قومیں ہمیشہ اپنی قومی زُبان کی شناخت کی بناپر ترقّی کرتی ہیں، غیر دیس کی زُبانیں زندہ قوموں کے لیے غلامی کے طوق کی طرح ہوتی ہیں۔ ریاض مجید نے اس حقیقت کو مختلف اداروں کے سربراہان کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

ریاض مجید نے یہ قطعات اس دور میں رقم کیے ہیں، جب ملک میں افراتفری اور دہشت گردی کا بازار گرم تھا۔ بیرونی طاقتیں، جن کا ماقبل ذکر ہو چکا ہے، پاکستان میں کساد بازاری کو پروان چڑھانے کے درپے تھیں، لیکن وقت نے ثابت کیا کہ پاکستان کوئی ایسی مملکت نہیں ہے، جو نامساعد حالات میں جینے کا ہنر نہیں رکھتی۔ ایسے حالات میں جہاں پاکستان کی سالمیت کو خطرہ لاحق تھا اور افواجِ پاکستان سرحدوں پر سینہ سپر دشمن کا منھ توڑ، جواب دینے میں مصروفِ عمل تھیں، ہمارے ادارے وحدت کے بجائے مفاد پرستی کی جنگ میں مصروفِ عمل تھے۔

سرکاری اداروں میں ہونے والی اقربا پروری کی فضا کو دیکھ کر اور ہمارے سیاسی نظام کی ابتر حالتِ زار پر آرمی چیف کو قوم کو پیغام دینا پڑا کہ ملکی سالمیت اور بقا کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندرونی اِتّحاد کو قائم رکھا جائے، تاکہ کوئی بھی بیرونی طاقت ہمیں اندرونی طور پر کم زور نہ کر سکے۔ بیرونی سرحدوں پر ہمارے فوجی اپنی جانوں کو وطن کی سرُبلندی کی خاطر داؤ پر

لگائے ہوئے ہیں۔ اس بیان سے اس دور کی سیاسی حالت اور ملکی دفاع کی کیفیت کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔ درج بالا کیفیات کی بابت ریاض مجید کا قطعہ دیکھیے:

ہمارے سرکاری شعبے:

ہیں اقربا نوازیوں سے شعبے محوِ کار
کُچھ ان کو اہلیت کی ضرورت نہیں رہی
کرتے ہیں کام اہلِ خوشامد کے ساتھ یہ
مردانِ کار کی اُنھیں حاجت نہیں رہی (۱۹)

ریاض مجید نے یومِ آزادیِ پاکستان پر ملک کے لیے دعائیہ پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ملکی بقا اور سالمیت کے لیے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار بھی کیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ دور پاکستان میں دہشت گردی کے خلاف لڑنے اور اس کی قمر توڑنے سے متعلق تھا، لہٰذا ہر کسی کی نظریں اسی امر پر مرتکز تھیں کہ اب کیا ہونے والا ہے، چناں چہ ریاض مجید نے بھی ملکی دہشت گردی کے خلاف قلمی جہاد جاری رکھا اور، جو کُچھ بھی پاکستان کی سرزمین پر ہو رہا تھا اس کو قلم کے زور سے عوام کے سامنے لاتے رہے۔ ایسا کرتے ہوئے اُنھوں نے ایسی تاریخ مُرتّب کی ہے، جو اپنی ذات اور فن دونوں کے اعتبار سے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

ریاض مجید نے ایک طرف ڈرون حملوں کی مُذمّت کی ہے، تو دوسری طرف پاکستان کے سیاسی زُعما کی جانب داریوں اور شاہ پسندیوں کا نوحہ بھی کیا ہے۔ اسمبلی کے مقدس فلور سے رہ نماؤں کے بھوٹ کے طومار باندھنے کی وہ نہ صرف مُذمّت کرتے ہیں، بل کہ یہاں تک کہ گزرتے ہیں کہ اگر ایسی صورتِ حال قائم رہی تو ان پر کون اعتبار کرے گا اور وہ کس منھ سے پاکستانیت کا پرچار کر پائیں گے۔ ایسے لوگوں کے لیے ریاض مجید نے عجیب لوگوں کی ترکیب استعمال کرتے ہوئے ان پر ایک طرح سے طنز کے قاری نشتر برسائے ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو:

ڈرون حملہ:

کرم ایجنسی میں حملہ ہوا ،جو امریکی
ہلاکتیں ہوئیں تین اس میں ، اور کئی زخمی
نئی ٹرمپ نے کیسی بنائی پالیسی؟
اَنا ہماری بھی ساتھ اس کے کل ہوئی زخمی (۲۰)

یہ بھی ایک عجیب و حیرت انگیز بات ہے کہ ہمارے سیاسی قائدین ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوئے تھے اور جرنل کا بیان عوام کے جذبات کا ترجمان تھا۔ ہمارے سیاسی نظام پر اس سے کہیں زیادہ طنز اور کسی طور پر ممکن نہیں تھا۔ ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والے اسمبلی کے فلورر پر ایک دوسرے کے دست و گریباں ہو رہے ہوں ،تو ایسے حالات میں بیرونی دراندازی اور غیر ملکی ریشہ دوانیوں کا کسی نہ کسی کو تو مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں عوام سیاسی قائدین کی جانب دیکھتے ہیں، لیکن یہاں کا منظر نامہ معاذ اللہ بدلا ہوا تھا۔

جرنل راحیل نے بیرونی طاقتوں کو دو ٹوک پیغام دیا کہ ایک زندہ قوم بیرونی مداخلت کسی طور پر قبول نہیں کر سکتی ،لہٰذا اگر کسی نے پاکستان کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھا تو اس کو اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا۔ یہ وہ دور تھا جب بیرونی دراندازی ضرورت سے زیادہ تھی اور را کے ایجنٹ افغانستان اور ایران کے راستے پاکستان میں داخل ہو رہے تھے ،جس سے ہماری فوج کو بہت زیادہ نقصان ہو رہا تھا۔ بھارتی ایجنٹ کلبھوشن اسی دور کی ایک یادگار کے طور پر آج بھی پاکستان کے پاس بہ طورِ یادگار موجود ہے۔

جنرل کا بیان، عوام کا ترجمان:

آزاد ممالک میں در اندازی ہے اک جرم
اس جرم کی لفظوں سے تلافی نہیں کافی
پامال، جو سرحد کا تقدس ہوا، اس پر
یہ لفظی مذمّت نہیں کافی، نہیں کافی! (۲۱)

بین الاقوامیت:

ریاض مجید نے متذکرہ بالا قطعات کے زمانۂ تحریر کے بارے میں دونوں تخلیقات کے آخر میں تاریخ وار موضوعات کو مُرتّب کر رکھا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ریاض مجید نے ان قطعات میں پاکستان کے مذکورہ عہد کی مکمل تاریخ رقم کی ہے۔ ریاض مجید نے شاید ہی کوئی ایسا موضوع چھوڑا ہو ،جو اس وقت تاریخ کے پردے پر نمودار ہوا ہو اور اُنھوں نے اسے کمال بے لاگ پن کے ذریعے سے نذرِ قطعات نہ کیا ہو۔ اس کمالِ فن پر وہ داد پا چکے ہیں۔

ریاض مجید نے جن موضوعات پر تسلسل سے لکھا ہے ان میں بین الاقومی معاملات بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ اُنھوں نے کمال ہنروری سے اس عہد کے جُملہ معاملات کو بساط بھر شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ اُنھوں نے اپنے زمانۂ قطعہ نگاری میں رونما ہونے والے عالمی واقعات اور دیگر معاملات کو بھی مقدور بھر شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ اُنھوں نے پاکستان کے روشن

مستقبل کی رہ سی پیک کے کامیاب منصوبے میں دیکھی ہے۔وہ اس منصوبے کو پاکستان کے لیے گیم چینجر کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔اُنھوں نے برملا انداز میں پاکستان کے روشن مستقبل کی خوش خبری دی ہے۔

ریاض مجید نے امریکہ کی پالیسیوں اور دنیا پر اجارہ داری پر ہمیشہ مُذمّت کی ہے۔ چھوٹے ممالک کے حقوق پر ڈاکا زنی امریکی پالیسیوں میں شامل رہی ہے۔وہ جب کسی ملک پر چڑھ دوڑنے کا ارادہ کرتا ہے،تو اس پر دہشت گردی کا الزام لگاتا ہے۔اس کی کوئی ایک مثال نہیں بل کہ لاکھوں مثالیں دی جاسکتی ہیں۔وہ کبھی داعش کے نام پر مسلم ممالک پر الزام تراشیاں کرتا ہے اور ان کی ملکی سالمیت کو خطرے میں ڈالتا ہے اور کبھی دہشت گردی کے درپردہ محرکات کے نام پر اسلام دشمن پالیسیوں پر عمل درآمد کرتا ہے۔

ریاض مجید نے مغربی ممالک کے اِنتخابات کی کیفیت کو دل پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔اُنھوں میں فرانس میں ہونے والے مثالی اِنتخابات کو سراہا ہے۔ہمارے ہاں اِنتخابات کی ہار جیت کو خوش اُسلوبی سے ہرگز تسلیم نہیں کیا جاتا۔ہارنے والے ہمیشہ جیتنے والوں پر الیکشن ریگنگ اور دھاندلی کے الزمات لگاتے آئے ہیں،اب تو اِنتخاب کو الیکشن کے بجاے سلیکشن کا نام دینا ایک عام رواج بن چکا ہے۔پاکستان کے سیاسی نظام کو ایسے اوچھے ہتھکنڈوں نے پوری دنیا میں ایک مذاق بنا کر رکھ دیا ہے۔ریاض مجید نے بادی النظر میں پاکستان کے نظامِ اِنتخاب کی خامیوں اور سیاسی نمائندوں کے منفی رویّوں کی کھل کر مُذمّت کی ہے۔اسی لیے وہ فرانس کے اِنتخابات اور ہارنے والی پارٹی کو دوسروں کے مینڈیٹ کے احترام کی بنا پر قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔دوسری طرف اُنھوں نے پاکستان کے سیاسی نظام پر طنز کے نشتر برسائے ہیں۔ مثال ملاحظہ ہو:

سی پیک روشن مستقبل:

راہِ ترقّی پر ہے اب گامزن یہ خطّہ
دنیا میں چاروں جانب خوشخبری یہ اُڑی ہے
کہنے میں ہو گا ثابت سی پیک گیم چینجر
فردا کی ہر ترقّی اب اس سے آ جڑی ہے (۲۲)

ریاض مجید نے ایران کی دھمکی کے مضمرات کو بھانپ لیا تھا اس لیے اس کے منفی اثرات پر وہ سب کو خبر دار کر رہے ہیں۔اُنھیں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ ایران کی دھمکیاں خِطّے میں امن وامان کے لیے نہ صرف خطرناک ہیں بل کہ وہ اس حقیقت کو بھی اچھّی طرح جانتے تھے کہ ایران کے کسی بھی ملک کے ساتھ برے حالات اور ہر قسم کی جنگ کی صورت میں اس کے ساتھ پڑوسی ممالک کا امن اور کاروبارِ زندگی بھی بری طرح تباہ ہو سکتا ہے۔علاوہ ازیں ہمارے ملک کا معاشی نظام بھی بری طرح متاثر ہو سکتا ہے۔اس لیے ریاض مجید نے اربابِ سیاست کو خبر دار کیا ہے کہ اُنھیں اتنے سنگین مسئلے پر خاموشی اختیار

نہیں کرنی چاہیے۔ایسا کرنا ریاض مجید کی سیاسی بصیرت افرازی کی دلیل ہے کہ وہ کس طرح ملکی سیاسی حالات کے ساتھ بین سیاسی نظام سے بھی اچھّی طرح باخبر ہیں۔

پاکستان کی پڑوسی ملک چین کے ساتھ ہمیشہ دیرینہ دوستی رہی ہے۔چین نے ہر آڑے وقت میں پاکستان کا ساتھ دیا ہے۔ایسے حالات میں بھی جب دنیا نے پاکستان کو بالکل تنہا چھوڑ دیا تھا،چین پاکستان کے شانہ بہ شانہ کھڑا رہا۔چین کی اس دیرینہ دوستی میں پاکستان نے بھی ہمیشہ دوستی کا ہاتھ بڑھائے رکھا۔چین کے ساتھ پاکستان نے بہت سے معاہدوں پر کام جاری رکھا ہوا ہے۔اب تو چین کے ساتھ مل کر پاکستان فوجی مشکیں بھی کر رہا ہے۔چین کے ساتھ جب سی پیک کا معاہدہ ہوا، تو بعض ملک دشمن اور سیاسی دشمنی رکھنے والے حضرات نے اسے پاکستانی سالمیت پر بھی ایک طرح سے حملہ قرار دیا۔ان کو تاہ بینوں کو پاکستان کے مستقبل سے کوئی سروکار نہیں تھا اس لیے یہ شوشے بازی سے کام لے رہے تھے۔ریاض مجید کی نگاۂ دوربیں یہ بھانپ چکی تھی کہ چین کے ساتھ ہونے والے یہ معاہدے پاکستان کے روشن مستقبل کی ضمانت ثابت ہوں گے۔اُنھوں نے پاکستانی عوام کو باور کروایا کہ چین کے ساتھ ہونے والے پاکستانی معاہدے نہ صرف پاکستان کے بل کہ پورے خِطّے کے مفاد میں ہیں اور آنے والا وقت اس بات کو ثابت کرے گا۔اُنھوں نے یہاں تک پاکستانی حکمرانوں کو باور کروایا ہے کہ امریکہ ان کو وعدوں پر ہی ٹرخاتا رہے گا، ان سے نہ مالی مدد مل سکتی ہے اور نہ ہی ان کی دوستی پاکستان اور خِطّے کے مفاد میں ہو سکتی ہے۔ریاض مجید کی بصیرت افروزی کی دلیل ہے کہ امریکہ کے ساتھ ہونے والے کئی ایک معاہدے اور کُچھ اور کر کے دکھانے کی اُمّید کے سوا کُچھ بھی نہیں ہو سکتی۔

ریاض مجید نے عراق کی جنگ اور منفی نتائج کو عالمی سطح پر اِتّحادیوں کی غلطی قرار دیا ہے۔اُنھوں نے ٹونی بلیئر کے بیان کو اپنی توثیق کے لیے استعمال کرتے ہوئے،اس کی غلطی کا اعتراف کروایا ہے۔ایسی اِتّحادی ریشہ دوانیوں نے کئی ممالک کا مستقبل داؤ پر لگا دیا ہے۔ایسے سیاسی بیان قوموں کے خمیازے کا ازالہ نہیں کر سکتے۔عالمی سطح پر کیے جانے والے ایسے کئی ایک اِتّحاد دوسرے ممالک کی تباہی و بربادی کی وجہ بن جاتے ہیں۔یہ ایک الگ بات ہے کہ بعد میں اِتّحادیوں کو اپنی غلطیوں کا ادراک ہو بھی جاتا ہے، لیکن اب پچھتائے کیا والی بات کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔اس ضمن میں شعری مثال ملاحظہ کیجیے:

پاک چین معاہدے:

خدا کرے کہ مکمل ہوں خیر و خوبی سے
معاہدے ،جو ہمارے ہوئے ہیں چین کے ساتھ
نتیجہ آتے زمانے میں ان کا نکلے گا
ملے ہیں اپنے ،جو قسمت کے تارے چین کے ساتھ (۲۳)

آئی ایم ایف کی طرف سے جن ممالک کو قرضے دیے جاتے ہیں، اس کے بدلے میں ان کی آزادی رہن رکھی جاتی ہے۔ چناں چہ ایسے ممالک آئی ایم ایف کی تجویز کردہ پابندیوں سے ہٹ کر کوئی بھی فیصلہ صادر کرنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ یہ ادارہ ایک طرح سے قرض دے کر پوری دنیا کے کم زور ممالک پر اپنا دھونس قائم رکھتا ہے۔ بد قسمتی سے پاکستان بھی ان ممالک کی فہرست میں چند اُوپر کے ممالک میں شامل ہے، جو آئی ایم ایف کے سودی نظام میں بری طرح جکڑا ہوا ہے۔ اب آئی ایم ایف پاکستان کی موجودہ حکومت کو عوام پر بے جا ٹیکس لگانے پر مجبور کر رہا ہے، لہٰذا کبھی بجلی کی قیمت میں من مانے ٹیکس عائد کیے جاتے ہیں اور کبھی گیس کی قیمتوں میں اضافے درکار ہوتے ہیں۔ ایسے میں پٹرول اور ڈیزل کی قیمتیں عالمی منڈی میں کم ہونے کے باوجود عوام کے لیے بڑھائی جاتی ہیں، تو کبھی کچھ اور بڑھ رہا ہوتا ہے۔ ریاض مجید نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ، جو قرض دیتے ہیں دوسروں کو بااختیار نہیں رکھتے کہ وہ اپنے اچھّے برے کا فیصلہ کر سکیں۔

ریاض مجید نے یورپی طاقتوں کے دنیا میں مسلم طبقے کے خلاف کیے جانے سخت فیصلوں کے بارے میں لکھا ہے کہ پوری دنیا پر یہ اجارہ دار طبقہ مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو چکا ہے، لہٰذا سوچی سمجھی چال کے تحت مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دیا جارہا ہے، جس سے ان کا جینا دوبھر ہوتا جارہا ہے اور ان کی آزادی صرف گھروں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔

یورپی سامراج کی سفاک پالیسیوں اور عرب کے ساتھ اُستوار ہونے والے نئے روابط کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ یورپ میں تو مسلمانوں کی حالت دگر گوں ہے، لیکن امریکہ اپنی منفی چالوں سے عرب مسلم ممالک میں بھی اپنا اثر ورسوخ بڑھانے پر کمر بستہ ہے۔ گویا آنے والے وقتوں میں دنیا کا مکمل سیاسی منظر نامہ بدلنے جارہا ہے۔ ریاض مجید نے اس خطرے کی گھنٹی اسی وقت بجادی تھی۔ اُنھوں نے امریکہ کے سیاسی منظر نامے پر مکمل نظر رکھی ہوئی تھی۔ امریکہ کے پاکستان کے ساتھ افغانستان میں دہشت گردی کے خاتمے کے لیے ایک پارٹنر کی سی تھی، لیکن امریکہ کی یہ شاطرانہ چال دیکھیے کہ وہ اپنے حریفوں کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ پاکستان نے اس امریکی اِتّحاد میں اپنی قیمتی جانوں کا نذرانہ پیش کیا اور مالی نقصان تو ناقابلِ تلافی ہوا۔ اس کے باوجود امریکہ پاکستان کو تشکیک بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ آخر کار پاکستان کو امریکہ کی ڈومور کی پالیسی کا مکمل انکار کرنا پڑا۔ کیوں کہ یہی ایک رہ تھی جہاں سے پاکستان اپنے آپ کو مزید اس بربادی سے بچا سکتا تھا۔ چناں چہ امریکہ کو پہلی بار اس انکار سے عزیمت اٹھانی پڑی اور رپاکستان کی بھی گلو خلاصی ہوئی۔ درج بالا بین اُمُور میں ریاض مجید کا اظہاریہ دیدنی ہے:

آئی ایم ایف:

دباؤ ہے یہ حکومت پہ آئی ایم ایف کا
کہ قیمت اور بھی بجلی کی کچھ بڑھائی جائے

"جو قرض دیتے ہیں ،کرتے ہیں فیصلے بھی وہی" (۲۴)
یہ تلخ بات بھی لوگوں کو اب بتائی جائے

جیسا کہ ماہ قبل یہ بیان ہو چکا ہے کہ چین کے ساتھ پاکستان کے برادرانہ اور دوستانہ مراسم قائم ہیں اور یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے، پاکستان اور چین کی دوستی کی دنیا مثال دیتی ہے۔ ہرآڑے وقت میں چین نے پاکستان کا ساتھ دیا ، لہٰذا ایسے حالات میں جب امریکی دباؤ پاکستان کے خلاف پوری دنیا میں خدشات پیدا کر رہا تھا۔ چین نے پاکستان کی حمایت کرتے ہوئے ایک نئی مثال قائم کر دی۔ ایسے حالات میں اس جانب دار طبقے کے منھ بھی بند ہو گئے، جو پاکستانی ترقّی کو چین سے معاہدوں کے حوالے سے تشکیک بھر نظروں سے دیکھتا تھا۔

ایسے نامساعد حالات میں مہاجرین کی واپسی پاکستان کے داخلی امن و امان کے لیے انتہائی ناگزیر تھی۔ بیرونی طاقتیں اس پر بھی اپنی سیاست چمکانے کی در پے تھیں، لیکن آرمی چیف کے بیان نے اس حوالے سے بر وقت سب کے منھ بند کر دیے کے مہاجرین کی واپسی پاکستان میں دیر پا امن قائم کرنے کے لیے ایک اہم پیش رفت ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ کہ دہشت گردی کی جنگ میں پاکستان نے سے زیادہ نقصان اٹھایا ہے، جس کی قیمت ہماری نسلیں چکا رہی ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر بھی مسلمان ممالک نے سب سے زیادہ نقصان اٹھایا ہے۔ اِنھی دنوں کی بات ہے کہ شام ہونے والے ظلم و ستم انسانیت کے دل خراش مناظر بیان کر رہے تھے۔ امتِ مسلمہ شام کی حالت زار پر ماسوائے ماتم کے اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ مسلمانوں کے دنیا میں مجموعی طور پر حالات خراب ہیں اوراس خرابی کی مکمل ذمے داری کسی اور پر نہیں بل کہ ہم پر عائد ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی حقیقت کھو دی ہے، تب ہی دنیا میں ہم دوسروں کے سامنے تماشا بنے ہوئے ہیں۔ ریاض مجید نے ان سب خطرات کو بہ خوبی بھانپ لیا تھا۔ لہٰذا اپنے قطعات میں درج بالا جُملہ معاملات پر رائے زنی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس خصوص میں ریاض مجید کا قطعہ دیکھیے:

چین زندہ باد:

تھی وہی بات اس کے ہونٹوں پر
ہم نے جو بات اس سے چاہی ہے
واہ کیسا بیان اس نے دیا!
چین نے دوستی نباہی ہے! (۲۵)

دنیا کو تماشا بنانے والا امریکہ صدر ٹرمپ کی تقریبِ صدارت میں دنیا کے سامنے ڈراما بنا ہوا تھا۔ وائٹ ہاؤس میں اس کی تقریبِ حلف برداری میں تمام امریکی ریاستوں میں دھاندلی کے خلاف امریکی مظاہرین سڑکوں پر تھے۔ یہ امریکہ کی تاریخ

میں پہلی بار ہوا تھا، جس پر ساری دنیا حیران تھی کہ امریکہ جسے آزادیِ فکر کے اظہار پر یقین رکھنے والے ملک کے لیے بھی ایسی صورتِ حال ہو سکتی ہے۔ ریاض مجید نے بھی اس کیفیت کا اظہار اپنے قطعات میں کیا ہے۔

ایشیائی ممالک اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے، جب تک وہ ایک دوسرے سے مل کر ترقّی کے لیے کوشاں نہیں ہوں گے۔ اس صورتِ حال کا ادراک کرتے ہوئے اقتصادی اِتّحاد کے لیے ایک ہونے کی کوشش کی اور اِتّحادی ممالک کے درمیان معاہدے ہوئے، جس سے ترقّی پذیر ممالک میں خوش حالی کے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اس اقتصادی ترقّی کی رہ میں حائل رکاوٹوں کو کس طرح دور رکھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے کئی معاہدے اس سے قبل بھی دنیا کے مختلف ممالک کے درمیان ہوتے آئے ہیں۔ اصل کام ان معاہدوں پر حقیقی معنوں میں عمل درآمد کرنا اور اس کے فوائد کا حُصُول ہے، جس کے لیے نیک تمناوں کا ریاض مجید نے اظہار کر رکھا ہے۔

پاکستان میں سیاست کا منظر نامہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا آیا ہے۔ وہی حکومت، جو اپنے ذاتی مفادات کے لیے کسی کی بھی حمایت کر سکتی ہے۔ بہ وقتِ ضرورت وہی سیاسی پارٹی اپنی ہم دردی اں بدلنے میں دیر نہیں لگاتی۔ ریاض مجید نے پی پی پی کی حقانی کے بارے میں پہلی رائے اور بعد میں اس کی غداری کے بارے میں دی جانے والی پالیسی کو بیان کرتے ہوئے عوام کے لیے یہ سوالیہ نشان چھوڑا ہے کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ اب کس کو غدار کہا جائے؟ یہ دراصل ہمارے سیاسی نظام کی ایک بہت بڑی خامی کی طرف اشارہ ہے کہ ہماری سیاسی جماعتیں اپنے مفادات کے لیے کس کس طرح دوسروں کو استعمال کر لیتی ہیں اور وقت پڑنے پر کس طرح گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتی ہیں۔ یہ بہ ذاتِ خود سوچنے والی بات ہے۔ ایک قطعہ دیکھیے:

اقتصادی اِتّحاد:

ہو رہا ہے ان دنوں ،جو دوسرے ملکوں کے ساتھ
ہو مبارک قوم کو یہ اقتصادی اِتّحاد
دوست ملکوں میں تعاون قابلِ تعریف ہے
دل سے اٹھی ہے یہ دعا لوگوں کے "ایکو" زندہ باد! (۲۶)

امریکہ کی طرف سے ایک بیانیہ جاری ہوا تھا کہ دہشت گرد تنظیمیں اپنا اتنا بڑا نیٹ ورک رکھتی ہیں کہ وہ دنیا کو برباد کرنے کے لیے کسی بھی کمزور ملک کی ایٹمی اثاثوں پر قابض ہو سکتی ہیں، لہٰذا اس وقت کے صدر بارک اوبامانے ایک طرح سے پاکستان کو خبردار کیا تھا کہ وہ اپنے ایٹمی اثاثوں کے تحفُّظ کو یقینی بنائیں، ورنہ امریکہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ایٹمی طاقتوں کے ایٹمی اثاثوں کی حفاظت کی ذِمے داری خود کرے یا کسی اور کے حوالے کرے۔ یہ بات دراصل پاکستان کے لیے ایٹمی حوالے

سے ایک خطرے کی گھنٹی تھی، لیکن پاکستانی افواج اور حکمرانوں نے امریکہ کو باور کروایا کہ ان کے ایٹمی اثاثے انتہائی محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔ اس لیے امریکہ کو اس امر پر تشویش کا اظہار کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ وہی وقت تھا جب امریکہ پاکستان سے 'ڈو مور' کی توقع رکھتا تھا۔ پاکستان نے پہلی بار امریکہ کو انکار کیا اور اس انکار کا فائدہ یہ ہوا کہ آنے والے وقتوں میں امریکہ کے ساتھ پاکستان دوستانہ تعلقات برابری کے اُصولوں پر قائم کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہو گیا۔ ایسی ہی کیفیت کا ریاض مجید نے بھی طنزیہ انداز میں اظہار کر رکھا ہے۔ دنیا کے حالات اور طرزِ زندگی نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ نظامِ زندگی کی طرح اُمورِ سلطنت سے لے کر عام اداروں کی کارکردگی تک نئے طریقے سے چل نکلے ہیں۔ سیاست کا طرز بھی اس قدر بدلا ہے کہ جمہوری اقدار نے سیاست کی کایا پلٹ کر رکھ دیے۔ سعودی عرب جیسے ملک میں کرپشن کے حوالے سے اسی دور میں اقتدامات ہونے لگے، جہاں بادشاہوں نے زمانۂ قدیم سے اپنی من مانیاں کر رکھی تھیں۔ ریاض مجید کی ان بین الاقوامی اُمور پر گہری نظر رہی ہے، چناں چہ اُنھوں نے بڑے بے لاگ انداز میں ان سیاسی روّیوں اور اختیار کے بے جا استعمال کو پہلی بار ایک دھچکا سا لگتا دیکھا ہے۔ اصل میں انسانی زندگی اسی طرزِ عمل یک متقاضی ہے، بہ ظاہر اس کی یک رخی تصویر کو سیاسی رہ نماؤں کے لیے برداشت کرنا محال لگتا ہے فی الحقیقت ایک نہ ایک دن ہونا ایسا ہی تھا:

امریکہ سے:

ہم نے نبھائی آپ سے اک عمر دوستی
ہم کو ہمارے حال پہ اب چھوڑ دیجیے
جو ہو چکا ، اسی کو غنیمت کریں شمار
''ڈو مور'' کا مطالبہ ہم سے نہ کیجیے (۲۷)

مذہبی تہوارات اور دینی واقعات کے متعلق قطعات:

ریاض مجید نے جہاں کہیں قومی تہوارات، ملکی طرزِ سیاست اور دیگر جُملہ موضوعات پر یومیہ انداز میں قطعات رقم کیے ہیں، اسی طرح اُنھوں نے مذہبی تہوارات اور سانحات کو بھی موضوعِ سخن کیا ہے۔ چناں چہ وہ عاشوری کے پیغام کو عام مسلمانوں کے لیے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ چاہے حالات کسی بھی نہج پر ہوں مسلمان اپنے ایمان کی دولت پر کاربند رہتا ہے اور کفر کی بڑی سی بڑی طاقت بھی اسے اپنے سامنے زیر نہیں کر سکتی۔ عاشورے کا یہ پیغام ایک طرح سے انسانیت کے حق میں ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ باطل کے سامنے حق کبھی بھی زیر نہیں ہو سکتا، لہٰذا حق کی خاطر مسلمان اپنی گردن تو کٹوا سکتا ہے، لیکن کفر اور ظلم کے ہاتھ پر کبھی بھی بیت نہیں کر سکتا۔

ریاض مجید نے اسلام اور امن کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والے مجاہدینِ پاک فوج اور رینجر کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک ملکی سرحدوں کی رکھوالی کرنے والے یہ مجاہدین بہ وقتِ ضرورت اندرونی سازشوں کا بھی قلع قمع کرتے ہوئے پیامِ امن کے داعی بن جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ریاض مجید اُنھیں سلامِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اُنھوں نے ربیع الاوّل کے بابرکت مہینے میں مسلمانوں کے لیے سعادت آثاری کی دلیل کو بھی بڑے خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ اپنے نادر اُسلُوب سے فکر کو چار چاند لگانے کا ہنر جانتے ہیں۔ ریاض مجید نے یہ واقعی کمال کیا ہے کہ دینی تہوارات اور اسی مناسبت سے یادگار لمحات کو اپنی شاعری میں اس طرح محفوظ کر رکھا ہے کہ مذہبی شاعری کا یہ پہلو بھی تاریخ میں ایک الگ آرٹ گیلری کی شکل اختیار کر گیا ہے، جس میں ہمیں انتہائی سادہ، مگر دل آویز تصاویر کے ایمان افروز نادر مُرقّعے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ضمن میں ریاض مجید کا چند قطعات بہ طورِ مثال دیکھیے:

سلامِ عقیدت:

اُصولِ امن کی خاطر بہا ہے جن کا لہو
اُنھیں نگاہِ عقیدت سے دیکھتے ہیں عوام
وہ فوج ہو کہ وہ رینجرز کے مجاہد ہوں
ہیں ضرب عضب کے جتنے شہید، سب کو سلام! (۲۸)

بہ حیثیتِ شاعر ریاض مجید کو یہ اعتبار حاصل ہے کہ اُنھوں نے نعتیہ دیوان بھی مُرتّب کیے اور اُن کا نعتیہ دیوان بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔ وہ عصرِ حاضر کے ایک جانے پہچانے نعت گو شاعر ہیں۔ ریاض مجید کی یہ بھی انفرادیت ہے کہ اُنھوں نے ہر صنفِ سخن میں نعتیہ اشعار کہے ہیں۔ قطعہ کے میدان میں بھی ان کے نعتیہ قطعات اپنی مثال آپ ہیں۔ وہ حضورِ اکرم ﷺ سے دلی موانست رکھتے ہیں، جس کا اظہار ان کی شاعری میں جابجا موجود ہے۔ اس حوالے سے ان کا کلام واقعی کارِ دارد ہے۔

ریاض مجید کی فکرِ کامل کا یہ بہترین اظہار ہے کہ وہ وطن دوستی کے ساتھ ملکی سلامتی کے لیے دعا گو ہونا دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ وہ اسلامی ممالک میں امن و سلامتی کے قیام کو دینی اشاعت و تبلیغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ چناں چہ جب افغانستان کا امن عالمی داؤ پر لگا، تو اُنھیں بے حد صدمہ ہوا۔ کیوں کہ بیرونی طاقتیں افغانستان کی ہمارے ملک کی سلامتی کے خلاف بہ طورِ آلہ کار استعمال کرتے تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس بد دیانتی میں افغان حکومت بھی دشمن طاقتوں کا ساتھ دے رہی تھی۔ ریاض مجید کہتے ہیں کہ ہم نے سکھ کا سانس لیا، جب افغان بارڈر پر امن قائم ہوا، کیوں کہ پاکستان میں امن و سلامتی کا قیام پڑوسی ممالک میں امن واماں سے گہرا ربط ہے۔

ریاض مجید کے نزدیک شبِ برات بھی اپنی پوری آب و تاب سے مسلمانوں کے لیے رحمت اور بخشش کا پیغام لاتی ہے۔ اس میں مسلمان اپنے دامن کی آلودگی سے چھٹکارا پاتے ہیں۔ وہ اس کی فضیلت بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کو اپنے رب العزت کے حضور سجدہ ریز ہو کر گناہوں سے توبہ تائب ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ ذی الحج کے بابرکت مہینے میں اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت سے لطف اندوز ہونے کی کیفیت کا بھی برملا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں تک ہی بس نہیں وہ حسبِ ترتیب اسلامی مہینوں کی اہمیت کے ساتھ ساتھ ان کے خصوصی فیوض و برکات کا تذکرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کے لیے ایمان افزازی کا سامان کرتے ہیں۔ ریاض مجید کی فکر کا یہ اعجاز ہے کہ وہ حضورِ اکرم ﷺ کی ولادتِ باسعادت کو امتِ مسلمہ کے لیے دنیا کا سب سے انمول تحفہ قرار دیتے ہیں۔ وہ اپنی بخشش کے لیے اس سے بڑے وسیلے کے خواست گار ہو ہی نہیں سکتے۔

ذی الحج مبارک:

وقت پھر آیا لیے بخشش و رحمت کی نوید
چھایا ماحول پہ پھر ابرِ کرم کا سایہ
ہو مبارک تمھیں ،افلاک سے اہلِ اسلام
برکتیں ساتھ لیے حج کا مہینہ آیا (۲۹)

ریاض مجید اسلام کے نام پر بڑھتی ہوئی فرقہ واریت کو امتِ مسلمہ کے اِتّحاد کے لیے زہرِ قتل تصوّر کرتے ہیں۔ یہ امر بھی مبنی بر حقیقت ہے کہ ان کا دینی مطالعہ کسی مستند عالم سے کسی طور کم نہیں ہے تاہم وہ دین کے نام پر پھیلائے جانے والے تفرقے کو امتِ مسلمہ کے اِتّحاد کو پارہ پارہ کرنے کا اصل محرک تصوّر کرتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ یقینا حق بہ جانب ہیں۔ اُنھوں نے علمائے کرام سے دست بستہ التجا کی ہے کہ وہ دین کو اپنے مفادات کی خاطر استعمال نہ کریں بل کہ امتِ مسلمہ کو باہمی اِتّحاد اور یگانگت کا درس دیں۔ اس باب میں ریاض مجید کی یہ کاوش لائقِ صد داد ہے۔

پوری دنیا کی اقوام اسلام کے خلاف سازشوں میں مگن ہے۔ ان کی مکروہ سوچ کے مطابق اسلام ہی ان کے لیے دنیا میں سب سے بڑا خطرہ ثابت ہو رہا ہے۔ دوسری جانب ہمارے علما ہیں، جو تفرقے بازی کی فضا کو آئے دن پروان چڑھانے میں مصروفِ عمل ہیں۔ یہ کون نہیں جانتا کہ امریکہ اور اسرائیل کا حالیہ گٹھ جوڑ اسلام کے خلاف کسی سازش سے کم نہیں ہے، تو پھر علما کو چاہیے کہ امتِ مسلمہ کے اِتّحاد کو قائم رکھیں۔ بہ صورتِ دیگر ساری طاغوتی طاقتیں اسلام کے خلاف بڑی آسانی سے سینہ سپر ہیں، جو بہ ظاہر کامیاب بھی ہو رہی ہیں۔ ریاض مجید نے ماہِ صیام کی برکت اور عزت و تقدیس کو بھی بہ طورِ خاص موضوع بنایا ہے۔ وہ مسلمانوں سے اس مہینے کی زیادہ سے زیادہ برکتیں سمیٹنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ ایسا مہینہ ہے جب اللہ تعالیٰ کی رحمت اور برکتیں عروج پر ہوتی ہیں اور مسلمان دست بہ دعا ہو کر اپنے رب کو نہ صرف منا سکتے ہیں بل کہ آنے والے دنوں میں اس کا

خصوصی فضل و کرم بھی سمیٹ سکتے ہیں۔ کیوں کہ دنیا میں طاغوتی طاقتوں کے مقابلے میں عالمِ اسلام اتنا مضبوط اور توانا نہیں ہے۔ ریاض مجید کے اس قبیل سے متعلق قطعہ ملاحظہ ہو:

رمضان:

رمضاں رحمت و برکت کا مہینہ آیا
اہلِ دیں اس میں عبادت کریں سارے بھر پور
جو بھی اخلاص سے اس ماہِ کرم میں مانگیں
سب دعائیں وہ خدایا! ہوں قبول و منظور (۳۰)

معاشرت:

ریاض مجید نے عوام کے نہ بدلنے والے عمومی رویّے پر بھی افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اُنھیں یہ تشویش لاحق ہے کہ ہماری عوام کا انفرادی طرزِ عمل لالچ اور بدنیّتی پر مبنی ہے، جب من حیث القوم ہم اجتماعی ترقّی کی رہ میں از خود رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ قومیں ایسے ترقّی نہیں کر سکتیں۔ پاکستان کی ترقّی کی رہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہم خود ہیں، ہمارے اندر جذبۂ حب الوطنی کا فقدان ہے، اس لیے ہمیں اپنے گھر کی فکر ہے، مگر ہماری کوتاہ فہمی کی بدولیت ہم پاکستان کو اپنا گھر تصوّر کرنے سے قاصر ہیں۔ پھر بھی ہمیں دوسروں سے شکوہ رہتا ہے اور ہم حکومت کے بھی شاکی ہوتے ہیں۔ حال آں کہ ملک کی شومئ قسمت میں سب سے بڑا منفی کردار ہمارا خود بھی ہے۔ ریاض مجید نے عوام کی اس بدعنوانی کو موضوع بناتے ہوئے ہمیں سوچنے اور اپنا چلن بدلنے کی تلقین کی ہے۔ ریاض مجید نے عوام کی بے حسی کے ساتھ ان کے مزاج میں پائے جانے والے کھلے تضاد کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم عوام کی خدمت کے لیے حکومتی نمائندوں کا خود اِنتخاب کرتے ہیں اور پھر ان کی نااہلی کا رونا بھی ہم ہی روتے ہیں۔ اس حقیقت سے کس کو انکار کی جرأت ہے کہ ہم قومی اُمور کی انجام دہی میں ہمیشہ سست رو واقع ہوئے ہیں۔ ہماری یہی سست روی ہمیں تباہی و بربادی کے منھ میں دھکیل دیتی ہے۔ بعد میں کفِ ماتم ملنے کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ ہم خود ہی عوامی نمائندوں کو ووٹ دے کر اسمبلی تک پہنچاتے ہیں اور پھر ان کی نااہلی کا رونا بھی خود ہی روتے ہیں۔ ریاض مجید نے ہماری اس قومی بیماری کا خوب تذکرہ کرتے ہوئے ہمیں قومی غیرت دلانے کی کوشش کی ہے۔ ہماری یہ کوتاہ فہمی پھر ہم پر مہنگائی کا پہاڑ توڑتی ہے۔ ملک میں جتنے بھی غلط کام ہو رہے ہیں ان کے ایک طرح سے ہم خود ہی ذمے دار ہیں، کیوں کہ ہمارا اِنتخاب ہی ناقص ہوتا ہے۔ ہم ایسے افراد سے ترقّی اور انسانی فلاح و بہبود کی کیا توقع رکھیں گے، جن کو پاکستان کی سالمیت سے دور کا بھی سروکار نہیں ہوتا۔ اداروں کو بہتر بنانے والے افراد میں سیاسی رہ نماؤں کا بھی قلیدی کردار ہوتا ہے۔ ادارے ان کی دل چسپی کے بغیر کیسے پروان چڑھ سکتے ہیں، جب کسی کو ملکی اور قومی درد ہی نہیں ہو گا تو ملک اور قوم کی ترقّی خاک ہو سکے

گی۔ صرف ہمارے ناقص اِنتخاب کی تباہی و بربادی یہاں تک بس نہیں ہوتی۔ ملک میں ناقص اشیاے خوردونوش اور دیگر غیر مِعیاری اشیاے فروخت کے لیے جب کوئی باقاعدہ نظام ہی نہیں ہو گا تو ترقّی کیا خاک ہو گی۔ ملاوٹ، رشوت، بد عنوانی، لوٹ مار، اقربا پروری اور کرپشن اس ملک میں باہر سے آکر کسی نے نہیں کی ہے۔ اس تباہی و بربادی میں ہمارا ذاتی ہاتھ کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔ بات پھر ہمارے ناقص اِنتخابات پر آجاتی ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ ہمارا مِعیار جب اچھّا ہو گا تو ہم آنے والے چند سالوں میں اپنی بدلتی ہوئی نئی دنیا دیکھ سکتے ہیں۔ ضرورت صرف اپنا محاسبہ کرنے کی ہے۔ ورنہ آنے والے چند سالوں میں پاکستان کی ترقّی ہمارے لیے عبرت کے تازیانے کے سوا کُچھ اور نہیں ہو سکے گی۔ ریاض مجید نے ایسی ہی دل خراش حقیقتوں کا اظہار کر رکھا ہے:

ملاوٹ اور زہر فروشی:

خوردنی چیزوں میں ملاوٹ کو
کیسے اب تک عوام نے سہا ہے
کبھی اس پر بھی کُچھ توجُّہ دیں
ملک بھر میں جو زہر بک رہا ہے (۳۱)

کسی بھی قوم کی ترقّی کا اصل راز اس کے باقاعدہ نظامِ زندگی میں ہوتا ہے۔ ملکِ عزیز پاکستان میں کسی بھی ضابطہ کا نہ ہونا ہی سب سے بڑا اضابطہ ہے۔ ہمارے بہت سے ایسے مسائل ہیں، جن کی طرف توجُّہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی ناعاقبت اندیش لوگوں کے لیے قوم کا لفظ کیسے اور کیوں کر استعمال کیا جا سکتا ہے؟ اس کی بیسیوں مثالیں بہ یک وقت پیش کی جا سکتی ہیں۔ فی الوقت پاکستان کی بے تحاشہ آبادی ہی کو لیجیے۔ بقائے نسلِ انسانی کا یہ ریلہ ایک ایسی ان دیکھی سمت رواں دواں ہے جہاں سے بہ قولِ غالب ہمیں خود اپنی بھی سمجھ نہیں آتی۔ ریاض مجید نے شگفتہ انداز میں ہماری بڑھتی ہوئی آبادی کی نشان دہی کی ہے۔

پاکستانی قوم کی ناعاقبت اندیشی کو ریاض مجید نے اپنی شاعری میں بڑی دردمندی سے بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے حالتِ حاضرہ کے جعلی پیر کے پاگل پن اور قتل و غارت گری کو بھی موضوع بناتے ہوئے ہمیں سوچنے کی دعوت دی ہے۔ ان کی دعوتِ فکر ہمیں واقعی جھنجھوڑتی ہے کہ اس ترقّی یافتہ دور میں بھی ہم کہاں کھڑے ہیں اور ہمارا مستقبل کیا ہو گا؟ قوم کے افراد ریوڑ کی طرح جس سمت چاہیں آگے بڑھے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ایسا جنون ہے، جو انجام کی پروا کیے بغیر آگے بڑھے جانے میں ہی ہماری عافیت تلاش کر رہا ہے۔ درج بالا حوالے سے ریاض مجید یوں معرض اظہار کرتے ہیں:

مردم شماری کے شہید:

ختم ہو گا کس جگہ دہشت کا خونی سلسلہ؟
روز بڑھتے جاتے ہیں تخریب کاری کے شہید
ہو گئے قومی فریضے کی سر انجامی کی نذر
ہائے یہ فوجی، جواں، مردم شماری کے شہید! (۳۲)

ریاض مجید نے انسان کی اپنی خود احتسابی کو اس کے لیے سب سے عمدہ عمل قرار دیا ہے کیوں کہ ایسا کرنے سے انسان کے اندر کردار سازی کی فضا پروان چڑھتی ہے۔ ایسا نہ کرنے سے ہمارا نقصان یقینی ہوتا ہے کیوں کہ احتساب سے انسان کبھی بھی دامن کشاں نہیں ہو سکتا۔ ریاض مجید نے شاید ہی کوئی معاشرتی برائی ہو گی جس پر قلم نہ اُٹھایا ہو، وہ خصوصاً ملاوٹ کے منفی اثرات کا رہ رہ کر تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہماری معاشرتی برائیوں میں ملاوٹ سب کی جڑ ہے، جس سے باقی ماندہ تمام معاشرتی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ ان کے مطابق جب تک ہم اپنے آپ کو نہیں بدل سکیں گے بیرونی تبدیلی ہمارے لیے کیا کسی کے لیے بھی کارگر ثابت نہیں ہو سکتی:

اپنا اپنا احتساب:

چاہے پہلے ہو، چاہے بعد میں ہو
ہونا تو احتساب سب کا ہے!
اپنی اپنی ہے سب کی فردِ عمل
اپنا اپنا حساب سب کا ہے! (۳۳)

ریاض مجید نے پاکستان کے ان من چلوں کا بھی ذکر کیا ہے، جو جیسے بھی حالات ہوں اور ان کی کوتاہی سے خواہ کتنے بچّوں اور، جوانوں کی گردنیں کٹ جائیں اُنھیں بسنت کے انتظار میں پتنگ بازی کا کھیل کھیلنا ہوتا ہے۔ حکومت کتنی قانون سازی کرے گی؟ پارلیمنٹ میں کس قدر قوانین پاس ہوں گے، جب تک ہم خود قانوں کی پاس داری نہیں کریں گے قانون از خود اندھے کا اندھا ہی رہے گا۔ ریاض مجید نے یہاں ایسے افراد، جو کسی بھی تہوار کو اپنے لیے باعثِ مُسرّت قرار دیتے ہیں، ان کے لیے یہ حقیقت ہے کہ ان کے شوق کی بھینٹ کسی کی قیمتی جان بھی چڑھ سکتی ہے۔ ایسا ہوتا ہوا ہم اکثر میڈیا پر دیکھتے رہتے ہیں کہ اکثر لوگ ایسے شتر بے مہاروں کی پتنگ بازی کی نذر ہو جاتے ہیں۔

ایک طرف ایسے افراد ہیں، جن کا درج بالا ذکر ہوا ہے۔ ہمارے ہاں خوش قسمتی سے ایسے افراد کی کمی نہیں ہے، جن کے دم خم سے ملک چلتا ہے۔ یہ افراد کی داخلی حیثیت ہوتی ہے کہ وہ محنت کی عظمت پر یقین رکھتے ہیں۔ ریاض مجید نے وزیرِ

اعظم کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ محنت کی عظمت کے سامنے دنیا کی ساری چیزیں ہیچ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ، جو شخص محنت کی عظمت پر یقین رکھتا ہے وہی وقت کا بڑا آدمی بنتا ہے، جو آنے والے وقتوں میں کامیابی کے فیتے کاٹنے کا مستحق ہوتا ہے۔ اس کا مقابلہ کسی کام چور شخص کے ساتھ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔

ریاض مجید نے ہماری ایک معاشرتی ناانصافی کی برائی کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے۔ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ قومیں اور معاشرے انصاف پرستی کے اُصولوں پر ترقّی کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے ان کی وہ کاوش ہے جس کے ذریعے سے وہ معاشرے میں انصاف اور عدل کا بول بالا کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اُنھوں نے بعض ایسے موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے، جو ان کے ذاتی نظامِ فکر سے اصلاحِ قوم کے لیے اہمیت رکھتے ہیں۔ ایسے موضوعات کی تعمیم تاریخ وار نہیں کی جا سکتی۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے شاید ان موضوعات کی اہمیت اس طرح قائم نہ رہ سکے، جس طرح ریاض مجید عمومی حوالے سے ان کی تعمیم کرنے کے خواہش مند ہیں۔

درج بالا مباحث میں پاکستان اور چین کی دوستی کی بابت بات ہو چکی ہے۔ یہاں صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ پاکستان میں معاشی ترقّی کے لیے پاک چین راہ داری ایک بہت بڑے باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر وہ عوام کو یہ درس بار بار دے رہے ہیں کہ وہ دشمن عناصر کی افواہوں پر کان نہ دھریں بل کہ اس منصوبے کی کامیابی کے لیے دعا گو رہیں، کیوں کہ اس منصوبے سے پاکستان کا روشن مستقبل وابستہ ہے۔ ہمارا جذبۂ حب الوطنی بھی اس بات کا متقاضی ہے کہ ہمیں پاکستان کے عالمی سطح پر کیے جانے والے حکومتی معاہدوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں۔ قطعاتِ ریاض مجید میں سے ایک قطعہ بہ طورِ مثال ملاحظہ ہو:

کام میں عظمت ہے:

باتیں کرنے والا تو باتیں کرتا ہے
حاسد زخم اپنے پچھتاوے کے چاٹے گا
کہا وزیرِ اعظم نے یہ کل مجمع میں
"محنت کرنے والا ہی فیتا کاٹے گا" (۳۴)

صحافت:

ریاض مجید نے اپنے قطعات میں بہ طورِ خاص جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے ان میں صحافت بھی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ہر ایک شعبے کے حوالے سے بے لاگ رائے کا اظہار کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اُنھوں نے جارحانہ انداز کے مقابلے میں ہمیشہ سبک رو انداز اور دھیمے لہجے میں شگفتہ بیانی کا مظاہرہ کیا ہے، مگر ان کی رائے

اور تبصرہ حقیقت پسندانہ ہی رہا ہے۔اُنھوں نے صحافیوں سے اکثر و بیش تر جانب داری کا شکوہ کیا ہے۔بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا اور عوام میں سنسنی پھیلانا صحافیوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔

ریاض مجید کے مطابق صحافتی ذمے داریاں سچائی کا تقاضا کرتی ہیں۔کیوں کہ خبر کا تعلق ہی سچ کے ساتھ ہوتا ہے۔وہ صحافی کی اہم ذمے داریوں میں قوم کی بیداری کو اوّلیت دیتے ہیں۔وہ صحافت کو جرائم اور جنس کے شکنجے سے آزاد دیکھنے کے آرزو مند ہیں۔آج کے دور کی صحافت کو محض ایک گورکھ دھندا قرار دیا جاسکتا ہے۔ریاض مجید نے ڈان لیکس کے حوالے سے اس کی مثال پیش کرتے ہوئے ،صحافتی نظام کو ایک طرح سے جانب دار قرار دیا ہے۔اس میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ صحافت کے مقدس پیشے سے عبادت کی حد تک آج کے دور میں کوئی بھی صحافی نہیں ہے،جو لگاؤ رکھتا ہو:

ہماری صحافت:

خوابِ خرگوش میں مدہوش یہ خلقت جاگے
معجزہ کوئی ،کہ اس قوم کی قسمت جاگے
ادب و شعر علامت کے گہن سے نکلیں
جرم اور جنس میں مدہوش صحافت جاگے (۳۵)

میڈیا پر کیے جانے والے بے جا ٹاک شوز اور ان میں ان جان اور صحافتی اُصولوں سے نابلد افراد کی شرکت اور ان کی اُوٹ پٹانگ رائے اور طرزِ عمل ریاض مجید جیسے صاحب الرائے شخص کو کیسے اپنی طرف متوجّہ کر سکتا ہے۔یہ صرف کسی ایک چینل کی بات نہیں ،یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔کس کی مثال دی جائے،آج کا کوئی ایک صحافی بھی نہیں ہے ،،جو جھوٹ کے اس کاروبار میں دامنِ دل سچا رکھتا ہو۔ریاض مجید نے پانامہ کیس کے حوالے سے میڈیا کے افراد کی فیصلہ دہی اور فضول بحث و مباحثے کے ضمن میں اُنھیں بے نقاب کیا ہے۔یہ حقیقت ہے کہ میڈیا پر چلنے والے پروگراموں کو اوّل تا اٰخر دیکھا جائے ،تو موضوع کے علاوہ ہر قسم کی باتیں ملتی ہیں،اگر کسی بات سے لاعلمی کی کیفیت ملتی ہے ،تو وہ موضوع ہی ہوتا ہے۔ریاض مجید نے ایسی بے کار کی باتوں کو وقت کا ضیاع اور درست رائے کے قیام کی راہ میں رکاوٹ قرار دیا ہے۔

ہمارے میڈیا پر پیش کیے جانے والے پروگراموں میں زیادہ تر پروگرام عدلیہ کا کردار ادا کرتے ہیں۔ایسے اصحاب بھی موجود ہیں،،جو بڑے فخر سے قانونی رائے دیتے ہیں۔حتیٰ کہ عدلیہ کے فیصلوں پر اپنی ماہرانہ رائے سے فیصلوں کی صحّت کو بھی موضوع بنایا جاتا ہے۔آج کل کی صحافت بدنامی کی طرف گامزن ہے۔ڈان لیکس ہی کو دیکھ لیجیے ہر تجزیہ کار کسی نہ کسی کی وکالت میں رطبُ اللّسان ہوتا ہے۔حال آں کہ بے لاگ تبصرہ اور رغیر جانب دارانہ رائے کسی ایک چینل پر بھی نہیں ملتی۔یہ کہنا درست ہو گا کہ میڈیا پر سب کُچھ ملتا ہے اگر نہیں ملتی تو سچائی نہیں ملتی۔اس حوالے سے مثال دیکھیے:

میڈیا:

لے کے پا نامہ کا قصّہ بیٹھ جاتے ہیں یہ روز
کس لیے پھیلا رہے ہیں ذہن اندر انتشار؟
عدلیہ حق کے مطابق کر ہی دے گی فیصلہ
میڈیا ہے ان دنوں کیوں بوکھلاہٹ کا شکار؟ (۳۶)

یہ سب میڈیا ہی کا کمال ہے کہ وہ لوگ جنھیں دنیا ایک عرصے سے جانتی ہے، میڈیا نے ان کے کردار کو ایسے بیان کیا ہے کہ ان کے بارے میں عوام کی رائے بدل کر رکھ دی ہے۔یوں اگر یہ کہا جائے کہ میڈیا جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے اور، جس کو چاہتا ہے برباد کر دیتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ سارا معاملہ روپے پیسے اور رمال و دلت کی ریل پیل کا ہے۔ دولت سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے، تو پھر میڈیا کیوں نہیں۔ بات کا بتنگڑ بنانا اور عوامی حلقوں میں عجب طرح کی سنسنی پھیلانا میڈیا کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ریاض مجید میڈیا کے ایسے منفی پروپیگنڈے کے خلاف ہیں۔ ایسی خبروں کے جاننے سے وہ خود کو بے خبر رکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ہائی ریٹنگ کی دوڑ میں مختلف چینلوں پر پابندی عائد کی جاتی ہے۔ حکومتی نظامت کی راہ میں بعض اوقات رکاوٹ بننے یا ایسی خبروں کی تشہیر کی وجہ سے، جو حقیقت میں ملکی سالمیت اور قومی مفاد میں نہیں ہوتیں، بعض مفاد پسند افراد اُنھیں پھیلا دیتے ہیں، جس سے پیمرا کی جانب سے ان پر پابندی اور جرمانے بھی ہوتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں، اکثر و بیش تر یہ ڈراما دیکھنے میں آتا رہا ہے۔ لوگوں کا مزاج بھی کُچھ ایسا ہی ہوتا جا رہا ہے۔ عوام تو درکنار اچھّا خاصا پڑھا لکھا طبقہ بھی ایسی ہی سنسنی کے پھیلاؤ میں ملوث ہوتا ہے۔ آج کے دور میں تو رہی سہی کسر سوشل میڈیا نے نکال دی ہے۔ اب کون کس کی بات پر یقین کرے اور سچی خبروں کی تصدیق کیسے کرے۔ یوں لے دے کر عوام کا انگریزی میڈیا پر بھروسا بڑھتا جا رہا ہے، اس کی وجہ بھی ہمارے صحافتی نظام کی ابتری ہی ہے۔ میڈیا کے ضمن میں قطعہ ملاحظہ کیجیے:

میڈیا کا غبار:

خود اپنے چہرے کی جانب نظر کرتا نہیں کوئی
کہ اپنے آئینوں میں بھی یہ اب جانے نہیں جاتے
غبار اتنا اُڑایا میڈیا نے آج ہر جانب
کہ پہچانے ہوئے چہرے بھی پہچانے نہیں جاتے! (۳۷)

کرکٹ کھیل سے دل چسپی:

ریاض مجید کرکٹ سے دل چسپی رکھتے ہیں۔ یہ دل چسپی جنون کی حد تک تو نہیں البتہ کرکٹ کے متعلق ان کی معلومات انسائیکلو پیڈیائی حد تک ہیں۔ یہ دعویٰ اس لیے ہے کہ کسی بھی کھلاڑی سے اس کھیل کے متعلق ان کی معلومات کہیں زیادہ ہیں۔ وہ ایک محبِ وطن پاکستانی کی حیثیت سے پاکستان کی کرکٹ ٹیم کی ہمیشہ حوصلہ افزائی اورر ہمت بندھائی کی بات کرتے ہیں۔ وہ پاکستان میں کھیلے جانے والے لیگ کے میچوں میں لاہور قلندرز کی حوصلہ افزائی کرتے آئے ہیں۔ کرکٹ کے میدان میں وہ پاکستان کو کھیل کے اُصولوں کا خیال رکھتے ہوئے چیمپین دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ ان کے نزدیک کوئی بھی کھیل سپورٹس مین سپرٹ کا متقاضی ہوتا ہے۔ کرکٹ کے میدان میں وہ پاکستانی ٹیم کو برداشت کی اسی حدِ فاصل سے اُوپر دیکھنے کے آرزومند ہیں۔

کرکٹ مافیا کے خلاف ریاض مجید اکثر زہر اگلتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عوام کی ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے قاتلوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے تا کہ اُنھیں پھر کبھی ایسی قبیح حرکت کرتے ہوئے ہزار بار سوچنا پڑے۔ وہ پاکستانی ٹیم کی معمولی سی کامیابی پر اس قدر خوش ہوتے ہیں کہ پورری قوم کو مبارک باد دیتے ہیں۔ وہ ایسے کھلاڑی، جو چند سکوں کی خاطر اپنا ضمیر فروخت کرتے ہیں، اُنھیں جعفر اور صادق جیسا غدارِ وطن سمجھتے ہیں۔ یہ سچ بات ہے کہ ایسے سفاک کھلاڑی ملکی عزّت کو داؤ پر لگاتے ہوئے ملکی بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔ کھیل، کھیل ہوتا ہے، جو انسان کے اندر برداشت کے جذبات کو پروان چڑھاتا ہے۔ کھیل کے ذریعے سے بین سطح پر ملک کو شہرت ملتی ہے اور دیگر ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ریاض مجید کی کرکٹ سے دل چسپی اور لاہور میں کھیل کو بار بار خوش آمدید کہنے کی بابت چند قطعات ملاحظہ ہوں:

کرکٹ مافیا:

ذرا ذرا سی بھی خوشیاں غریب لوگوں کی
بڑی نفاستوں سے ہائی جیک ہو رہی ہیں
جو میچ ہونے کو ہے فائنل ، ریاض اس کی
سنا ہے میں نے کہ ٹکٹیں بلیک ہو رہی ہیں (۳۸)

ریاض مجید پاکستان کی ہار کو لڑ کر ہارنے کو صدقِ دل سے قبول کرتے ہیں۔ تاہم اُنھیں نااہل کھلاڑیوں کے اِنتخاب اور نااہل کوچنگ پر انتہائی دکھ ہوتا ہے۔ وہ ہار جانے کے درپردہ محرکات کی تحقیق اور کھوج رسانی کو بھی قابلِ مذمّت قرار دیتے ہیں، کیوں کہ اس طرح بین الاقومی سطح پر ملک کا مزید وقار مجروح ہوتا ہے۔ جب بھی پاکستانی ٹیم کوئی کامیابی حاصل کرتی ہے، تو وہ خوشی کے مارے جامے میں پھولے نہیں سماتے۔ اُنھیں ایسے لمحات میں قومی ٹیم پر افتخار ہوتا ہے۔ اُنھیں مردانہ وار مقابلہ

کرتے ہوئے کسی بھی درجے پر ہار منظور ہوتی ہے۔ سیمی فائنل تک پہنچنے کو تو وہ اپنی ٹیم کی تمام تر کم زوریوں کے باوجود قابلِ فخر بات جانتے ہیں۔ ان کا مِعیار صرف پاکستانی کھلاڑی ہی نہیں ہیں بل کہ وہ دوسری ٹیموں کے مایہ ناز کھلاڑیوں کو بھی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اسی مناسبت سے ان ٹیموں کے ساتھ پاکستان کے کھیل کو بھی دیکھنے کے قائل ہیں۔ یہی بات ان کی سپورٹس مین اسپرٹ کی دلیل ہے۔ یاد رہے کہ ریاض مجید کے متذکرہ دونوں مجموعوں میں شامل قطعات بھی ان کی کرکٹ پسندی کی دلیل ہونے کے ساتھ ساتھ اِنھی ایّام کی یادگار اور کرکٹ کی ایک ادبی تاریخ رقم کرنے کی ذیل میں آتی ہے، جو حالاتِ حاضرہ کے تناظر میں کھیلے جاتے رہے ہیں۔ اِسی خصوص میں ریاض مجید کے چند قطعات بہ طورِ مثال ملاحظہ ہوں:

پاکستان کرکٹ ٹیم:

کون تھا نا اہل؟ کیپٹن، کوچ یا پھر مینیجر
میڈیا میں ہو رہی گفتار کی تحقیق کیا؟
کیا ملے گا جگ ہنسائی اور ندامت کے سوا
جس کی دنیا ہو گواہ ، اس ہار کی تحقیق کیا؟ (۳۹)

ضرورت کے عنوان سے قائم کردہ قطعات:

ریاض مجید نے ضرورت کے عنوان سے چند قطعات بیان کر رکھے ہیں۔ ان قطعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کی جُملہ اقدار پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے عوام کے انفرادی رویّوں سے قطع نظر اجتماعی خرابیوں کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ وہ معاشرے میں پھیلتے ہوئے فساد کو حتی الامکان روکنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ معاشرے کو نیکی کے اُصولوں پر کاربند دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ ایسا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان اپنے باطن کو صاف نہ کر پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کورباطن کو حقیقت آشنائی کا درس دیتے ہیں۔

ریاض مجید افراد کے اندر کرداری صلاحیّتوں کو پروان چڑھانے کے متمنی ہیں۔ وہ قومی تنزلی کا سزاوار عوام کو بھی قرار دیتے ہیں۔ اس میں کوئی دوسری رائے بھی نہیں کہ ہماری کوتاہ بینی قومی تنزلی میں بڑی حد تک شامل ہے۔ کردار اسی صورت مثالی ہو سکتا ہے، جب ہم اس کی طرف خاطر خواہ توجُّہ دیتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں کردار سازی کی اشد ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ہم اپنے اندر خود مثبت تبدیلی لانے سے قاصر رہیں گے، اس وقت تک کوئی دوسری چیز بیرونی سطح پر ہماری ممد و معاون نہیں ہو سکتی۔

ہمارے ملک اورر معاشرے کی ترقّی کی رہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ انصاف کی عدم فراہمی ہے۔ سماج اس وقت تک ترقّی نہیں کر سکتا، جب تک معاشرتی انصاف کا بول بالا نہیں ہو گا۔ ریاست کی رٹ بھی اسی صورت قائم رہ سکتی ہے، جب ملک

کے سبھی افراد قانون کی بالادستی کے لیے کوشاں نہیں ہوں گے۔ایسا معاشرہ جس میں امیر غریب میں فرق و امتیاز روا رکھا جاتا ہے،وہ مثالی نمونوں کا ہمیشہ سے فقدان رہتا ہے۔یہی معاشرتی عدم انصاف نسلوں کی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔اس لیے ریاض مجید نے عدل وانصاف کی ضرورت پر زور دیا ہے۔یہ بات سچ ہے کہ کوئی بھی معاشرہ ظلم پر تو قائم رہ سکتا ہے، لیکن انصاف کے بغیر اس کا وجود نیست ونابود ہو جاتا ہے۔ریاض مجید کے اس قبیل کے قطعات ملاحظہ ہوں:

نیک نیّتی کی ضرورت:

خوشی کی ساعتیں، آسودگی کے پل ہیں بہت
ہیں آج اندھیرے تو کیا، نور پاش کل ہیں بہت
معاملات ہیں بد نیّتی سے الجھے ہوئے
جو دل ہوں صاف تو ہر مسئلے کے حل ہیں بہت (۴۰)

ریاض مجید نے بین الاقوامی مسائل پر بھی اپنی رائے دی ہے۔وہ کشمیر کے معاملے کی سنگینی سے بہ خوبی آگاہ ہیں، اس لیے وہ اکیلے اس مسئلے کو حل کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔اُنھیں یقین ہے کہ اگر اس مسئلے پر بیرونی سطح پر رائے عامہ استوار نہیں کی جائے گی، تو مسائل اور سنگینی اختیار کریں گے اُنھوں نے اس مسئلے کے اجتماعی حل کی طرف پیش رفت کو ضروری ٹھہرایا ہے۔کیوں کہ دو ایٹمی طاقتوں کے مابین اشتعال انگیزی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔

انسانی زندگی مسائل اور پریشانیوں کی مرکب ہوتی ہے۔ریاض مجید نے اس کے لیے ایک ایسا نسخہ تجویز دیا ہے کہ عمل کے بغیر کبھی بھی کسی مسئلے کا حل تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ہمارا معاشرہ عمل تو کرتا ہے، لیکن منفی طرزِ عمل کے باعث معاملات اکثر خراب ہو جاتے ہیں، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ عمل کے ساتھ حسنِ نیت وہ کسوٹی ہے، جو معاملات کو راستی کی سمت ڈالتی ہے۔ریاض مجید کے اس نکتے سے انکار کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔

ریاض مجید نے عوام کو ہمیشہ اداروں کے احترام کی تلقین کی ہے۔جب بھی کسی ادارے میں نئے قوانین وضوابط لائے جاتے ہیں تو عوام روایتی انداز پر خود کو بہتر جانتی ہے اور ہر آنے والی مثبت تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے بے جا رکاوٹیں ڈالتی ہے۔ریاض مجید نے اس حوالے سے عوام اور ذِمّے دار افسران اور ملازمین دونوں کو مل کر نظام کو موئثر طریقے سے چلانے کی اہمیت پر زور دیا ہے۔اس کی مثال کے طور پر وہ نادرا کے شناختی کارڈ کے سلسلے میں لائی جانے والی نئی تبدیلیوں کے بارے میں ذِمّے داران اور متعلقان کو سمجھاتے ہیں۔اس بات کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ شناخت کے بغیر شناختی کارڈ کیسے اور کیوں کر بنایا جا سکتا ہے؟ایسا کرنے سے قومی سطح پر ادارے کے قیام کا مقصد بھی پورا ہوتا ہے اور بہ وقتِ ضرورت شناخت میں بھی آسانی ہوتی ہے۔بیرونی ممالک سے داخل ہونے والے افراد بالخصوص افغانستان کے طورخم بارڈر سے بہت سے افراد

جاسوسی کے لیے پاکستان میں در آتے ہیں۔ان میں سے زیادہ تر کی تعداد بھارتی جاسوسوں کی ہے،،جو اپنے مذموم عزائم لے کر پاکستان میں داخل ہوتے ہیں۔ایسے افراد کی چھان بین اور شناخت بھی انتہائی ضروری ہے۔ابھی ضروریات کے ضمن میں ریاض مجید کا قطعہ ملاحظہ ہو:

عمل کی ضرورت ہے:

جھوٹ سے ،مکر سے،خود ساختہ تعبیروں سے
چاہ مت باندھنا الفاظ کی زنجیروں سے
زندگی حسنِ عمل ہی سے جِلا پاتی ہے
مسئلے حل نہیں ہوتے کبھی تقریروں سے (۴۱)

شخصیات کا تذکرہ:

ریاض مجید نے اپنے قطعات کی تحریر کے زمانے میں بہت سی شخصیات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ان میں بہت سے افراد ایسے ہیں،جو اپنے مثالی کردار کی وجہ سے خراجِ تحسین کے مستحق ہوئے ہیں۔اسی طرح ایسی شخصیات بھی ہیں،جو اس دنیا سے رخصت ہوئی ہیں،چناں چہ ان کے سانحہ ٔارتحال کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔چند ایسی قومی ہستیاں ہیں،جن کو قومی کارہائے نمایاں کیا نجام دہی کی بابت خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔

ریاض مجید نے جنرل راحیل شریف کے کردار کو پاکستانی فوج اور قوم کے لیے نیک شگون قرار دیا ہے۔وہ ان کی قائدانہ صلاحیتوں کو بھی برملا بیان کرتے ہیں اور ان کی بصیرت افروزی کے بھی قائل ہیں۔جنرل راحیل شریف پاکستانی عوام میں قبولیت پانے والے واحد جرنیل ہیں، جنھیں عوام نے بھی وہی عزّت عطا کی ہے، جس کے وہ مستحق تھے۔وہ عوام اور فوج میں برابر شہرت رکھنے والے واحد جرنیل کی حیثیت امتیاز رکھتے ہیں۔

ریاض مجید نے مختار مسعود کی وفات پر بھی اُنھیں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔وہ ایک صاحبِ طرز انشا پردار تھے،جنھوں نے اُسلُوب کی تازہ کاری کے لیے کئی کئی دھائیاں صرف کیں۔ان جیسی گراں مایہ ہستی کو ریاض مجید خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ریاض مجید ان کے اُسلُوب اور طرزِ بیان کے گھائل ہیں۔

پانامہ لیکس کے دور میں عمران خان کی لندن فلیٹ کے حوالے سے عدالت طلبی کو بھی ریاض مجید نے موضوع بنایا ہے۔عائشہ گلالئی کی عمران خان پر الزام تراشی کے بارے میں بھی ریاض مجید نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کہ ایسی عورتیں میڈیا کا سہارا لے کر اکثر بڑے لوگوں کو بدنام کرنے کی کوشش میں رہتی ہیں۔ایسی سستی شہرت رکھنے والی عورتیں اکثر تاریخ

میں بدنامی کے داغ کے ساتھ امر ہو جاتی ہیں۔ ریاض مجید نے ایسی تصاویر کے دوسرے رخ کی بھی نقاب کشائی کی ہے۔ وہ درج بالا حوالوں سے کیسے معرضِ اظہار کرتے ہیں، آیے دیکھتے ہیں:

آہ مختار مسعود!

ریاض مجید نے اقبال کے زندہ و جاوید پیغام کو مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ قرار دیا ہے۔ وہ اقبال کو اپنی شاعری میں اکثر و بیش تر خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ان کے پیامی شاعر ہونے کو وہ اُمّتِ مسلمہ کے لیے بالعموم اور ہندی مسلمانوں کے لیے بالخصوص عطیۂ خداوندی گردانتے ہیں۔ چناں چہ وہ یومِ اقبال اور یومِ پاکستان کے موقعے پر اکثر اس عظیم لیڈر اور پیامی شاعر کو عقیدت کے پھول پیش کرتے ہیں۔ علاّمہ اقبال کے ساتھ مولانا ظفر علی خان کی جرأت مند اور مسحُور کن شخصیت کو بھی وہ عقیدت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

مولانا ظفر علی خان کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے مختلف پہلوؤں کو ریاض مجید نے مسلمانوں کے لیے نشانِ جرأت و جواں مردی قرار دیا ہے۔ وہ ان کی ادبی حیثیت، نعتیہ مقام، سیاسی مرتبے اور بے باک مقرر ہونے کے ساتھ صحافت کو بھی خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

ریاض مجید کی یہ متوازن سوچ کا منھ بولتا ثبوت ہے کہ وہ ہر بڑے آدمی کی وفات پر اُنھیں ارادت مندی کے پھول پیش کرتے ہیں۔ چناں چہ پروین شاکرؔ، منیرؔ نیازی اور محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کو ان کی وفات کے حوالے سے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ زمانی اعتبار سے ان تینوں شخصیات کی وفات ایک ہی ماہ میں ہونے کی مناسبت سے ریاض مجید نے ان سب کا ایک ساتھ نام لیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ تینوں ہستیاں اپنے اپنے میدان میں اپنی مثال آپ اور ملکِ پاکستان کی پہچان تھیں۔ یہی مقام و مُرتّبہ ان کے نزدیک بانو قدسیہ کا بھی رہا ہے۔ وہ ان کی گراں قدر ادبی خدمات کو بھی بہ صد احترام دیکھتے ہیں۔ اس حوالے سے ریاض مجید کا خراجِ عقیدت ملاحظہ کیجیے:

نذرِ اقبالؒ:

ترا پیام ہے ہم خفتگاں کو بانگِ رحیل
اک ایک شعر ترا، مثلِ بالِ جبرائیل
حیاتِ تازہ کا پیغام بر ہے تُو ، لاریب
ترا کلام مرے حق میں صورِ اسرافیل (۴۳)

اسی طرح محمد علی باکسر، جو پاکستان کی عالمی سطح پر تین بار باکسنگ چمپئین ہونے کا اعزاز رکھتے تھے، ان کی وفات پر بھی ریاض مجید نے اُنھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی شخصیت پر بڑے موئثر انداز میں بے لاگ تبصرہ بھی کیا ہے، جس سے محمد علی باکسر کی زندگی کے بارے میں واضح اشارے ملتے ہیں۔ ریاض مجید چند لفظوں کی مکمل تصویر کشی پر مہارت رکھتے ہیں، جس کی زندہ مثال ان کے قطعات ہیں، جہاں اُنھوں نے اختصار کو بہ طورِ فن استعمال کیا ہے۔

عمران خان کے عدالت میں چلنے والے اثاثوں کے مقدمے کے چلن کے بارے میں بھی ریاض مجید نے اپنی رائے کا اظہار کی ہے۔ عمران خان کے گوشواروں اور تحریری دستاویزوں کی بنیاد پر وہ ان کی بدلتی ہوئی بیان بازی اور سیاست میں 'یو ٹرن' پالیسی پر بھی شیریں انداز میں نشتر زنی کرتے ہیں۔ جیسا کہ ماقبل بتایا جا چکا ہے کہ ریاض مجید نے یہ قطعات زمانی ترتیب سے تاریخ وار مُرتّب کیے ہیں، لہٰذا رقم کے بھی اسی ترتیب کا خیال رکھا ہے۔ یومِ اقبال کے موقع پر دوسری بار ریاض مجید نے علّامہ اقبال کے کلام کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

محمد علی باکسر:

سہ بار باکسنگ کا دنیا میں چیمپئن
لاکھوں میں منفرد تھا ، کروڑوں میں فرد تھا
جو کاسئیس کلے سے محمد علی بنا
" حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا" (۸۹)

ریاض مجید نے عصری سیاست، سیاسی حکمرانوں کی ملاقاتوں اور سیاسی گٹھ، جوڑ اور میل ملاقات کو بھی بڑے شگفتہ انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ مصطفیٰ کمال اور فاروق ستار کی ملاقات اور اِتّحاد کو اسی انداز میں دیکھتے ہیں۔ اسی طرح آصف علی زرداری اور مولانا طاہر القادری کی ملاقات کو بھی اُنھوں نے مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا یہ شیریں و شگفتہ انداز واقعی مسکراہٹ آمیز ہے۔ اس حوالے سے ریاض مجید اپنا ایک الگ اور انوکھا طرز رکھتے ہیں۔

فرزندِ اقبال جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی وفات پر بھی ریاض مجید نے دل دردمند کا اظہار کیا ہے۔ وہ ادبی دنیا میں ہونے والے اس ناقابلِ تلافی نقصان کا نوحہ بیان کیا ہے۔ وہ اس بات پر اشک فشانی کرتے ہیں کہ پاکستان کا خواب دیکھنے والے علّامہ اقبال کی فکر سے پہلے ہی پاکستانی نابلد ہیں۔ چناں چہ ان کی وفات سے اقبال شناسی کا ایک اور باب بند ہو گیا ہے۔ اس حوالے سے ریاض مجید کا یہ قطعہ ملاحظہ کیجیے:

آہ!فرزندِ اقبال رحلت کرد

کریں کس سانحے سے اہلِ ادب اس کا قیاس
تیری رحلت سے فضا اورہوئی جاں کی اُداس
بڑھ گیا اور خلائے خرد افروزی کچھ
حیف! پہلے ہی تھے کم کم یہاں اقبال شناس! (۴۴)

سانحات:

ریاض مجید نے قطعات کی تخلیق کے ایّام میں رونما ہونے والے سانحات کو بھی شعری پیکر عطا کیا ہے۔اُنھوں نے محض تاریخ رقم کرنے کا فریضہ انجام نہیں دیا بل کہ وہ اس قطعے میں اپنی موئثر رائے کا اظہار بھی کرتے ہیں۔اس کی مثال فلوریڈا کا سانحہ ہے، جہاں اسی ترقّی یافتہ فضا میں پروان چڑھنے والے، جو ان کے بارے میں، اُنھوں کے کہا ہے کہ ایسی فضا میں پروان چڑھنے کے باوجود وہ کیسے اتنا خطرناک دہشت گرد بن سکتا ہے؟ حال آں کہ پوری دنیا تو اسلام کو دہشت گردی کا آلہ کار اور مسلمانوں کو دہشت گرد گردانتے ہیں۔ریاض مجید نے اس سانحے پر پورے یورپ کو دعوتِ فکر دی ہے کہ دہشت گردی کے محرکات کی سراغ رسانی کسی اور وجہ کی متعامل ہے۔اُنھیں اپنے زاویۂ نگاہ کو درست رکھ کر حقائق تک رسائی حاصل کرنی چاہیے۔اسی طرح سانحۂ مردان میں آپے سے باہر ہونے والے افراد کی مُذمّت کرتے ہوئے ریاض مجید کہتے ہیں کہ عوام کو چاہیے کہ قانون کو کسی صورت میں بھی اپنے ہاتھ میں نہ لیں اور خود کو آپے سے باہر نہیں ہونے دیں۔اس طرح سائل اور مشکل صورت اختیار کر جاتے ہیں، عوام کے لیے قانون کی بالا دستی سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔اس میں امیر غریب کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ قانون تب ہی سب کو تحفُّظ فراہم کر سکتا ہے۔

مستونگ کے حادثے میں ہونے والے زخمیوں اور شہدا کے بارے میں بھی ریاض مجید نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔وہ دہشت گردی کی اس وقت نہ ختم ہونے والی لہر کی مذامت کرتے ہیں۔اُنھوں نے حادثے میں شہید ہونے والے چھبیس افراد کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

ریاض مجید نے مختلف خفیہ ایجنسیوں کی کارستانیوں کے بھی پردے چاک کیے ہیں۔چناں چہ اُنھوں نے انوکھا طرزِ عمل اپنار کھا ہے۔سانحۂ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے بعد جہاں کہیں بھی کوئی دہشت گرد حملہ ہوتا ہے، وہ بغیر تحقیق کیے داعش کے نام ڈال دیتے ہیں۔حال آں کہ بسا اوقات حقیقت اس کے مختلف بھی ہوتی ہے۔ریاض مجید نے ایجنسیوں کے طرزِ تحقیق کو بھی تشکیک کی نگاہ سے دیکھا ہے۔یہاں وہ جابرانہ طور طریقوں کے لیے ایک سوالیہ نشان چھوڑ جاتے ہیں۔درج بالا سانحات کے ضمن میں ریاض مجید کے قطعات ملاحظہ کیجیے:

نائن الیون کے بعد:

ایجنسیوں نے یہ آسان کام ڈھونڈ لیا
اب اپنا غصہ وہ داعش پہ سب نکالتی ہیں
جہان بھر میں ،کسی بھی جگہ، کسی بھی وقت
دھماکے جو بھی ہوں ، داعش کے نام ڈالتی ہیں (۴۵)

ریاض مجید نے سانحۂ قابل کے دل خراش منظر کو بھی بیان کیا ہے۔ یہ ایسا سانحہ رونما ہوا تھا جس میں سیکڑوں قیمتی جانیں لقمۂ اجل بنی تھیں۔ یہ ایسا کرب ناک حادثہ تھا، جس نے اغیار کو بھی اشک بار کر دیا تھا۔ اُنھوں نے برطانیہ میں ہونے والی حادثوں کی خبر کا بھی تذکرہ کیا ہے، جس کے در پردہ محرکات کی سراغ رسانی کے لیے دعوتِ تحقیق بھی شامل ہے۔ ایران میں ہونے والے دھماکوں کے بارے میں ریاض مجید اس خدشے کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ اُمّتِ مسلمہ کو تقسیم کرنے کی ایک گھناؤنی سازش ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ ایسا کرنے والے کہی بار پہلے بھی شیعہ سنی فسادات کی آڑ میں اپنے عزائم پورے کر چکے ہیں۔ ان کی تشویش ایک صِحّت مند سوچ رکھنے والے فرد کی تھی۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عوام کے جذبات اس حوال سے کس قدر جذباتی ہو سکتے ہیں۔ اس حوالے سے قطعات دیدنی ہیں:

برطانیہ کے دھماکے:

لرز لرز اٹھا دل اس خبر کے سنتے ہی
،جو کتنے وسوسے ہم راہ اپنے لائی ہے
عقب میں اس کے نہ سازش ہے کوئی در پردہ
خبر دھماکوں کی برطانیہ سے آئی ہے (۴۶)

سانحۂ احمد پور شرقیہ میں عید کے موقع پر کئی جانیں آگ میں جل کر خاکستر ہو چکی تھیں۔ یہ ایسا کرب ناک واقعہ تھا، جس پر ہر آنکھ اشک بار تھی۔ شاید ہی کوئی ہو گا، جس نے اس سانحے کے اثرات قبول نہ کیے ہوں۔ ریاض مجید جیسا حساس اور درد مند دل رکھنے والا شخص کیسے چپ رہ سکتا تھا۔ چناں چہ اُنھوں نے اس حادثے کے بارے میں مقدور بھر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا لفظ لفظ خون کے آنسو روتا اور بلکتا دکھائی دیتا ہے۔

لاہور میں ہونے والے دہشت گردی کے واقعات نے ہر طرف خوف ہراس کی لہر دوڑار کھی تھی۔ یہ دور ہی ایسا تھا کہ آئے روز کوئی نہ کوئی دھماکا ضرور ہوتا تھا۔ ایک طرح سے حکومت کی رِٹ ناکام ہو چکی تھی، چناں چہ حکومتِ وقت نے خود کو سنبھالا اور پاک فوج کے تعاون سے اس دہشت گردی کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ عوام میں اتنا خوف وہراس تھا کہ کسی کو کوئی اُمّید

نہیں تھی کہ باہر جانے والا زندہ سلامت واپس آسکے گا کہ نہیں ۔اس دہشت گردی میں کئی ماؤں کے لال لقمۂ اجل بنے اور سینکڑوں عورتوں کے سہاگ چھنے ۔ سیکڑوں بچّے یتیم ہوئے۔پاکستان کی تاریخ کا یہ انتہائی کرب آمیز اور خطرناک دور تھا ،جہاں ہر روز کوئی نہ کوئی دل خراش دھماکے کی خبر گوش زد ہوتی تھی۔ غرض خوشی کی خبر سننے کو کان ترس گئے تھے۔

سانحۂ ماڈل ٹاؤن لاہور کو بھی آج کئی سال ہوگئے ہیں، لیکن آج بھی شہدا انصاف کی لیے بے چین کھڑے ہیں۔اس کی رپورٹیں بھی منظرِ عام پر آئین، مگر فیصلہ کن مرحلہ ابھی باقی ہے۔ جس دن یہ واقعہ رونما ہوا ریاض مجید بھی اِنھی دنوں تاریخ کو ادب کے آئینے میں بند کرنے کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔چناں چہ اُنھوں نے اس وقت تک کی ہونے والی پیش رفت کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ایسے سانحات سے قطع نظر ریاض مجید نے دیگر موضوعات کو بھی شعری پیکر عطا کیے ہیں، جن کے لیے ان قطعات رجوع چاہتے ہیں۔ درج بالا سانحات کے حوالے سے ریاض مجید کا قطعہ ملاحظہ کیجیے:

سانحۂ لاہور:

دور ہوئے نا ،ملک سے سائے دہشت کے
ختم نہ دہشت گردی کا طوفان ہوا
چیر گئی لاہور کو پھر دہشت کی لہر
دل پنجاب کا پھر سے لہو لہان ہوا (۴۷)

پڑوسی ملک بھارت کی ریشہ دوانیاں:

ریاض مجید نے پڑوسی ملک کی عیاری اور مکاری پر گہری نظر رکھی ہوئی ہے۔وہ بین الاقوامی معاملات کے بھی شناور واقع ہوئے ہیں۔ پُڑوس میں ہونے والی بھارت کی انتہا پسندی اور ان کے جانب دارانہ رویّے سے پاکستان تو کیا ہر ملک کے شعرا و ادبا نالاں ہی دکھائی دیتے ہیں۔ صرف یہاں تک بس نہیں اب تو ان کے اپنے فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی ان کی جارحیت سے تنگ آچکے ہیں۔ بھارت دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا دعوے دار ہے ،جب کہ وہاں دنیا کی سب سے بری جمہوریت پائی جاتی ہے۔

تاریخ اچھّی طرح گواہ ہے کہ بھارت میں ہندوانہ انتہا پسندی عروج پر ہے۔ آج کل کے مودی نظام نے تو ہندتوا راج کو اپنا نعرہ بنایا ہوا ہے۔ انتہا پسند ہندوؤں نے ہندوستان میں مسلمانوں کا جینا دوبھر کر کے رکھ دیا ہے۔ان کے ظلم وستم کی داستانیں دنیا کے سامنے عیاں ہیں، لیکن وہ اپنی عیاری سے کسی طور باز آنے والے نہیں ہیں۔

ریاض مجید نے مودی کی انتہا پسندی کو جا بہ جا اپنے کلام میں موضوع بنایا ہے۔ وہ للکار للکار کر کہتے ہیں کہ مودی ہندوستان کی تباہی کے درپے ہے۔ عالمی طاقتیں اس کا تماشا نہ دیکھیں بل کہ اس کی اقلیت کش پالیسیوں کی نہ صرف مُذمّت کریں بل کہ اسے خبر دار کریں کہ وہ بھارت میں اقلیتوں کے حقوق کا خیال رکھے۔ مودی کے مذکرات کرنے کے بارے میں ریاض مجید نے اس کے تعصُّبانہ اور جانب دارانہ رویّے پر پاکستانی حکمرانوں کو خبر دار کیا ہے کہ وہ مذاکرات کا مذاق کیے جا رہا ہے۔ اس کے در پردہ بھی اس کی ہندتو اپالیسی کار فرما ہے۔ اس بات سے ہر کوئی اچھّی طرح با خبر ہے کہ بھارت کشمیر کو اپنا اندرونی مسئلہ قرار دیتا ہے۔ اس لیے وہ اس پر بات کرنے کو کسی طور پر تیّار نہیں ہے۔ کشمیر کے علاوہ وہ پاکستان کی بات ہر فورم پر سننے کو تیّار ہے، لیکن کشمیر کے علاوہ اور کسی معاملے پر پاکستان اس کے ساتھ بات نہیں کرنا چاہتا:

مودی کا اقلیت دشمن رویّہ:

اقلیّتیں دیواریں ہیں گر ، ان کو گرائیں
معلوم ہے سب کو کہ ہے ، یہ چھت کی تباہی
مودی نہ پڑھے ، دنیا تو پڑھ سکتی ہے اس کو
دیوار پہ لکھی ہے جو بھارت کی تباہی (۴۸)

بھارت کا یہ دیرینہ طرزِ عمل ہے کہ وہ ہمیشہ اِنتخابات میں پاکستان دشمنی اور کشمیر کا کارڈ کھیل جاتا ہے۔ بی جے پی کی یہ چال ہر بار بڑی آسانی سے الیکشن میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ پھر اسی مسلم دشمنی میں یہ جماعت بھارتی عوم کو اگلے الیکشن تک اُلّو بنائے رکھتی ہے۔ حال آں کہ بھارت میں بھی امن پسند ہندوؤں کی تعداد کم نہیں، لیکن پاکستان دشمنی کا کارڈ بی جے پی ہمیشہ کھیل جاتی ہے اورر اس میں وہ کامیاب بھی ہو جاتی ہے، چناں چہ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ بھارت میں مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت دیدنی ہے۔ اِنتخابات میں بھی ان کی نمایندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسی طرح بھارت میڈیا بھی مودی سرکار کو کٹھ پتلی کا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس طرح وہ ملک دوستی کی آڑ میں ملک دشمنی کا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔ بھارت کے اس ظلم و ستم اور انتہا پسندانہ رویّے کے بارے میں ریاض مجید کا قطعہ دیکھیے:

بھارتی مسلمان:

اِنتخابات میں کیسے نظر انداز ہوئے
ہوئی کس طور سے پس پائی مسلمانوں کی؟
یوگی اب چیف منسٹر ہیں، خدا خیر کرے
شامت اس بار بھی ہے آئی مسلمانوں کی! (۴۹)

بھارت کی پاکستان میں در اندازی اور دہشت گردی کے فروغ میں کیے جانے والے گھناؤنے کردار کی زندہ مثال کلبھوشن یادیو کا پکڑا جانا اور دہشت گردی کے جرائم کا اعتراف ہے، جس کو دنیا نے بھی تسلیم کر رکھا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بھارت نے کلبھوشن کو 'را' کا ایجنٹ ماننے سے صریحاً انکار کر رکھا تھا، لیکن اس کی سزائے موت کے بعد اب عالمی سطح پر پروپیگنڈا کیے جا رہا ہے۔ یہ بھارت کی دہشت گردی اور دوسرے ممالک کی حدود کی خلاف ورزی کی زندہ مثال ہے۔ بھارت کی انتہا پسندانہ سوچ ایک عرصے سے خِطّے کے امن وامان کو داؤ پر لگائے ہوئے ہے۔ یہ بات اور بھی تشویش ناک ہے کہ اب امریکہ ،بھارت اور اسرائیل کا اِتّحاد ہو چکا ہے۔ یہ تینوں ممالک مسلم کش پالیسیوں کے علم بردار ہیں اور دنیا سے اسلام کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ امریکہ کی شہ پر بھارت رہی سہی کسر بھی نکالنے پر تلا ہوا ہے۔ ریاض مجید نے بھارت کے اس مکروہ چہرے کو اپنی شاعری میں بے نقاب کیا ہے۔ اس حوالے سے ریاض مجید کے قطعات بہ طورِ مثال ملاحظہ ہوں:

کلبھوشن:

کلبھوشن اس نے بھیجا تھا جاسوس ایک اِدھر
بھارت یہ ماننے سے مگر تھا گریز پا
اس کو سزائے موت کا اعلان کیا ہوا
اب تلملائے جاتا ہے بھارت کا میڈیا (۵۰)

کشمیر پر کیے جانے والے مظالم:

ریاض مجید نے اپنے قطعات میں کشمیر پر کیے جانے والے مظالم کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے۔ وہ بھارتی جارحیت اور کشمیریوں پر کیے جانے والے مظالم کی کھل کر مذمّت کرتے آئے ہیں۔ بھارت کی کشمیری مسلمانوں پر بپا کی جانے والی ظلم کی داستان سے کون واقف نہیں ہے، لیکن مسئلہ کشمیر کی طرف عالمی برادری کی بے حسی بھی اپنی جگہ ایک سوالیہ نشان ہے۔

اب تو بھارتی جارحیت اور ظلم وستم اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ ۵/ اگست ۲۰۲۰ء کو کشمیر کی جغرافیائی حیثیت ہی کو بدل کر بھارت کا ایک نیا صوبہ بنا دیا گیا ہے اور نہتے کشمیریوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ دیے گئے ہیں۔ کشمیری مسلمان گزشتہ ایک سال سے بھارتی جبر کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ تاریخِ انسانی میں یہ پہلا واقعہ رونما ہوا ہے کہ جب ایک سال سے زائد عرصے تک کسی قوم پر کرفیو لگا کر زندگی کا پیمانہ تنگ کر دیا گیا ہو۔ تاریخ میں ایسی انسان کشی کی بھیانک مثال نہیں ملتی۔

کشمیر کی آزادی کے حق میں پوری دنیا میں یومِ سیاہ منایا گیا اور بھارت کا مکروہ چہرہ دنیا کے منصفوں کو دکھایا گیا۔ اب وہ دن دور نہیں جب کشمیری عوام کے حقِ خود ارادی کو تسلیم نہ کیا جائے۔ بھارت نے آزادی سے لے کر اب تک گزشتہ سات

عشروں سے زائد عرصے میں کشت وخون کا، جو بازار گرم کر رکھا ہے، اب یقیناً اس کا انت ہونے کو ہے۔ بھارت کے کشمیر کر کیے جانے والے مظالم اور ظلم و بربریت کے بارے میں ریاض مجید کا قطعہ دیکھیے:

مقبوضہ کشمیر:

ظالمانہ ہے بہت کشمیر میں
بربریت بھارتی افواج کی
خون آلودہ کیے ہیں مَرغزار
چادرِ امن و اماں تاراج کی (۵۱)

غرض ریاض مجید نے قطعہ نگاری کے ضمن میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے قطعات کے دو مجموعے خبر اخبار اور ذکر اذکار کے نام سے منصّۂ شہود پر آ چکے ہیں۔ اوّل الذکر مجموعے میں اُنھوں نے بالترتیب یکم/ اکتوبر ۲۰۱۵ء تا ۲۳/ جون ۲۰۱۶ء تک لکھے جانے والے ہر تاریخ کے مطابق تاریخ وار قطعات کو شامل کیا ہے۔ مؤخر الذکر مجموعے میں ریاض مجید کے تاریخ وار بالترتیب ۱۶/ مارچ ۲۰۱۷ء تا ۱۳/ دسمبر ۲۰۱۷ء تک یومیہ بنیادوں پر تخلیق کردہ قطعات شامل ہیں۔ دونوں مجموعہ ہائے قطعات میں ریاض مجید نے اڑھائی اڑھائی سو کے تناسب سے کل پانچ سو قطعات تخلیق کرتے ہوئے نہ صرف مِعیار بل کہ مقدار کا بھی اعتبار قائم کیا ہے۔

ان قطعات کی خوبی یہ ہے کہ ریاض مجید نے اُن ایّام میں رونما ہونے والے تاریخی واقعات اور سال کے مخصوص ایّام کے تناظر میں رونما ہونے والے عالمی معاملات کو بھی نذرِ شعر کیا ہے۔ قطعے کی روانی اور موزونی کے باعث ریاض مجید کسی بھی موضوع پر فی البدیہہ قطعہ کہنے پر قادر ہیں۔ یہاں اُن کے کمالِ فن کے سامنے بڑے بڑے قادر الکلام شعرا سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ ریاض مجید نے حالاتِ حاضرہ سے لے کر زندگی کے تمام شعبہ جات میں طبع آزمائی کی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو گا، جس پر ریاض مجید نے قلم نہ اُٹھایا ہو۔ اُن کے قطعات اُن کی بصیرت اور وسیع مطالعے کے ساتھ زیرکی کا پتا دیتے ہیں۔

ریاض مجید حالاتِ حاضرہ اور عصری سیاست پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ جب سے اُنھوں نے تاریخ وار قطعات بندی کا اہتمام کیا ہے، شاید ہی کوئی ایسا سیاسی منظر نامہ ہو گا، جو ریاض مجید کے بیانیے سے دامن کشاں ہو سکا ہو گا۔ اُن کے دونوں مجموعوں میں کثیر تعداد میں سیاسی حوالے سے قطعات موجود ہیں، جو اُن کی سیاست پر گہری نظر کا بین ثبوت ہیں۔ وہ عدالتی نظام کی کم زوریوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے، حقیقی احتساب کی روح دیکھنے کے آرزو مند ہیں۔ وہ بلدیاتی نظام کے قائم کرنے کے لیے سیاسی رہ نماؤں کے تابڑ توڑ حربوں اور دوسروں کی چت کرنے کی ریشہ دوانیوں کا ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں بڑا

کامیاب نقشہ اُتارتے ہیں۔ اُنھوں بڑے شیریں انداز میں سیاسی نمایندوں کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اُن کے اس قبیل کے قطعات زُبانِ خلق کا انداز رکھتے ہیں۔

متذکرہ بالا دورانیے میں ریاض مجید نے نو بہ نو موضوعات کو قطعات میں بیان کیا ہے۔ اس دوران میں رونما ہونے والے جُملہ واقعات کا ایک طرح سے اُنھوں نے تاریخ نامہ مُرتّب کر دیا ہے۔ اس پر مستزاد ان کا سادہ اور بے پیچ اُسلُوب ہے، جس کے ذریعے سے وہ اپنی رائے کا اظہار بھی بڑی شیرینی اور شگفتگی سے کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے مختلف شخصیات کو ان کے کارہائے نمایاں کی انجام دہی کی بدولت خراجِ تحسین بھی پیش کیا ہے۔ وہ قومی حیثیت کی حامل شخصیات کے سانحاتِ ارتحال پر اشک فشاں بھی ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں پاکستان میں اور بین الاقومی سطح پر رونما ہونے والے وقعات اور سانحات کو بھی ریاض مجید نے موضوعِ سخن بنایا ہے۔

ریاض مجید نے ملکی ضرورت کے پیشِ نظر بہت سے موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ چوں کہ وہ ان سب واقعات کے عصری گواہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے ان کی ذات رائے اور مشاہدات دیدنی ہیں۔ اُنھوں نے ان قطعات میں پاکستانیت اور جذبۂ حُب الوطنی کی بات کی ہے۔ وہ پاکستانی اداروں کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کی ترقّی کو وہ پاکستان کی ترقّی سے عبارت گردانتے ہیں۔ پاکستانی فوج کے کردار اور ملک سے دہشت گردی کے خاتمے کے حوالے سے ریاض مجید نے مسلسل لکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دور پاکستانی تاریخ میں دہشت گردی کے حوالے سے عروج پر تھا۔ اُنھوں نے ملکی سالمیت کے لیے اپنی قیمتی جانوں کی قربانی دینے والے شہدا کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

مذہب، صحافت، معاشرت، فنونِ لطیفہ اور کرکٹ کے حوالے سے ان کے قطعات بے لاگ تبصروں پر مبنی ہیں، جن میں ان کی ماہرانہ رائے وقعت رکھتی ہے۔ اُنھوں نے دہشت گردی کے حوالے سے بھارت کے مذموم عزائم اور نہتے کشمیریوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کو بھی بڑی شد و مد سے بیان کیا ہے۔ ان موضوعات کے علاوہ روزانہ کی بنیاد پر ایسے بے شمار موضوعات بھی ہیں، جن پر ریاض مجید نے خامہ فرسائی کی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ قطعہ نگاری کے باب میں بھی ریاض مجید غزل، نظم اور نعت کی طرح ایک مکمل شناخت اور پہچان و اعتبار رکھتے ہیں، تو یقیناً درست ہو گا۔ اس حوالے سے بھی وہ اسی داد کے مستحق ہیں۔ ان کا یومیہ مُرتّب کیے جانے والا قطعات کا تاریخ نامہ واقعی ایک اہم کارنامہ ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا،اُردُو کی قدیم اصنافِ شعر، آئینۂ ابد،لاہور، س ن، ص۳۱۶

۲۔پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، نئے الفاظ،اُردُونامہ،لاہور، ص۱۵۶

۳۔ریاض مجید، خبر اخبار، قرطاس پبلشرز،فیصل آباد،۲۰۱۶ء، ص۷

۴۔ ریاض مجید،ذکر اذکار، قرطاس پبلشرز،فیصل آباد،۲۰۱۸ء، ص۲۹

۵۔ ریاض مجید، خبر اخبار، ص۱۱

۶۔ ریاض مجید،ذکر اذکار، ص۶۶

۷۔ ریاض مجید، خبر اخبار، ص۲۲

۸۔ ریاض مجید،ذکر اذکار، ص۲۷

۹۔ ریاض مجید، خبر اخبار، ص۲۵

۱۰۔ ایضاً، ص۲۹

۱۱۔ ایضاً، ص۳۹

۱۲۔ ایضاً، ص۴۲

۱۳۔ ایضاً، ص۵۶

۱۴۔ایضاً، ص۹۰

۱۵۔ ایضاً، ص۱۰۵

۱۶۔ ایضاً، ص۲۳

۱۷۔ ریاض مجید،ذکر اذکار، ص۸

۱۸۔ ریاض مجید، خبر اخبار، ص۸۴

۱۹۔ ریاض مجید، ذکر اذکار، ص۴۷

۲۰۔ ایضاً، ص۸۸

۲۱۔ ریاض مجید، خبر اخبار، ص۱۱۹

۲۲۔ ریاض مجید، ذکر اذکار، ص۶

۲۳۔ ایضاً، ص۳۴

۲۴۔ ریاض مجید، خبر اخبار، ص۲۰

۲۵۔ ریاض مجید، ذکر اذکار، ص۸۴

۲۶۔ ریاض مجید، خبر اخبار، ص۸۷

۲۷۔ ریاض مجید، ذکر اذکار، ص۱۰۶

۲۸۔ ریاض مجید، خبر اخبار، ص۳۰

۲۹۔ ریاض مجید، ذکر اذکار، ص۸۲

۳۰۔ ریاض مجید، خبر اخبار، ص۱۲۱

۳۱۔ ایضاً، ص۵۱

۳۲۔ ریاض مجید، ذکر اذکار، ص۱۵

۳۳۔ ایضاً، ص۶۹

۳۴۔ ریاض مجید، خبر اخبار، ص۶۸

۳۵۔ ایضاً، ص۳۵

۳۶۔ ریاض مجید، ذکر اذکار، ص۲۷

۳۷۔ ایضاً، ص۱۰۴

۳۸۔ ریاض مجید، خبر اخبار، ص۷۲

۳۹۔ ریاض مجید، خبر اخبار، ص۹۳

۴۰۔ ایضاً، ص۵

۴۱۔ ایضاً، ص۱۰۲

۴۲۔ ریاض مجید، ذکر اذکار، ص۲۰

۴۳۔ ریاض مجید، خبر اخبار، ص۲۳

۴۴۔ ایضاً، ص۶

۴۵۔ ریاض مجید، ذکر اذکار، ص۳۹

۴۶۔ ایضاً، ص۴۵

۴۷۔ ایضاً، ص۶۸

۴۸۔ ریاض مجید، خبر اخبار، ص۸

۴۹۔ ایضاً، ص۸

۵۰۔ ایضاً، ص۱۸

۵۱۔ ریاض مجید، ذکر اذکار، ص۴۱

باب ششم:

ریاض مجید کی نثر نگاری

ریاض مجید ادبی دنیا میں اظہار کے قرینوں کے حوالے سے ایک مستقل مقام اور شناخت رکھتے ہیں۔اُردُو ادب کی شعری اصناف میں سے مروجہ ہیئتوں میں شاید ہی کوئی صنف اور ہیئت ہو گی، جس میں ریاض مجید نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ وہ اس میں ہر حوالے سے کامران رہے ہیں۔ریاض مجید کی عروض دانی بھی شعری دنیا میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔وہ نظم، غزل، نعت اور قطعہ نگاری کی دنیا میں اپنی صلاحیّتوں کا لوہا منوا کر داد پا چکے ہیں۔اُنھوں نے اظہار کے نئے قرینے کا نثری نظم کے حوالے سے نہ صرف پذیرا اٹھہرایا ہے بل کہ اس کو یہاں تک اعتبار عطا کروایا ہے کہ نثری نظموں کا مجموعہ 'نثمیں' منظرِ عام پر لے آئے ہیں۔یہ ان کی جدّت پسند طبیعت کا اعجاز ہے کہ وہ نئی چیزوں کو بڑی خوش دلی سے قبول کرتے ہیں۔اُنھوں نے دوسرے شعرا کی طرح شعر کی یک جہتی بساط پر اکتفا نہیں کیا ہے۔وہ اظہار کی رہ میں رکاوٹ ڈالنے والے عروضی پیمانوں کو ان لوگوں کے آزاد خیال کرتے ہیں، جو تخیّل کی بُلند آہنگی تو رکھتے ہیں، لیکن عروضی پابندیوں کی وجہ سے کُچھ کہہ نہیں پاتے۔ریاض مجید نے ایسے شعرا کے جدّتِ خیال کو خوش آمدید کہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ مستند شاعر ہونے کے باوجود نثم نگاری کی طرف گامزن ہوئے ہیں۔ان کی یہ کاوش جدید لکھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئی ہے، کیوں کہ اب حضراتِ معترضین ان شعرا پر اعتراض نہیں کر پاتے، جو نثری نظم کو سرے سے شاعری ہی نہیں مانتے تھے۔نثری نظم ہمارے دور کا تقاضا تھی، اس لیے ریاض مجید نے اسے خوش دلی سے نہ صرف قبول کیا بل ان کا ایک شعری مجموعہ بھی زیورِ طباعت سے آشنا ہو چکا ہے۔پروفیسر عارف رضا اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> "ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، اس لیے اِنھی کے مطابق شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔جدید دور کی حیرت ناک سائنسی ترقّیوں کی بدولت دنیا ایک بین الاقوامی گاؤں بن گئی ہے۔مختلف اقوام کی تہذیبوں کے باہمی تعامل سے زندگی کے ہر شعبے میں عملی، علمی اور فکری تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، شاعری اس سے الگ نہیں۔" (۱)

اس بات کو سبھی شعرا اور مفکرین مانتے ہیں کہ خیال بنیادی شے ہے۔اس کی ابدی حیثیت سے آج تک کسی نے انکار نہیں کیا۔پھر بھی عجب بات یہ ہے کہ ہمارے بہت سے شعرا نثری شاعری کو سرے سے ماننے کے خلاف ہیں۔حال آں کہ اُردُو زُبان سے قطع نظر دنیا کی دیگر زُبانوں مثلاً: انگریزی، فرانسیسی، اطالوی اور جرمنی جیسی بین زُبانوں میں بھی اظہار کے نثری قرینوں کی مسلمہ صورتیں موجود ہیں۔اُردُو ادب میں بھی نثری نظموں کا گزشتہ تین دہائیوں سے بڑی شد و مد سے غلغلہ ہوتا آ رہا ہے۔دل چسپ بات یہ ہے کہ اس کی شدید مخالفت کے باوجود مقتدر شعرا کا ایک جدّت پسند حلقہ نثری نظموں کی طرف راغب ہوا ہے، جس سے مخالفین کی بڑی حد تک زُبانیں بند ہوئیں ہیں۔پروفیسر عارف رضا نثری نظموں کے لیے استعمال ہونے والے ناموں اور شعرا کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''نثم کو بالعموم 'نثری نظم' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ صنف بھی انگریزی ادب کی پروز پوئم کے حوالے سے ہمارے شعری ادب میں گزشتہ بیس پچیس سال سے رائج ہوئی ہے۔ چناں چہ اس کے اوّلین لکھنے والوں میں مبارک احمد، قمر جمیل، احمد ہمیش، عبدالرشید، کشور ناہید، فاطمہ حسن اور لطیف قریشی نے اسے پروز پوئم کے ترجمے کے حوالے سے 'نثری نظم' کہا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے 'نثر لطیف' کہہ ہے۔ بقول ڈاکٹر انور محمود خالد، ہندوستان میں کسی زمانے میں اسے 'ادبِ لطیف'، 'شاعرانہ نثر' اور 'شعرِ منصور' کے نام سے پکارا گیا۔۔۔ ریاض مجید نے اسے 'نثم' کا نام دیا ہے۔''(۲)

ریاض مجید نے اس کا نظم کی مناسبت سے مختصر نام رکھا ہے، جس کے اندر ایک شعری حسن بھی کار فرما ہے۔ یہ تو وقت ثابت کرے گا کہ کون سا نام زیادہ مقبول ہوتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ رواج پذیر ہوتا ہے۔ البتہ ان سب ناموں کی اپنی ایک شناخت اور تاریخی حیثیت مسلمہ رہے گی۔ بہت سے شعرا و ادبا ریاض مجید کے نام کو اسم بامسمّٰی خیال کرتے ہوئے زیادہ معتبر جانتے ہیں۔ بہر حال نثم کی مقبولیت کی یہ بھی ایک دلیل ہے کہ مختلف نامیوں نے مختلف اوقات میں اس کے نام رکھے ہیں۔ یہی اس کو قبولیت کی ایک اہم دلیل ہے۔ ریاض مجید ایسے نابغۂ روزگار شاعر نے نثم کی طرف توجّہ کر کے نئی غیر عروضی شعرا کے لیے ایک بڑا دروازہ کھولا ہے۔ ان جیسے شعرا کی پذیرائی کی بدولت نئی شعری اصناف شاعری کے دامن کا حِصّہ بنتی ہیں۔ ریاض مجید کی اس نثری نظم کی پذیرائی کے بارے میں پروفیسر عارف رضا مزید لکھتے ہیں:

''مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ریاض مجید ادب کی تمام اصناف پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ بطنِ شعر کا شعور اور عروض و بحور پر کامل عبور رکھتے ہیں۔ شعر گوئی ان کی طبیعت میں گوندھی ہوئی ہے۔۔۔ یہ عجب بات ہے کہ پابند شاعری پر پوری گرفت رکھنے کے باوجود اور بسہولت اپنی بات کہنے کی صلاحیّت رکھنے کے باوصف انھون نے اختراعی افتادِ طبع کی بنا پر ''نثمیں'' کا مجموعہ بھی کہہ ڈالا اور جب یہ مجموعہ میرے مطالعے میں آیا تو میں حیران ہوا کہ اُنھوں نے کمال چابکدستی سے 'نثم' کے تمام تقاضوں کو پورا کیا ہے۔''(۳)

نثم کہنا بھی کُچھ نہ کُچھ فنی تقاضوں پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے سارے فنی تقاضے بات کہنے کے اُسلُوب کے گرد گھومتے ہیں۔، جو شاعر بات کہنے کا جتنا اچھّا ڈھنگ رکھتا ہے، وہ اتنا ہی اچھّا نثم گو ہو سکتا ہے۔ ریاض مجید کی نثمیں بھی ان کے نادرہ کار اُسلُوب کا بین ثبوت ہیں۔ اُنھوں نے کمال ہنر وری سے نثم کو اس وقت برتنا شروع کیا ہے، جب ابھی پوری طرح اس کا اعتبار بھی قائم نہیں ہو پایا تھا، لہٰذا ریاض مجید ان شعرا میں سے ہیں، جنھوں نے اُردُو شاعری میں دیگر اصناف کی طرح نثم نگاری کو بھی رواج دیا ہے۔ ریاض مجید کے بارے میں یہ کہنا درست ہو گا کہ ان کی طبیعت ہر رنگ میں خود کو ڈھالنے اور جلدی مثبت اثرات قبول کرنے کی صلاحیّت رکھتی ہے۔ ان کو یہ کمال حاصل ہے کہ اُنھوں نے ہر صنف میں اپنے جذبوں اور آدرشوں کا اظہار کیا ہے۔ یہ ان کی ہمہ جہتی ذہنی صفت ہے، جو بہت کم لوگوں کے نصیب میں آتی ہے۔

ریاض مجید نے اپنے شعری مجموعے نشمیں کا آغاز پہلی لوح سے کیا ہے۔اس نثم کی آخری سطریں ملاحظہ ہوں:

اے میرے آغاز!

تیرا اگر مجھ سے رابطہ ادھورا ہوتا تو۔۔۔۔۔۔

تو میری ماں کا دودھ رگیں بن کر میرے جسم میں کیسے پھیلتا؟ (۴)

ریاض مجید نے حرفِ آغاز کے نام سے ایسی موئثر فضا پروان چڑھائی ہے کہ نثم کے دیگر شعرا کے ہاں ایسا اعجاز کہاں دست یاب ہے۔اُنھوں نے صاحبِ شبِ اسریٰ کو ایک سلام میں خاص ارادت و عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے۔نعت گوئی ریاض مجید کا ایک مستقل حوالہ ہے۔نعت کی دنیا میں ریاض مجید اپنی ایک الگ تھلگ شناخت رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کا نعتیہ دیوان بھی منظرِ عام پر آ گیا ہے۔اُنھوں نے نثم کے پیرایے میں بھی نعتیہ اشعار رقم کیے ہیں۔ان کا کمالِ فن نعتیہ شاعری میں پہلے سے مسلمہ ہے، تاہم نثم میں بھی وہ ایک انوکھی شناخت رکھتے ہیں۔اس ضمن میں ریاض مجید کی نعتیہ نثم کی چند سطور ملاحظہ ہوں:

لفظ اسی چوکھٹ کی غلامی سے سرخرو ہیں

اور کلام اسی مدینے کی گلیوں کی دریوزہ گری سے بامعنی۔۔۔۔۔

اس کا ذکر لفظوں کا سب سے بامعنی آہنگ ہے

اور اس کی نعت کلام کی معراج۔۔۔۔ (۵)

ریاض مجید مختلف اصناف میں قومی شخصیات کو کارہائے نمایاں انجام دینے کی وجہ سے خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔اُنھوں نے نثری نظموں میں بھی ایسی شخصیات کو مقدور بھر خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔وہ قائدِ اعظم کی مسحُور کن شخصیت کی اعلیٰ سیاسی بصیرت اور قائدانہ صلاحیّتوں کے ہمیشہ سے قائل رہے ہیں،اسی صداقت کا اظہار اُنھوں نے "مرے قائد" نامی نثم میں بھرپور انداز میں کیا ہے۔چناں چہ ریاض مجید اپنے مخصوص بیانیے میں یوں گویا ہیں:

تو روشنی و صدا ہے

اور ہم سایہ و سکوت۔۔۔۔۔

تجھ میں اور ہم میں وہ بے کراں صحرا حائل ہیں

جو قول اور عمل کے درمیان ہر عہد میں ننگِ زیست رہے ہیں (۶)

ان سطروں میں بیان کردہ حقائق میں ایک خاص انداز میں ممدوح کی مدحت سرائی بھی ہے اور شعریت بھی۔ ایسا کم ہی ہو سکتا ہے کہ نثری نظم کا شاعر موضوع کی مطابقت سے بیان پر کڑی نظر رکھتے ہوئے اشعار نشتر کرے کہ بات دل سے نکلے اور دل پر وارد کرے۔ یہ ریاض مجید ایسے شاعر ہی کا اعجاز ہو سکتا ہے کہ وہ نثری نظم میں بھی ایسا سماں باندھے رکھیں کی بات مکمل ہوئے بغیر قاری رہ نہ سکے۔ یہ سچ ہے کہ اگر شعری مزاج نہ ہو تو نثری شاعری بھی ممکن نہیں ہو سکتی۔ ایسی سیکڑوں مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں کہ مصرعے سیدھے کرنے سے شاعری تھوڑی ہی ہو سکتی ہے۔ تک بندی کے لیے بھی معانی نہ سہی ٹوٹے پھوٹے خیال کو آہنگ ضرور عطا کرنا پڑتا ہے، لہٰذا یہ بات ماننی پڑ جاتی ہے کہ شاعری اگر مزاج میں رچی بسی نہیں ہو گی، تو شعر نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات تو شعری دنیا میں مستند ہے ہی، شعر فہمی بھی ذوقی چیز ہے۔ اچھّے شعر پر واہ کہنے والا سخن سہی کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے تب ہی جا کر بات بن سکتی ہے۔ چہ جائے کہ نثری نظم ہی کہنے پر زور دیا جائے۔ بھلا کیسے ممکن ہو پائے گا۔ مراد یہ کہ شاعری بقولِ غالب بچّوں کا کھیل تھوڑا ہی ہوا کرتا ہے۔ اس میں جہانِ معنی کی کارفرمائی اور لفظوں کی کفایت اور پہچان وغیرہ ایسے عناصر ہیں، جن کے بغیر شاعری خواہ وہ نثری ہو یا آہنگ کے سامان کے ساتھ نبھائی جائے ممکن الوقوع ہو سکتی ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ نثم نگاری بھی کوئی بچّوں کا کھیل نہیں ہے اور ریاض مجید ایسے ثقہ شاعر کے نثی کلام کو دیکھ کر ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آہنگ کے بغیر آہنگ کا کمال، یہ اِنھی جیسے شاعر کے بس کا روگ ہو سکتا ہے، سطریں سیدھی کرنے والے کا نہیں۔ کیوں کہ بقولِ غالب قدرے تصرف کے ساتھ، مدعا عنقا ہو جاتا ہے ایسے عالمِ تحریر کا۔

ریاض مجید علاّمہ اقبالؒ کی شخصیت سے بھی مختلف حوالوں سے متاثر تھے۔ وہ ان کی قومی خدمات کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اقبال کی شاعری بھی ان کے لیے بطورِ شاعر ایک مثال رکھتی ہے۔ ان کی نظر میں اقبال ایک مجددِ عصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اقبال کی شاعری کو بار بار سراہتے ہیں۔ اُنھوں نے کئی بار اقبال کو شعری خراج پیش کیا ہے۔ ان کی غزل ہو یا نظم، قطعہ ہو یا آزاد نظم، وہ ہر صنف اور ہیئت میں اقبال کے فن اور فلسفے کے لیے رطبُ اللّسان رہے ہیں۔ نثری نظم میں ریاض مجید نے اقبال کی آفاقی شاعری کو ادب کی عُروقِ مردہ میں ایک تحرک پیدا کرنے کا آلہ کار بتایا ہے۔ اُنھیں اس بات کا بھی شدت سے احساس رہا ہے کہ ہم نے اقبال نے فلسفے کو محض گائیکی کی نذر کر رکھا ہے۔ پیامِ اقبال کی اصل روح سے ہمارے شعرا اور قارئین بالکل کور باطن اور تہی دست رہے ہیں۔ ورنہ اقبال جیسا شاعر اور فلسفی تو زندہ قوموں میں ہمیشہ باعثِ افتخار رہا ہے۔ وہ پاکستانی قوم سے اس حوالے بھی گلہ مند رہے ہیں کہ اقبال شناسی میں ہم نے اپنے آپ کو دوسروں کا محتاج بنا رکھا ہے۔ یہ امر بھی مبنی بر حقیقت ہے کہ ہمارے عہد میں ایسی بہت کم ہستیاں رہی ہیں، جو اقبال شناسی میں اہم نام تھیں، وقت نے اب ہمیں اقبال کے پیغام کو سمجھنے کے لیے اوروں کا محتاج کر دیا ہے۔ اقبال ناشناسی کی یہ روایت ہمارے لیے ایک بہت بڑے بحران کا سامان کرتی جا رہی ہے۔ ریاض مجید ہمارے ان بزرگوں کی باقیات میں سے ہیں، جنھوں نے فکرِ اقبال کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی تھیں اور بہت سے افراد تو ایسے بھی ہو گزرے ہیں کہ جنھیں اقبال سے ملاقاتوں کا بھی شرف حاصل رہا ہے۔ اس

حوالے سے ریاض مجید اقبال کے قریبی افراد کے ساتھ ملنے اور اقبالیاتی ادب پر بات کرنے کا شرف رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے اقبال کے فرزند ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کی وفات پر ایک قطعہ لکھا ہے، جس میں وہ اقبال شناسوں اور فکرِ اقبال کے حقیقی پیامیوں کی ایک ایک کر کے رخصت ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے، اقبالیاتی فلسفے سے اپنی قوم کے تہی دستی او کور باطنی کا گلہ کرتے ہیں۔ اُنھوں نے نثم میں بھی اقبال کی شاعری اور ر فکر کو خراجِ تحسین پیش اپنے فرائض میں شمار کیا ہے۔ چناں چہ ریاض مجید کی اس نثم بنام ''اقبالؒ'' سے چند سطریں ملاحظہ کیجیے:

تو نے نظریے کو نعرہ کی تنگ نائے سے نکال کر آفاقیت کے محیط سے متعارف کرایا

ہمارے ادب کی مردہ رگوں میں تری سر سراہٹ نہ ہوتی تو ہمیں

احساس بھی نہ ہو تا ہم خیر کے کس معدن اور یقین کے کس اثاثے سے محروم ہیں! (۷)

ریاض مجید ہمارے قومی ہیروز کی ارادت مندی کی طرح وطنِ عزیز پاکستان سے بھی دلی ارادت رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ملکِ پاکستان اسلام کا ایک مضبوط قلعہ ہے۔ یہ اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے، اس لیے وہ پورا یقین رکھتے ہیں کہ یہ اسلام کے نام کے ساتھ تا قیامت زندہ رہے گا۔ دنیا کی کوئی بھی طاقت اسے خواہ کتنی ہی اندرونی و بیرونی سازشیں کر لے، صفحۂ ہستی سے نابود نہیں کر سکتی۔ یقین کی اس قوت کے ساتھ ریاض مجید وطن دوستی کے گیت گاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آڑے سے آڑے وقت میں بھی ان کی شاعری اور رپیام بری میں رجائیت کے علاوہ کوئی چیز نہیں دکھائی دیتی۔

اسلام اور پاکستانیت کے بعد دنیامیں اگر ریاض مجید نے کسی اور چیز کو قابلِ قدر اور قوعت پذیر جانا ہے، تو وہ ہماری قومی زُبان اُردُو ہے۔ اُنھیں اپنی قومی بان سے قوم اور ملک کی طرح پیار ہے۔ وہ اُردو زُبان کو پاکستانیت اور ملکی اِتّحاد کی ضمانت تصوّر کرتے ہیں۔ وطن پرستی کی طرح اُردُویت پرستی بھی ان کے رگ وپے میں سرایت شدہ ہے۔ وہ اُردُو زُبان کو ایک چھت قرار دیتے ہوئے ان افراد کو پیغام دیتے ہیں کہ ہماری قومی زُبان ایک شیرازے کا کام کرتی ہے۔ ریاض مجید کا یہ واضح پیغام ان افراد کے لیے تازیانے کی حیثیت رکھتا ہے، جو اُردُو زُبان کے مقابلے میں کسی بھی مقامی زُبان کو اوّلیت دینے کے درپے ہیں۔ اُنھوں نے بڑے خُوب صُورت انداز میں ایک تمثیل کے ذریعے سے اس حقیقیت کو واضح کیا ہے کہ عالی وقار چیزیں اپنی وقعت اور ارفعیت میں مقام نہیں کھتی۔ ان کے نزدیک اُردُو زُبان بھی دسری زُبانوں کے مقابلے میں یہی اِتّحادی عنصر رکھتی ہے۔ ان کی یہ پیغام رسانی ایک نصب العین اور واضح منشور کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ضمن میں ریاض مجید کی نثم کی چند سطریں ملاحظہ کیجیے:

اُردُو چھت ہے

اور پاکستان کی دوسری زُبانیں وہ سرِبُلند دیواریں، جن سے یہ چھت بُلند ہے

دیواریں جتنی اونچی ہوں گی چھت اتنی ہی سر بُلند ہو گی

دیواریں چھت کو پھاڑ کر اُوپر نہیں جاسکتیں

ان کا وجود بہر حال چھت کے تابع رہنا چاہیے

اے میرے وطن کی پیاری زُبانو!

اسی چھت کے سایہ میں پھلو پھولو

اور اپنے روز افزوں بُلند ہوتے وجود سے چھت کو بھی سر بُلند کرتی جاؤ (۸)

ریاض مجید نے اپنی نثموں میں تشبیہ اور استعارے کے ساتھ علامتی انداز کو بھی بھرپور انداز میں برتا ہے۔ وہ تزئینِ شعر کی جُملہ نزاکتوں سے بہرہ مند تھے، اس لیے وہی شعری التزام نثموں میں بھی روا رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے اس حوالے سے کمال ہنر وری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے مزاج میں نئے امکانات کی تلاش کا عنصر تو تھا ہی، لیکن اچھّی بات یہ ہے کہ وہ اظہار کے لیے استعمال ہونے والے وسیلوں کے بھی پارکھ واقع ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے اس میدان میں بھی فکر و فن کو ایک خاص آنچ پر رکھ کر شاعری کو دو آتشہ کیا ہے۔ ان کی نثموں میں شعری لذّت کے عناصر کی کار فرمائی نے اُنھیں دوسروں سے الگ اور ممتاز مقام عطا کر رکھا ہے۔ ریاض مجید نے نثم کے باب میں نئی لکھاریوں کے لیے ایسی راہ ہموار کی ہے کہ ہزار اختلافات کے باوجود اُنھیں ایک ایسا راہبر میسّر آیا ہے، جو ان کے سامنے ایک ایسا تحفّظی بند باندھنے میں کامران رہے ہیں کہ حضراتِ معترضین سے ان کی گلو خلاصی یقینی ہوئی ہے۔ نئے لکھاری اس حوالے سے بامراد رہے ہیں کہ اُنھیں اس محاذ پر سنبھالا دینے والا ایک بڑا نام سامنے کھڑا ہر وار کا مردانہ وار جوب دیتا دکھائی دیتا ہے۔

ریاض مجید نے ایسے افراد، جو شعری ادب کے لیے پرانے خیالات کی خاطر سب کُچھ قربان کرنے کا عزم رکھتے ہیں، کو ایک واضح پیغام دیا ہے کہ اب پرانے خیالات بغاوت پر اترنے والے ہیں۔ شاعری اور شعر فہمی کا بستہ اب یکسر بدلنے والا ہے۔ اس تبدیلی کے قبول کیے بغیر اب چارہ کار نہیں ہے، لہٰذا پرانے خیالات اور روایت پرستی کو مثبت طور پر قبول کرنے کے ساتھ ساتھ نئے اظہار اور امکانات سے بھی کسی طور پر گریز پائی ممکن نہیں۔ کیوں کہ شاعری شاعر عوام کے لیے کرتا ہے اور فی زمانہ شعر فہمی کا ذوق اور مزاج بدل چکے ہیں۔ وہ پرانے ذوقی اب شعرا کو کہاں دست یاب ہوں گے، جو شعرا کی رُجعت پسندانہ فکر کے متعامل ہوں گے۔

اس حوالے سے ریاض مجید کا موٗقف صداقت پر مبنی ہے کہ نری رُجعت پسندی سراسر خرابی کا پیش خیمہ ہو گی، لہٰذا جن چیزوں کو زمانہ قبول کرنے کا مذاق رکھتا ہے، ان سے منحرف ہونا کہاں کہ عقل و دانش ہے۔ ان کے خیال میں شعرا کو بھی مذاقِ زمانہ کے ساتھ حالیؔ کی طرح "چلو تم اُدھر ہوا ہو جدھر کی" کے مصداق عمل پیرا ہونا چاہیے۔ اس بات سے کون انکار کرتا

ہے کہ شعرا اپنی شاعری میں کلاسیکی آن بان کا خیال نہ رکھیں ۔یہ تو ہمارا ادبی ورثہ ہے، جس پر ہم جتنا فکر کر سکیں کم ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ رُجعت پسندانہ خیالات اور کلاسیکی آن بان میں فرق وامتیاز روا رکھا جائے۔

ریاض مجید نے اظہار کی نئی نزاکتوں کو برتنے میں شعرا کو ایک حوالے سے محاذ آرای سے باز رکھا ہے اور اُنھیں کھلے دل سے نئے اسالیب اور ذائقوں کی دعوت دی ہے۔وہ اُنھیں یہ سمجھاتے ہیں کہ غالبؔ ایسا شاعر بھی اگر اس وقت منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ایک نو آموز زُبان میں اظہار کو کسرِشان نہیں سمجھتا، تو اُنھیں بھی اسالیبِ نو کے ان سانچوں سے انکار نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ یہ وقت نے ثابت کرنا ہوتا ہے کہ کون سی صنف اور کون سا قرینۂ اظہار کس وقت کے ذوق کے ساتھ بلا کھاتا ہے۔غالبؔ اپنے وقت میں جس چیز کو زُبان کے ذائقے بدلنے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے،وہ آج دنیا کی دوسری بڑی زُبان بننے کی دعوے دار ہے اور غالب کا وہی کلام آج ان کی انفرادیت کا ضامن ہے۔اس سے بڑی اور دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ رُجعت پسندی کسی بھی شخص کو انفرادی طور پر ایک خاص وقت کے لیے بند باندھنے پر تو مجبور کر سکتی ہے، لیکن طویل وقت تک اس پر کار بند رہنا مذاقِ زمانہ کے یقینا منافی ہے۔وہ مختلف پیرایے میں شعرا کی رُجعت پسندانہ سوچ کے خلاف ایک واضح موٴقف رکھتے ہیں۔اکبر جیسا شخص اکبر وقت کی رو کے خلاف اگر زیادہ دیر کے لیے بند نہیں باندھ سکا، تو ہمارے عہد کے شعرا شاید اس حوالے سے موٴثر آواز پیدا نہ کر پائیں۔وقت اپنا مزاج خود بھی متعین کرتا ہے۔اس کی موافقت ہی لکھاریوں کو زیب دیتی ہے۔ریاض مجید کا منفرد اظہار یہ ''رُجعت پسندوں کے لیے ایک نظم'' نامی نثم میں ملاحظہ ہو:

امکان کی خُوش بُو کو قید رکھنے والے درختوں کے تنو!

کیا چھال کی اپنی مہک نہیں ہوتی؟

اور کیا چھلکے کا اپنا ذائقہ نہیں ہوتا؟

بلاشبہ اجنبی تازگی مانوس کہنگی سے ایک صف پیچھے ہے

مگر اس کے وجود کا انکار۔۔۔۔۔

وجود پر اکتفا اور اپنی ذات کے وجود کا انکار ہے (۹)

اسی سلسلے کی کڑی ریاض مجید کی ایک اور نثم بہ عنوان '' بے جہت جدّت پسندوں کے لیے'' بھی ان کی متوازن سوچ اور شاعری کے ارتقا کے سلسلے کی اہم کڑی ہے۔اس نثم میں ریاض مجید ایسے بے لگام جدّت پسندوں کو بھی رہِ راست اختیار کرنے کی صلاح دیتے ہیں۔وہ بے جہت شعرا کی رنگینی بیان کو بھی اسی طرح قابلِ مُذمّت قرار دیتے ہیں، جس طرح اُنھوں نے درج بالا نثم میں رُجعت پسندی کو مذاقِ زمانہ کے منافی قرار دیا ہے۔اُنھوں نے ایسا کرنے والے ساتھوں کے بے وقوفانہ حماقتون

کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ اُنھیں فطرت کے تقاضوں کی شناسائی کا درس دیتے ہیں تا کہ وہ اس خیالِ خام سے باہر نکلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ جتنا جلدی اس بات کو تسلیم کریں گے ان کے لیے بہتر یہی ہو گا:

میرے بے وقوف ساتھیو!

ایک آنکھ بند کر کے دیکھا کرو

اپنی ایک ٹانگ ننگی کر کے چلو

اپنی عورتوں سے کہو کہ وہ منھ کے راستے بچّے جنیں

کیوں کہ فطرت کے الٹے رخ پر بہنا

گمنامی کے گہن سے نکلنے کا زود اثر وسیلہ ہے (۱۰)

ریاض مجید نے ''نثم کے دفاع میں'' ایک نثم لکھی ہے جس میں وہ رُجعت پسندی اور بے جہت جدّت پسندی کو ایک جہت اور توازن عطا کرتے ہیں۔ اُنھوں نے نئے مذاقِ زمانہ کو اپنانے کے درپیش کسی مضائقے کے نہ ہونے کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ بات وہی ہے جس کا درج بالا اقتباسات میں وضاحت سے بیان ہو چکا ہے۔ چناں چہ وہ جدید شعرا کو ہیئتوں کے پرانے سانچوں سے آزاد کروانا چاہتے ہیں۔ وہ نئے زمانے کی نئی فضا میں تازہ سانسیں لینے کی ترغیب دیتے ہیں۔

نئے امکانات کی تازہ کاری اور موجودہ زمانی فضا کے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کرنے میں مضائقہ ہی کیا ہے۔ جدید شعرا ابھی تو پرانے سانچوں اور ہیئتوں کو نئے اسالیب کے ساتھ زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ریاض مجید ان میں تازہ روح پھنکنے کے متمنی ہیں۔ اُنھوں نے نئے کہنے والوں کے لیے ایک بہت بڑی بات کی ہے کہ زمین کے آبلے سخن وری کے سدِ رہ ہیں، ان کی دامن کشائی کے بغیر بہت سی نئی باتیں، جو ہر حوالے سے انسانیت کے جذبات کی حقیقی ترجمانی کرتی ہیں رہ جاتی ہیں۔ کیوں کہ عروصی پیمانے ان کی راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے ریاض مجید کی مذکورہ نثم کی چند سطریں ملاحظہ کیجیے:

یاد رکھو!

ہوا اپنے تلے راستوں پر نہیں چلتی

نئی ہیئتیں پرانے ناموں سے زندہ نہیں رہ سکتیں

سو زمین کے آبلے سے پاؤں چھڑاؤ

اور درختوں پر شاہراہیں تعمیر کرو! (۱۱)

ریاض مجید نے بڑے موثر پیرایے میں اس نکتے کی صراحت کی ہے کہ ان کی شاعری کی وجودی حیثیت کیسے رونما ہوتی رہی ہے۔ وہ پابند شاعری کے پیکروں کی بابت بھی اپنا ایک نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ گویا ان کی غزل اور نظم شعری اُفق پر کسی طرح سے بے ،جواز نہیں رہی ہے۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو ایک طرح سے ادبی کٹہرے میں ادب شناسوں اور ادب دوستوں کی عدالت میں کھڑا کرتے ہوئے اپنی شاعری کے ،جواز میں دلائل بھری بحث خود کی ہے۔ اس حوالے سے ریاض مجید اپنی شاعری کے سب سے بڑے وکیل کے روپ میں ہمارے سامنے از خود آجاتے ہیں۔ ان جیسی ذاتی وضاحت اور شعری، جواز کی کیفیت شاید ہی کسی شاعر نے پیش کر رکھی ہو۔ فی الحقیقت اُنھوں نے ادب کی عدالت میں یہ مقدمہ اس لیے لڑا ہے کہ وہ جدید تقاضوں کو نبھانے کے امکانات روشن کرنے کے خواہاں تھے۔

ریاض مجید کی شاعری میں بھی اُسلُوب سے قطع نظر خیال آرای اہمیت کی حامل رہی ہے۔ وہ تخیّل کو کسی صورت بھی لفظی قبول ورد کی نذر نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ ان جیسا نابغۂ روز گار شاعر ایسی سستی شہرت کا متعامل ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ اظہار کے قرینے اور سلیقے سے اچھّی طرح باخبر ہیں۔ وہ اچھّی طرح جانتے ہیں کہ کون سی بات کس ہیئت اور فارم میں پیش کی جائے تو زیادہ معنی خیز ہو گی اور زمانے کا مذاق بھی اسے کس نہج پر قبول کرے گا۔ گویا اُنھوں نے شعری پیکر کی اثر خیزی کا بہر صورت اہتمام کیا ہے۔ اُنھوں نے شاعری کے لیے بیان بازی کرنے والوں کو شائستگی کے دامن میں رہتے ہوئے گفت گو کرنے کی تلقین کی ہے۔ یہ امر مبنی بر حقیقت ہے کہ ایک شاعر کی زُبان یقیناً ایک پڑھے لکھے شخص کی زُبان ہوتی ہے، اس لیے کہ لوگ اس کی کہی ہوئی باتوں کو بطورِ مثال پیش کرتے ہیں۔ زمانے کا ادبی مذاق بھی ایسے شعرا کے فکر سے متعیّن ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ریاض مجید حق بہ جانب ہیں۔ اُنھوں نے ساری زندگی اچھّی شاعری پیش کی ہے۔ اس لیے وہ لفظوں کے حقیقی نبض شناس اور پارکھ واقع ہوئے ہیں۔ یہاں ہر صاحب ذی فہم، ان کی بات کا حامی دکھائی دیتا ہے۔ چناں چہ ''ابلاغ کے سلسلے کا پھیلاؤ'' والی نثم میں اُنھوں نے ایسے ہی جذبوں کا اظہار کیا ہے۔ چند سطریں ملاحظہ کیجیے:

میرے لفظوں کی آنکھیں لحہ لحہ بدلتی ہوئی ارتقا کی روشنی سے با معنی ہیں

میری تحریر کی یہ کرامت اس ازلی خُوش بُو کی ایک جست ہے

یہ سب ابلاغ ہی کا پھیلاؤ ہے

میرے اظہار کی کوئی ہیئت -- کوئی ارتعاش -- کوئی لہجہ اس دائرے

سے باہر نہیں

ابلاغ وہ سانس ہے جس سے میرے لفظ مردہ مشینوں کے دور میں بھی زندہ ہیں

یہ وہ شہادت ہے جس سے میری تخلیق کے چہرے سرخرو ہیں

میرے جزیرہ لفظوں کے سمندر ابلاغ۔۔۔۔!

میرے احساس کے امکانات تیرے محیط ہی میں شاداب اور سرسبز ہیں (۱۲)

شاعری کے لیے ابلاغ سب سے معنی خیز چیز ہے۔ ابلاغ کی راہ میں رکاوٹ بننے والی لفظی کیفیتیں شاعر کو اس وقت تک ذہنی آسودگی میسّر نہیں ہونے دیتیں، جب تک وہ اظہار کے لیے ابلاغ کی راہیں ہموار نہیں کر پاتا۔ فکری حوالے سے ابہام اور تشکیک بات کہنے کے سدِ راہ ہو گی تو مفہوم غارت گرِ زمناہ ہو تا ہے۔ کون ایسا شاعر ہو گا،، جو ریاض مجید کے اس موٴقف کی تائید نہیں کرے گا، تو پھر اختلاف کے کیا معنی۔ اختلاف صرف اس لیے کہ نئے سانچوں میں بات کہی نہیں جا سکتی، یقینا ایک عجیب وحیرت انگیز بات ہو گی۔

ریاض مجید نے اپنی نثموں میں انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کو بھی بیان کیا ہے۔ وہ انسانی فطرت کے نبض شناس ہیں۔ وہ جذبوں کی ناپید اکناریوں کو امکانات کے ساتھ باہم آمیخت کرتے ہوئے انسانی فطرت کے تضاد اور مطابقت کو اچھوتے انداز میں بیان کرنے پر مکمل قدرت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی نثموں میں انسانی محبّت کو ایسے موٴثر پیرایے میں بیان کیا ہے کہ تخیل کی کار فرمائی ہمیں جُز قتی طور پر غزل کی عجب فضا میں لے جاتی ہے۔ وہ رومان انگیز فضا کی پیدا کاری میں ایسے ایسے رومان پرور نظّارے ہمارے شعور کا حِصّہ بناتے ہیں کہ انسانی عقل دھنگ رہ جاتی ہے۔

انسانی فطرت کی یہ نبض شناسی اور پھر اس کے ردِ عمل کو شعری پیکر عطا کرنا کوئی ایسی نئی بات نہیں کہ جس کو اتنا شدو مد سے بیان کیا جائے، البتہ یہ بات واقعی دیدنی ہے کہ نثری نظموں میں خیال آرایاں اور رومان پرور فضا ایک لاجواب کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اس حوالے سے ریاض مجید واقعی درست انداز میں داد خواہ ہیں۔ ان کا نادر اُسلُوب اپنے اندار اظہار کا ایسا اجمالی اور ایمائی انداز لیے ہوئے ہو تا ہے کہ ہمیں ان کی ذہنی پختہ کاری کا ہر جگہ احساس رہتا ہے۔

وہ جذبوں کے نہ ٹوٹنے والے طلسم کو احساس کی وہ لمس عطا کرتے ہیں کہ قاری کے سامنے ایک رومان انگیز فضا نکھر کر جلوہ نما ہوتی ہے۔ یہی رنگِ سخن ان کی غزل کا بھی خاصہ ہے۔ وہ محبوب اور محب کی وارداتِ قلبی کو ایسے مسحُور انداز میں پیش کرنے پر قدرت رکھتے ہیں کہ ہمیں بیک وقت ایک محبّت میں منجھا ہوا تجربہ کار شخص اور نیا سادہ لوح محبّت کا راہی ایک اُفق پر دکھائی دیتے ہیں۔ وہ محبّت کی راہ کے نئے مسافر سے ایسی دل خراش گفت گو کرانے پر قادر ہیں، جس کو سن کر محبّت کا پیرِ مغان بھی اپنی نصیں کاٹنے پر آماد ہو جاتا ہے۔ ریاض مجید نے ایسا اچھوتا اُسلُوب پیدا کرنے میں غزل کی دنیا میں بڑا ریاض کیا ہے تب جا کر بات بنی ہے۔ ان کی نثم ''ادھورے فقرے'' کی درج ذیل چند سطور اس دعوے کا بین ثبوت ہیں، ملاحظہ کیجیے:

دوست!

ہتھیلی پر ہجر کی لکیر تو ہاتھ ملا کر بھی بنائی جا سکتی ہے

میرے چہرے پر اپنی نگاہیں جھکا کر بھی تم میرے اور اپنے درمیان لاتعلقی

کے خلا پھیلا سکتے تھے

تم سے بڑھ کر کون جانتا ہے

کہ اپنے بخشے ہوئے سانس واپس لے کر تم مجھے بے جان کر سکتے تھے (۱۳)

ریاض مجید نے محبّت کی رومان پرور فضا کو غزلیہ آہنگ کے ساتھ نظم کے دامن کا حِصّہ بنایا ہے۔ وہ جدّت بھرے انداز میں ایسا سماں باندھتے ہیں کہ قاری اپنے آپ کو ان کے پہلو بہ پہلو شریکِ واقعہ سمجھتا ہے۔ یہاں وہ قاری کو اپنے بیان کے سحر سے کسی طرح آزاد نہیں ہونے دیتے بل کہ تاثر پذیری کا تو یہ عالم ہے کہ بات ختم ہونے کے باوجود قاری گھنٹوں ان کے بیان کا اسیر رہتا ہے۔ یہ جادوئی کیفیت نئے لکھنے والے شعرا، خواہ وہ کسی بھی ہیئت میں اظہارِ خیال کر رہے ہوں ان کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔

ریاض مجید نے رومانی عناصر کی کارفرمائی اور پیکر تراشی کے ساتھ منظر کشی کی بھی ایسی کیفیات پیدا کی ہیں کہ واقعی منظر آنکھوں کے سامنے جلوہ نما ہو جاتا ہے۔ وہ رومانیت کی ایسی روح پرور فضا سامنے لاتے ہیں کہ قاری اس کے درپردہ جذبۂ عشق کی کارفرمائی کے درپے ہو جاتا ہے۔ اُنھوں نے روایتی انداز کی نفی نہ صرف خیال کے حوالے سے کی ہے بل کہ وہ لفظی سطح پر بھی نئے آہنگ کو نظموں کے دامن میں سمونے میں شاد ہوئے ہیں۔ مراد یہ کہ وہی پرانی باتیں جس قالب میں بیان کی جاتی تھیں، اُنھیں کمال ہنر وری اور رجدّت سے ایسا منفرد اندازِ نطق عطا کیا ہے کہ واقعی تخیّل کی کارفرمائی کارِ دارد ہے۔ درج بالا مباحث کا منھ بولتا ثبوت ''نہیں جان ایسے نہیں!'' نظم کی چند سطریں ہیں:

نہیں جان ایسے نہیں۔۔۔۔۔

کیا تم ان کشتیوں کو آگ لگا کر بہشت آباد کناروں پر تنہا اتر جاؤ گے

جو تمھیں خوف بھرے پانیوں سے نکالنے کا سبب بنی ہیں

کیا تم ایسی جنّت مثال جزیرے میں رہ لو گے

جس میں مَیں نہیں ہوں گا (۱۴)

ریاض مجید نے اپنے جذبوں کی خُوش بُو سے قاری کو ایک جہانِ نو کی سیر کروائی ہے۔ وہ انسانی حسی نظام کو متحرک کرتے ہوئے انسانی شعور کی کارفرمائی کا بھی سامان کرتے ہیں۔ اُنھوں نے محبّت کی رومان پرور وادی میں ایسے ایسے انوکھے جذبے پیدا کیے ہیں کہ ان کے درپردہ پہلو داری کا سماں ہوتا ہے، یہاں ریاض مجید وقتی طور پر قاری کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے چھوڑ کر اسے

رومان پرور فضا میں اکیلے تماشا کرنے کا موقعہ باہم پہنچاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ قاری کو اس فضا سے لطف اندوز ہونے کا تو بھر پور موقع دیتے ہیں، لیکن وہ اس کو اس مسحُور کن منظر میں بھٹکنے نہیں دیتے۔ اُنھوں نے اپنی نثم ''با معنی خُوش بُو کا وصال'' میں ایسی ہی کیفیتوں کو بیان کیا ہے:

یہ میرے جذبوں کی خُوش بُو ہے

جو بے آہنگ سطروں کی شاخوں سے پھوٹ رہی ہے

شاخیں ایک قد کی ہوں یا چھوٹی بڑی۔۔۔۔

خُوش بُو کے ادراک کا وسیلہ تو صرف شامہ ہے (۱۵)

ریاض مجید نے نثری نظموں میں علامتوں کے استعمال سے پیدا شدہ جہانِ نو سامنے لایا ہے۔ وہ ہر منظر کو نئے زاویے سے دیکھنے اور نئے انداز میں احساس کو ایک نیا پن دلوانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ شاعر کو ایک ایسی جدّت بھری عینک عطا کرواتے ہیں، جس میں وہ اپنی قاری کو ایک نئی دنیا کی سیر کرواسکے۔ ان کے ہاں جیسے پرانے خیالات بغاوت پر آمادہ ہیں اور چہار دانگِ عالم ایک نیا منظر نامہ سجنے والا ہے، تشبیہوں، استعاروں، علامتوں اور تلازموں سے بھی ایسی ہی منظر و پیکر تراشی کا یاپلٹنا چاہتے ہیں۔ ورنہ وہ آواز جس کے لیے ریاض مجید شعری اُفق پر ایک نیا جہاں تخلیق کرنے پر آمادہ ہوئے ہیں، وہ کسی اور سطح پر ایسے نتائج ہر گز نہیں مُرتّب کر پائے گا۔

اُنھوں نے اپنی ایک نثم ''سفید کتابوں کا دور'' میں انسانی زندگی میں رونما ہونی والی ایک مکمل تبدیلی کی باز گشت سنائی ہے۔ اور انسانی زندگی کو امکانات کی اس دنیا میں جہاں کہیں اس معراج رد یکھتے ہیں، انسان ءجذبوں اور احساس کو بھی وہی نہج عطا کرنے کے لیے نئے لفظوں اور ان کے بر محل استعمال کو بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ریاض مجید کا زاویۂ نگاہ دوسرے لوگوں سے یک سر مختلف ہے۔ یہی ان کے اُسلُوب اور فکر کی امتیازی حیثیت ہے۔ ان سطور میں یہی عناصر کار فرما ہیں:

انسانی جسموں اور شہروں کے لمس سے تار کول بن چکا ہے

مشینی شہروں میں سب آوازیں یک رنگ شور بن چکی ہیں

اب گھنے جنگلوں کے سکوت سے نئی معنویت پھوٹنے کو ہے

لفظوں، قوسوں، وقفوں کے اسرار کھلنے کو ہیں

علامتیں اظہار کی ذِمّے داری اٹھانے کو تیّار ہو رہی ہیں (۱۶)

ریاض مجید نے نثمیہ شاعری میں ایسے ایسے فکر انگیز پہلو تراشے ہیں کہ انسانی فکر دھنگ رہ جاتی ہے۔اس پر مستزاد ان کا اظہار اور اندازِ بیان ہے کہ داد دینی پڑتی ہے۔اُنھوں نے عصری شعور اور انسانی رویّوں کو بھی بہ نظرِ غائر دیکھا ہے۔وہ ایک ماہر بناض کی طرح زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہیں اور ایسے پر معنی انداز میں انسانیت کی روح فرسائی اور بے حسی کا احاطہ کرتے ہیں کہ قاری ان کی اس قبیل کی نثمیں پڑھ کر ان کی فکر کا اسیر ہو جاتا ہے۔

ریاض مجید نے ہمارے زمانے کے یزیدیوں کو حضرتِ امامِ حسینؑ کے دور سے بھی کہیں زیادہ خطرناک عزائم والا دکھایا ہے۔اس دور میں تو شاید آج کے دور جیسی کیفیت نہیں تھی اور یہ یقینی بات ہے کہ آج کا منظر نامہ اس کہیں زیادہ بدلا ہوا اور کہیں زیادہ خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ہر دور میں یزیدیت کا پرچار کرنیوالے موجود رہے ہیں اور حسینیت تو ایک ایسی علامت بن چکی ہے کہ ہر کفر کے سامنے اس کا استعارہ برملا کھڑا ہوتا ہے۔ریاض مجید نے حسینت کو انسانی طرزِ زندگی کی قربانی کی سب سے بڑی معراج قرار دیا ہے۔وہ اپنے زمانے کے اہلِ ہوس کو یزیدیت کے پیروکار اور کاشت کار گردانتے ہیں۔"یزیدیت کے کاشت کار" میں اُنھوں نے ایسی ہی کیفیات کا محاکمہ کیا ہے۔چند سطریں دیکھیے:

ہمیں ترے تاحشر روشن اُصولوں کی پاس داری نہیں،

ترے غم کی نمائش مقصود ہے

تو نے شہادت کے وقت بھی نماز کی ٹہنیوں سے عبادت کے پھول چنے

مگر ہم ہوس کار مصروفِ ماتم ہیں

دنیا طلب سیاہ ہاتھ حرص زدہ چھاتیوں پر پڑ رہے ہیں

ہمارے ماتمِ عقیدت پر زمانہ ہنس رہا ہے

اور ہمارے گریہ پر کربلا کی ریت آب آب ہو رہی ہے (۱۷)

ریاض مجید نے پابند اور آزاد شاعری کی طرح نثری نظموں میں بھی استعاراتی اور علامتی انداز سے کام لیا ہے۔شاعر ہمیشہ استعارے سے پھوٹتا ہے۔شاعری اور علامت و استعارے کا ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔رمز و ایما اس پر سونے کے سہاگے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ریاض مجید جیسا منجھا ہوا شاعر ان چیزوں کا حقیقی پارکھ ہے۔عمومی طور پر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ نثری شاعری میں بھی اکثر نئے لکھنے والے بات کہنے کے ڈھنگ سے نابلد رہے ہیں۔یہی وہ عنصر ہے، جو ان کے خلاف محاذ آرائی کی سب سے بڑی وجہ بنا ہے۔جہاں تک ریاض مجید کا تعلق ہے، تو وہ ان لوگوں کے لیے ایک دفاعی دیوار کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔اُنھوں نے ایسے ایسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے، جن پر عمومی انداز میں بھی شعر اشعر نکالنے

سے کتراتے ہیں۔ وہ نثم نگاری کے باب میں بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والے شاعر ہیں۔ اُنھوں نے نت نئے اور اچھوتے انداز میں موضوع بندی کی ہے کہ داد دیے بغیر بات نہیں بنتی۔

اُنھوں نے نثموں میں بھی ایک خاص پیامی اُسلُوب اپنایا ہے۔ وہ مختلف استعاروں اور علامتوں کے ذریعے سے اپنے پیغام کو عام کرنے میں کامران ہوئے ہیں۔ ان کے اُسلُوبِ بیان کا یہ اعجاز ہے کہ وہ بات ایسے موئثر انداز میں قاری کے سامنے رکھتے ہیں کہ وہ ان کی رائے سے اتفاق کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ یہی ان کے نادرہ کار اُسلُوب کا اختصای پہلو ہے۔ ان کی ایک نثم بہ عنوان ''نیکی کا ہاتھ'' اپنے اندر یہی انداز لیے ہوئے ہے۔ وہ عظمتِ رفتہ کی یاد میں نسلِ نو کو اشک فشاں ہوتے ہوئے پیام دیتے ہیں کہ نئی قدریں اپنی جگہ بجا سہی، لیکن ماضی کی وہ یادیں اور قدریں، جو اس قابل ہیں کہ اُنھیں اپنی زندگی کا نصب العین بنایا جا سکتا ہے اُنھیں بہر حال قائم رہنا چاہیے۔ اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ریاض مجید قدروں کی جدّت کے منافی بات کرتے ہیں، وہ تو ماضی کے خوب صورت ورثے کے داعی ہیں، جو ہماری قدروں کا قیمتی سرمایا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ریاض مجید نسلِ نو کو نہ تو بے لگام آزادی دینے کے قائل ہیں اور نہ ہی ان پر بے جا روایتی پابندیاں لگانے کے متعامل ہیں۔ وہ تو بس زندگی کے اصل حسن کو حقیقی روپ مین دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہی زندگی کا اصل حسن ہے کہ زندہ رہنے والی قدریں اپنی حقیقت نہ کھونے پائیں۔ اس حوالے سے ریاض مجید کا درج ذیل اظہار یہ ملاحظہ ہو:

وہ گھر، جہاں بلبلیں اور برگد مل کر رہتے تھے

نفرت کی ہوا میں گھر گیا ہے

تارے سورج کے دشمن ہو گئے ہیں

ڈر ہے دشمنی کی لہریں نیکی کے گواہ اس ہاتھ کو بھی خود میں غرقاب نہ کر لیں! (۱۸)

ریاض مجید نے انسانی قدروں کے ساتھ سچے جذبوں کی عکاسی کر بھی زور دیا ہے۔ وہ سچے جذبوں اور سادہ لوح زندگی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جدید نسل کی ان جذبوں کی ناقدری اور سادہ لوح انسانوں کی مذاق آرای کو بھی وہ تباہ کن چیز تصوُّر کرتے ہیں۔ اُنھوں نے زندگی کو حقیقی روپ میں برتا ہے اور ایک پیامی ہونے کے ناطے یہی پیام نسلِ نو تک پہچانا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ اُنھیں پتا ہے کہ نئی نسل مادہ پرستی کی بدولت زندگی کی حقیقی اقدار سے منھ موڑ چکی ہے اور یہی حالتِ زار اُنھیں تباہ و برباد کرنے کے لیے بہ طورِ آلہ کار ثابت ہو رہی ہے۔ اُنھوں نے ''ندامت کے سفر کے آغاز'' میں اسی انسانی کمزوری کا اظہار کیا ہے۔ وہ ایسے طبقے کو خبر دار کرنا چاہتے ہیں کہ حالات کی سنگینی برابر دستک دیے جا رہی ہے اور اس کا انجام انتہائی بھیانک ہے۔ چند سطروں میں ریاض مجید کی انتباہی کیفیت ملاحظہ ہو:

تم جنھوں نے روئید گی کا مذاق اڑایا، سکوں کی موت کیسے مر سکو گے ؟
سچے خوابوں کا مذاق ایک مکروہ عمل ہے
جس پر آج کُچھ دیر کے لیے تم قہقہہ لگا سکتے ہو ہمیشہ نہیں
تمھارا بڑے سے بڑا اور یہی طنزیہ قہقہے ہیں

ریاض مجید کی نثم ''اب ندامت کے سفر کا آغاز ہونے کو ہے''میں بھی ایسی ہی کیفیت کا نوحہ بیان ہوا ہے:

اب ندامت کے سفر کا آغاز ہونے کو ہے
جلد بازی کی فصل کٹ گئی تو ہر رُت پچھتاوے کے کھلیان بُلند ہوتے جائیں گے
قبل از وقت پرواز کے شوق میں گھونسلے سے گرنے والے بچّے
بے نام فنا کا رزق بن جاتے ہیں (۱۹)

ایسی ہی کرب ناک اور سوہانِ روح کیفیت کو ریاض مجید نے درج ذیل سطروں میں بیان کیا ہے۔ انسانیت کی بلکتی ہوئی ذلت آمیز حالتِ زار کو اُنھوں نے عجب رنگ میں بیان کیا ہے، جس کا درد ہر ہر لفظ سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نثم '' نشیب کا سفر ختم ہونے کو ہے''میں ریاض مجید نے انوکھا اظہار کیا ہے، جس میں ہمیں دل خراشی کت ساتھ آسودگی اور روئید گی کے گہرے آثار دکھائی دیتے ہیں۔

ریاض مجید نے اتناسب کُچھ ہونے کے باوجود رجائی انداز اور موثر پیامی کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ وہ اپنے قاری کو تمام تر کوتائیوں کے باوجود سہارا دیتے ہیں۔ اُنھوں نے ''نشیب کا سفر ختم ہونے کو ہے''نثم میں اسی کیفیت کا بر ملا اظہار کیا ہے۔ اس نثم کی چند سطریں ملاحظہ کیجیے:

جب ہاتھوں پہ قسمت کی لکیریں دشمنی کی لکیریں بن جائیں
اور عمروں کی لکیریں آپ موت موت پکارنے لگیں
تو جسموں کے بچنے کی کیا صورت ہو!
حسد کے زہریلے دھوئیں میں لیے جانے والے سانس اور کب تک ہمارے کینسر
زدہ پھیپھڑوں کو زندہ رکھیں گے
کاش وعدے پورے ہونے کا جاں پرور لمحہ آئے
مَحبّتوں کا سبز بادل برسے
اور ہمارے بنجر ہوتے گھروں میں خیر کی روئید گی کا آغاز ہو! (۲۰)

ریاض مجید کی شاعری میں ہمیں جذبوں کا بر ملا اظہار ملتا ہے۔ وہ انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کے پارکھ ہونے کے باوصف ایسا کرنے کر گرفت رکھتے ہیں۔ جذبے کی مختلف داخلی حالتوں پر اُنھوں نے ایسے نشتر اشعار نکال رکھے ہیں، جو ان کی رائے کو نہ صرف مستند کرنے کی اہلیت رکھتی ہے بل کہ وہ دوسروں کی برتی ہوئی زندگی کی ترجمانی بھی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ایسی بیسیوں مثالیں ان کی شاعری سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان کے نثم نگاری کے موضوعات قریباً وہی رہے ہیں۔ البتہ ان کی لفظیات اور بات کرنے کے ڈھنگ میں ضرور تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں اُنھیں بات بہ اندازِ دگر کرنی پڑتی ہے۔ یہی ان کے اُسلُوب کی امتیازی صفت شمار ہوتی ہے۔ اُنھوں نے رومانی انداز میں جذبوں کی لمس کو انوکھے انداز میں کبھی سادی اور کبھی پرکاری سے بیان کیا ہے کہ ہر دو حوالوں سے ہمیں ان کی دی جانے والی آواز پہچاننے میں دِقّت نہیں ہوتی۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ ریاض مجید جب بھی کسی جذبے کی بات کی ہے وہ خود جذباتی ہوئے بغیر اپنامافی الضمیر بیان کر گئے ہیں۔ ان کا یہی غیر جذباتی انداز بات کے اندر تاثیر پیدا کرنے اور بات منوانے میں مدومعاون رہتا ہے۔ اس پر مستزاد ان کا رجائی انداز ہے، جو آخرِ کار تمام محرومیوں کے باوجود زندگی کی لمس اور تحرک بر قرار رکھنے میں کارگر ثابت ہوتا ہے۔ نثم "راز یابی کی ساعت" میں ایسا ہی ملا جلا رجحان کارفرما ہے:

دل، جسے یہ بھی خبر نہیں تھی اس کے تقاضے کیا ہیں،

اب دنیا کی گردش سے پیدا ہونے والے معاملات کے بارے میں فیصلے دے رہا تھا

ایک سرگوشی میرے اندر کی گرہ کھول رہی تھی

ایک اندھیرا مجھے روشنی کے سمندر کی طرف لے جارہا تھا

بھروسے کا ایک ہاتھ مجھے نادیدہ دنیاؤں کی طرف بلا رہا تھا

تسلی بھرا ایک لہجہ میرا رہنما بن گیا تھا

اوراب سات آسمان مجھے اپنے راستوں کے سنگِ میل لگ رہے تھے (۲۱)

ریاض مجید نے اپنی نثموں میں رومانیت کے ساتھ ساتھ ترقّی پسندیت کو بھی ہر ممکن طور پر جگہ دی ہے۔ وہ نام نہاد ترقّی پسندیت کو بھی قابلِ مذمّت گردانتے ہیں۔ وہ ایک بالغ نظر فن کار ہیں، اس لیے زندگی کو بھی بلیغ اور کشادہ کینوس پر بیان کرتے ہیں۔ اُنھوں نے ہمیشہ رجائیت کو اپنا رہبر بنایا ہے۔ وہ انسانیت کو بربادی کے دہانوں پر لا کھڑا کرنے والے اذیت ناک اندھیروں کے ہمیشہ خلاف رہے ہیں۔ ریاض مجید کی اسی مزاحمتی اور رجائی کیفیت کے بارے میں پروفیسر عارف رضا رقم طراز ہیں:

"ریاض مجید نے جہاں ادبی رُجعت پسندوں کو واشگاف انداز میں انتباہ کیا ہے وہاں نام نہاد ترقّی پسندوں پر بھی کڑی تنقید کی ہے۔ ریاض مجید کی نثموں میں بالواسطہ اور بلا واسطہ نسلی، فرقہ وارانہ اور علاقائی و لسانی تعصّب رکھنے والے اذہان کے رویّوں پر گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے۔ مایوسی کی جگہ رجائیت اور تیقّن آمیز لہجہ قاری کو حوصلہ دیتا ہے۔" (۲۲)

ریاض مجید کی یہ صفت ان کے کلام کی جان ہے، کیوں کہ وہ اچھّی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں پہلے سے ہی ایسی مایوسی اور بے کیفی کے بادل چھائے ہوئے ہیں کہ اگر کہیں سے بامرادی کی پیام رسانی ممکن الوقوع نہ ہو پائی، تو ہمارے معاشرے اور معاشرتی اقدار کا کیا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسے نامساعد حالات میں بھی ادب کے ہر فورم پر ایک اُمّید افزا پیام دیتے دکھائی دیتے ہیں، جس کی زندہ مثال ان کی نثم "خود شناسی کا لمحہ آواز دی رہا ہے" ہے، جہاں ہمیں ان کا رجائی لہجہ اور مستقبل کی نوید واضح نظر آتی ہے:

یہ بے خبریت کیا ہے؟

اپنے چھوٹے سے وجود کا محیط ہی کیا ہے

دنیا تسخیر کرنے سے قبل اپنی ذات کو تو تسخیر کر لو

یہ کام اس مرحلے پر نہ ہوا تو آئندہ کے ہر راستے پر نوکیلے اور کھردرے

رویّوں کی طرح دسترس میں آئی ہوئی منزلوں کو بھی نارسائی کی دھند میں لپیٹ دے گا (۲۳)

اس نثم پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر عارف رضا لکھتے ہیں:

"اس نثم کے اخیر میں ریاض مجید نے معاشرتی جمود کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگلی نثموں میں وہ ریاض مجید مایوسی اور تشکیک کی فضا سے نکل کر یقین کی منزل میں داخل ہو گیا ہے۔ میں اسے حق الیقین یا عین الیقین کی منزل تو نہیں کہوں گا کیوں کہ یہ منزلیں بے حد دشوار ہیں، تاہم سفر جاری رہے تو منزل مل ہی جاتی ہے۔ ان نثموں میں رومانویت کی لمس سے ریاض مجید کے اظہار و ابلاغ کا کینوس وسیع تر ہو گیا ہے۔ ایمائیت، استعارات اور تشبیہات کے عمدہ استعمال نے اس کے پیرایۂ اظہار میں گیرائی اور گہرائی پیدا کر دی ہے۔" (۲۴)

پروفیسر عارف رضا کے متذکرہ بالا بیان سے ریاض مجید کے نثم نگاری کے باب میں رونما ہونے والے ارتقا کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بات تو مبنی بر حقیقت ہے کہ ریاض مجید نے جہاں کہیں بھی معاشرتی ناسور دیکھا ہے، اسے بیان کرنے میں وہ بے خوف و خطر رہے ہیں۔ اُنھوں نے کسی بھی چیز کی پروا کیے بغیر ایک ماہر جراح کی طرح اس ناسور کے اندر کی غلاظت کو باہر نکال کر ایک صِحّت مند فریضہ انجام دیا ہے، لہٰذا یہ بات کہ اُنھوں نے اس حوالے سے رجائیت اور یقین کی کیفیت بعد کی اپنے

اندر پیدا کی ہے ،ریاض مجید ایسے غیر جذباتی انداز میں بات کرنے وار سہنے والے بردبار شاعر کے لیے کہنا انوکھی بات ہے۔کیوں کہ وہ نثم سے کہیں پہلے شاعری میں اپنی ایک مستقل شناخت رکھتے ہیں۔ہاں یہ بات ضرور ہے کہ پروفیسر عارف رضا کے سامنے ریاض مجید کی نثمیں، جس ترتیب سے مجموعے میں شامل کی گئی ہیں،اُنھیں دیکھ کر ارتقائی حوالے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ان کی نثم ” ابھی وقت ہے “کی چند سطور بطورِ مثال دیکھیے:

ابھی وقت ہے تیز ہوا کی ہم سفری سے کنارہ کرلو

یہ تمھیں تمھارے ماحول سے دور کرنے کا سبب نہ بنے

اورآتی سوگوار رتوں میں تمھارے اکیلے پن کے اندر سدِرہ نہ بن جائے

ذات سے بڑھ کر خواب دیکھنے والوں کے دکھ قبر کی دیواروں تک لمبے ہوتے ہیں

آسمان چھونے کی خواہش میں مٹّی اپنی زمین سے بھی دور ہو جاتی ہے (۲۵)

ریاض مجید نے نثم نگاری میں نظم کی روایت کی طرح نئے اور اچھوتے مضامین بیان کیے ہیں۔اُنھوں نے محض لفظوں اور بیان کی آمیحنت پر ہی اکتفانہیں کیا بل کہ خیال اور لفظوں کی بنت کا فریضہ انجام دیا ہے۔وہ فن کی نزاکتوں کا خیال رکھتے ہوئے بڑے موئثر انداز میں قاری کو اپنے فکری سحر میں مقید رکھنے کا ہنر رکھتے ہیں۔

ان کا کمال یہ ہے کہ وہ ماضی کی حسین یادوں کو شعری پیکر میں ڈھالنے کے لیے کسی دوسرے وسیلے کے بجائے بڑی آسانی سے اپنی ذات کے داخل کا سہارا لیتے ہوئے بات کہہ ڈالتے ہیں۔اس امر کی انجام دہی کے دوران میں وہ اکثر اپنے باطن کے نہاں خانوں میں سے ایسی ایسی دل خراش باتیں نکال باہر کرتے ہیں کہ شعری حسن اور معنویت کی پہلو داری یہاں گر اس قدر اضافے ممکن الوقوع ہو پاتے ہیں۔غرض اُنھوں نے اپنے باطن کے نہاں خانوں سے ایسی دل پسند رومانی کہانیاں منظرِ عام پر لائی ہیں کہ واقعی ریاض مجید کے فن اور فکر کو داد دینی پڑتی ہے۔ان کی نثم ”رکے ہوئے شکریہ کا بوجھ “اپنے اندر ایسا ہی سماں باندھے ہوئے ہے:

لہو میں جلتی ہوئی پھلجھڑیاں خوف سے بجھ گئیں

یا سرشاری کے پھیلاؤ نے شریانوں میں سیکڑوں انار جلا دیے

یہ خوف یا حسرت کی کون سی منزل ہے، جس کی عطا اک گہری خاموشی ہے

یہ سوچ میرے پورے وجود کو لرزا رہی ہے

کہ جس سورج نے ایک پل میں میرے پورے وجود کو روشنیوں میں نہلا دیا ہے

دل اسے ”شکریہ“ کا ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا (۲۶)

یہ ایک ایسا حسین امتزاج اور بظاہر تضاد ہے کہ ریاض مجید کبھی رومان پرور فضا کی بنت میں محبوب کے عدم شکریے پر دل کو ملامت کرتے ہیں اور کبھی شکر گزاری کی فضا ان کے رگ وپے میں سرایت کر جاتی ہے۔ اس بات کا، جواب اتنی آسانی سے تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ اس حوالے سے ریاض مجید کے مزاج اور داخل پر گہری نظر رکھنی پڑتی ہے کہ وہ کس طرح چیزوں کو قبول کرتے ہیں اور ان کے مزاج میں ردِ عمل کی کیفیت کس انداز کی ہوتی ہے۔ اس گہرے مشاہدے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ریاض مجید جیسا بالغ فن کار آپ بیتی کے رنگ میں جگ بیتی کے بیان میں بھی وہی کمالِ فن رکھتے ہیں، جو جذبات سے بھرپور کوئی شخص اپنی ذات کے حوالے سے برملا اظہار کر سکتا ہے۔ وہ جذبات کی تطہیر ایسے کرتے ہیں کہ قاری کو بھی یک گونہ طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ ”یہ کس اطمینان کا ظہور ہے؟“ نثم کی یہی بڑی خوبی ہے۔ اس نثم کی چند سطریں ملاحظہ کیجیے:

یہ کس اطمینان کا ظہور ہے؟

جس نے میرے پورے وجود کو اپنی خوش گوار گرفت میں لے رکھا ہے

میرے بدن میں دوڑتے لہو کی ہر بوند شکریہ کے لفظ کا ورد کر رہی ہے

مگر میرے ہونٹ اس کی ترجمانی سے قاصر ہیں

احساس اور اظہار کے مابین فاصلوں نے مجھے اپنے سورج کے سامنے شرمندہ کر رکھا ہے (۲۷)

ریاض مجید کی جدّت، طبع نے ایسے شعری چمن کی آبیاری کی ہے، جہاں ہمیں نو بہ نو فکری نمونے ملتے ہیں۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہاں بھی وہی ریاض مجید بول رہا ہے، جو عصری شعور کی کار فرمائی سے پورے تیقّن کے ساتھ انسانی زندگی کے جذبات واحساسات کے مختلف پہلوؤں کے بیان پر قدرت رکھتا ہے۔ بظاہر نثموں کی ہیئت اختیار کرنے والا ایسا نابغۂ روزگار شاعر ہمیں فکر کی ایسی پر سحر وادیوں میں سرگرداں ہوتا ہے، لیکن غائر توجّہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جیسا شاعر ہی نئی بناوٹ کے ایسے شاہ کار تراشنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اُنھوں نے فن کو فکر کے ایسے ان دیکھی فضاؤں کی زیارت کرائی ہے، جہاں کسی اور کو بغیر دعوت کے جانے کی جسارت نہیں ہے۔ ان کے ایسے تخیّل پر ہمیں رومان انگیز فکر کے گہرے بادل چھائے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بھی انوکھی بات ہے کہ ریاض مجید ہمیں وہاں اتنے جہاں دیدہ گھاگ ہونے کے باوجود ایک نو آموز کی طرح انجان وادیوں میں قدم رکھتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سادہ روی بھی اس تخیّل کی پیدا کار فن کارانہ ضرورت ہے، جس کو ہم اچھّی طرح غور کیے بغیر سمجھ نہیں پاتے۔ نثم ”شوق رستے کا ظہور“ کا ایسا ہی رومان انگیز اور سادہ لوح منظر دیکھیے، جہاں ریاض مجید اسی آب وتاب کے ساتھ جلوہ ساماں ہیں:

ان آنکھوں پر ایک مہربان بوسے کا لمس تارے کی طرح چمک رہا ہے

عمر کے راستے سہل ہو گئے تھے اور خواہشوں کی منزل واضح۔۔۔۔۔۔

شوق رستوں سے بے یقینی کی دھند چھٹ چکی تھی

اور اب دل کسی ہوا کی انگلی پکڑ کر سفر کے لیے تیّار ہو چکا تھا(۲۸)

ریاض مجید نے ایسے رومانی جذبوں کی بھی کامیاب عکاسی کی ہے، جن کے بطن سے حیران کن کسک پھوٹتی ہے۔ وہ انسانی جذبوں اور احساس کی کارفرمائی کے حقیقی نبض شناس واقع ہوئے ہیں کہ ان کی عکاسی کے لیے بسا اوقات کُچھ نہ کہہ کر بھی بہت کُچھ کہہ گزرنے کے فن کے شناور ہیں۔ ایسا انداز اُنھیں معاصر شعرا سے یقیناً ممتاز کرتا ہے۔ وہ کُچھ کہنے کے لیے لفظوں کے محتاج نہیں بھی ہوتے۔ وہ خاموش زُبانی اور انسان کی گنگ کیفیت سے دوسروں کے دل چیرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے ایسی بہت سے رومانی کہانیاں تخلیق کی ہیں کہ ان کے در پردہ محرکات کی سراغ رسانی سے انسانی عقل دھنگ رہ جاتی ہے۔ وہ جذبوں کی تمانیت کو ہلکی آنچ پر رکھ کر ایسے سنجیدہ اور سبک رو انداز میں پیامی بن کر سامنے آتے ہیں کہ قاری از خود چند لمحوں کے لیے آپے سے باہر ہو جاتا ہے، لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ ریاض مجید ایسے منجھے ہوئے فن کار ہیں کہ وہ کسی بھی ہیئت میں کُچھ بھی کہنے کا ہنر رکھتے ہیں تو یقیناً بجا ہو گا۔ اس ضمن میں ریاض مجید کی نظم ''تمھیں خبر ہے'' کی چند سطریں بطورِ مثال پیش ہیں:

جدائی کی ہوائیں دکھوں کی پیشن گوئی ہوتی ہے

بچھڑنے والوں کے لرزتے ہونٹوں پر چاہے کوئی لفظ نہ آئے

شک کی ماری ہوا نے میرے کان میں، جو سرگوشی کی تھی

وہ کتنا تہہ دار سچ لیے ہوئے تھی؟

کبھی دوریوں کی دھند کے پیچھے جھانک

اور اس سچ کی اذیت برداشت کر

تمھیں خبر ہے (۲۹)

ریاض مجید نے رومانی نظموں میں ہمیں ایسی کہانیاں بھی سنائی ہیں، جہاں وہ ایک غیر جانب دار کہانی گو کے روپ میں بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایسا انداز کہانی پن کی بنت میں ماضی میں داستان گو انجام دیا کرتے تھے، جن کے در پردہ علم کا سمندر اور معلومات کا انبار کار فرما ہوتا تھا۔ ریاض مجید بھی ایسی کیفیت میں اپنے بے بہا مطالعے اور زندگی کے بلیغ اور کٹھن تجربے کے ساتھ کہانی پن کا حق ادا کرتے ہیں۔

وہ ایک ماہر سرجن کی طرح جذبوں کے نہاں خانوں میں اتر کر انسانی نفسیات کی عینک سے دیکھتے ہیں، تو اُنھیں کوئی نہ کوئی ایسی شخصی کمزوری دکھائی دیتی ہے، جسے وہ کمال فن کاری سی انسانی جذبے کی کمزوری اور انسانی فطرت کا خاصہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے گرد و پیش پر گہری نگاہ رکھی ہے کہ کہیں نہ کہیں ایسی کہانی ضرورت چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے ، جس کو وہ سماج پر لاگو کرتے ہوئے بڑے کینوس پر بیان کر جاتے ہیں۔ ''یہ منزل ہر ربط کا مقدر نہیں'' میں ریاض مجید کا یہی انداز ملاحظہ کیجیے:

اجنبی دوست!

محبّتوں کی یہ منزل ہر ربط کا مقدر نہیں ہوتی

حیرت اور خوف میں گندھی خاموشی سے یہ راستہ طے نہیں ہو گا

جب تک دل کی تائید میں آنکھ کا اشارہ شامل نہ ہو گا

ذائقے ہونٹوں کے باہر آ کر رہیں گے (۳۰)

ریاض مجید نے ایسے لمحوں کی لمس کو بھی از خود محسوس کیا ہے، جو انسانی زندگی کی حسین یادوں کا ایک طرح سے سرمایۂ حیات ہوا کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اُنھوں نے صرف اپنی ذات پر ہی اکتفا نہیں کیا بل کہ وہ دوسروں کی زندگی کے حسین لمحوں اور ناقابلِ فراموش خوب صورت یادوں کو بھی فن کارانہ انداز میں اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں ایسے خوش گوار لمحات ضرور آتے ہیں، جن پر وہ اپنی حیاتِ مستعار کو قربان کرنے کو تیّار ہوتا ہے۔ چناں چہ ایسی حسین یادوں کو جب کسی اور کے سامنے بے ساختہ اور ر فطری انداز میں بیان کیا جاتا ہے، تو ہر کوئی اس کی تاثیر کو اُسی طرح محسوس کرتا ہے۔ اس طرح کہانی پن میں اگر فطری سادگی اور سیدھا سادہ انداز اپنایا جائے، تو کہانی کا حسن دوچند ہو جاتا ہے۔ ریاض مجید کے کلام میں ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ایسی کہانیوں میں اُنھوں نے کبھی داخل سے خارج کی طرف جست لگائی ہے اور بسا اوقات وہ خارج سے داخل کی طرف گامزن ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے فن کی پیش کش میں کو، جو بھی حربہ اختیار کیا ہو، وہ بہر صورت بات کہنے کے انداز اور تاثر کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔ مثلاً: ''کیسا لمحہ تھا!'' میں وہ یوں گویا ہیں:

میرا وجود ایک ایسے لمس کا امانت دار ہوا

جو اس بھرے قافلے میں صرف میرا مقدر بنا ہے

شکریہ! اے میرے حدی خوں!

اب میری زندگی تیری آواز پر آنکھیں بند کر کے کسی سمت بھی نکل سکتی ہے (۳۱)

ریاض مجید کے کلام میں پیدا ہونے والی رجائیت کے بارے میں ما قبل مفصل بات ہو چکی ہے۔اس ضمن میں ان کی شعری تمثیلوں پر بھی اکتفا کی گئی ہے۔ یہاں ان کی رجائیت کے صرف اس پہلو پر بات کرنی مقصود ہے، جس میں وہ کہانی کا مرکز خود اپنی ذات ہی کو بناتے ہیں۔ ہم نے گزشتہ اوراق میں ان کی ایسی شاعری کو بھی بطورِ مثال پیش کیا ہے، جس میں ہمیں عصری منظر نامے کے آثار دکھائی دیتے تھے، جہاں ریاض مجید نے زیادہ تر غیر جذباتی انداز میں بات کی ہے اور کہیں کہیں وہ بات کہنے میں جذباتی بھی ہوئے ہیں۔

اسی طرح ایسی کہانیاں جن کی بنت میں اُنھوں شعر کے حسن کو اوّلیت دیتے ہوئے کُچھ تصرف بھی کیا ہے۔ان کی مثالیں بھی کمال پیش کی ہیں۔ یہاں ریاض مجید رجائیت کے اس عنصر کو منظرِ عام پر لانا چاہتے ہیں کہ بعض یادیں انسان کی ذات کے لیے بذاتِ خود اتنی تسکین بخش ہوتی ہیں کہ وہ اُنھیں صرف اپنے لیے بچا بچا کر رکھتا ہے۔ یہ بھی انسانی نفسیات اور فطرت کا ایک اہم پہلو ہے، جس سے روگردانی ممکن نہیں۔" صرف میرے لیے" نظم میں یہی انداز کار فرما ہے:

میری یہ ذات سے بڑی اہمیت، میرا یہ آسمان سے بُلند مان

کوئی کبھی اسے نہیں سمجھ سکے گا

مستقبل کی آنکھیں مجھے میری نظر میں بے یقین کر دیں گی

کبھی سورج صرف میرے لیے نکلا تھا، پھول میرے لیے کھلے تھے

ہوا صرف میرے لیے چلی ہے، اسے کون مانے گا؟ (۳۲)

ریاض مجید نے علامت اور استعارے کے ذریعے سے اظہار اور تکنیک کے ایسے قرینے تلاش کیے ہیں، جو عمومی طور پر ہمیں پابند شاعری کا حسن دکھائی دیتے ہیں۔ وہ زندگی کی اجنبیت اور ایک خاص ماحول سے وابستگی اور موانست کو ایک ایسے دھارے پر لا کھڑا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں، جہاں زندگی اپنی تمام تر توانائیوں کے باوجود اپنے اندر ایک ایسی ان دیکھی دنیا کا احساس رکھتی ہے کہ جہاں آمد و رفت کا ایک میلہ سالگا رہتا ہے۔ یہی اجنبیت اپنی ذات کے اعتبار سے ہر وقت اور دور میں جاری و ساری رہتی ہے اور لوگوں کا گروہ در گروہ پرندوں کے غولوں کی طرح آگے بڑھنے کا علم بھی رواں دواں رہتا ہے۔ یہی علامتی اور استعاراتی انداز ریاض مجید کی کئی ایک نظموں میں جھلکتا ہے۔ ایسی ہی ایک مثال " اجنبی پرندے کے لیے" ہے، جہاں ریاض مجید انسانی زندگی کی تلخیوں اور حقیقتوں کو پرندوں کی زندگی پر منطبق کرتے ہوئے درسِ زندگی دیتے ہیں۔ اس نظم کی چند سطور بطورِ مثال پیش کی جاتی ہیں:

درخت جانتا ہے کہ اجنبی زمینوں سے آیا ہوا یہ پرندہ زیادہ دیر تک اس آب وہوا میں

نہیں رہ سکتا

برف پگھلنے پر اسے واپس اپنے مرغزاروں کی طرف پلٹنا ہے

اس کے جانے سے پیدا ہونے والی لرزش شاخوں سے دلوں میں

اور پھر روحوں تک میں اتر جائے گی

پھر ہم سب اپنی اپنی برداشت کے کناروں تک اس کے لیے اُداس رہیں گے! (۳۳)

ریاض مجید کا یہی استعاراتی انداز اُنھیں کبھی مَحبّت کی رومان انگیز فضاؤں میں لے جاتا ہے، جہاں وہ انسان کی دلی کیفیات کو رومان انگیز طرز عطا کرتے ہیں۔ اُنھیں یہ کمال حاصل ہے کہ وہ انسانی جذبوں کو نو بہ نو اندازِ مَحبّت عطا کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی رومان انگیز شاعری میں ایسی دنیائیں آباد نظر آتی ہیں، جو انسان کے ذاتی تجربات کا ایک انوکھا منظر نامہ رکھتے ہیں۔ انسان بھی اپنی ذات کے اعتبار سے ایک نہایت پیچیدہ مخلوق ہے۔ اس کے اندر بہت سی ہموار اور پر پیچ دنیائیں آباد ہیں، جن کی سراغ رسانی کے لیے انسانی نفسیات پر مکمل عبور نہ سہی، لیکن بڑی حد تک شناسائی اور آگاہی کی ضرورت ہوتی ہے۔

انسان کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات اور معاملات ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ ان میں بعض عجیب و حیرت انگیز قسم کے واقعات بھی رونما ہوتے ہیں، جن کے بارے میں انسان نے کبھی سوچا تک نہیں ہوتا۔ ایک حساس فن کار زندگی کی رعنائی و برنائی اور ایسی تلخی اور محرومی کو بڑے قریب سے دیکھتا ہے اور ایسی کہانیوں کو شعری پیکر میں ڈھالتے ہوئے ایسا فن تخلیق کرتا ہے کہ قاری کے احساس و شعور کو بھی اپنے ہم رکاب رکھتا ہے۔ انسان نے ایسی بہت سی چیزیں، جو اس کی زندگی کے تجربات میں شامل نہیں ہوتیں، دوسروں سے سیکھ رکھی ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں بہر حال انسان کے تجربات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ انسانی زندگی کی ایک رومان انگیز جھلک ملاحظہ کیجیے، جہاں اس کا ذاتی اور کائناتی تجربہ شاعر نے پیش کیا ہے کہ جیسے وہ دوسروں کو اپنی زندگی کی کہانی سنائے جا رہا ہے۔ ''ایک دن کی مَحبّت'' میں ہمیں ایسا ہی لطف ملتا ہے:

آج کا دن گزرے کل سے کتنا مختلف ہے

کل میرے ہاتھ بے یقینی کی ریت میں دھنسے ہوئے تھے

اورر آج میرے پاس اتنا کُچھ ہے

کہ میرے ہاتھوں سے لے کر اعصاب کی برداشت تک سے باہر ہے (۳۴)

ریاض مجید نے زندگی کی حقیقت اوررومانیت کے بیان میں رجائیت کا مظاہرہ کیاہے۔وہ اپنی شاعری کے ذریعے سے روشنیاں بکھیرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔اُنھوں نے کُچھ بہتر کر گزرنے کے لیے زندگی کے تجربات کو بڑے یقین کے ساتھ ہمارے شعور کا حِصّہ بنایاہے۔وہ انسانی رفعتوں اورآبرو مندی کے لیے حساس جذبوں کی ترجمانی کرنے پر کمال قدرت رکھتے ہیں۔یہی آبرو مندانہ کاوش اُنھیں بڑے فن کار کے روپ میں ہمارے سامنے لاتی ہے۔وہ انسان کی ناموس اور رفعت کے لیے ہمیشہ ربّ العزّت کے حضور میں دست بہ دعاہیں۔ان کا ایک دعائیہ بہ عنوان " ایک دعا" ایسے ہی جذبے کی عکاسی کرتا ہے:

اے مالک!

اس روشنی بکھیرتے تجربے کے عقب میں کوئی ندامت نہ ہو

اس لو کی حفاظت کر

اور اس کا دوام میرے بخت میں لکھ دے

میرا دل اس لو کے زینے سے ثانیہ ثانیہ روح کی ابدی رفعتوں کو چھونے کا آرزو مند ہے (۳۵)

ریاض مجید نے اپنے شعری قصر کی آراش کے لیے بیان وبدیع کو مقدور بھر استعمال کیاہے۔وہ بات کو موئثر انداز میں بیان کرنے کے لیے تشبیہات کا سہارا لیتے ہیں۔ان کی تشبیہات نہ تو دور از کار ہوتی ہیں اور نہ ہی وہ تشبیہات کے استعمال سے بیان کو گنجلک بناتے ہیں۔ان کی تشبیہات شعر و سخن کے حسن کے لیے در آتی ہیں۔ایسا گمان ہر گز نہیں ہوتا کہ وہ تشبیہات کے استعمال کے لیے بیان کو پیچ عطا کرتے ہوں۔بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ شعر اکلام میں جان بوجھ کر علمِ بیان کے ارکان کو سموتے ہیں۔اس طرح خیال آرای کی راہ میں اکثر رکاوٹیں در آتی ہیں،یہی فن شاعر کے ابلاغ کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔اس طرح کلام میں ابہام اور تشکیک کے عنصر غالب آجاتا ہے۔ریاض مجید جیسے نابغہ شاعر کی قادر الکلامی کی یہ بھی ایک دلیل ہے کہ ان کی مکمل کلیات کا اس ضمن میں اگر بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے،تو معلوم ہو گا کہ وہ ابلاغ اور اختصار کے لیے علمِ بیان کے مختلف ارکان کلام میں بے ساختگی سے استعمال کرتے ہیں۔ایسا کرنے سے ان کے کلام میں معنویت دوچند ہوئی ہیں، لہٰذا ریاض مجید کے کلام میں کہیں بھی ایسا شعر ان کی کمزوری کی مثال کے طور پر بھی نہیں پیش کیا جا سکتا۔

اگر یہ کہا جائے کہ ریاض مجید نے فن کے تاثر کے لیے تشبیہات کو شاعری میں بڑی بے ساختگی سے سمویا ہے،تو یقیناً بجا ہو گا۔ان کی استعمال کردہ تشبیہات میں ہمیں دو طرح کے عناصر کار فرما نظر آئیں گے۔ایک یہ کہ وہ تشبیہ کے ذریعے سے معنویت کو دوبھر چند کرتے ہیں،جو ابلاغ کی ایک سبیل ہے۔دوسرے یہ کہ وہ ایسی تشبیہات استعمال کرتے ہیں،جو ہمارے ادبی مزاج سے باہم آمیخت ہوں۔ایسا کرنے سے اُنھوں نے قاری کی مانوسیت کا بھی اہتمام کیا ہے۔"اب کیسے ملنا ہے؟" نامی نظم میں ریاض مجید کا یہی شعری اعجاز ملتا ہے:

جیسے ازل کی بچھڑی روحیں اس دھرتی پر ملتی ہیں

جیسے کوہ سے نکلا چشمہ سمندر کی آغوش میں گرتا ہے

جیسے رات کے پچھلے پہر میں شبنم کا قطرہ تازہ کھلے گلاب کی پتی میں ضم ہو جاتا ہے

جیسے دن رات سے ملتا ہے

جیسے معنی اپنے الفاظ سے ملتے ہیں

جیسے لمبے سفر میں پیاس اور دھوپ سے جھلسے ہونٹ، ٹھنڈے پانی کے چشمے سے ملتے ہیں (۳۶)

تشبیہ و استعارے اور جدّتِ خیال کا ایک اور انوکھا اظہار ان کی نظم "یہ وہ نہیں" میں قابلِ توجّہ ہے:

وہ ایک زندہ عکس ہے

واہمے کی اقلیم سے پرے!

لمس کی دسترس سے بہت دُور!

ہاتھ میں نہ آنے والی روشنی! (۳۷)

ریاض مجید کا یہ کمال ہے کہ وہ زندگی کے ساتھ ساتھ تجربے اوراحساس کی پختگی کو نئے اور پختہ کار رنگ میں پیش کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے جذبے اوررومانیت کو باہم آمیحنت کرتے ہوئے ایسی کیفیت بھی پیدا کی ہے ، جہاں ہمیں زندگی کی تمام تر تلخیوں کے باوجود ایک آس کی ڈھارس دکھائی دیتی ہے۔ وہ معاشرتی اقدار کی خاطر شخصی اِتّحاد کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ ان کا اظہارِ بیان ایسا شگفتہ اور دل آویز ہوتا ہے کہ بات دل کو موہ لیتی ہے۔ وہ شام کے وقت اکٹھے دوستوں میں جہاں ہر قماش کے افراد دن بھر کی تھکاوٹ کو دور کرنے اور ذہنی آسودگی کی خاطر جمع ہوتے ہیں ،اُنھیں ایک بزرگ دوست کی حیثیت سے ناصحانہ انداز میں کہانی سناتے ہوئے زندگی کی حقیقتوں کے پردے چاک کرتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی ایک نظم "بازوؤں کی زنجیر" میں یہی والا انداز اپنایا ہے:

مَحبّت نے دوستی کا نیا پل تعمیر کیا ہے

لمحے کتنے آسودہ اور راستے کتنے سہل ہو گئے ہیں

خوشی کا سفر ایک دوسرے کے وسیلے سے جاری ہے

رشتہ در رشتہ۔۔۔۔۔۔۔۔

دست بہ دست روشنی کا سفر جاری ہے (۳۸)

ریاض مجید نے اپنی پابند نظموں، غزلوں اور قطعوں میں بھی سال بھر کے معاملات اور تجربات کے ساتھ حالاتِ حاضرہ پر بھی بڑے مبسوط انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ قومی تہوارات، سانحات اور دیگر تقاریب کی حوالے سے قصرِ شعری کی آراش کا اہتمام کرتے رہے ہیں۔ چناں چہ سالِ نو کی مبارک باد کے حوالے سے بھی ان کی پابند شاعری اور نثموں میں بھی اظہار ملتا ہے۔ ہمیں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ریاض مجید کے لیے شعر نکالنا اور وہ بھی نشتر شعر نکالنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اِدھر کوئی نیا واقعہ رونما ہوتا ہے، اُدھر ان کا نوکِ قلم انوکھی بات کہہ ڈالتا ہے۔ کمال کی بات یہ ہے کہ ریاض مجید نے سالِ نو کی مبارک باد کے حوالے سے جہاں کہیں بھی شعر کہا ہے، اس میں نیا انداز اختیار کیا ہے اور نئی بات کی ہے۔ اُنھوں نے تخیّل کی کار فرمائی سے ایک عجب شعری قندیل روشن کی ہے۔ وہ ایک ایسے شاعر کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں، جس نے اپنے اشعار کو بھی دہری بار استعمال میں نہیں لایا ہے۔ وہ اپنے چبائے ہوئے لقمے دوبارہ نہیں چباتے، چہ جائے کہ دوسروں سے اس حوالے سے اکتساب کیا ہو۔ سالِ نو کے ضمن میں ریاض مجید کی ایک نثم "نئے سال کی مبارک" ملاحظہ کیجیے:

نئے سال کی ساری خوشیاں تمھیں مبارک ہوں

محبّت، مُسرّت، تسلی، سکوں میری دعا ہے کہ۔۔۔۔

اس نئے سال میں

سب تمھاری گلی کے مطمئن مسافر ہوں (۳۹)

ریاض مجید نے اپنی نثموں میں ماضی کے دریچے میں جھانکتے ہوئے رمانیت کی عجیب داستان سرائی کی ہے۔ اُنھیں بھی فطرت کا یہ رنگ مزاجاً بھاتا ہے۔ وہ پرانے خوابوں کو سرمایۂ حیات تصوّر کرنے والے افراد کے دل کی بات کرتے ہوئے ان کے جذبات کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اُنھوں نے انسان کی اس فطرتِ ثانیہ کو بیان کرتے ہوئے حال میں ایک ذہنی آسودگی کا گوشہ تلاش کیا ہے۔ ایسی اطمینان بخش فضا کے حوالے سے ریاض مجید کی نثم "پرانے خواب اچھّے ہوتے ہیں" کی چند سطریں بطورِ مثال پیش کی جاتی ہیں:

وہ بچھڑتے وقت زندگی کی تفصیلات ساتھ لے گیا تھا

اس کے واپس آتے ہی میری زندگی کی تفصیلات واپس آ گئیں

اس کی آواز مجھے اپنے تک آتی محسوس ہوتی ہے

اب ہم دو الگ الگ نہیں رہے (۴۰)

ریاض مجید انسانی فطرت کے کمزور پہلوؤں کی عکاسی پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسی بہت سے برائیاں پائی جاتی ہیں، جن کو قابلِ مذمّت گردانتے ہوئے ریاض مجید نے برملا قلم اٹھایاہے۔ ان کے کلام سے ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اُنھوں نے تمام معاشرتی برائیوں کی جڑ جھوٹ کو سب سے زیادہ قابلِ مذمّت ٹھہرایاہے۔ یہ ایسی برائی ہے، جو اعتبار کے سدِراہ ہوتی ہے۔ وہ اس برائی کو انسانی معاشرے کی سب سے بیخ کن برائی کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کا اندازِ بیان چوں کہ بہت کم جذباتی اور جارحانہ ہوتا ہے، اس لیے وہ اپنے دھیمے سروں میں بات کہہ جاتے ہیں۔ نثم "میں جھوٹ سے ڈرتا ہوں" میں اُنھوں نے ایساہی منظرنامہ پیش کیاہے، چند سطور میں ان کا انداز دیکھیے:

میں دشمن کے سچ سے نہیں

جھوٹ سے ڈرتا ہوں

کہ اس کے پاس سچ بہت ہی محدود ہے

اور

جھوٹ میں وہ کسی حد سے بھی آگے جاسکتا ہے (۴۱)

ریاض مجید کی نثم کا ایک مستقل باب رومانیت اور رجائیت عمل بردار ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اُنھوں نے زندگی کو حقیقت پسندانہ نگاہ سے نہیں دیکھا۔ وہ زندگی کے جُملہ پہلوؤں کو بڑی شد و مد سے بیان کرنے پر مکمل عبور رکھتے ہیں، تاہم ان کی نثم نگاری کے پسندیدہ موضوعات کے حوالے سے درج بالا موضوعات کی وقعت زیادہ ہے۔ اُنھوں نے اس خصوص میں تشبیہ اور استعارے اور علامت سے بھی خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ وہ شاعری میں اثرانگیزی کی روح کے زیادہ قائل ہیں۔ اُنھوں نے ، جو بھی بات کی ہے، وہ دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ریاض مجید نے زندگی کو بہت قریب دیکھا اور برتاہے۔ وہ زندگی کے حقائق اور نزاکتوں کے پارکھ واقع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کی رنگارنگ حالتوں کے الگ الگ بیان سے الگ الگ دنیائیں آباد کرنے پر قادر ہیں۔ ان کی شاعری ایک ایسا نگارخانہ ہے، جہاں ہمیں حیرت انگیز آرٹ گیلری نظر آتی ہے۔

ریاض مجید نے نثموں میں، جو منظر کشی کے جواہر دکھائے ہیں، یہ ان کی بارک بینی اور نگاہِ تدقیق کا اعجاز ہیں۔ وہ لفظوں کے ذریعے سے ایسے انوکھے اور پرسحر جزیرے آباد کرتے ہیں کہ جن میں ہر جزاپنے اندر ایک کل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُنھوں نے بیان کی ربط سے ایسا سماں باندھ رکھا ہے کہ عام قاری بھی بات مکمل کیے بغیر سانس نہیں لیتا۔ ایک بڑے فن کاری کی فن کارانہ صلاحیّتوں کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ قاری کو اپنے سحر سے آزاد نہ ہونے دے۔ ریاض مجید کے حوالے سے یہ بیان بالکل صادق آتا ہے۔ درج ذیل نثم " آخرکار" میں ریاض مجید اسی نقطۂ نظر کی عکاسی کرتے ہیں:

اس کی محبّت شبنم کے قطروں کی طرح ہے

اور مرا زخمی دل پھولوں کی کھلی ہوئی پنکھڑیوں کی طرح ہے

آفتاب ہر صبح میری اس پونجی کو چرا لے جاتا ہے

میں اس کے مقابلے میں بہت بے مایہ ہوں (۴۲)

ریاض مجید ایسے فن کار ہیں، جنھوں نے زندگی بھر فن کو انسانیت کی بھلائی کے لیے بطورِ آلہ کار استعمال کیا ہے۔ وہ فن برائے زندگی کے نظریے کے علم بردار بھی ہیں اور فن کی فن کارانہ ضروریات اور جہات کے بھی منکر نہیں ہیں۔ رندگی کی رومان پرور فضاؤں کا اظہار تو ان کی شاعری کا خاصہ ہے ہی، وہ زندگی کے سود مند حوالوں کی بھی نفی نہیں کرتے۔ اُنھوں نے ادب کو نری کھوکھلے نعرے بازی کے لیے کبھی بھی استعمال نہیں کیا ہے۔ وہ ایک ایسے باشعور فن کار ہیں، جن کے فن میں زندگی جھلکتی ہے۔ وہ زندگی کے بناض کی حیثیت سے شعری آراش کا سامان کرنے میں بڑی حد تک کامران رہے ہیں۔ یہی ریاض مجید کی شاعری اور فکر و فن کا اعجاز ہے۔

ریاض مجید نے فن کے اس میدان میں ان فن کاروں کی کھل کر مذمّت کی ہے، جو فن کو زندگی کی ترجمانی کے لیے استعمال کرنے سے کتراتے ہیں۔ ان کے نزدیک فن ایک ایسی حقیقت ہے، جس سے کسی کو انکار نہیں۔ پھر فن کی مردہ انانیت کے کیا معنی؟ فن تو شروع ہی سے انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا عکاس رہا ہے۔ وہ اس عینک کے علاوہ فن کو کسی اور طرح دیکھنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہ ہر فن کار کو اسی حقیقی عینک سے زندگی کو دیکھنے اور پیش کرنے کا امین کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں ادب میں فن کی اور طرح کی کوئی بھی پیش کش ان کے لیے کھوکھلے نعرے بازی کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ ایسے فن کار کو وہ تہذیب یافتہ زندگی کی توہین قرار دیتے ہیں۔ ان کی نظم ''آرٹ لَور'' اِنھی جذبوں سے مملو ہے، اس کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

شہر کے سب سے بڑے آرٹ لَور

اپنی اپنی مردہ اناؤں کی قبروں کے گرد بیٹھے فن کی نمو پر گفت گو کر رہے ہیں

اگر فن حق کی ترویج نہیں کرتا

انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی پاس داری اس کا منصب نہیں

تو ہر فن کار اپنی حیثیت کے جھوٹے گھمنڈ میں سرشار

تہذیب یافتہ زندگی کی توہین کا محض تماشائی ہے (۴۳)

انسانی زندگی میں جذبوں کی قدردانی اور محبّت کی حقیقت کو بھی ریاض مجید نے اپنے انوکھے وژن سے دیکھا ہے۔ وہ مختلف تلازموں اور علامتوں سے ان حقیقتوں کی ترجمانی پر قادر رہے ہیں۔ وہ کبھی زندگی کی بے ثباتی کو بیان کرتے ہوئے انسانی زندگی کی کم مائیگی کا ادراک کرتے ہیں، تو کبھی زندگی کے حسن کو بیان کرنے کے لیے اس بے ثباتی کے باوجود ایک لذّت کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ غرض ریاض مجید نے زندگی کے جُملہ امکانات کو مقدور بھر شعری سانچوں میں پیوست کیا ہے۔

''لمس کا امانت دار موسم'' میں اُنھوں نے زندگی کی حقیقت کو ایک اور روپ میں بیان کیا ہے۔ اس نظم کو دیکھ کر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ریاض مجید ایک ایسے فن کار ہیں،، جو زندگی کو ہر عینک سے دیکھ کر اس کی نئے انداز میں عکس بندی کرتے ہیں۔ ان کی اس آرٹ گیلری میں ہمیں ایسی تصاویر بھی نظر آجاتی ہیں، جن کے در پردہ سایوں میں موجود زندگی کی رمق ایک اور زاویۂ نگاہ رکھتی ہے۔ مراد یہ کہ ریاض مجید نے انسانی زندگی کو ہر زاویے سے دیکھا، پرکھا، برتا اور پیش کیا ہے، لہٰذا جس زاویے سے بھی ان کی پیش کردہ زندگی کا درشن کیا جائے گا اسی زاویے سے زندگی ایک الگ رنگ میں جھلکے گی۔ زندگی کی اس بو قلمونی کے حوالے سے ریاض مجید واقعی قابلِ داد ہیں:

پرندہ اڑ کر جا چکا ہے

شاخ ابھی تک سرشاری سے جھوم رہی ہے

آتے کئی موسم اس لمس کے امانت دار ہوں گے (۴۴)

ریاض مجید نے فکرِ غالبؔ کے اس پہلو ''قطع تعلقی سے عداوت روائی'' کی تلقین کو بھی اپنی نظم میں انوکھے انداز میں بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے انسانی فطرت اور جبلت کو معاشرتی تعلق کی دلیل ٹھہراتے ہوئے، تعلقات کے لامتناہی سلسلے اور گفت و شنید کو انسان ہونے کا جُز قرار دیا ہے۔ وہ بات کی دلیل کو سب سے اعلیٰ و ارفع جانتے ہیں۔ چوں کہ وہ انسان بیزاری کو انسانیت کے لیے زہرِ ہلاہل سمجھتے ہیں، اس لیے تعلق براری کے لیے بات چیت کو ضروری جانتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی انوکھی بات بھی نہیں ہے، جس کو ریاض مجید نے اپنے کلام کی زینت بنایا ہے۔ البتہ ان کا اندازِ کلام اور ضرورتِ کلام دونوں یقیناً انوکھے ہیں۔ ''مکالمے رہنے چاہئیں'' کی چند سطور دیکھیے:

اسے معلوم ہے میں اس سے خفا نہیں ہو سکتا

اسے حق ہے وہ پوری دنیا کو تباہ کر دے

لیکن اسے یہ بھی علم ہے

کہ وہ اس طرح مجھے اپنے آپ سے بیزار نہیں کر سکتا (۴۵)

اسی طرح ایک اور نظم بہ عنون "جسم نے میری منزل کیا ہونا ہے" میں ریاض مجید کی تعلق براری اور مکالموں کی اہمیت اور ضرورت کے حوالے سے انوکھا انداز دیکھیے:

رازیاب خاموشی میرا راستہ ہے

جس میں کہیں کہیں مہربان مکالموں کے سنگِ میل آتے ہیں (۴۶)

درج بالا شعری تماثیل میں ریاض مجید کی ایک اور نظم "ایک آواز" بھی اہمیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ وہ یہاں اس آواز کو زندگی کی تاریخ سمجھتے ہیں، جس کے رک جانے سے انسانی زندگی میں تعطل پڑ سکتا ہے۔ اُنھوں نے یہاں چہکتے ہوئے چہروں کے گنگ اور ساکت ہونے کا نوحہ بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے زندگی کی تاریکی اور روشنی کو سمجھانے کے لیے بھرپور منظر کشی کی ہے:

یہ کیسی آواز ہے؟

جسے روک لیا جائے تو نصف صدی کے فن کا سفر رک جاتا ہے

سیلولائیڈ کے فیتے پر لمبی خراشیں پڑ جاتی ہیں

چہکتے چہرے گنگ اور ساکت ہو جاتے ہیں

جیسے بجلی کے چلے جانے سے ماحول کا متحرک حِصّہ ساکت اور تاریک ہو جاتا ہے

اس آواز کے بغیر

فن کی نصف صدی ساکت اور تاریک ہے (۴۷)

ریاض مجید نے اپنے کلام میں اس حقیقت کی بھی مُذمّت کر رکھی ہے کہ اینٹ کا، جواب اینٹ اور پتھر کا، جواب پتھر ہی سے دینا، جو ہر زندگی ہے۔ وہ تو محبّت اکے ایسے دیپ روشن کرنے کے آرزومند ہیں، جن کی ضوفشانی سے آنے والے وقتوں میں دل کی دنیا میں تاریکیوں کو پاٹا جاسکے۔ بات وہی ہے کہ ریاض مجید زندگی کے جینے کا فن زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ محبّت کے دیپ جلتے دیکھ کر اندر سے جاگ اٹھتے ہیں۔ وہ میدانِ وفا میں کامرانی کی کوشش کو اس انداز میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ اُنھوں نے انجام کی پروا کیے بغیر ایسا طرزِ عمل روا رکھنے کو اصلِ حیات قرار دیا ہے۔ نظم "تم سرخرو ہو گئے" میں ہمیں زندگی میں سرخرو ہونے کی ممکنہ صورت واضح انداز میں دکھادی ہے:

ایک ہلکی سی دیا سلائی۔۔۔۔۔۔ایک چھوٹا سا دیا

در گزر، محبّت، طلب، خاموشی اختیار کیے رکھو

اس کا، جواب خاطر خواہ نہ بھی ملے

تم اپنی وفا میں تو سر خرو ہو گے (۴۸)

غرض ریاض مجید نے پابند شاعری کا ایک مستند شاعر ہونے کے ناطے اظہار کے نئے امکانات کو بہ صد شوق قبول کیا ہے۔ ان کی وسعتِ نظری اور امکاناتِ شعری کی یہ ایک بڑی دلیل ہے کہ انھوں نے غزل، نظم، نعت اور قطعہ میں شاعری کے باو، جو ود نثری نظم کو بھی اظہار کا ذریعہ گر دانتے ہوئے دو اُمور انجام دیے ہیں ایک یہ کہ اُنھوں نے ہیئتوں کے اضافے کو کھلے دل سے نہ صرف قبول کیا بل کہ اس میں لکھنا بھی شروع کیا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ریاض مجید نے ان نو واردانِ شوق کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی ہے بل کہ ان کے مخالفین کے سدِ راہ بھی ہوئے ہیں۔ ایسا کرنے سے ان لکھاریوں کو، جو عروضی پیمانوں اور بحر و آہنگ کو شعر گوئی کی رہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے ان کے لیے بڑی حد تک امکانات کے در وا کیے ہیں۔

ریاض مجید نے نثم نگاری میں وہی موضوعات عمومی طور پر بیان کیے ہیں، جو پابند شاعری خصوصاً نظم نگاری میں رہے ہیں۔ اُنھوں نے نثم نگاری کی فضا کی بنت میں قابلِ قدر اضافے کیے ہیں۔ وہ بات کہنے کا ڈھنگ جانتے ہیں، اس لیے وہ یہاں بھی نثری اسالیب میں بھی شعری حسن پیدا کرنے میں کامیابی سے ہم کنار ہوئے ہیں۔ نثم نگاری میں اُنھوں نے جارحانہ اُسلُوب کو بالکل جگہ نہیں دی۔ وہ بڑے لوچ دار اور دھیمے سروں میں بات کر گئے ہیں۔ ابتدا میں ان کی نثموں میں کہیں کہیں ہیجان انگیز فضا جھلکتی ہے، تاہم ان کی نثم نگاری میں بھی ایک باشعور فن کار کی طرح ارتقائی منازل طے ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اُنھوں نے کمال ہنر وری سے نثموں میں انسانی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ وہ ہر کہانی کی بنت میں خود کو سامنے رکھتے ہوئے بات سے بات نکالتے چلے جاتے ہیں۔

ریاض مجید کی نثموں میں ہمیں قاری کے ساتھ ان کی ایک مخصوص ذہنی ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے۔ وہ بات کو شعری پیکر میں ڈھالنے اور فکری تسلسل کو قائم رکھنے میں فن کارانہ صلاحیّتوں سے درپردہ طور پر کام لے جاتے ہیں۔ یہ ریاضت ریاض مجید کی نصف صدی سے زائد عرصے کی شعری ریاضت کی دلیل ہے۔ اُنھوں نے نثم نگاری کے اُسلُوب کو بھی دیگر اسالیب سے مختلف روا رکھا ہے۔ یہی ان کے فن کا اعجاز بھی ہے اور انفرادیت بھی۔

حوالہ جات:

۱۔ پروفیسر عارف رضا، نثمیں-ایک جائزہ، مشمولہ: نثمیں، از ریاض مجید، قرطاس، فیصل آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۴

۲۔ ایضاً، ص ۱۲۵

۳۔ ایضاً، ۱۲۵-۱۲۶

۴۔ ریاض مجید، نثمیں، قرطاس، فیصل آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۹

۵۔ ایضاً، ص ۱۰-۱۱

۶۔ ایضاً، ص ۱۲

۷۔ ایضاً، ص ۱۵

۸۔ ایضاً، ص ۱۶

۹۔ ایضاً، ص ۱۸

۱۰۔ ایضاً، ص ۳۸

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۹

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۱-۲۲

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۷-۲۸

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۰

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۲

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۴

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۱-۴۲

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۵

۱۹۔ ریاض مجید، نظمیں، ص۴۸

۲۰۔ ایضاً، ص۴۹-۵۰

۲۱۔ ایضاً، ص۵۵-۵۶

۲۲۔ پروفیسر عارف رضا، نظمیں ایک جائزہ، مشمولہ: نظمیں از ریاض مجید، ص۱۲۶

۲۳۔ ریاض مجید، نظمیں، ص۵۷-۵۸

۲۴۔ پروفیسر عارف رضا، نظمیں ایک جائزہ، ص۱۲۷

۲۵۔ ریاض مجید، نظمیں، ص۵۹

۲۶۔ ایضاً، ص۶۱

۲۷۔ ایضاً، ص۶۳

۲۸۔ ایضاً، ص۶۵

۲۹۔ ایضاً، ص۶۶

۳۰۔ ایضاً، ص۶۸-۶۷

۳۱۔ ایضاً، ص۶۹

۳۲۔ ایضاً، ص۷۲

۳۳۔ ایضاً، ص۷۳

۳۴۔ ایضاً، ص۷۴

۳۵۔ ایضاً، ص۷۶

۳۶۔ ایضاً، ص۷۷

۳۷۔ ایضاً، ص۹۳

۳۸۔ ایضاً، ص۸۱

۳۹۔ ریاض مجید، نشیمن، ص ۹۲

۴۰۔ ایضاً، ص ۹۵

۴۱۔ ایضاً، ص ۹۶

۴۲۔ ایضاً، ص ۹۷

۴۳۔ ایضاً، ص ۹۸

۴۴۔ ایضاً، ص ۹۹

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۴۶۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۴۷۔ ایضاً، ص ۱۰۴

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۰۵

باب ہفتم:

نثری خدمات

ڈاکٹر ریاض مجید کی پنجابی کتاب ''خودی تے بے خودی'' کے بارے میں میرزا ادیب لکھتے ہیں:

''قیامِ پاکستان کے بعد پنجابی زُبان و ادب کو بڑا فروغ حاصل رہا ہے اور مسلسل ہو رہا ہے جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اس صنف ادب کو تو پنجابی صوفی شعرا نے بڑی بُلندی پر پہنچا دیا تھا۔ بابا فرید باہوؒ، سلطان باہوؒ، شاہ حسینؒ، محمد بخشؒ، بلے شاہؒ، سید وارث شاہؒ، یہ مختصر سی فہرست ہے۔ اس میں اور طبی متعدد قابل ذکر شعرا کے اسمائے گرامی کو درج ہونا چاہیے۔ ان شعرا نے پنجابی شعری ادب کی معنوی اور تخلیقی ثروت ہیں پاکستان کے وجود پذیر آنے سے پیشتر ہی اہم اضافہ کر دیا تھا۔ پچھلے پچاس برس میں پنجابی شاعری نے آگے بڑھ کر مختلف النوع معاشرتی مسائل کو ساتھ لے کر نئی بُلندیوں کو چھوا ہے۔ یہ کوشش تواتر سے باری ہے ان لمحوں میں مجھے علّامہ اقبال کی ایک کتاب کے حوالے سے کُچھ گفت گو کرتی ہے، مگر میں چاہتا ہوں کہ اقبالیات کے سلسلے میں پنجابی زُبان کے حوالے سے کام نہ رہے اس کا مختصراً ذکر کر دوں۔ یہاں میں ڈاکٹر شہباز ملک، صدرِ شعبہ پنجابی یونی ورسٹی اور ئینٹل کالج کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس فہرست کو پیش کرنے میں میں نے ان کی جامع تالیف پنجابی کتابیات سے مدد لی ہے۔'' (۱)

علّامہ اقبال کے حوالے سے اب تک مئی ۱۹۹۱تک، جو کام ہو رہے وہ درج ذیل کتابوں کی طرف ہماری توجُّہ مبذول کراتا ہے:

ارمغانِ حجاز: ترجمہ عبدالغفور اظہر

اسرارِ خودی: ترجمہ خلیل آتش

اسرارِ خودی: ترجمہ قریشی احمد حسین قلعہ داری

اقبال و الشکارا: ترجمہ اختر حسین شیخ۔ (اس کتاب میں ترجم نے علّامہ کی پانچ نظموں کو پنجابی میں منتقل کیا ہے)

اقبال دیاں... نظماں: ترجمہ خلیل آتش

بالِ جبریل: ترجمہ نسیم...

پنجابی شکوہ: ترجمہ رحمت علی رحمت

پنجابی شکوہ: ترجمہ فضل احمد شان

جاوید نامہ: ترجمہ شریف کنجاہی

جاوید نامہ: ترجمہ ڈاکٹر مہر عبدالحق

خطباتِ اقبال: ترجمہ شریف کنجاہی

دلاں دا چانن: ترجمہ عبد المجید خاں ساجد (علّامہ اقبال کی اس نظموں کو پنجابی میں پیش کیا گیا ہے)

شکوہ، جواب شکوہ: ترجمہ فضل احمد فاروقی

شکوہ، جواب شکوہ: ترجمہ ماسٹر کاظم علی

علم الاقتصاد: ترجمہ شریف کنجاہی

گلشنِ رازِ جدید و بندگی نامہ: ترجمہ احمد حسین قریشی

مسافر: ترجمہ احمد حسین قریشی قلعہ داری

نقشِ اقبال: ترجمہ صوفی تبسم (علّامہ کی منتخب فارسی نظموں کا ترجمہ)

ہُن کی کریے: منظوم ترجمہ سیّد منظور حیدر

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ علّامہ اقبال کے سلسلے میں، جس کام کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ مئی ۱۹۹۱ء تک زمانے کو محیط ہے۔

علّامہ اقبال کی بعض کتابوں کا ترجمہ مختلف اہلِ قلم نے کیا ہے اور اس بات کو پیشِ لفظ نہیں رکھا کہ جس کی کتاب کا وہ ترجمہ کر رہے ہیں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے یہ کوئی قابلِ گرفت بات ہرگز نہیں۔ یہ ایک صاحبِ قلم کا اپنا اُسلُوب اپنا طریقِ تفہیم و اظہار ہوتا ہے اور تیسری بات کہ اقبال کو نثری تصانیف کی طرف اتنی توجُّہ نہیں دی گئی جتنی شعری مجموعوں کی طرف دی گئی ہے کہ اس ضمن میں شریف کنجاہی کی کوشش نمایاں ہے کہ اُنھوں نے علّامہ کی دو نثری کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔

یہ کتاب اقبالیات کے دائرے ہی میں آتی ہے یہ کتاب ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید کی تازہ ترین کتاب ہے اور اس کا نام ہے ''خودی تے بے خودی'' اور اس کی جُزی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

متذکرہ بالا سطور میں علّامہ اقبال کی ان کتابوں کے پنجابی تراجم کی فہرست دی ہے، جو مئی ۱۹۹۱ء تک کئے گئے ہیں اس فہرست کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علّامہ کے بیشتر شعری مجموعے پنجابی زُبان میں منتقل ہو چکے ہیں اور اب کہ ۱۹۹۵ء کا سال اپنی اختتامی منزل سے گزر رہا ہے علّامہ کے بقیہ مجموعے بھی ترجمے توسط سے پنجابی زُبان میں آ چکے ہوں گے۔ میرزا ادیب ریاض مجید کی اس تخلیق کے بارے میں مزید لکھتے ہیں:

> ''علّامہ نے اپنے افکار و تصوُّرات کا اظہار تو اپنے فارسی اور اُردُو کلام میں ہی کہا ہے، لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے ان افکار کی تشریح اور صراحت اپنی نثری کتابوں ہی میں کی ہے۔ یہ نثری کتابیں شعری مجموعوں سے

مقابلتاً کم ہیں، مگر اقبال کے فلسفے کی تفہیم ملے، ان کا مطالعہ بھی ناگزیر نے شریف کنجاہی نے اقبال کی سب سے اہم نثری تصنیف خطبات اقطال ترجمہ کر دیاہے اور یہ ان کا اہم رول ہے، لیکن میں عرض کر دوں گا کہ ہر چند کہ اقبال کی تصانیف کو پنجابی میں منتقل کرنا ایک اہم ضرورت پوری کر دیتا ہے، لیکن یہ کام اقبال کے نظریات کے قریب تر پہنچے۔ کافی نہیں بالخصوص ان کے مرکزی نظریے خودی و بے خودی کے لیے اور میں نے ابھی ابھی جس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید کا کاوش ''خودی تے بے خودی'' وہ اس لحاظ سے ایک نہایت اہم کارنامہ سمجھا جائے گا کہ ڈاکٹر صاحب نے تراجم سے ہٹ کر غلام کے فلسفے پر روشنی ڈالی ہے اور میں سمجھتا ہوں بھرپور روشنی ڈالی ہے۔'' (۲)

ڈاکٹر ریاض مجید اُردُو اور پنجابی کے منفرد شاعر ہیں۔ صاحبِ فکر، صاحب بصیرت اور صاحب شعور ہیں اُنھوں نے علّامہ کے نظریے کے وضاحت بصیرت آموز انداز میں کی ہے اور اقبال کے سلسلے میں ایک بڑی کمی کی بڑی خوش اُسلُوبی سے پورا کیاہے۔ فہرست پر ایک نظر ڈالتے آپ دیکھیں گے تو آپ اسی نتیجے پر پہنچیں گے، جس کا اُوپر کیاہے ملاحظہ فرمایے۔ خودی تے بے خودی۔ تنقیدی جائزہ پھر بعض... اصطلاحات ای وفات۔۔ اشاریہ، کتاباں، اس آخری باب میں مصنف نے بڑی محنت کاوش۔ تلاش و جستجو سے کام لیاہے۔ یہ کتاب تمام کی تمام اِنھی خصوصیات کی مظہر ہے، لیکن ان کا خصوصی اظہار اس باب میں کیا گیاہے۔ بقول میرزا ادیب:

> ''یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے بارے میں بہت کُچھ کہا جا سکتاہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے بہت کم کہاہے، لیکن مجھے یقین ہے یہ فرخ اس کتاب کا تنقیدی جائزہ لینے والے حضرات ادا کریں گے۔'' (۳)

ڈاکٹر ریاض مجید نے اپنی اس ذہنی کاوش کا انتساب اپنے محترم اُستاد مرزا محمد منوّر صاحب کے نام کیاہے، جو بلاشبہ فکرِ اقبال کے بڑے فاضل مفکر ہیں۔

یہ کتاب علّامہ اقبال کی مشہور کتاب ''اسرار ورُموز'' کے بارے میں ایک جائزہ ہے، جس کا مقصد پنجابی قارئین کو علّامہ اقبال کی شاعری کے بنیادی موضوعات خودی اور بے خودی سے متعارف کرانا ہے۔ اقبال کے فکر و فن کے حوالے سے اُردُو زُبان میں گراں قدر کام ہو چکا ہے، لیکن پنجابی اور دیگر پاکستانی زُبانوں میں یہ کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ ریاض مجید اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے کہ یہ کتاب اقبال کے تصوُّری خودی کے حوالے سے کسی چونکا دینے والی نئ فکر کا اضافہ نہیں کرتی بل کہ اُنھوں نے اس کتاب کے ذریعہ سے صرف یہ کوشش کی ہے کہ اُردُو میں موجود وضاحتی مواد کے حوالے سے پنجابی قارئین کو ''اسرار ورُموز'' کے مختلف پہلوؤں سے آشنا کرایا جائے۔

کتاب کو چار حِصّوں میں تقسیم کیا گیاہے۔ پہلے حصے میں مثنوی ''اسرار خودی'' کا جائزہ لیا گیاہے۔

۱۔ تمہید ۲۔ کائنات دے نظام دی بنیاد۔۔۔ خودی ۳۔ خودی دی حیاتی مقصد اں نال مَحبّت سے منحصر اے۔ ۴۔ خودی عشق تے مَحبّت نال مضبوط ہوندی اے ۵۔ سوال خودی نوں کمزور کر دیندا اے ۶۔ خودی تے کائنات دا نظام ۷۔ مغلوب قوماں دا مخفی حیلے ۸۔ افلاطوں تے گوسفندی مسلک ۹۔ شعر دی حقیقت تے ادبیات دی اصلاح تے درستی ۱۰۔ خودی دی تربیت دے تِن درجے ۱۱۔ حضرت علیؓ دے ناواں دے اسراری تفسیر ۱۲۔ اسراروالیاں کہانیاں ۱۳۔ اسلامی جہاد مقصد۔ ۱۴۔ وقت تلوارے۔ ۱۵۔ دعا

کتاب کے دوسرے حِصّے میں ''رموزِ بے خودی'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس جائزہ کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ تمہید، ۲۔ توحید، ۳۔ رسالت، ۴۔ مِلّت دا تصوُّر تے اسلامی ملّت دیاں نویکلیاں خوبیاں، ۵۔ مقام دی قید توں آزادی، ۶۔ قید زمانی توں آزادی، ۷۔ مِلت محمدیہ ہمیشہ قائی رہوے گی، ۸۔ اسلامی مِلّت دی ترقّی تے ایہدی مضبوطی دیاں بنیاداں، ۹۔ رسُولِ اکرمؐ دے حضور عرضِ حال۔

اس حِصّہ میں مثنویوں کے جائزہ کے سلسلے میں، جو ابواب بندی کی گئی ہے وہ مثنویوں کی اصل کے مطابق نہیں ہے بل کہ بعض جگہ دو دو تین تین عنوانات کے تحت لکھے گئے خیالات کو ایک ہی عنوان کے تحت جمع کر دیا گیا ہے۔

کتاب کے تیسرے حِصّہ میں مثنوی ''اسرار و رموز'' کے حوالے سے اجتماعی حیثیت سے ایک تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں مثنوی کے فکری و فنّی پہلوؤں کے بارے میں مختصر گفت گو کی گئی ہے۔ کتاب کے طوالت کے خدشے کے پیشِ نظر فنّی محاسن کے بارے میں بہت تفصیلی بحث گریز کیا گیا ہے، لیکن ریاض مجید، علّامہ اقبال کے مفکرانہ اور شاعرانہ دونوں حیثیتوں کے تہہ دل سے معترف ہیں۔

کتاب کے چوتھے حِصّے میں سب سے پہلے علّامہ اقبال کے کلام کے بارے میں ایک سیر حاصل بحث موجود ہے۔ اقبال کی شاعری کو سمجھنے کے لیے بعض ایسے الفاظ کا مفہوم قاری پر واضح ہونا بہت ضروری ہے، جو بار بار علّامہ اقبال کے کلام میں استعمال ہوئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے الفبائی ترتیب (Alphabetical Order) کے تحت ایسے الفاظ کے بارے میں ضروری معلومات دی گئی ہیں۔ وضاحت (فرہنگ) کے ذریعہ سے اقبال کے وہ پنجابی قارئین ضرور مستفید ہوں گے، جن کا تعلق مسلم معاشرے سے ہے یا، جو اسلامی تہذیب اور تاریخ کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے۔ اسی حصّے میں حوالہ جات، مآخذ، کتابیات اور اشاریہ شامل کر کے کتاب کو ایک مستند اور معتبر جہت عطا کی گئی ہے۔ اشاریہ کے ذریعے کتاب میں آنے والی قرآنی آیات، احادیث، اشخاص کے نام، کتب، ممالک اور اقوام کے نام اور ان مقامات کے بارے میں صفحات کی نشان دہی کی گئی ہے جن کا ذکر کسی نہ کسی حوالے سے اس کتاب میں آیا ہے۔ اس کتاب میں اقبال کی اُن بہت سی تراکیب اور الفاظ میں کوئی ردّوبدل نہیں کیا گیا، جن کے مفہوم کی ترجمانی کا حق پنجابی میں ادا نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ بعض مقامات پر مصنف نے ایسے الفاظ

وتراکیب کا استعمال کیا ہے، جو عام بول چال سے ہٹ کر ہیں، لیکن مفہوم کی ترسیل میں زیادہ معاون ثابت ہوئی ہیں، ''خودی تے بے خودی'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''خودی دی بیداری لئی اقبال ہوری مقاصد نوں اوّلیت دیندے نیں۔ اقبال دی نظر وچ انسان دی برتری دا بنیادی سبب انسان دا آرزو نال مسلح ہونا اے۔ ایس سرنانویں دے ماتحت اقبال نے جیہڑی پہلی گل کیتی اے اوہ ایہہ وے کہ:
>
> زندگی در جستجو پوشیدہ است اصلِ او در آرزو پوشیدہ است
>
> (حیاتی جستجو وچ لکی ہوئی اے تے ایہدی اصل آرزو وچ چھپی ہوئی اے مطلب ایہہ کہ کسے نہ کسے مقصد تے آرزو وچ رجھے رہنا تے کسے نہ کسے منزل نوں حاصل کرن لئی مسلسل اوہدے ول ودھے جانا ای زندگی اے)۔ ایس بند وچ مقصد، مدعا تے تلاش ستّے اکھر مترادف دے ہم معنی نیں۔ اقبال کہندے نیں کہ حیاتی دی ہمیشگی ایس گل تے منحصر اے کہ کوئی صاف تے خاص مقصد انسان دیاں اکھّاں موہرہووے۔ حیاتی مقصد وچ تے مقصد سدّھر وچ لکیا ہویا اے۔ انسان فطری طور تے تلاش نال پیار کردا اے۔ ایسے ای تحقیق تے جستجو وچ حیاتی دا بھیت لکیا ہویا اے۔ بے مطلب حیاتی حیوانیت دے اتبار نال تے بے شک جیوندی لگے گی (مطلب ایہہ اتوں تے جیوندی دسّے گی) پر انسانیت دے حوالے نال ایس تے موت لاگو ہو جاوے گی۔'' (۴)

اس کتاب کے مطالعہ سے اس بات کا بھرپور احساس ہوتا ہے کہ ریاض مجید نے اقبال کے فلسفۂ خودی اور بے خودی کو نہایت مہارت اور خوبی کے ساتھ پنجابی قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی تخلیق پر اُنھیں حکومتِ پاکستان کی جانب سے صدارتی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔

پڑھ بسم اللہ بالاں دی نرسری دا پہلا قاعدہ:

''پڑھ بسم اللہ'' ریاض مجید دی بالاں لئی اک نروئی تے نویکلی کاوش اے۔ ریاض مجید ہوری شاعری وچ بڑھ ڈوئی شناخت رکھدے نیں پاکستان چ تے پاکستان توں باہر اوہناں نوں اک شاعر دے طور تے پشانیاں جاندا اے۔ اوہناں دی پنجابی نظماں دیاں دو کتاباں توے دے تارے تے جاشنا پہلے ہی چکا پے چڑھ چکیاں نیں تے ہن پڑھ بسم اللہ بالاں لئی اوہناں دیاہ نرسری رائمز (Nursery Rymes) دی کتاب اے۔ ڈاکٹر رشید احمد گوریچہ ایس کتاب دے وارے چ کہندے نے:

> ''کدی مشرقی معاشرے وچ اک رسم بسم اللہ دے ناں توں منائی جاندی سی۔ جدوں بچہ ذرا ہوش سنبھالا تے اوہنوں خاندان دے وڈوڈیرے کٹھے ہو کے کسے عالم دین کولوں بسم اللہ پڑھاندے سن اوروں علم دا آغاز بسم اللہ چوں کتیا جاندا سی تے عربی فارسی پہلی زُبان دے طور پر پڑھائیاں جاندیاں سن۔ ایسے پاروں ساڈے معاشرے چ حالی، شبلی، نذیر احمد تے غالب جیسے شاعر تے ادیب تے لکھاری پیدا ہوئے پر جدوں اسیں اپنی مدتوں چھڈ کر غیر اں دی مدتوں اختیار کیتی تے زُبان دی بدل لئی دنیاوی ترقّی تے فیش لئی انگریزی پڑھنا پڑھونا فیشن بن گیا تے ہن اے فیشن وبا بن گیا اے۔ گلی محلے وچ

تنگ گلیاں تے تنگ مکاناں چ کنڈا گارٹن تے مونیٹری سکول کھل گئے نیں۔ پنجابی گھراں چ بچیاں پنجابی چ گل کرن دی بجاے انگریزی چ گل بات کرنا یا اُردو گل بات کرنا نشین بن گیا اے۔ ماں پیو آپ پنجابی چ گل بات کردے نیں بچیاں نال اُردو بول دے نیں تے اوہناں نوں انگریزی سکولاں پڑھاندے نیں ایس طرح زُبان دی جس منُافقت دی جڑ بنیاد گھر وچ رکھ جاندی اے اوہ پھول کے سارے معاشرے نوں لپیٹ وچ لے اوندی اے۔ بچہ جیویں جیویں وڈا ہوندا جاندا اے اوہ پھل کے سارے معاشرے نوں لپیٹ وچ لے اوندی اے۔ بچی جیویں جیویں وڈا ہوندا جاندا اے اوہ سوچیں پے جاندا اے پئی اوہدی اصل زُبان کیہڑی اے۔ اوہ مادری زُبان پنجابی بولے یا سکول دی زُبان انگریزی بولے یا اُردو توں اظہار خیال دا ذریعہ بناوے۔ ایس طراح اوہدے وچ منُافقت اوندی جاندے اوہ پنجابی بولنا اپنی توہین سمجھدا تے پنجابی بولن دا لیاں نوں حقارت دی نظر نال دیکھ دا اے۔" (۵)

ریاض مجید ہوراں پڑھ بسم اللہ بنیادی طور تے پاکستان توں باہر رہن دے پنجابی گھراں چ بالاں لئی لکھی اے۔ اوہناں دا قصّہ اے لیے پئی اوہ جیہڑے اکھراں توں ناں اشینا ہو گئے نیں اونفطالی اوہناں نو فیر دتی جاوے۔ ایس طراں "پڑھ بسم اللہ" بنیادی طور تے اک درسی کتاب اے۔ میں ریاض مجید ہوراں دے ایس وعدے نال اتفاق نئی کردا او کہندے نیں: "ایہہ کتاب اناں پنجابی بچیاں لئی ترتیب دتی گئی اے جیہڑے دور دیساں وچ اجنبی ماحول وچ رہن پاروں اوس مڈھلی نفطالی توروئی نا آشنا نہیں جیہڑے اپنے مذہب کلچر تے رتیل نوں سمجھنے لئی ات ضروری اتے جنہاں دے ماں پیو نوں وی ایس کئی دا احساس ہووے۔ ڈاکٹر رشید احمد گوریچہ ڈاکٹر ریاض مجید ہوراں دی ایس کتاب دے واے چ فر کہندے نے:

"ریاض مجید نے ملکوں باہر وسن والے ماں پیو تے اونہاں دے بالاں دا تے بڑا خیال کیتا اے پر اوہ اپنے گھر توں بے خبر لگدے نیں اونہاں نوں پتا ای نئیں پتئی اے نام نہاد انگریزوں سکول ساڑے بالاں دی فصل اجاڑن تے لک بنی پھر دے نیں تے ساڈے دیس ماں پیو احساس کمتری دا شکار ہو کے پنجابی نوں ہتّھیلے بندیاں دیاں زُبان سمجھ کے نظر انداز کر دے نیں۔ اسیں انگریزی دی تعلیم حاصل کرن دی خدمت نہیں نہ اور بولن دے خلاف آں پر پنجاب وچ رہندیاں ہویں سانوں اپنے بالاں نال پنجابی زُبان بولنی چاہدی اے تے پنجابی کلچر تے اتیں بہتر نال تعلق رکھن والی شئیاں نوں اونہاں دے اصل روپ وچ پہچانا چاہیدا۔"(٦)

"پڑھ بسم اللہ" دیاں نظماں اُوپرے ماحول وچ پلن والے پنجابی بچیاں لئی مڈھلی لفظاں لی دی مِعیار بندی دا کوئی مثالی نمونہ نئیں پیش کردہ ایس مسئلہ دل اشارہ ضرور کردیاں نیں کیوں جے اجیہی مِعیار بندی پنجابی دے ماہر سکالر اتے نفسیات داناں دا کم اے میںوں ایہدے پنجابی زُبان تے کلچر نوں فروغ دین والے ادارے ریہدی اجیہی مِعیار بندی دل دھیان دین گے۔

ریاض مجید دی ایس گل بات توں اے پتا چلدا۔ پئی ریاض مجید نوں احساس ہے پئی بالاں سٹی پنجابی زُبان چ کجھ نیں لکھیا گیا تے پنجابی زباں دے جان کاراں نے ایدے دل خاص دھیان وی نئیں رت پئی پنجابی زُبان نوں صرف شعر وشاعری دی زُبان توں اڈا ک علمی زُبان بنایا جادی پہلی جماعت دے نصاب لئی کتاباں لکھن دل دھیان کیتا جاوے۔ میںوں یقین اے پئی جے

ساڈے سکولاں وچ ہمپٹی ڈمپٹی اور بابا بلیک شو یہو یو اپنی وول دی تھاں تے ''پڑھ بسم اللہ'' دیاں نظماں یاد کرائیاں جان کے اوہ پہلی جماعت لوگ دین دا اک صاف کھرا حوالہ کے لیے، جو ان ہون گے۔ ڈاکٹر رشید احمد گورریجہ فرَ کہندے نے:

''ریاض مجید ہوراں دی ایہہ فکری کاوش اس قابل ہے پئی اُنھوں نرسری کلاساں وچ پڑھایا جاوے تے ٹیکسٹ بک بورڈ نوں چاہیدا ایس کتاباں توں مُڈھ سنبھ کے پنجابی لئی مِعیاری درسی کتاباں شایع کرن دا چارہ کرے۔ ریاض مجید ہوراں نے اپنی اک اوکھڑ داوی ذکر کیتا تے میں پنجابی زُبان دے سوجھ داناں نوں درخواست کراں گا پئی اور پنجابی نوں سالریاں لئی قابل قبول بنان لئی ایدے لئی اک لہجہ مقرر کرن۔ اوہدے وچ اوورد ے لفظاں دا استعمال بری گل نئیں کیوں جے زندہ زُباناں وچ دوریاں زُبان دیاں مل وہ اہدیاں نیں۔'' (۷)

ریاض مجید نے پنجابی دی لفظالی توں تصویری صورت وی دتی دے تے نکیاں نظماں راہوں بالاں توں پنجابی زُبان دے نفظالی (حروف تہجی) توں واقف کروایا اے۔ اونہاں نیں بالاں دی عمر دالحاظ کر کے زُبان سادہ تے آسان جہنم استعمال کیتی اے۔ اک وہ قتالاں ویکھو:

اک نوں وَن کے دو نوں ٹُو
گنتی یاد کرے ببلو
تن تھری تے چار نیں فور
ہو ویں نا وعدے دا چور (۸)

ایس طراں عمر مکھاں چ رہن والے کے انگریزی سکولاں دے بال آسانی نال پنجابی گنتی سکھ لیندے نیں اوہناں وہال نظماں چ اخلاقی سبق دی دتے گئے نیں جیویں۔ ہوری نال ودے دا چور دادرونی پہاڑوی ساڈے مشاہدے چ اون دا یہاں شیواں نال مُرتّب کیتا گیا؟

اک دُونی دُونی
کت روں دی پونی
ستو دُونی چوداں
کلّے اتے بجھی گاں (۹)

ریاض مجید ہوراں دی کاوش پڑھ بسم اللہ سمعی بصری Audio video اعانتاں Aids نال ہوری دی چنگی طراں سمجھائی جا سکدیاں نیں۔ جدوں اسیں سکولے جاندے ہوندے سن ساتوں قاعدہ پڑھنا ہنداسی۔

یہ برکت ہے

یہ برکت کا گھر ہے

یہ برکت کی گائے ہے

گائے دودھ دیتی ہے (۱۰)

سانوں کھوتیاں راہیں برکت، برکت دے گھر تے برکت دی کاں دا تصوّر دا تا جاندا سی۔ ریاض مجید دیاں انہاں نظماں یوں دی جے کدھرتے آڈیو ویڈیو ذریعے پیش کیتا جادتے اجنبیں ایس دے باسیاں بالاں نوں پنجابی کلچر تے تیل بتیل دا ٹھیک ٹھیک انداز کرائیا جاسکدا اے۔

ریاض مجید نے اپنے ایس قاعدے راہیں کم کیتا اے جیویں محمد حسین آزاد دیاں ریڈراں شہورس ایسے طراں ریاض مجید دی پڑھ بسم اللہ وی مشہور ہوئے گی۔ ریاض مجید نے اج دے دور چ استعمال ہون والیاں شیشیاں دا بڑا واضح تصور پیش کیتا۔ ٹرسنٹھ شیز بارے انسان دی لکھت ویکھو:

اک انوکھی ٹھنڈ پٹاری

اڈّھے خانے دی الماری

انج بہشتی دا واں ونڈے

رکھے گھر دے کمرے ٹھنڈے (۱۱)

ٹیلی فون بارے صرف دو مصرعیاں چ اگوائی دتی دے:

تاراں راہیں گل کرا دے

دُور دراڈے اِنج ملا دے (۱۲)

''پڑھ بسم اللہ'' چ تصویر اں نے ایدی معنویت وچ بڑا اداد کیتا اے۔ بچّے تصویر اں ویکھن دے بڑے شوقین بندے بنن تے ریاض مجید نے بالاں دی ایس نفسیاتی ضرورت نوں پورا کرن دی خاطر رنگدار تے چٹپاں کالیاں فوٹواں نال کتاب سجائی اے۔ کتاب وچ ملکی تے غیر ملکی تصویر اں تے خاک نے اہنوں بڑا وصایا اے۔ ڈاکٹر رشید احمد گوریچہ ریاض مجید دی ایس کاوش نوں سراہندیوں ہویوں کہندے نے:

'' مینوں پکا یقین اے پئی ریاض مجید ہوراں دی اے کاوش پنجابی ادب دی تاریخ چ اپنیاں دانال ہمیشہ لئی محفوظ دے گی۔ تے جدوں کدھرے ساڈے دیس وچ پنجابی زُبان نوں اوہدا جائز مقام ملیا تے پڑھ بسم اللہ ضبد ساڈے سکولاں چ پہلی جماعت دے قاعدے دے طور تے پڑھاتی جائے گی۔'' (۱۳)

مزے دی گل ای ہے جے ایدیاں نظماں گنتی گنتی چے پنجابی طور ایس کتاب نوں ابدیت بخشدے نیں۔ ساڈی دعا ہے پئی ریاض مجید ہوری بالاں توں بعد وڈیاں جماعتاں دے بالاں لئی وی ایس طراں دے نظماں دی کتاب ضرور لکھن۔ خدا ایصال ثواب حیاتی دیوے تے کہہ کرن دی توفیق دے دیویں۔ڈاکٹر اسلم رانانے کیڈی سوہنڑی گل کیتی ہے:

''ڈاکٹر ریاض مجید دی نویں کتاب بالاں دے عالمی دن دی سوغات ''پڑھ بسم اللہ'' میں دی پڑھی، مینوں تے ایہہ چنگی لگی اُردُو دے اک پنجابی پروفیسر نے جیہڑا نویکلا رنگ جمایا اے پنجابی دے وڈھے وڈھے اداریاں دے وڈے کماں توں وی بھارا اے۔ وطنوں دور وسن پنجابی دے وڈھے وڈھے ادریاں دے وڈے کماں توں وی بھارا اے۔ وطنوں دور وسن والیاں پنجابی بالان دا ایہہ انسائیکلوپیڈیا اے وڈھے شہریں وسن والیاں وڈیاں لئی اک قطبی تارا اے۔ پنجابی وچ اج تائیں، بچیاں واسطے کہہ سیانیاں واسطے وی کوئی کتاب اینی سوہنی چھپی نہیں۔'' (۱۴)

ریاض مجید نے دیس پنجاب اندر جیہڑی سوہنی کمیڈر چائی اوہو جیہی کھیڈا جے تیک تے رچی نہیں۔ لکھن والیالمی حیاتی، سوکھے پینڈے، اچامان تر ان تیرے لکھ شکر ان تے روشن کر دتی اے دیس پنجاب دی اچی شان اللہ اجر دیو سی تینوں دونہہ جیان تینوں لکھ مبارکاں۔

بال ادب لکھنا ڈاڈھا اوکھا کم اے ایس وچ قصبے بالوں دی نفسیات نوں مکھ رکھنا پینداا اے اوتھے اپنے آپ نوں وہ اوہناں دی ذہنی سطح تے لیاکے گلی کرنی پیدای اے ایہو وجہ اے پئی بال ادب لکھیار پنج ست ناواں توں اگانہ فیس ودھ سکے۔ بالاں دی ترتیب دا سفر ماں دی گود توں شروع ہوندادے۔ ماواں لوریاں راہیں بالاں نوں چنگے عملاں ول پرپردیاں نیں ایس توں، مگروں بھیناں ویراں نوں کھچھڑ چک کے روڈلے گتیاں راہیں اپنے پگھلتے پیار تے معلوم جذبیاں دا اظہار کر دیاں نیں۔ اوہ اپنے ویراں توں معاشرے وچ بڑے اچے مقام تے ویکھنا چاہندیان نیں ایس لئی اونہاں دے ست بل زور تے ہوندیاں نظماں الیکدیاں نیں۔ لوک ادب وچ ایہہ خزانہ ڈھیر جلداا اے۔ وکھیاں جاوے تے ٹھیٹھ لفظاں وی اوہناں وچ ای لبھدی اے۔ ایہہ لفظاں ساڈی دھرتی دی لفظاں اے ایسے لئی دھرتی دی آواز ہوندی اے۔ زُباناں اودوں ترقّی کر دیاں نیں جدوں قدرہی وچ ساہ سب ہووے۔ قدروں وڈھ جان تان زُباناں وی ہنساں پے جاندیاں نہیں اتے ترقّی دا سفر دی ٹک جاندا اے۔ ا،جو کی نسل داالمیہ المیہ دے جے اوہ نویں تہذیب دے پچھے پچھے ترن پاروں اپنیاں قدراں نے اپنی زُبان توں پر انہہ ہڈی جا رہی اے۔ غلام مصطفی بسمل ہوراں ریاض مجید دی ایس کتاب دے بارے چ اکھیا اے:

'' ڈاکٹر ریاض مجید ہوریں ایس سلسلے وچ بڑے بھاگاں والے جی میں جنھاں مردیاں مکدیاں قدروں نوسا سنبھالا دین لئی بال ادب دی اساری کیتی اونہاں بالاں دی ذہنی سطح طرف ٹکھ رکھدیاں ہویاں ''پڑھ بسم اللہ'' راہیں نہ صرف سھد رپرتے مزی نظماں لکھیاں سگوں پنڈری دی وشعروں تے اوتھوں تے نقطاں نوں نظماں وچ ڈھال کے بالاں لئی آسانی پیدا کر دتا گیا۔ اس توں اڈا اونہاں جیہڑے موضوع چنے اوں اونہاں دے اخلاقی سدھار لئی بڑے نوچکا نیں۔ ایس مٹھی بندری تے

دن بھاوتی زُبان وچ دیسی گھیو وچ بھجی پنجیری دا شعر ادا اے۔ میں آس رکھتاں جے اوہ ایہہ سوادلا تے من موہن سلسلہ جاری رکھن گے۔'' (۱۵)

مکدی گل اے وے کہ ریاض مجید ہوران دی اے کاوش آنڑیں والیاں نسلاں تک سادی پنجابی زُبان نوں ہیک وکھرا تے اُچا مقام دلواسی۔ اونان دی اے کاوش رہندیاں زمانیاں تک اوناں دی فکر داٹھول کُٹتی رہسی۔ ایس لئی ایس تو و دیا ہور کڑی گل اے۔

تخلیق ادب ___ بڑے ادبی مراکز اور مضافات __ ایک ساختہ اظہاریہ:

اِس موضوع کے مطالعہ کے کئی پہلو ہیں ذاتی، سماجی، امکانی اور زمانی ہر پہلو کا مطالعاتی اعتبار سے اضافیت کے کئی مضمرات رکھتا ہے، لہٰذا ایک ایسے مبحث کا دَروا کرتا ہے، جس کا نتیجہ حتمی حیثیت میں سامنے نہیں آسکتا اور ہر نتیجہ اپنے اندر ایک اور ختلاف کے شائبے کو جنم دینے کا باعث ہو سکتا ہے۔

تخلیق کار کا تعلق سماجی اور مکانی حوالوں سے ڈھونڈنے سے پہلے ہمیں اس کے ذاتی اعتبار جسے میر از عبد القادر بیدل نے ''پاس اعتبار'' کہا ہے:

سہل نبود در محیط دہر پاس اعتبار　　　آبروئے چوں گہر ہم راہِ سر داریم ما

اس کا جائزہ لینا ہو گا۔ یہ اعتبار اس کی علم و ہنر سے وابستگی اور اظہار کی فن کارانہ صلاحیّت سے قائم ہو تا ہے۔ صرف بڑے شہر، کسی علمی و ادبی ماحول اور معروف دبستان ادب کی اقدار وروایات سے نجّی، ذاتی اور نسلی انسالک سے یہ اعتبار قائم نہیں ہوتا۔ محض ذاتی وابستگی ایسے حسب نسب کی طرح ہے، جو 'اہلیت' کے بغیر صرف ایک دھوکا، خوش گمانی اور 'پدرم سلطان بود' کا بر خود غلط اظہا ہو، جس کی تکرار اور گردان کبھی کبھار 'موروثیّت' کے اخلاص اور خواص کو بھی غبار آلود اور خجالت آثار بنادیتی ہے۔ سو علم و ادب اور شعر و فن کے صف میں شمولیت کی شرط اوّل یہی 'پاسِ اعتبار' ہے، جس کی طرف بیدل نے اشارہ کیا ہے اور، جو 'تخلیق کاری' میں اخلاصِ نیّت اور بے ریا جگر کاری سے حاصل ہو تا ہے شہرت، دولت اور اس حوالے سے پذیرائی اور عزّت افزائی بعد میں ملنے والے وہ ثمرات ہیں، جو اس اخلاص اور محنت کے تسلسل سے خاص ہیں روشنائی کو لہو میں ڈھالنے اور ہڈیوں میں سلگنے والی آگ کو سُروں اور لحن و لَے میں منتقل کرنے ہی سے علّامہ اقبال کے لفظوں میں اس 'معجزہ فن' کی نمود ہوتی ہے، جو نسل کو 'دل' بنادیتا ہے اور جس سے صدا (یعنی لفظوں) میں 'سوز و سرور' پیدا ہو جاتا ہے۔

وارداتِ فن میں 'مبتلا' ان سچے تخلیق کاروں کا یہ مسئلہ ہی نہیں کہ ان کے اظہار کے اثرات اور ان کی چھان پھٹک کے پیمانے کیا ہیں؟ ایک فارسی مثل کے مصداق:

کس شنود یا نشنود من ہاو ہو می کنم

اُن کا سارا معاملہ اپنی تخلیق کے اظہار سے ہے اور وہ مقدور بھر اس اظہار سے جڑے رہنے پر مجبور ہیں، ان کے لیے آرٹ اور کرافٹ کا یہ سارا عمل اپنے اندر کے تخلیقی جذبے کی مجبوری ہے، جس کی ادائی ان کی جبلّی مجبوری ہے یہاں اظہار فن کے تخلیقی محرکات کے ڈانڈے نمائشیت (Exilitionsion) سے جڑے ہوئے دکھائی نہیں دیتے۔ یہ ایک اندر کا جبر ہے، فن کی موج۔ ایک نے نواز چرواہا جنگل میں بانسری بجاتے ہوئے جا رہا ہے۔ گردوپیش کی سماعت، ماحولیاتی پذیرائی اور داد سے بے نیاز، بے پرواہ اجنتا اور ایلورا کی غاروں میں سالہا سال تک، نسل در نسل نقش کاری سے منسلک فن کار بھی ایسے ہی بے نیاز شائشیں تھے۔ اسی طرح دنیا بھر کے ادب میں سیکڑوں معرکتہ الآرا تصانیف اور مختلف فنون لطیفہ سے متعلق شہ پارے مل جاتے ہیں جن کی بنیاد یہی اندر کا جبر اور محض اپنی ذات کا وہ اطمینان تھا، جو اظہار سے حاصل ہوتا ہے۔ جسیات کے ذیل میں تخلیق ہونے والا ادب، شاعری اور عظیم علمی کام اسی اندر کے جبر سے صورت گر ہوا، جس کی طرف نظری نے اس شعر میں نشان دہی کی ہے:

تو پندار کہ ایں نغمہ ز خود می گویَم
گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست (۱۶)

غالب کے الفاظ میں 'ستائش کی تمنا' اور 'صلے کی پروا' کے بغیر ہر دور، ہر زُبان اور ہر خطّے میں ایسے سیکڑوں سچے، تخلیق کار مل جاتے ہیں، جنہوں نے محض اپنے تخلیق جذبے کے اظہار کے لیے زندگی بھر اپنے آپ کو کارِ اظہار سے وابستہ رکھّا۔

میں نے ایران کا ایک بڑا حِصّہ سڑک کے ذریعے دیکھا۔ مفہان، تہران، ماضی و حال کے بڑے بڑے شہروں کے علاوہ بیسووَں ایسی بستیوں اور نسبتاً چھوٹے شہروں سے گزرا، جن کے نشاناتِ راہ پڑھ پڑھ کر ایسے بیسووَں اکابرین علم و شعر کی یاد تازہ ہو جاتی جن کا کام گزشتہ کئی صدیوں سے ذہنوں کو جگمگا اور دلّوں کو گرما رہا ہے زرقان، یزدیا تق سے امام زرقانی، سالک، یزدی، وحشی بافقہی کی یاد تازہ ہوئی۔ سعدی شیراز کے حوالے سے جانا گیا اور اب یہ شیراز سعدی کے حوالے سے مفتخر و معتبر ہے۔ یہی صورت حال حافظ شیراز کے حوالے سے ہے آج کا شیراز سعدیہ (سعدی شیرازی کے مزار کا علاقہ) اور حافظیہ (حافظ شیرازی کے مدفن والا علاقہ) ہی کے سبب چاروانگ عالم میں مشہور ہے۔ مقصود صرف یہ نشاندہی تھی کہ دنیا کی تاریخ اور جغرافیے میں بڑے شہروں (جس کی تعریف مَیں بعد میں کروں گا) کے علاوہ چھوٹے چھوٹے علاقوں سے بھی بڑے بڑے با کمال لوگ اٹھے۔ یونانی، انگریزی، عربی، فارسی اور دنیا بھر کی دوسری زُبانوں میں ہمیں ہزاروں ایسے شاعر، ادیب، فلاسفر، کیمیا دان، مصوّر، موسیقار، سفر نامہ نگار، محدّث مفسّر اور مورخ مل جاتے ہیں، جنہوں نے اپنے اپنے قصبوں اور علاقوں میں بیٹھ کر اپنے اپنے مخصوص شعبوں میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے ،جو آج کی مہذب اور متمدن تاریخ اور زندگی کے پس منظر میں ایک موثر حوالے سے طور پر آج بھی نمایاں ہیں۔ ان شخصیات میں بعض ایسی بھی ہیں، جنہوں نے مواقع ملنے کے باوجود

اور دنیا بھر میں گھوم پھر کر بھی اپنے چھوٹے علاقے ہی میں رہنے کو ترجیح دی معروف یونانی مورّخ پلوٹارک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایتھیز سے اس کے چند پرستار اُسے اپنا قصبہ چھوڑ کر ایتھنز میں نقل مکانی پر رضا مند کرنے کے لیے گئے، تو اس نے کہا کہ "میرا قصبہ پہلے یہ بہت چھوٹا ہے اگر میں بھی یہاں سے چلا گیا تو یہ اور چھوٹا ہو جائے گا۔"

آج بھی کئی نوبل لاریٹ (Horbel lourite) بڑے شہروں کی بجاے دور افتادہ علاقوں، بڑے شہروں سے نسبتاً کم معروف دور دراز کے قصبوں اور جزیروں پر رہنے کو ترجیح دیتے ہیں علّامہ اقبال کے الفاظ میں شائد اس لیے کہ بڑے شہروں کے تمدّن، مصروفیات، آبادی کے دباؤ، سماجی و صنعتی شور نے حسّاس ذہنوں کی تخلیقی تنہائیاں چھین لی ہیں اور یوں آج کے بڑے شہروں کا رہایشی حجاب در حجاب اسرارِ حیات سے دور نکل گیا ہے میکانکی زندگی کی جکڑ بندی اس کے اور اس کی تخلیق آفرینی کی درمیان ایک دیوار بن گئی ہے یوں خدا شناسی اور خود شناسی سے ذات فہمی اور کائنات کی راز یابی:

خلوتِ کوہ دیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش کے لیے غور و فکر کے امکانات کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں باہر کی دنیا آباد ہونے سے انسان کو اندر اجڑ گیا ہے۔ ظاہر میں آسائشوں کی بھرمار سے انسان اپنے باطن میں تنہا ہوتا جا رہا ہے:

وہی ہے امتحاں در امتحاں ناظر
محافظ ہفت خواں در ہفت خواں سب کا (۱۷)

کجدار و مریز کی نمایش، اعداد و معلومات کی جمع آوری، میڈیا کی یلغار، آبادی کا دباؤ، خورشید رضوی کے لفظوں میں اندر کی اکائی کو یک جانہ ہونے دینے والے مسائل و احوال اور پھر آج کی معاشی جکڑ بندی بقول اقبال:

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری، دے کے تجھے فکرِ معاش (۱۸)

اسی نظم میں اقبال کہتے ہیں کہ انسان کے لیے وہ تخلیقی تنہائی بھی ضروری ہے کہ وہ ان معاملات و احوال پر غور کر سکے جنھیں شہری تمدن نے انسانی آنکھ سے اوجھل دکھا ہوا ہے کہ: خلوت کوہ وبیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

ایسے ہی اسرار کی تلاچ میں کڑوڑوں کی آبادیوں والے شہروں سے کئی تخلیق کار نسبتاً کم معروف قصبوں کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ انبوہ سے ہٹ کر اور بھیڑ سے کٹ کر رہنے کے اس چلن نے ڈسپلن (ائیر لینڈ) کو ادیبوں، فلاسفروں، شاعروں اور دانش وروں کی جنت بنا دیا ہے، جہاں متعدد نوبل لاریٹ رہائش پذیر ہو رہے ہیں۔ بات ایک بار پھر دور نکل گئی، مگر کسی نہ کسی حوالے سے اپنے مبحث سے جڑی ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ آیا عظیم تخلیقات کا تعلق بڑے شہروں سے ہے؟ ہے تو کس قدر ہے اور چھوٹے شہروں یا مضافات میں رہنے والے اہلِ علم و دانش کی تخلیقات کا پایہ اور اعتبار کیا ہے؟

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بڑے شہروں کی تعریف بھی کر لی جائے بڑے شہروں سے مراد آبادی کے لحاظ سے بڑے شہر میں یا صنعت و حرمت کے اعتبار سے یا جغرافیائی یا اکائی کے لحاظ سے مسئلہ چوں کہ تخلیق کاروں کے حوالے سے ہے، لہٰذا یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ ایسے شہر، جو اپنی تاریخی حیثیت اور علمی اثاثے، اقدار و روایات کے سبب بڑے ہیں جن میں علمی و ادبی انجمنیں، تہذیبی اور ثقافتی ادارے، اشاعتی و نشریاتی ذرایع، علمی و ادبی شخصیات، اہل فکر و دانش، شعرا ادیب اور فنون لطیفہ سے وابستہ بڑی شخصیات زیادہ ہیں۔ شہروں کی شہرت کا تعلق زمانے سے بھی ہے۔ کبھی لاہور کے مقابلے میں ملتان زیادہ اہم شہر تھا۔ سیّد ہجویری داتا گنج بخش نے ایک جگہ لاہور کو " در فصافات ملتان" سے یاد کیا ہے۔ یہ ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ بعد میں لاہور کو ایسا عظیم مقام ملا کہ بقول شاعر:

لاہور رابہ جان برابر خریدام

اسے روس البلاد' اور 'قطب الارشاد' کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ اُردو زُبان اور شعر و ادب کے حوالے سے دکن، دہلی اور لکھنو کے بعد، یہاں اتنا بڑا تخلیقی اور اشاعتی کام ہوا کہ ہر شعبہ ادب و شعر اور فن و ثقافت میں لاہور کی خدمات کے حوالے سے جداگانہ تاریخ آثار تحقیقی مقالات کی ضرورت ہے۔ وطن عزیز میں اُردو کا سب سے بڑا مرکز بلاشبہ اب یہ عظیم شہر ہے۔ یہاں پہلے سے موجود اہلِ قلم اور ۱۹۴۷ء کے بعد موجودہ ہندوستان کے شہروں سے ہجرت کر کے قیام پذیر ہونے والی ادبی شخصیات نیز تلاشِ معاش اور دوسری ضروریات کے سبب موجودہ پاکستان سے نقل مکانی کر کے آباد ہونے والے شاعروں، نثر نگاروں، محققوں، ناقدوں، صحافیوں اور علوم و فنون سے تعلق رکھنے والے دوسرے ہنروروں کے باعث لاہور پنجاب ہی نہیں پاکستان کا دل ہے۔

علم و فن کے دوسرے مراکز میں کراچی اور اسلام آباد ہیں جیسے جیسے ان شہروں میں تہذیبی و ثقافتی اداروں، انجمنوں، جامعات، اخبارات، رسائل، ذرایع ابلاغِ عامہ، ریڈیو، ٹی وی جیسی نشریاتی سہولیات کا اضافہ ہوتا جاتا ہے، یہاں کے رہایشیوں کی فنّی و تخلیقی استعداد کے اظہار کے مواقع بڑھتے جا رہے ہیں اور یوں دوسرے شہروں سے بھی ہنرور اساتذہ، صحافی، ٹیکنیشنز، فن کار اور اہل علم و دانش ان شہروں میں رہایش اختیار کر رہے ہیں اس نقل مکانی میں بہتر سہولیات زندگی کی موجودگی، روزگار اور تعلیم کے حُصول کے زیادہ ذرائع، اپنی فنّی استعداد کے اظہار معتبر ذرائع چانسز وغیرہ سب کچھ شامل ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بڑے شہر میں نقل مکانی اور رہایش پذیری ہی تخلیقِ فن کے میدان میں کسی کو بڑا بنا سکتی ہے؟ اس کا جواب نفی میں دیتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی اگر بڑے شہروں کی شہریت ہی وجہ شہرت و عظمت قرار پائی تو دہلی کے سارے شاعر مرزا غالب اور لکھنو کے سارے شاعر مرزا انیس کے ہم پایہ نہیں تو قریب قریب ضرور ہوئے، مگر دور

دور تک ایسا نہیں ہوا۔ یہاں ایک یاد اس تحریر کے اس ابتدائیہ کی طرف توجُّہ دلانا ضروری ہے کہ تخلیقِ فن میں شہرت و عظمت کی اوّل شرط وہی ذاتی تخلیقی استعداد ہے، جو میر تقی میر کے لفظوں میں 'بات' کو 'فن' بنا دیتی ہے۔

کیا تھا بات کو پردہ سخن کا سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

یعنی بات کرنے کی سعی میں مسلسل کوشش، مَحبّت، جگر کاری بہتر سے بہتر بات کرنے کا اُسلُوب، جو عام بات کو فن کے درجے پر لے جائے یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اندر کے جبر کا سارا سلسلہ 'اظہار' پر اختتام پذیر ہوتا ہے انسان کے باطن میں لاکھ تاج محلوں کا نقشہ ہو۔ ہزاروں نغمے سر سرائیں، سیکڑوں کہانیاں، سفر نامے، افسانے اور ناول خاکے کی صورت میں موجود ہوں ان کا صورت پذیر اور اظہار یاب ہونا ضروری ہے کہ فن نام ہی نامعلوم سے معلوم، خفی سے جلی، ناموجود سے موجود اور معنی سے لفظ کی صورت گری کے جاں اور جگر گداز تخلیق عمل کا نام ہے بقول غالب:

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے؟ (۱۹)

لہٰذا نام و نسب کی طرح شہریتِ محض بھی شہرت و نام وَری کا سبب نہیں سیکڑوں نہیں ہزاروں اہلِ قلم بڑے شہروں میں رہتے ہوئے بھی بے نام ہیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں، جو تخلیقی اعتبار سے کئی نامُور اہل قلم سے بہتر بھی ہیں ا،ور جنہوں نے سچے تخلیقی عمل سے غیر وابستگی اور فن و اظہار سے مسلسل، بے لوث اور بے ریا رابطے کے نتائج کے طور پر منفرد اور معتبر نمونے بھی تخلیق کئے، مگر ہو بو جوہ زیادہ حروف تو کیا اوسط درجے کی نامُوری بھی نہ حاصل کر سکے۔ اس کی وجہ یا وجوہات کئی ہیں اور کئی اور ہو سکتی ہیں۔

ایک یہ کہ بعض لوگ تخلیق طور پر اتنا آگے نکل جاتے ہیں اور تخلیق فن کی مختلف جہتوں میں اتنے 'منتشر اور منہمک ہو جاتے ہیں کہ وہ زندگی بھر کی ریاضت کے باوجود اپنے کام کو کوئی ایسی واضح اور موثر تنظیمی شکل نہیں دے سکتے، جو ان کی نام وری کی امکانی جہت کو واضح کر سکے میں نے منتشر اور منہمک، جو دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں یہ ان کی طبعی اور جبلّی مجبوری کے حوالے سے ہے نقص یا بڑے معنوں میں نہیں:

بنا کے قافلہ چلنے کا شوق لے ڈوبا
اکیلے چلتے تو اب تک کہیں پہنچ جاتے (۲۰)

ایسے لوگ خیال و اسالیب کی مختلف وادیوں میں سفر کرتے ہیں۔ اپنے تخلیقی مزاج کے مرکزی اور فطری رُخ کو سمجھنے والے قاصر ہوتے ہیں۔ میں اس بات کو ذرا واضح کر تا چلوں کہ وہ شائد اپنے فطری تخلیقی مزاج کی گرفت میں آ جانے والی لہر کو سمجھ نہیں سکتے۔ گرفت سے میری مراد اظہار کی فن کارانہ اور بیان کی ماہرانہ گرفت ہے۔ بر ٹنڈر سل نے بیسوؤں کتابیں سماجی

فلسفوں، ریاضیات، مستقبیات وغیرہ پر لکھیں، مگر یہ کم لوگوں کو پتا ہے کہ اُنھوں نے فلسفہ و دانش کے ساتھ تخلیقی ادب میں بھی قدم رکھا اور افسانوں کے تین مجموعے بھی تخلیق کیے۔ یہ مجموعے چھپے اور پڑھے بھی گئے، مگر یہ ان کے اظہار کا مرکزی حوالہ ثابت نہ ہوئے سو بعض اعلیٰ تخلیق صلاحیتوں کے حامل فن کار اپنے ادھورے اور نشر کاموں وار مقاصد کے سبب بھی (بڑے شہروں میں رہتے ہوئے) نام وَری کے حوالے سے پس منظر میں رہتے ہیں۔ واضح ہو کہ اعلیٰ تخلیق عمل ایک منضبط پلاننگ (منصوبہ بندی) بھی مانگتا ہے۔ تخلیقِ خالص کے ساتھ ساتھ اُسلُوبیاتی تنظیم بھی بہت ضروری ہے، اگر آپ بہت اعلیٰ تخلیقی کام کو مناسب طریقے سے پیش نہیں کرتے، تو آپ کسی بھرپور تاثر کو پیدا کرنے میں ناکام رہیں گے۔ دانتے کی ڈیوائن کامیڈی سے علّامہ اقبال کے 'جاوید نامہ' تک ہے۔ادبیاتِ عالیہ کے ہر بڑے شکار کے پیچھے سچے تخلیقی عمل کے ساتھ ایک ماہرانہ منصوبہ بندی ہی نظر آتی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ علّامہ اقبال کی نظموں 'مسجد قرطبہ' اور 'ذوق وشوق' میں تخلیقی عمدگی اور معجز نما اظہار کے ساتھ ان نظموں کی ڈرافٹنگ بھی ملاحظہ کریں ان نظموں کی ابتدائی مسودوں کی روشنی میں شایع شدہ نظموں کے تقابلی مطالعہ سے آرٹ کے ساتھ منصوبہ بندی کی اس محنت کی ضرورت و اہمیت واضح ہو جائے گی یاد رہے کہ 'شکوہ' اور '،جواب شکوہ' میں آرٹ اور کرافٹ تخلیقی عمل اور پیش کش میں اس ماہرانہ منصوبہ بندی کا فقدان ہے، جو 'مسجد قرطبہ اور ذوق وشوق' میں تاثیر کا جادوئی کرشمہ ظاہر کرتی ہے۔

تیسرا سب ایسے فن کاروں کے اعلیٰ تخلیق کاموں کا مناسب تشہیر نہ ہو سکتا ہے۔ علّامہ اقبال کے لفظوں میں:

نفس کے زور سے وہ غنچہ وَا ہوا بھی تو کیا
جسے نصیب نہیں آفتاب کا پرتو (۲۱)

نفس کے زور کے بعد 'آفتاب کے پرتو' بھی اس سارے تخلیقی عمل کی تکمیل کے لیے ضروری ہے نفس کا دور اگر انفرادی صلاحیّت ہے، تو 'آفتاب کا پرتو' خارج سے ملنے والے حوصلے کی نشاندہی کرتا ہے۔ بڑے شہروں کے علمی ادارے، ترسیل و تشہیر کے ذرایع اور مواقع اسی کی توسیعات ہیں، جو مواضیات میں میسر ممکن نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کسی شاعر کو کہا جائے کہ تمھیں شہرت نہیں ملے گی اب تم چاہو شاعری کرو یا نہ کرو، تو کیا تخلیق کار سچّا تخلیق کار تخلیق سے باز رہے گا؟ نہیں شائد ایسا ممکن نہیں ماحول سے حوصلہ افزائی ملے تو بہتر وگرنہ 'ستایش کی تمنا' اور 'صلے کی پروا' کے بغیر تخلیق کار نے اپنے انداز میں اس عمل سے گزرنا ہی ہے جیسے کہ مرزا غالب نے کہا ہے:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنیٰ نہ سہی (۲۲)

یہ 'نہ سہی' اسی انداز کی طرف اشارہ ہے کہ سچا تخلیق کار تو اپنی واردات کے اظہار میں ابلاغ اور ترسیل فکر کے مروّجہ مِعیارات کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ آج کے حالات میں مضافات کا وہ مفہوم اور کردار نہیں رہا، جو گزشتہ صدی میں تھا۔ آج

اخبارات و رسائل اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے تخلیق کار علم و ادب کے مرکزی دھاروں سے اپنے آپ کو مربوط رکھ سکتے ہیں، جو ان کی اپنی تخلیقات اور ان کے فروغ کے لیے ضروری ہے اور اگر وہ اپنے باہر کے علمی و ادبی میلانات اور تہذیبی و ثقافتی فضا سے بے خبر ہیں، تو وہ بڑے شہروں میں رہتے ہوئے بھی مضافات میں ہیں۔

پڑھ بسم اللہ:

ریاضؔ مجید نے بچّوں کے لیے پنجابی شاعری کی ایک کتاب ''پڑھ بسم اللہ'' لکھی۔ یہ کتاب اقوامِ متحدہ کی طرف سے منائے جانے والے بچّوں کے عالمی دن کے ۷/اکتوبر کے حوالے سے ۱۹۹۱ء میں شایع کی گئی۔ اس کتاب کا انتساب دنیا بھر کے بچّوں کے نام، امن، صحّت، تعلیم اور روشن مستقبل کی دعاؤں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت ۴۲ نظمیں شامل ہیں۔ غلام مصطفی بسمل ریاض مجید کی کتاب پڑھ بسم اللہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''بنیادی طور پر یہ کتاب کینیڈا، امریکہ، انگلینڈ، فرانس، جرمنی، ڈنمارک اور دیگر غیر ممالک میں بسنے والے پاکستانی بچّوں کو پنجابی زُبان اور روایات سے روشناس کرانے کی جانب ایک اہم قدم ہے۔ مذہب اور کلچر کے مختلف عناصر کے بچّوں تک پہنچانے کے لیے نہایت خُوب صُورت نظموں کا سہارا لیا گیا ہے۔ یہ نظمیں تین سے دس سال تک کی عمر کے متوسط ذہن کے حامل بچّوں کی صلاحیّت اور استعداد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہیں۔'' (۲۳)

کتاب کے صفحات کی نمبر شماری ایک سے سو تک اُردُو، پنجابی اور انگریزی لفظوں اور ہندسوں کے ساتھ کی گئی ہے تاکہ اس طرح نمبروں کی شناخت ہو جائے۔ سو کے بعد صفحوں کی گنتی کو صرف اُردُو اور انگریزی ہندسوں میں لکھا گیا ہے۔ ریاضؔ مجید اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''بچّے ساڈے کولوں بہت کجھ منگدے نیں۔ مَحبّت، توجّہ، علم تے علم دین دے دل چسپ طریقے وی۔''(۲۴)

کتاب میں مذہبی حوالے سے چھ نظمیں شامل کی گئی ہیں، جن کے عنوانات پڑھ بسم اللہ، حمد، نعت، دعا، قرآن اور مسیت ہیں۔ کتاب میں موضوع اور عنوانات کے حوالے سے نظموں کے دل کش اور مانوس تصویروں سے مزّین کیا گیا ہے۔ جس سے کتاب میں بچّوں کی دل چسپی میں اضافہ کے ساتھ ساتھ، اُنھیں اصل مفہوم تک رسائی میں مزید آسانی ہوتی ہے۔

اب پ، گنتی اور دُونی دا پہاڑا، خالص علمی اعتبار کی نظمیں ہیں۔ جن میں اُردُو کے حروفِ تہجی کے علاوہ پنجابی گنتی کے الفاظ سے آشنا کرایا گیا ہے۔ انگریزی اور پنجابی اعداد کا بالمقابل استعمال کر کے پنجابی گنتی سکھانے کا خوب صورت انداز اپنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دو کا پہاڑا ذہن نشین کرانے کے لیے مظاہرِ فطرت کی مدد لی گئی ہے۔ ''پاکستان، قائداعظم اور پنجاب'' ایسی

نظمیں ہیں، جو وطن سے محبّت کے فروغ کا باعث ہیں۔ ''چند اُتے پہلا آدمی، کمپوٹر، موٹر لانچ، ٹیلی ویژن، کرین، ریسی سائیکل اور بس'' جیسی نظمیں ہلکے پھلکے سائنسی انداز میں پنجابی کو متعارف کرواتی ہیں۔

''زبیرا، منّے دی مانو، بابے دا کتا، بلیک ٹائیگر، الو، گھو گا جیون، جو گا اور بطخاں دا سکول'' جیسی نظموں میں بچّوں کے من پسند جانوروں کے تعارف اور ان کی حرکات کا بیان کیا گیا ہے۔ عنوانات سے ہی ظاہر ہے کہ یہ نظمیں بچّوں کے لیے خاص دل چسپی کا باعث ہیں۔ اور وہ کھیل ہی کھیل میں پنجابی زُبان سے آشنا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

نظم ''جادو دا مکان'' میں نہایت دل کش طریقے سے جادو کے مکان کی کہانی سناتے ہوئے بچّوں کو مختلف رنگوں کے نام ازبر کروا دیے گئے ہیں۔ ''علی دا چڑیا گھر'' میں بلّی، چڑیا، کبوتر، بکری، بطخ، ہرن، گھوڑا، زبیرا، زرافہ اور دیگر جان وَروں کا تعارف اور شناخت بذریعہ تصاویر کرائی گئی ہے۔ نظم ''بجھارتاں'' میں اٹھارہ سہیلیوں کی مدد سے چھوٹے بچّوں کو ذہنی مشقیں کروائی گئی ہیں اور ان کی ذہنی استعداد اور صلاحیّت کا امتحان بھی لیا گیا ہے۔

نظم ''بطخاں دا سکول'' اپنی مثال آپ ہے۔ جس میں جھیل کے ٹھنڈے کنارے پر بطخوں کے اسکول کی تصویر کشی اس انداز میں کی گئی ہے کہ بطخوں اور بگلوں کی اسکول میں حاضری سے لے کر ان کے راگ الاپنے تک کے تمام مراحل بیان ہو گئے ہیں۔ ''، جوڑ بے، جوڑ'' میں اپنے رہن سہن کے انداز کی مختلف جزئیات کو موثر طور سے پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کے آغاز میں فہرست کے بعد کتابیات کے عنوان کے تحت ان کتابوں کی فہرست بھی دے دی گئی ہے۔ جن سے ریاضؔ مجید نے استفادہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ Young Parents (June...August) 1990.Singapore.I.S.S.B-No0218..0618 کا وہ اقتباس بھی شامل ہے، جس میں بچّوں کی الفاظ سیکھنے کی استعداد کے بارے میں اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں۔

لہجے اور صورت کی ظاہری شناخت اور لفظ کے لغوی تلفظ کو ترجیح دی گئی ہے۔ کسی جگہ پر ایک لفظ کو شدّ کے ساتھ اور کسی دوسری جگہ پر اسی لفظ کو بغیر شدّ کرنے کی سب سے بڑی وجہ تلفّظ کی مختلف شکلوں کو بچّوں کے ذہن نشین کرانا ہے۔ غلام مصطفیٰ بسمل ریاض مجید کی اس کتاب کی بابت مزید رقم طراز ہیں:

> ''یہ کتاب ریاض مجید کی بچّوں کے لیے ایک ایسی کاوش ہے، جو اس سے قبل کم از کم پنجابی زُبان میں منظرِ عام پر نہیں آئی۔ یہ کتاب سائنسی، نفسیاتی اور ادبی حوالوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے ترتیب دی گئی ہے۔، مگر اس کے باوجود شاعر کو یہ دعویٰ ہر گز نہیں کہ وہ کوئی مثالی نمونہ پیش کر رہا ہے۔ البتہ ریاضؔ مجید کے خیال میں بچّوں کے ایک اہم مسئلے کی طرف توجُّہ ضرور دلائی گئی ہے۔ ۔ بلاشبہ ریاضؔ مجید کی یہ کاوش اس خیر مقدم کی مستحق ہے، جو اب کے کسی بھی دیرینہ مسئلے کی طرف پہلا قدم اٹھانے والے شاعر یا ادیب کا بنیادی حق ہے۔'' (۲۵)

کتاب سے چند اقتباس ملاحظہ ہوں:

اللہ اللہ
جیہنے مینوں
جیہنے تینوں
پیدا کیتا
اوہو سب دا
مالک، خالق
واحد، رازق
اوہدے ناں دی
برکت ساری
اللہ اللہ
پڑھ بسم اللہ
پڑھ بسم اللہ (۲۶)

باگے اندر رہندی اے
پھل کلیاں تے بہندی اے
رنگ برنگی ہندی اے
کِنّی چنگی ہندی اے
رونق باغ بہاراں دی
شوبھا اے گلزاراں دی
جد پھل چُمن بہندی اے
آپے پھل بن ّبہندی اے
رنگ ایہدے سوہنے سوہنے
سوہنے سوہنے من موہنے
تتلی (۲۷)

یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ ریاضؔ مجید نے اُردُو ادب کی جُملہ شعری اور نثری اصناف میں نہ صرف طبع آزمائی کی ہے بل کہ اُنھوں نے مختلف ہیئتوں میں تجربات بھی خوب کیے ہیں۔ ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ریاض مجید کی کون سی ادبی حیثیت کو درجہ ٔکمال پر رکھا جائے۔ یہ بھی ریاض مجید کا اعجاز ہے کہ، اُنھیں ان کی گراں قدر ادبی خدمات کی بدولت ہم کسی ایک صنف پر کامل طور پر منتج نہیں کر پاتے۔ اُنھیں اگر بہ حیثیتِ شاعر دیکھا جائے، تو اُن کی یہ حیثیت ہمارا دامنِ دل کھینچتی ہے

اور اگر ان کی نثر نگاری کو ملحوظِ نظر رکھا جائے، تو یقیناان کی نثری حیثیت انفرادیت کا تقاضا کرتی ہے۔ اُنھوں نے نعتیہ شاعری اور عمومی ادبی تحقیق و تنقید کے ضمن میں گراں قدر کارہاے نمایاں انجام دیے ہیں، وہ واقعی کارِ دار ہیں۔ یہاں صرف یہ کہنا کافی ہے کہ ریاض مجید جیسے نابغۂ رُوز گار شاعر نے نثری حوالے سے بھی نہ صرف اُردُو ادب بل کہ پنجابی زُبان و ادب میں اپنا اعتبار قائم کر رکھا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔میرزا ادیب،ریاض مجید کی پنجابی کتاب" خودی تے بے خودی" مشمولہ: ریاض مجید ایک مطالعہ ،مُرتّب: علی مجید ،نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء، ص۱۹۳

۲۔ ایضاً، ص۱۹۶

۳۔ ایضاً، ص۱۹۷

۴۔ ایضاً، ص۲۰۱

۵۔ڈاکٹر رشید احمد گوریچہ، پڑھ بسم اللہ بالاں دی نرسری دا پہلا قاعدہ، مشمولہ: ریاض مجید ایک مطالعہ، مُرتّب: علی مجید، ص۱۲۰

۶۔ ایضاً، ص۱۲۱

۷۔ ایضاً، ص۱۲۲

۸۔ ریاض مجید، پڑھ بسم اللہ، مجلس پنجابی، فیصل آباد،۱۹۹۱ء، ص۳۰

۹۔ ایضاً، ص ۳۲-۳۳

۱۰۔ ایضاً، ص۲۶

۱۱۔ ایضاً، ص۱۷

۱۲۔ ایضاً، ص۸۳

۱۳۔ڈاکٹر رشید احمد گوریچہ، محولہ بالا، ص۱۲۵

۱۴۔ ایضاً، ص۱۲۵

۱۵۔ غلام مصطفی بسمل، پڑھ بسم اللہ، پشتی فلیپ

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ ریاض مجید، خاک، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد،۲۰۱۶، ص۶

۱۸۔علّامہ محمد اقبال، کلیّاتِ اقبال(اُردُو)،اِقبال اکادمی پاکستان،لاہور،۲۰۱۱ء،ص۵۹۶

۱۹۔مرزااسد اللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالب، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز،لاہور،س ن،ص۳۱۳

۲۰۔ایضاً،ص۳۴۷

۲۱۔علّامہ محمد اقبال، کلیّاتِ اقبال(اُردُو)،ص۳۹۹

۲۲۔مرزااسد اللہ خاں غالبؔ، دیوانِ غالب،ص۲۷۴

۲۳۔غلام مصطفی بسمل، پڑھ بسم اللہ، مشمولہ: ریاض مجید ایک مطالعہ، مُرتّب: علی مجید،ص۱۲۸

۲۴۔ریاض مجید، دیباچہ: پڑھ بسم اللہ،پنجابی مجلس فیصل آباد،۱۹۹۱ء،ص۱۶

۲۵۔غلام مصطفی بسمل، پڑھ بسم اللہ،ص۳۱

۲۶۔ریاض مجید، پڑھ بسم اللہ،ص۱۷

۲۷۔ایضاً،ص۵۰

باب ہشتم:

حاصل تحقیق

ریاض مجید کا تعلق بھی ایک دینی گھرانے سے ہے۔ آپ کا خاندان علمی و ادبی حوالے سے بھی ایک وقار رکھتا ہے۔ ریاض مجید کے آباؤ اجداد کا تعلق دہلی کے ایک علمی و دینی خاندان سے تھا۔ معلوم خاندانی تاریخ کے مطابق یہ خاندان سترھویں صدی کے آخر میں محلّہ دریاگنج میں موجود ایک پرانی مسجد (جس کا نام زینت المساجد ہے) میں علمی، دینی اور تدریسی خدمات پر مامور تھا۔

سلیمان سیمابی کے خاندانی پس منظر کی تلاش میں معلوم دست یاب میں مولانا عبدالرحمن کا نام ملتا ہے، جن کا تعلق دریاگنج کے علاقے سے تھا اور خاندانی روایات اور قیاس کے مطابق یہی وہ مسجد تھی، جن میں اس خاندان کے اکابرین مولانا عبدالرحمن اور ان کے بیٹے مولانا محمد محسن درس و تدریس اور قاضی کے عہدے پر فائز تھے ان کے بیٹے مولوی محمد عظیم نے پنجابی میں ایک کتاب 'علی نامہ' لکھی۔ یہ منظوم کتاب ان دنوں کی یادگار لگتی ہے، جب یہ خاندان دہلی چھوڑ کر شاہ شجاع کے زمانے میں لدھیانہ میں آ کر آباد ہو گیا۔

مولوی محمد مسلم (۱۸۰۸- ۱۸۸۰ء) اور مولوی محمد اسماعیل، مولوی محمد عظیم کے بیٹے تھے ، جو خود پنجابی کے معروف شاعر تھے اُنھوں نے کئی کتابیں لکھیں جن میں سے ایک 'علی نامہ' کا تذکرہ پنجابی ادب کی تاریخوں میں ملتا ہے۔ مولوی عبدالغفور سلیمان اویسی سیمابی کا تعلق گڑھا (ویندان) جالندھر مشرقی پنجاب (انڈیا) کے مولوی خاندان سے تھا۔ ان کے خاندان کے بڑے شاعر، جو پنجابی میں کئی کتابوں کے مصنف تھے مولوی محمد مسلم تھے۔

سلیمان سیمابی کے خاندانی پس منظر کے مطابق سلیمان سیمابی کا پس منظر علم و ادب کی روایت سے جڑا ہوا ہے۔ تاریخ ارائیاں کے مصنف کے مطابق یہ خاندان دینی تعلیم ، درس و تدریس اور مذہبی مشاغل و تصانیف کے حوالے سے محترم تھا۔ مولوی محمد مسلم اور مولوی اسماعیل کے والد مولوی محمد عظیم لدھیانہ میں کافی مشہور تھے اور اُن کی علمی برتری کی وجہ سے اُن کو قاضی القضا کے عہدے پر فائز کیا گیا تھا۔ مولوی محمد مسلم کی شادی جالندھر کے بالکل نزدیک قریباً تین میل دور گاؤں گڑھا میں ہوئی۔ ایک خاندانی روایت کے مطابق مولوی محمد عظیم نے پہلے حفاظت کے لیے اپنے دونوں بیٹے اور خاندان کے دوسرے افراد گڑھا یعنی جالندھر بھیج دینے کے بعد میں جب لدھیانہ کے حالات زیادہ خراب ہو گئے، تو آپ بھی ہجرت کر کے گڑھا (جالندھر چھاؤنی) آ گئے۔

ریاض مجید کی پیدائش جالندھر کے مولوی خاندان میں ہوئی، جو گذشتہ تین صدیوں سے درس و تدریس سے متعلق رہا ہے۔ خاندانِ مغلیہ کے زمانے میں اس خاندان کے دو بڑے عالم مولانا عبدالرحمٰن اور مولانا محمد محسن قاضی القضات کے درجے پر فائز تھے۔ اس خاندان کا ابتدائی سراغ محلّہ دریاگنج دہلی کی تاریخی مسجد جسے عرفِ عام میں ''گھٹا مسجد'' ۔ مغلیہ حکومت کے زوال اور اس کے آخری حکمرانوں کی نااہلی کی وجہ سے دہلی سازشوں کا اکھاڑا بن گیا تھا اور اس سیاسی افراتفری کی وجہ سے تمام

خاندان دہلی سے ہندوستان کے دوسرے شہروں اور قصبوں میں ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے۔ اس طرح مولوی خاندان بھی نقل مکانی کرکے لدھیانہ (مشرقی پنجاب) آگیا۔

مولوی محمد عظیم کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام محمد مسلم اور چھوٹے بیٹے کا نام محمد اسماعیل تھا۔ ۱۸۳۰ء میں مولوی محمد مسلم جالندھر کے قریب گڑھا (جہاں آج کل ایک جالندھر چھاؤنی ہے) آکر آباد ہوگئے اور دین اسلام کی تبلیغ میں مصروف رہے۔ مولوی محمد مسلم نے متعدد پنجابی کتب تصنیف کیں۔ درس و تبلیغ اور تصنیف و تالیف کا یہ سلسلہ مولوی محمد مسلم سے ان کے پسر مولوی محمد علی اور پھر ان کے پسر مولوی شمس الدین تک منتقل ہوا۔ ان کی تصانیف چند قصّوں اور کتابچوں تک محدود ہیں۔ مولوی شمس الدین کے بیٹے عبدالمجید تھے۔ ریاض مجید اِنھی کی اولاد میں سے ہیں۔

ریاض مجید کے والد عبدالمجید ''گڑھا گاؤں'' جالندھر میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد مولوی شمس الدین کے ساتھ کاروبار کرنے لگے۔ ۱۹۴۷ء میں میں پاکستان بننے کے بعد ہجرت کرکے پاکستان آئے۔ یہاں آکر فیصل آباد میں قیام پذیر ہوگئے۔ یہاں پر قیام کے چھ سال بعد (دو یا تین سال بیمار رہنے کے بعد) وفات پاگئے۔

ریاض مجید ۱۲ ؍اکتوبر ۱۹۴۲ء بروز سوموار گڑھا ویزاں گاؤں (موجودہ جالندھر چھاؤنی) میں پیدا ہوئے۔ اسلامی مہینے کی تاریخ کے مطابق یکم؍ شوال عید الفطر کا دن تھا۔ گڑھا گاؤں جالندھر سے دو اڑھائی میل کے فاصلے پر تھا۔ اس گاؤں کی اکثریت مسلمان اور ارایں برادری پر مشتمل تھی اور اِنھی میں سے ایک گھر اُن کا تھا۔ یوں ریاض مجید کا تعلق بھی ارائیں خاندان سے بنتا ہے۔

ریاض مجید کے والد عبدالمجید اکتوبر ۱۹۵۳ء میں فوت ہوئے، جب کہ وہ چھٹی جماعت میں زیرِ تعلیم تھے۔ ان کی پرورش ان کی والدہ عزیز بیگم (جو اپریل ۲۰۰۲ء میں نوّے سال کی عمر میں فوت ہوئیں) نے کی۔ ریاض مجید کی تعلیم کی ذمّے داری ان کے بڑے بھائیوں احسان الحق اور اکرام مجید نے سنبھالی۔ بچپن میں اُنھیں مطالعہ اور کرکٹ کا زیادہ شوق تھا۔ ان کے ماموں حمید جالندھری (مالک مکتبہ کاروان لاہور) سے مطالعے کے لیے تازہ بہ تازہ کتابیں مل جاتی تھیں اور یوں یہ شوق پروان چڑھتا گیا۔

ریاض مجید کی والدہ عزیز بیگم جن کو سب بی بی جی کے نام سے پکارتے تھے۔ بہت نیک اور عبادت گذار خاتون تھیں۔ اپنا زیادہ وقت جائے نماز پر گذارتی تھیں اور اپنے پروردگار کے حضور سر بہ سجود رہتیں۔ اُنھوں نے اپنے خاوند کی وفات کے بعد اپنے بچّوں کی تعلیم و تربیت بہت ہی اچھّے طریقے سے کی۔

ریاض مجید چار بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ ان کے دو بھائی بہت چھوٹی عمر میں وفات پا گئے تھے۔ اس کے بعد دو بہنیں ہیں ایک کشور سلطانہ، جو شادی شدہ ہیں اور فیصل آباد میں ہی رہایش پذیر ہیں۔ دوسری شفقت سلطانہ بھی شادی شدہ ہیں اور فیصل آباد میں ہی مقیم ہیں۔ ریاض مجید کے بڑے بھائی احسان الحق ہیں۔ اکرام مجید احسان الحق سے چھوٹے ہیں۔ ان کے بعد ریاض مجید ہیں۔ انعام مجید سب سے چھوٹے ہیں، جب پاکستان بنا تو ریاض مجید کی عمر ساڑھے چار سال تھی۔ یہ کشت و خون کا زمانہ تھا۔ جب بے سرو سامانی کے عالم میں ان کا خاندان ہجرت کر کے فیصل آباد آیا اور یہاں آکر ڈگلس پورہ میں آباد ہوا۔ یہیں آکر ریاض مجید کی تعلیم کا آغاز ہوتا ہے۔

ریاض مجید کی ابتدائی تعلیم ڈگلس پورہ میں ہوئی۔ چناں چہ آپ کو میونسپل بورڈ کے قائم کردہ میونسپل ایم بی اِسکول میں مارچ ۱۹۴۸ء میں داخل کیا گیا۔ ریاض مجید نے اِس مادرِ علمی سے بنیادی تعلیم کے چار سال مکمل کیے۔ اُنھیں مسلم ہائی اِسکول میں درجہ پنجم کی تعلیم کے حُصُول کے لیے داخل کیا گیا۔ ریاض مجید نے مسلم ہائی اِسکول سے ۱۹۵۸ء میں میٹرک کی سند حاصل کی، گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے سہ سالہ آنرزان لینگوایجز(اُردُو)۱۹۶۳ء میں کیا اس کے بعد ایم اے کی تکمیل کے لیے اُنھوں نے یونی ورسٹی اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ ایم اے کے پرچے چوں کہ بی اے آنرز کے تیسرے سال میں ہو چکے تھے، لہٰذا اُنھیں یہاں ایک سال میں ایم اے کی تکمیل کرنی تھی۔ اورینٹل کالج میں ان کے دیرینہ ہم جماعت احسان الحق اختر اور یعقوب مظہر گل کے علاوہ ان کے نئے ہمہ جماعتوں میں تبسم کاشمیری، صدیق جاوید، اکرام چغتائی، فیضان دانش، ریاض حسین چوہدری وغیرہ شامل تھے۔ اِنھی سالوں میں گوہر نوشاہی، ممتاز منگلوری، محمد عارف تھے۔

پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، لاہور میں ریاض مجید کو اُس وقت کے مایہ ناز اساتذہ سے اکتسابِ فیض کا موقع ملا۔ بقول ریاض مجید یونی ورسٹی اورینٹل کالج میں ہمیں ڈاکٹر سیّد عبداللہ، پروفیسر سیّد وقار عظیم، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر غلام حسن ذوالفقار، پروفیسر سجاد باقر رضوی ایسے اساتذہ ملے۔ ان دنوں وائس چانسلر پنجاب یونی ورسٹی پروفیسر حمید احمد خاں یعنی ایم۔ اے فائنل کو مغربی تنقید پڑھانے کے لیے ہفتہ میں ایک دو دن کے لیے اورینٹل کالج آیا کرتے تھے۔ ہم نے یہاں ان سے مغربی تنقید خصوصاً بو طیقا(ارسطو) کے بارے میں بہت استفادہ کیا۔

اورینٹل کالج کی علمی و ادبی فضا سے ریاض مجید نے بہت کُچھ سیکھا۔ یہاں اُردُو، فارسی، عربی کے شعبوں میں آئے دن کوئی نہ کوئی تقریب ہوتی، لاہور اور معروف لاہور سے اہلِ قلم، شاعر اور ادیب یہاں تشریف لائے اور اساتذہ سے ملتے۔ طلبہ کو بھی ان سے ملنے کا موقع ملتا۔ انتظار حسین جیلانی کامران، شہزاد احمد، انجم رومانی، شہرت بخاری، قیوم نظر، وزیر آغا، شورش کاشمیری، احسان دانش سے لے کر جگن ناتھ آزاد اور عبد العزیز میمنی جیسی شخصیت کو اس عظیم درس گاہ میں آتے دیکھا ان میں سے بہتوں کے خطیات اور لیکچر سنے، بالمشافہ ملاقاتیں کیں، شاعری سنی۔

گورنمنٹ کالج، لاہور اور اسلامیہ کالج سول لائینز کی ادبی نقاریب میں شرکت کے مواقع بھی اُنھیں دنوں کی یادگار ہیں، جن میں فیض احمد فیض، بیگم انیس فیض، غلام رسُول مہر، عبید عابد علی عابد اور دوسرے کئی مشاہیر کو دیکھنے، ان کی گفت گو سننے اور اُنھیں ملنے کا موقع ملا۔

ریاض مجید نے ۱۹۶۴ء میں پنجاب یونی ورسٹی (اورینٹل کالج) سے ایم۔اے اُردُو کا امتحان پاس کیا۔ ریاض مجید نے پی ایچ۔ڈی بھی پنجاب یونی ورسٹی سے کی اس کے لیے تگ ودو گورنمنٹ کالج، لائل پور آئے۔ان کے اساتذہ میں مرزا محمد منوّر، سجاد باقر رضوی، حمید احمد خان (سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی)، وقار عظیم، ڈاکٹر وحید قریشی اور سیّد عبداللہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ سجاد باقر رضوی صاحب سے دوستانہ انداز میں زمانۂ تعلیم کے بعد بھی متعدد صحبتیں رہیں۔اسی طرح مرزا محمد منور اور سیّد عبداللہ سے بھی آخرِ وقت تک نیاز مندی کا سلسلہ جاری رہا۔

ریاض مجید کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز کالج کے زمانے سے ہوتا ہے۔اُنھوں نے کالج کے زمانے میں بہت سے مشاعرے پڑھے اور انعامات، ٹرافیاں حاصل کیں۔مشاعروں کے سلسلہ میں پنڈی، اسلام آباد، ایبٹ آباد، سرگودھا، جھنگ وغیرہ جاتے رہے ہیں۔

ریاض مجید نے ملازمت کا آغاز ۱۹۶۵ء میں فیملی پلاننگ ڈیپارٹمنٹ میں سپروائزر کے طور پر کُچھ مہینوں کے لیے کیا پاکستان میں یہ محکمہ بیرونی امداد کے ذریعے قائم کیا گیا اس میں سپروائزر کا سکیل اس زمانے کے لیکچرر کے برابر تھا۔ گورنمنٹ کالج میں ریاض مجید نے ستمبر ۱۹۶۶ء تک تدریسی ذمّے داریاں سرانجام دیں۔اِنھی دنوں ویسٹ پاکستان پبلک سروس نے بہت سی اسامیوں کا اشتہار دیا۔ان میں بیالیس کے قریب اُردُو کی اسامیاں بھی دیں انٹرویوز میں کامیابی کے بعد، ریاض مجید نے اپنی مستقل ملازمت کا آغاز ۱۵ر نومبر ۱۹۶۹ء میں کیا۔ ریاض مجید نے گورنمنٹ کالج، بوچھال کلاں سے اپنی مستقل ملازمت کا آغاز کیا بوچھال کلاں خوشاب سے چکوال جانے والی سڑک پر کلر کہار کے قریب واقع ہے، یہاں ریاض مجید قریباً سوا دو سال رہے۔

ریاض مجید کو درس و تدریس کے علاوہ کالج کے دیگر تفویضی اُمور اور علمی و ادبی سرگرمیوں سے خصوصی شغف رہا ہے۔وہ ادبی حوالے سے اسٹیج کے آدمی تھے اور قدرت نے اُنھیں بے پناہ صلاحیّتوں سے نواز رکھا تھا۔ آپ اعلیٰ انتظامی صلاحیّتوں میں بھی مشاق تھے۔موقع و محل کے عین مطابق حکمتِ عملیاں مُرتّب کرنا اور اپنی منشا کے مطابق نتائج مُرتّب کرنا ریاض مجید کے بائیں ہاتھ کا کھیل رہا ہے۔ گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں ملازمت۔ اساتذہ سے تعلق، علمی و ادبی پروگراموں میں اپنی مشارکت اور انعامات پانے کے ساتھ کالج کے اَدَبی مجلّے کی ایک طویل عرصے ادارت جیسی گراں قدر علمی و ادبی خدمات انجام دیں۔

ریاض مجید کی شادی رخسانہ سے قرار پائی۔ اپنی ملازمت اور علمی وادبی خدمات کی انجام دہی کے بعد اُن کے پاس وقت کی کمی ہوتی تھی۔ چناں چہ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اُن کی تمام تر گھریلوں ذِمّے داریوں کا بار اُن کی اہلیہ کے سر رہا، جسے اُنھوں نے بہ طریقِ احسن انجام دیا۔ ریاض مجید اپنی شادی خانہ آبادی، اولاد، اُن کی تعلیم وتربیت میں اپنی اہلیہ کے کردار اور اولاد کی شادیوں کے بارے ہمیشہ مطمئن رہے ہیں۔

ریاض مجید کے بڑے بیٹے محمد مسلم مجید نے ہمدرد یونی ورسٹی فیصل آباد کیمپس سے بی اے آنرز کیا اور عین اس وقت جب وہ اسی یونی ورسٹی میں ایم بی اے کے داخلے کے لیے یونی ورسٹی جانے کے لیے تیّار ہو رہا تھا کہ اچانک فوت ہو گیا۔ یہ جواں مرگی پورے خاندان کے لیے ایک اہم واقعہ تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے Amblyism ایک ایسی بیماری سے تعبیر کیا، جس میں دوران خون میں کسی بلبلے (Bulbble) کے آنے سے دماغ کے کہیں حصّے کو آکسیجن کی سپلائی منقطع ہونے سے آدمی کی فوری موت واقعہ ہو جاتی ہے۔ یوں مسلم ۲۸ر دسمبر ۲۰۰۳ء کو قریباً سوا بائیس سال کے عمر میں فوت ہو گیا۔

ریاض مجید کے دوسرے بیٹے محمد علی مجید نے پنجاب گروپ آف کالجز سے ایم بی اے کیا۔ بعد میں اُن کی شادی ہوئی علی مجید کی اہلیہ کا نام وردہ ہے ان کے دو بچّے انیبہ اور طٰہٰ ہیں۔ وہ فیصل آباد کے ایک معروف صنعتی ادارے انٹرلوپ میں ملازم ہیں اور ریاض مجید کے ساتھ رہایش پذیر ہیں۔

ریاض مجید اپنی ازدواجی زندگی سے بہت مطمئن ہیں۔ پاکستان ٹیلی ویژن لاہور سے تیّار ہونے والی دستاویزی 'قلم' میں اور میری تحقیق' ۱۹۹۵ء پروڈیوسر عالی میں (جو پچپن منٹ پر مشتمل ہے) میں ان کے بچّوں، بچیوں اور اہلیہ کے تاثرات میں اس اطمینان کا ظہار ہوتا ہے۔

ریاض مجید سادہ طبع کے مالک ہیں۔ ان سے ملاقات کے لیے آنے والا کوئی بھی اجنبی شخص پہلی نظر میں اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا کہ وہ جس شخص سے ملاقات کر رہا ہے وہ برّصغیر پاک و ہند کی اہم ترین ادبی شخصیات میں سے ایک ہے۔ ریاض مجید نہایت ملنسار اور مہمان نواز انسان ہیں۔ ان کی خوش خلقی کے باعث لوگ پہلی ہی ملاقات میں ان کے دیوانے ہو جاتے ہیں۔ ایثار، عاجزی اور تواضع، ریاض مجید کی شخصیت کے نمایاں اوصاف ہیں۔

ریاض مجید نے اپنی زندگی میں جہاں کہیں اپنے اساتذہ سے کسبِ فیض کیا ہے، وہاں وہ اپنے دوست احباب کے بھی معترف ہیں۔ اُن کا خاندان ایک علمی و ادبی سلسلہ رکھتا تھا۔ چناں چہ وہ اپنے ننھال اور دھدھیال میں سے چند قابلِ تقلید ہستوں کے ہمیشہ سے معترف رہے ہیں۔

ریاض مجید تصنّع اور بناوٹ سے عاری زندگی پر دل و جان سے فریفتہ ہیں۔ وہ سادہ لباس پہنتے ہیں اور سادہ خوراک کے شوقین ہیں۔ شلوار قمیص ان کا پسندیدہ لباس ہے۔ بدلتے موسم میں قمیص کے اُوپر واسکٹ اور سردیوں میں کوٹ اور مفلر زیب تن کرتے ہیں۔ اگر کوئی نیاز مند اُن کی دعوت کرنا چاہے تو اپنے دستر خوان پر چپاتی کے ساتھ پودینے کی چٹنی رکھ لے اور اگر زیادہ تواضع مقصود ہو تو کدو کے رائتے کا اضافہ کر لے۔ ریاض مجید کو مرغن غذاؤں سے زیادہ رغبت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایسی دعوت میں، جو خالصتاً ان کے اعزاز میں منعقد کی گئی ہو ایسے تکلفات کی ممانعت کرتے ہیں۔

ریاض مجید مجلس اقبال اور ''حلقہ ارباب ذوق'' کے کارکن کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ رائٹرز گلڈ اور انجمن افکار اسلامی سے وابستہ ہیں اور بہت سی علمی و ادبی، ثقافتی اور مذہبی تنظیموں میں شرکت کرتے رہے ہیں۔ ریاض مجید سکول کے زمانے سے شعر کہتے آرہے ہیں، لیکن ان کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز کالج کے زمانے سے ہوتا ہے۔ کالج کے زمانے میں تھرڈ ایئر میں باقاعدہ غزل کہنا شروع کی۔ کالج کے مشاعروں کی نمایندگی کرتے تھے اور اس سلسلے میں انعامات بھی حاصل کئے ہیں۔ اس زمانے میں اُنھوں نے بہت سی غزلیں اور کُچھ نظمیں کہیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ شعری ذوق بھی بڑھتا گیا اور آخرکار ان کا پہلا مجموعہ ''پس منظر'' ۲۰ فروری ۱۹۷۳ء کو چھپا۔ اس ادبی فضا کے ساتھ ساتھ بہت سے بیرونی سفر بھی کر چکے ہیں۔ پہلا سفر خواجہ نظام الدین اولیا کے عرس کے موقع پر ۱۹۶۴ء میں انڈیا کا کیا۔ اس کے بعد امیر خسرو کے عرس پر دوبارہ انڈیا گئے۔

ریاض مجید کو جہاں تخلیق کا شوق رہا وہاں اس کے ساتھ ساتھ ادبی کتب کی اشاعت کا شوق بھی رہا ہے۔ اس شوق کی تکمیل کے لیے اُنھوں نے دوستوں کی وساطت سے ایک اشاعتی ادارہ ''قرطاس پبلشرز'' کے نام سے شروع کیا اور وہ اس ادارے کے تحت اب تک تقریباً دو سے زائد کتابیں چھاپ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ '' نعت اکادمی'' ان کے زیرِ نگرانی کام کر رہی ہے اور ''مسلم پنجابی مجلس''، جو اُنھوں نے اپنے بزرگ مولوی محمد مسلم کے نام پر قائم کی ہے، کام کر رہی ہے۔

ریاض مجید کو ادب سے گہرا لگاؤ ہے اور وہ ایسے تمام افراد کی بھرپور مدد کرتے ہیں، جو تخلیقی یا تحقیقی حوالے سے ان کے پاس رہ نمائی کے لیے آتے ہیں۔ ریاض مجید کے پاس آنے والا ہر نوجوان طالب علم اپنی توقعات سے زیادہ تعاون اور رہ نمائی حاصل کرتا ہے۔ ان کی ذاتی لائبریری کے دروازے ایسے طالب علموں کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں، جو کوئی نہ کوئی نئی بات سیکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ نوجوان نسل کے لیے ریاض مجید کی باتیں سبق آموز ہیں۔ ایسی دانائی کی باتوں کے پس منظر میں طویل عمر کے تجربات اور مشاہدات پوشیدہ ہیں۔

ریاض مجید شعر و ادب سے لگاؤ رکھنے والے نوجوانوں میں شعر گوئی کا ایسا شوق پیدا کر دیتے ہیں کہ پھر وہ فرد کاغذ قلم کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ریاض مجید کو کلاسیکی میوزک سننے کا بہت شوق ہے۔ ان کے پاس کلاسکی ریکارڈز بھی موجود ہیں۔ اس

کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے فوٹو گرافی کا شوق بھی پال رکھا ہے۔اس سلسلے میں ان کے پاس مختلف کیمرے اور لینز کافی تعداد میں موجود ہیں وہ ان کے ذریعے سفر کے دوران اپنی یادوں کو محفوظ کر لیتے ہیں۔

ریاض مجید کی شخصیت تضادات کا شکار نہیں۔وہ جو کہتے ہیں اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے فیصل آباد میں ایک علمی وادبی فضا اور ماحول قائم ہوا ہے۔ان کے بارے میں ہمیشہ لوگ اچھّی بات کہتے ہیں۔ریاض مجید فیصل آباد کی ادبی و نظریاتی عمارت کا اہم ستون ہیں۔اُنھوں نے اپنے ادبی سرمایے کو نہ صرف اپنے ذہن تک محدود رکھا بل کہ اوروں تک پہنچانا اپنا فرض اوّلین سمجھا۔اس کا ثبوت ان کی ادبی محفلیں ہیں ،جو ذہنی تربیت کا باعث بنتی ہیں۔

ریاض مجید ادبی محفلوں کی جان ہیں۔ادبی محفل جماتے ہیں تو خوب جماتے ہیں۔بہت سے لوگ ان کے حوالے سے شاعر اور ادیب بنے۔ریاض مجید کا تعلق چوں کہ ایک مولوی خاندان سے ہے۔ان کے بزرگ اپنے زمانے میں بڑے عالم فاضل گزرے ہیں۔اس لیے ریاض مجید بھی مذہب کو زندگی میں ضروری تصوّر کرتے ہیں۔نمازِ پنجگانہ کی پابندی کرتے ہیں۔ہر وقت درود کا ورد کرتے رہتے ہیں۔

ریاض مجید پانچ وقت کی نماز کی پابندی کرتے ہیں۔کیسی بھی مذاق کی محفل ہو،مشاعرہ ہو یا کوئی اور اہم تقریب ہو ان کی زُبان پر درود کا ورد جاری رہتا ہے اور اس کی تاکید بھی کرتے رہتے ہیں۔اُنھوں نے قرآن و حدیث کے مطالعہ سے بھی اپنی فکر کی شمع کو روشن کیا ہے۔اس مقدس فکر کی روشنی اُنھیں حدودِ ادب سے باہر نہیں جانے دیتی۔

ریاض مجید تعلیمی میدان میں نمایاں رہے اور اُردُو ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔اس زمانے میں اُنھوں نے کُچھ غزلیں اور نظمیں کہیں۔اُنھیں نعت لکھنے کا شوق بھی اسی زمانے میں ہوا اور دو نعتیں کہیں ایک فارسی میں اور دوسری اُردُو میں۔ریاض مجید بڑی دھیمی شخصیت رکھتے ہیں اور درویشانہ رکھ رکھاؤ کے مالک ہیں۔

ریاض مجید کی ایک خاص پہچان اُن کی نعتیہ شاعری ہے۔ریاض مجید کی نعتیہ شاعری میں ایک خاص سوزوساز کی خلش پنہاں ہے ،جو اضطرابِ درونِ قلب پیدا کرتی ہے،جس کے درپردہ اُن کا جذبۂ عشق کار فرما ہے۔ریاض مجید کی نعت پسندی کا منھ بولتا ثبوت نعت اکادمی فیصل آباد سے ایک خاص وابستگی اور ممبر شپ ہے۔اِس ادارے کی خصوصیت یہ ہے کہ حمد، نعت اور منقبت سے متعلقہ تنقید اور چھپائی کا کام بھی بہ طریقِ احسن ہوتا ہے۔اِس ضمن میں شایع ہونے والی نعتیہ کتب میں کہیں نہ کہیں ریاض مجید ہمیں نظر آتے ہیں۔اِس ادارے کو بین سطح پر پذیرائی ملی ہے۔مانچسٹر کے ایک ادارے ''کاروانِ ادب'' نے ریاض مجید کو ''لائف اچیومنٹ ایوارڈ'' ملا اور اَسی حوالے سے اُنھیں ''احسان بینک'' نے اُنھیں انعام سے بھی نواز رکھا ہے۔نعت اکادمی سے شایع کردہ کتب میں ریاض مجید کی کتب ''حیَّ علی الثنا'' اور ''سیّدنا رحیم ﷺ '' کو انعامات سے نوازا جا

چکا ہے۔اِس ادارے کے ذریعے سے ریاض مجید نے نعت کے حوالے سے بکھرے ہوئے کام کو بھی اکٹھا کیا ہے،جو نعت کے میدان میں ایک اہم ادبی کارنامہ تو ہے ہی، لیکن ساتھ دینی حوالے سے ایک بہت بڑا کارِ خیر بھی ہے۔

ریاض مجید متوازن سوچ کے مالک اور اُصول پسند انسان ہیں۔ دوستوں اور گھر کے افراد سے ان کا رویّہ بے حد نرم ہوتا ہے اور ایسے لوگوں سے بالکل تعلق پسند نہیں کرتے جن میں تصنُّع ہو۔ ریاض مجید سچ کہنے والے شخص کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ بے شک یہ سچ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ خود بھی سچ بولتے ہیں اور دوسروں سے بھی اس کی توقع کرتے ہیں۔

ریاض مجید کو حلقۂ اربابِ ذوق فیصل آباد کے دو سال، جوائنٹ سیکرٹری اور دو سال سیکرٹری رہنے کا اعزاز بھی حاصل رہا ہے۔ اس دوران میں اُنھوں نے مختلف تقریبات کے انتظامات کے سلسلہ میں نہایت گرم، جوشی اور مستعدی سے کام کیا۔ کئی مشاعرے ایسے تھے، جو انتہائی کم وقت کے نوٹس پر کرنا پڑے، مگر ریاض مجید نے حد درجہ حسنِ انتظام اور سلیقہ پسندی کا مظاہرہ کیا۔ وہ بدیہہ گو شاعر ہی نہیں بدیہہ گو بھی ہیں۔ ریاض مجید باتیں بھی مصرعوں اور شعروں میں کرتے ہیں۔ احباب کے ساتھ دورانِ گفت گو میں ریاض مجید اِنھی باتوں کی نظمیں اور غزلیں ایسے خوب صورت الفاظ میں ترتیب دیتے ہیں کہ سب حیران رہ جاتے ہیں۔ اُن کی بدیہہ گوئی کا ایک زمانہ معترف ہے۔

ریاض مجید کو جہاں بہت سی ادبی کتابیں پڑھنے اور لکھنے کا شوق ہے وہاں اُنھیں ادبی کتابیں جمع کرنے کا شوق بھی ہے۔ ان کے گھر کی لائبریری ہے، جس میں ترتیب سے رکھی ہوئی کتابیں ان کے ادبی ذوق کی پہچان ہیں۔ کالج کے طلبہ میں ادب سے شیفتگی اور لگاؤ پیدا کرنے کے لیے اُنھوں نے باقاعدگی سے سیمی نارز منعقد کرانے کی مستحکم روایت قائم کی۔ بحیثیت اُستاد وہ ایک شفیق اور مہربان شخصیت کے مالک ہیں۔ دورانِ لیکچر ان کا انداز انتہائی دوستانہ اور غیر روایتی ہوتا ہے۔ ان کے وسیع مطالعہ اور ماہرانہ اندازِ گفت گو کا ثمر کہیے یا نعمتِ خداوندی، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ کمرۂ جماعت میں ان کا سامع کبھی بھی بوریت کا شکار نہیں ہوتا۔

شہر کی ادبی سرگرمیاں ریاض مجید کی شرکت اور رائے کے بغیر ادھوری سی رہتی ہیں۔ کسی کتاب کی تقریبِ رونمائی ہو یا کسی شخصیت کی ادبی و فنی خدمات کا جائزہ، ریاض مجید اپنی دیانت دارانہ رائے کو پوری ذمّے داری کے ساتھ سب کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اُن سے ملنے والا کوئی بھی نووارد خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا۔ علم و دانائی کی باتیں سیکھنے کے ساتھ ساتھ وہ اُن کی جانب سے اپنے ہم رہ کئی خوب صورت کتب کا تحفہ ضرور لے کر جاتا ہے۔ ریاض مجید کی کوشش ہوتی ہے کہ دورانِ تعلیم نو، جوانوں شعر گوئی پر زیادہ وقت صرف نہ کریں۔ وہ طلبہ کو عملی زندگی کی کامیابیوں پر توجُّہ دینے اور کسی مقام کے حصُول کے بعد شعر گوئی کو مستقلاً اپنانے کا درس دیتے ہیں۔ وہ بہت کم لوگوں کو باقاعدہ شاگردی میں لیتے ہیں، البتہ شعر گوئی کے حوالے

سے سب کی فراخ دلی کے ساتھ رہ نمائی فرماتے ہیں۔ ریاض مجید اپنے فن سے گہری وابستگی رکھنے کے باعث کئی اصناف ادب کے ماہر ہیں۔ ان کی شخصیت اور فن میں ایک ہم آہنگی اور توازن کی کیفیت موجود ہے۔

ریاض مجید نے شاعری کا آغاز کالج کے زمانے میں غزل گوئی سے کیا خصوصاً ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء تک گورنمنٹ کالج میں، جب وہ بی اے سہ سالہ آنرزان لینگوایجز کے طالب علم تھے، اُنھوں نے پاکستان کے مختلف شہروں میں منعقد ہونے والے بین الکُلیّاتی مشاعروں میں کالج کی نمایندگی کی۔ ان دنوں تعلیمی اداروں کی سالانہ تقریبات میں حسن قرات اور اُردُو، انگریزی پنجابی مباحثوں کے ساتھ مشاعرں کا بھی چلن تھا۔ عام طور پر کسی مصروف شاعر یا اساتذہ کی غزل کا ایک مصرع طرح کے طور پر مختلف کالجوں سے میں بھیج دیا جاتا۔ اسی طرح کسی موضوع پر نظم کے لیے کوئی عنوان دے دیا جاتا۔ کالج سے دو دو شاعروں کی ٹیم ان مشاعروں میں شرکت کرتی۔ غزل اور نظم کے دو دور ہوتے، جن میں بہتر نمایندگی کرنے والے شاعروں کو اوّل، دوم اور سوم انعام دیے جاتے اور بہ حیثیت مجموعی کارکردگی کی حامل ٹیم کو ٹرافی دی جاتی۔

اُردُو کے عام شاعروں کی طرح ریاض مجید نے بھی اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا، اُنھوں نے ابتدائی غزلیں کالج نے زمانے میں اس وقت لکھیں، جب وہ گورنمنٹ کالج فیصل آباد (لائل پور) میں زیر تعلیم تھے۔

ریاض مجید کا شمار بھی اُنھی معدودے چند شعرا میں ہوتا ہے کہ جنھوں نے غزل کا انتخاب اسی اختصاری کیفیت کے پیشِ نظر کیا ہے۔ اس زمانے میں کالجوں میں ٹیوٹوریل گروپ کا نظام بڑا اہم تھا ہفتہ میں ایک پیریڈ ایسا تھا، جس میں کالج کے مختلف ڈسپلنوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ اکٹھے ہوتے۔ اس میں ایف اے، ایف ایس سی میڈیکل اور پری انجنیئرنگ گروپ کے، جونئیر اور سینئر سال اوّل، دوم، سوم اور چہارم کے طلبہ مختلف گروپوں میں اس طرح جمع ہوتے کہ ایک گروپ کے کل طلبہ کی تعداد پچیس تیس سے نہ بڑھتی۔ خوش قسمتی سے ریاض مجید کو، جو گروپ ملا، اس کے انچارج پروفیسر مرزا محمد منور تھے۔ ریاض مجید نے اسی زمانے میں بین الکلیّاتی مشاعروں میں بھی بہت سی غزلیں اور نظمیں پڑھیں۔ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد کے مشاعرے میں اُنھوں میں معروف شاعر ''شہزاد احمد'' کے طرح مصرع 'رواں دواں ہی رہا قافلہ بہاروں کا' ہر غزل لکھ کر اوّل انعام حاصل کیا۔

ریاض مجید کا شعری مجموعہ '' پس منظر '' ایک خاص کرب اور تنہائی کی دستاویز ہے۔ اِس مجموعے کے مطالعہ سے، جو تاثر شدّت اور وسعت سے نہایت نمایاں اور عیاں نظر آتا ہے، وہ آشوبِ تنہائی ہے۔ یہی آشوبِ تنہائی ریاض مجید کے کرب کو دو آتشہ کرتا ہے ''پس منظر'' کی کوئی بھی غزل ایسی نہیں جہاں کرب تنہائی کسی نہ کسی صورت میں موجود نہ ہو۔ ''پس منظر'' کا شاعر اپنے اس المیے سے بخوبی آگاہ ہے، اس تاثر کے پیشِ نظر ''پس منظر'' کو بجا طور پر دستاویزِ آشوب تنہائی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ ریاض مجید کی غزل کا مرکز و محور وہ کرب ہے، جس میں نہ صرف اُس کی ذات اسیر ہے، بل کہ وہ پوری کائنات کو اِس

کرب کی شدت میں اینٹھتا اور کراہتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ شاعر کا یہ کرب اگر سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی شعور کی پیداوار ہو تو اس کرب کے فن کارانہ اظہار سے شاعر اس صورت حالات کو مثبت انداز میں منقلب کر دینے کی تمناؤں کو نطق دیتا ہے، لیکن اگر یہ کرب احساسِ شکست اور اس کے نتیجے میں بے بسی اور بے دلی کا اظہار ہے، تو اسے منفیت کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ریاض مجید کے اِس شعری مجموعے کے مطالعے سے شاعر کی حیاتِ مَحبّت کا مفصل باب تحریر کیا جا سکتا ہے۔ چناں چہ آغاز و انجامِ مَحبّت کے حیات افراز یا جان لیوا تجربات سے مملو ''پس منظر'' کے اوراق ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ شاعر نے مَحبّت کے حوالے سے، جو اشعار کہے ہیں وہ اُردو ادب کی روائتی عشقیہ شاعری سے کہیں مختلف اور منفرد ہیں، لہٰذا ریاض مجید نے مَحبّت کو ''برائے شعر گفتن خواب است'' کے طور پر نہیں لیا بل کہ مَحبّت نے شاعر کے رگ وپے، ریشے ریشے اور جسم کی نَس نَس کو اس طرح آتشیں رکھا ہے کہ اس کی آنچ سے ان کے اشعار تمازت حاصل کرتے ہیں، جو اُن کی جسمانی کرب ناکی سے کہیں زیادہ روحانی اذیت کا باعث بنتے ہیں۔

ریاض مجید کے احساسِ تنہائی کو زیرِ نظر شعری مجموعے نے خوب سہارا دیا ہے۔ گویا اُس دور میں کی جانے والی شاعری عاشقانہ تنہائیوں کی پیداوار ہے، جس میں اُن کا عشقیہ کرب واضح طور پر لپٹا دکھائی دیتا ہے۔ جہاں تک بارِ آگہی کا تعلق ہے اس کے لیے اُنھیں ''گزرے وقتوں کی عبارت'' اور ''ڈوبتے بدن کا ہاتھ'' کا انتظار رہا ہے۔

ریاض مجید کی شاعری اور داخلی جذبات کی ترجمانی اِس بات کی متقاضی ہے کہ ریاض مجید کو بلا مبالغہ شاعرانہ تجربات کا سمندر قرار دیا جائے اور اُن کی شاعری کو ایک ایسے عظیم الشان شعری مرقّع قرار دیا جائے، جس میں جذبے سے لے کر اخلاص تک ہر شے اپنا ذاتی وجود رکھتی ہے۔ اِس شذرے میں ریاض مجید کی شاعری کے ایک مخصوص، لیکن نمایاں پہلو مَحبّت اور احساسِ تنہائی کے محرکات کی سراغ رسانی کی گئی ہے۔ پس منظر کی کوئی بھی غزل ایسی نہ ہو گی، جس میں کربِ تنہائی کسی نہ کسی صورت میں موج زن نہ ہو۔

تنہائی کے اس ہمہ گیر اور شدید ترین احساس کے عوامل کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اس کی بنیادی اور سب سے بڑی وجہ شاعر کا المیہ مَحبّت ہے۔ اگرچہ مَحبّت کا موضوع، کوئی نیا یا اچھوتا موضوع نہیں ہے بل کہ یہ تخلیقِ آدم کے وقت سے چلا آ رہا ہے اور ہر دور کے شعرا نے اس موضوع دل پذیر پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ایک ریاض مجید کے یہاں اس ازلی و ادبی جذبہ نے جس فطری پن، معصومیت، نزاکت اور ایک خاص رازداری کے ساتھ جگہ پائی ہے اس کی مثال بہت کم شاعروں کے یہاں نظر آئے گی۔

ریاض مجید کی یادوں کے البم سے پیچھا چھڑانا اُن کے لیے کسی طور پر ممکن نہیں ہے۔ یہی ''پس منظر'' کے اس ''الم ناک پس منظر'' کی سب سے بڑی خوبی ہے، جسے جانے بغیر ہم ریاض مجید کی اُن اُداسیوں، تنہائیوں اور بے کیفیوں کا صحیح

معنوں میں ادارک نہیں کر سکتے۔ ایک زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے، تو اُن کی یہ الم ناک یادیں ہی، اُن کے لیے سرمایۂ حیات کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ریاض مجید نے گزرتے وقتوں کے ساتھ تخلیقِ فن کا فریضہ بھی انجام دیا ہے۔ گویا اُن کا ماضی ایک ایسی دستاویز بن چکا ہے، جس میں ہر اُن کی قلبی واردات اور اُس کے تجربات کا سراغ رساں ہے۔

ریاض مجید زمانے کی تحقیقی فاعلیت کا حِصّہ ہیں، جس سے اُنھیں کبھی انکار نہیں رہا ہے۔ حال کے لمحات سے گریز پائی اُنھیں براہ راست اُسی ماضی کی کڑی سے منسلک کرتی ہے، جو حال سے ہو کر استقبال تک مربوط ہے۔ ماضی کے افعال کی ذِمے داری بھی ایسے ہی کڑے حوصلوں والے رکھتے ہیں، جو اپنے حال کو بدلنے کی جرأت سے بہرہ رکھتے ہوں۔

ریاض مجید کی غزل مثبت کرب کا اظہار ہے، کیوں کہ وہ اُس شعور سے مسلّح ہے، جس کے بغیر انسان سفاک عناصر اور بے رحم انسانوں کی اِس دنیا میں ہتھیار ڈال کر بیٹھ جاتا ہے۔ ریاض مجید نے کسی مرحلے پر بھی ہتھیار نہیں ڈالے۔ موضوع سے قطع نظر، اگر وہ غزل کی خوب صورت روایت سے بھی بغاوت کرتا ہے، تو یہ نفسیاتی نکتہ ہاتھ لگ سکتا تھا کہ وہ تخریب کاری پر اُتر آیا ہے، مگر اُس کی غزل روایت سے صرف اِس حد تک بغاوت کرتی ہے، جس حد تک عصرِ حاضر کے غزل گو کو بہر صورت کرنی چاہیے۔ اِس سے آگے نہ وہ لفظوں کے پینترے دکھاتا ہے، نہ ماورائیت کی بازی گری سے کام لیتا ہے۔ وہ ایک ایسا حقیقت پسند نہیں، جس کے دونوں ہاتھوں میں نشتر ہوں۔ ریاض مجید کے ایک ہاتھ میں نشتر اور ایک ہاتھ میں پھول ہے اور اُس کی اِسی ادا نے جدید اُردو غزل میں اُسے ایک نمایاں انفرادیت بخشی ہے۔

ریاض مجید کا واحد متکلم تخلیقی بنت میں اپنے تمام حوالوں سے موجود ہے۔ یہ انانیت اُن کے خارجی عناصر اور اُن کی ذات کی شناخت بھی ہے، جو اُن کے معمارِ قوم ہونے سے بھی مختص ہے اور آنے والوں تک میراث فکر پہنچانے کی ذِمّے داری سے بھی عبارت ہے۔، لہٰذا اُس کی ایک صورت ریاض مجید کی خود کلامی بھی ہے، جہاں وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر خود سے ہر وہ بات کرتے ہے، جو عام ماحول میں یا وہ، جو وہ نہیں کہی جا سکتی۔

ریاض مجید ایک ایسے حساس طبع شاعر ہیں، جن کے نوکِ قلم سے متعدد شعری مجموعے معرضِ اظہار میں آئے ہیں۔ اُن کا شعری مجموعہ ''ڈوبتے بدن کا ہاتھ'' ایک ذہین، حساس اور پڑھے لکھے شاعر کے سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے خیالات و تفکرات کا دلآویز اور خوب صورت مُرقّع ہے۔ یہ شعری مجموعہ اپنے دامن میں بہت کُچھ سمیٹے ہوئے ہے۔ مثلاً: ابدی انسانی المیے کا، بالتفصیل تجزیہ، حرصِ زیست کے محرّکات، غمِ انسانی کی پُراسراریت، ہمارے لمحاتی خوف و دہشت کے سالوں کی عقدہ کشائی، نفس روح سے آگہی، واقعات کے اسباب و محرّکات کی دریافتیں، فکری ارتقا کے کرشمات، مرکزیت کا انسانی زندگی میں عمل دخل اور اس کی اہمیت، گہری سوچوں کی جلتی دہکتی آگ کے شرارے، بدی اور تہذیبی ترقّی کا نازک تعلّق، تلاشِ ذات کی

کاوشِ پیہم، یکسانیت کی اذّیت، تصوّف کی نکتہ آفرینیاں، اُن کی ہوس ناکی اور انتشار کے صحرا ے بیکراں میں امن و سکون اور اپنے ارمانوں کی جنتِ گُم گشتہ کی تلاش وغیرہ وہ بنیادی موضوعات اور مسائل ہیں، جن پر شاعر کے فکرِ جلیل نے متذکرہ موضوعات پر شعر کہتے ہوئے چونکا دینے والے افکار تخلیق کیے ہیں۔ ریاضؔ مجید ایک متوازن دانش ور ہیں، اُن کے اکثر و بیشتر اشعار اپنے ڈھڑکتے، سانس لیتے لفظوں میں ایک حقیقی روحانی انقلاب کی بُو باس رکھتے ہیں۔

ریاض مجید کی مکمل شاعری ایک خواب بیداری کا شعری اظہار محسوس ہوتی ہے۔ یہی اُن کی منفرد رومانویت کا اصل سرچشمہ ہے، کیوں کہ بیداری کے خوابوں سے ایک فرحت و انبساط کی کیفیت ختم لیتی ہے۔ وہ سب کے درمیان رہتے ہوئے بھی خود کو سب سے الگ تھلگ تصوّر کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ریاض مجید اپنے اور متذکرہ پیدا شدہ ماحول کے درمیان مصالحت کی صورت پیدا ہونے کے امکانات سے عاری ہیں۔

ریاضؔ مجید نے اپنے شعری پیکروں میں جابجا اُس انسانی گریز اور ناقابل مزاحمت حالات کو جُملہ مکروعات کے ساتھ علامتی انداز میں بیان کیا ہے، جن میں انسانی انانیت کو سخت مجروح ہوتی ہے۔ ایسے عناصر سے اُن کی دامن کُشائی عین ممکن تھی، لیکن اُن دبے جذبوں، خواہشوں اور آدرشوں کا بڑی جاذبیت اور بھرپور توانائی سے اظہار کیا ہے۔ جن سے پوری انسانی زندگی عبارت ہے۔ چناں چہ اُنھوں نے، جو کُچھ دیکھا، محسوس کیا، برملا انداز میں معرضِ اظہار میں لایا ہے۔ ''ڈوبتے بدن کا ہاتھ'' عرفانِ حقیقت کے اشاریے کے طور پر ایک قابلِ ستایش شعری کاوش ہے، جسے ایک متوازن سوچ کا حامل نقاد ہمیشہ جدید اُردو شاعری میں ایک سنگِ میل کی حیثیت سے دیکھے گا۔

ریاض مجید کا شعری سفر قیامِ پاکستان کے بعد دوسری دہائی میں آغاز پذیر ہوتا ہے۔ اِس اعتبار سے وہ بیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائی میں ابھرتے ہیں۔ ریاض مجید کی غزلیات کا پہلا مجموعہ '' پس منظر'' ۲۰ر فروری ۱۹۷۳ء میں منظر عام پر آیا۔ اِس مجموعے میں شامل ۹۰ غزلیات کا عرصہ تخلیق ۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۶ء ہے۔ ریاض مجید کی طبعِ رسا آغاز، جوانی میں زوروں پر تھی اور فکر کی تازہ کاریوں کے نمونے بھی روزافزوں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف تین ماہ کے اندر اُن کی غزلیات کا دوسرا مجموعہ ''گزرتے وقتوں کی عبارت'' ۱۷ر مئی ۱۹۷۳ء میں شایع ہوا۔ ۵۹ غزلیات پر مشتمل اِس مجموعے میں ۱۹۶۷ء تا ۱۹۶۹ء کا کلام شامل ہے۔ ۱۰۱ غزلیات پر مشتمل تیسرا مجموعہ کلام ''ڈوبتے بدن کا ہاتھ'' ۱۹۷۴ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ اِن غزلیات کا عرصہ تخلیق ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۳ء ہے۔ ریاض مجید کی شاعری میں کلاسیکی اظہاریت اور عصری حسیّت کا بھرپور احساس ملتا ہے۔ اُن کی شاعری کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ اُس کے اندر تنوع اور رنگا رنگ پائی جاتی ہے۔ ریاض مجید کی شعری آرایش کا اعتراف ایک زمانہ کرتا ہے۔

ریاض مجید کی غزل ایک ایسا ادبی منشور ہے، جس سے چھن کر نکلنے والی متنوع روشنیاں ایک عجب شعری قندیل روشن کرتی ہیں، جہاں ریاض مجید معاصر شعری ادب میں اپنی الگ تھلگ شناخت رکھتے ہیں۔ اُن کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت، ،جو اُنھیں اپنے معاصرین میں ایک منفرد اور ممتاز مقام عطا کرتی ہے، اُن کا سائنسی شعور ہے۔ اُن کی غزلیات کے تینوں مجموعے ،اُن کی سائنسی فکر کے مظہر ہیں۔ ریاض مجید کے طیفِ غزل میں جدید سائنسی علوم کے بیش تر رنگ دیکھے جاسکتے ہیں۔ اِن اشعار کے غائر مطالعے سے اُن کی سائنسی علوم سے گہری دل چسپی اور سائنسی شعور اور مزاج کا ثبوت ملتا ہے۔ اُن کا وسیع مطالعہ بھی اِس امر کی دلیل ہے کہ وہ سائنس اور اُس سے پیدا شدہ امکانات اور نقصانات کا مکمل ادراک رکھتے ہیں۔ ریاض مجید کے قالب میں شاعر کا دل اور سائنس دان کا دماغ ہے ،بنابریں اُن کی شاعری میں شعر و سخن کی دیوی منروا اور فطرت کی دیوی میڈونا گلے ملتی نظر آتی ہیں۔ یہی کرداری آمیخت اُن کی شاعری میں ایسا جادوئی عنصر پیدا کرتی ہے، جس کی بدولت سائنس اور ادب یک جان و دو قالب ہو جاتے ہیں۔

اِن سب پر مستزاد ریاض مجید کا تاریخی شعور ہے، جو نہایت سلیقہ مندی سے شعری قالب میں ڈھل جایا ہے۔ ہبوطِ آدم سے عروجِ آدم تک بنی نوع انسان نے ارتقا کی، جو منازل طے کی ہیں اور انسانی شعور نے بتدریج ، جو ترقّی کی ہے، اُسے اجتماعی دانش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ریاض مجید کے اشعار میں بشریات اور قدیمیات کے کئی اشارات ملتے ہیں۔ اِس ضمن میں وہ معاصر شعری ادب میں سب سے منفرد دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب کُچھ ریاض مجید کے وسیع مطالعے اور قوتِ مشاہدے کے طفیل ممکن ہوا ہے۔ اُن کی فکرِ رسا جس چیز کا احاطہ کر جاتی ہے، شاید بہت سے شعرا اُس کی ہوا کے بھی متعامل نہیں ہو سکتے۔ اُن کا یہ خاصہ ہے کہ وہ تحریر و تقریر کے دروان میں اسلاف کی خوشہ چینی اور اُس کے بغیر بھی بہت کُچھ کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ لفظی صوت گری اور معنی آفرینی ریاض مجید کے کلام کی ایسی خوبی ہے، جس نے اُنھیں ادب کے مقتدر حلقے میں ایک خاص اعتبار عطا کر رکھا ہے۔

ریاض مجید جدید ذہن و فکر کے عکاس ہونے کے باوجود روایت سے اپنا گہرا رشتہ اُستوار رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مٹّی قدروں کا نوحہ خواں ہیں۔ بسا اوقات یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی گم شدہ تہذیب کے بھٹکے ہوئے راہی ہیں، جو صدیوں کی مسافت طے کر کے عہدِ حاضر میں آ نکلے ہیں۔ اُن کی شاعری میں کھنڈروں اور غاروں کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ نوسٹلجیا اُن کے مزاج کا حِصّہ ہے، تو تاریخی شعور کی عتیقیات سے گہری دل چسپی کا مظہر ہے۔ یہی روایت اور جدّت کا انضمام ریاض مجید کو پچھلی دنیا کے مسافر اور جدید دنیا کے راہی ہونے کا ثبات دیتا ہے۔

ریاض مجید لمحۂ حال کو ماضی کے تسلسل میں دیکھتے ہیں۔ اُنھیں رمزیات اور علم العجائب سے بھی دل چسپی ہے۔ ریاض مجید نے سائنسی اور سماجی علوم کے مطالعے سے کشید شدہ اصطلاحات اور معلومات کو اپنے مربوط فکری نظام اور انسانی زندگی کے مسائل کی پیش کش کے لیے استعمال کرتے ہوئے ایک جہانِ معنی تخلیق کیا ہے۔

ریاض مجید کی غزل گوئی کے تجزیے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے کلام کے ابتدائی نمونوں سے اُن کی حالیہ غزل گوئی تک میں ایک بتدریجی ارتقا ہے 'پس منظر' ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ تھا، جو رومانی شاعری سے عبارت ہے اس میں آغاز شباب کے وہ شعری مجموعہ تھا، جو رومانی شاعری سے عبارت ہے اس میں آغاز شباب کے وہ شعری تجربے ہیں، جنھیں کلاسیکی غزل کے حوالے سے 'غم جاناں' سے تعبیر کیا جاتا ہے 'گزرے وقتوں کی عبادت' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کھوئے ہوؤں کی جستجو اور رفتگاں کی سرگزشت کے فکری عناصر رکھتا ہے جب کہ 'ڈوبتے بدن کے ہاتھ' ملکی، قومی اور ملّی مسائل سے بھرپور تجربوں کا عکاس نظر آتا ہے یہ غزل گوئی کا وہ اندازہ ہے جسے 'غم درواں' سے تعبیر کیا جاتا ہے یوں ریاض مجید کی غزل 'غم جاناں' سے 'غم درواں' کی طرف سفر کرتی نظر آتی ہے یہ موضوعاتی یا فکری تفہیم صرف افہام و تفہیم کے لیے ورنہ پندرہ بیس سالوں میں لکھی گئی اس شاعری میں افکار کے سبھی رنگ ملے نظر آتے ہیں، یعنی پس منظر میں کئی شعر ملکی احوال نامے کے ترجمان نظر آتے ہیں اور 'ڈوبتے بدن کا ہاتھ' میں بھی بہترین رومانی شعر مل جاتے ہیں۔

'خاک' ریاض مجید کا چوتھا مجموعہ ہے، جو پہلے تین مجموعوں کے قریباً ربع صدی بعد شایع ہوا اس مجموعے کی غزلوں میں ماضی کے سبھی تجربے ایک مہارت اور پختگی کے ساتھ اظہار پذیر ہوتے ہیں ان غزلوں میں شاعر کا تجربہ مہارت اور پختہ کاری کا ترجمان ہونے کے ساتھ جدّت اور ندرت کا حامل بھی ہیں۔

'خاک' کی شاعر جہاں ایک طرف شاعر کی غزل سے وابستگی کی علامت ہے وہاں اپنے معاصر شعری میلانات کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں ان غزلوں میں رومان، زمانہ، سیاسی انتشار، زوال اُمّت کا گریہ، اخلاقی قدروں کا زوال، خیر اور شائستگی جھلکیاں____ یعنی کم و بیش تمام شعبہ ہائے حیات کے تناظر میں زندگی کے آشوب کا بیان ملتا ہے خاک کے درج ذیل مختلف شعر اسی بیان کی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ 'خاک' کے بعد کی شاعری کو، جو زیر ترتیب طبع ہے تین درج ذیل مجموعوں میں ترتیب دیا گیا ہے۔

'کہیں اور' یہ غزل کی کتاب ہے، جو ان دنوں زیر اشاعت ہے اس کی غزل 'خاک' ہی کے فکری بیانیے کی توسیع ہیں اور اس کے مضامین بھی کم و بیش معاصر شاعری کے فکری میلانات کا عکس ہیں۔

'مدار سے نکلے ہوئے' ریاض مجید کی غزلوں کی ایک اور کتاب ہے اسے ریاض مجید کی غزلوں کا چھٹا مجموعہ کہہ سکتے ہیں اس میں زیادہ تر غزلیں رومانی انداز کی ہیں یہ غزلیں جداگانہ حیثیت رکھتے ہوئے بھی ایک ہی فکری کل کا جُز لگتی ہیں۔

'جُزدان' ریاض مجید کا ساتواں مجموعہ غزل ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا مختلف مجموعہ ہے، جو چار چار، تین تین، اور دو دو کے تین حِصّوں پر مشتمل ہے۔ اُنھیں ریاض مجید کی غزلوں کی باقیات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ ان کی وہ غزلیں، جو کسی وجہ سے مکمل ہو سکیں جُزدان میں شامل ہیں، اُنھوں نے دست یاب نامکمل غزلوں کو تین حِصّوں میں الگ الگ جمع آوری کی چار اشعار سے زائد یعنی پانچ شعروں کی غزلوں کو اُنھوں نے 'مدار سے نکلے ہوئے' مجموعے میں شامل کیا ہے اور باقی چار چار، تین تین اور دو دو شعروں والے غزلیہ ٹکڑوں کو 'جُزدان' میں شامل کر لیا ہے یہ کتاب کافی ضخیم ہے۔ دو تین مجموعوں کے برابر ہے۔

'فردیات' کے نام سے ریاض مجید کا ایک اور مجموعہ غزل ہے، جو قریباً تین ہزار اشعار پر مشتمل ہیں 'فردیات نگاری' ریاض مجید کا ایک پسندیدہ شعری شغل ہے، اُنھوں نے اپنے اکثر شعری تجربوں کو ایک ایک شعر میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا یہ کلام 'کلیات فردیات' کی صورت میں جمع ہونے جا رہا ہے۔ اس کا ایک حِصّہ 'وہ' کے نام سے افشین شوکت نے مُرتّب کر کے شایع کر دیا ہے۔

واضح ہو کہ ان کی غزلوں کے یہ حِصّے کہیں اور مدار سے نکلے ہوئے اور فردیات کے نام سے پائلٹ ایڈیشن میں موجود ہیں۔ یعنی ان کمپوز شدہ مسودہ چھپنے سے قبل کی حتمی صورت میں موجود ہے اور کسی وقت بھی شایع ہو سکتا ہے۔ یہاں ان کتابوں کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ ریاض مجید کی غزل کے حجم اور نوعیت کو سمجھنے کے لیے ان کی مطبوعہ کتابوں کے ساتھ ان پائلٹ ایڈیشنوں کی نشاندہی بھی ضروری تھی۔ یوں ریاض مجید کی غزلوں کا کل سرمایہ قریباً آٹھ مجموعوں پر مشتمل ہے۔ ریاض مجید کی غزلوں میں سے 'گزرے وقتوں کی عبارت' اور 'خاک' کا ایک ایک ایڈیشن اور بھی شایع ہوا 'گزرے وقتوں کی عبارت' مکتبہ دین و دنیا لکھنؤ سے ۱۹۷۸ء میں شایع ہوگی جب کہ 'خاک' کا دوسرا ایڈیشن قرطاس فیصل آباد سے ۲۰۱۶ء کو شایع ہوا۔

ریاض مجید کی غزلوں کے مجموعے:

ریاض مجید کی غزلوں کے اب تک چھے مجموعے شایع ہو چکے ہیں ہم یہاں کتاب وار ان کا مختصر تعارف پیش کرتے ہیں:

۱۔ پس منظر: یہ ریاض مجید کا پہلا مجموعہ غزل ہے جس میں اُن کی غزلیں شامل ہیں۔ ان کا یہ کلام جیسا کہ اُنھوں نے آغاز کتاب میں نشاندہی کی ہے ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء تک کی غزلوں پر مشتمل ہے۔

۲۔ گزرتے وقتوں کی عبارت: یہ ریاض کا دوسرا مجموعہ غزل ہے، جو ۱۷ر مئی ۱۹۷۳ء میں شایع ہوا۔ اِس میں اُنسٹھ (۵۹) غزلیں شامل ہیں۔

۳۔ ڈوبتے بدن کا ہاتھ: یہ ریاض مجید کا تیسرا مجموعۂ غزل ہے۔ اِس شامل غزلوں کی تعداد ۱۰۱ ہے۔ یہ ۱۷/ مئی ۱۹۷۳ء سے سے ۳۱/ دسمبر ۱۹۷۴ء تک کے زمانے کی لکھی ہوئی ہیں۔ اِن نظموں کا نمایاں حِصّہ سقوط ڈھاکا کے حوالے سے ہے۔ اِس کے فلیپ پر شہزاد احمد اور وزیر آغا کے تاثرات ہیں۔

۴۔ خاک: ریاض مجید کا چوتھا مجموعہ غزل ہے اس میں غزلوں کی تعداد ۸۸ ہے یہ مجموعہ ۲۷/ مارچ ۲۰۱۶ء میں شایع ہوا۔

۵۔ کہیں اور: یہ ریاض مجید کی غزلوں کا پانچواں مجموعہ ہے۔ یہ خاک کے بعد کی غزلیں ہیں، مگر اِن میں کُچھ غزلیں پہلے زمانے کی بھی ہیں، جو اس کتاب کی اشاعت کے وقت غیر مطبوعہ رہیں۔

۶۔ مدار سے نکلے ہوئے: اِس مجموعے میں وہ غزلیں شامل ہیں، جو ابھی تک منصۂ شہود پر نہیں آئیں۔

درج بالا مجموعہ ہائے غزل کے علاوہ، ریاض مجید کے دو زیرِ ترتیب ضخیم مجموعہ ہائے غزل بھی شامل ہیں۔ ایک مجموعہ ''جُزدان'' کے نام سے ہے، جس میں اُن کی وہ غزلیں شامل ہیں، جو اب تک کسی غزلیہ مجموعے کا حِصّہ نہیں بنیں۔ اِن دونوں مسودوں کے بارے میں اُنھوں نے انٹرویو میں بتایا کہ غزلوں کی کُچھ کتابوں کی اشاعت کے بعد میری توجُّہ دوسری کتابوں کی ترتیب و اشاعت کی طرف رہی۔ میں نے اپنی شاعری کے ابتدائی نمونے اور پہلی غزلیں 'شروعات' کے نام سے ایک مسودہ تیار کیا تھا۔ اِسی طرح غزلوں کے حوالے سے باقی تمام اشعار 'جُزدان' کی فائل میں جمع کر دیے ہیں۔ اُن میں پانچ پانچ، چار چار، تین تین اور دو دو کے عنوانات سے چار حِصّوں میں سیکڑوں نامکمل غزلوں کے اشعار ہیں۔

ریاض مجید کی نظم نگاری:

ریاض مجید کی نظم نگاری کا آغاز اُن کی غزل گوئی کے ساتھ ہُوا، اُنھوں نے کالج کے زمانے (۱۹۶۰ء-۱۹۶۴ء) گورنمنٹ کالج فیصل آباد (تب لائل پور) اور یونی ورسٹی اور ینٹل کالج (پنجاب یونی ورسٹی) لاہور کی طرف سے متعدد بین الکلیّاتی مشاعروں میں حِصّہ لیا۔ اس زمانے میں کالجوں کی علمی و ادبی تقاریب میں مشاعرے کو ایک خاص حیثیت حاصل تھی۔ اُردُو کے وہ شاعر، جنہوں نے اپنی شاعری کا آغاز ساتھ اور ستر کی دہائی میں کیا کم و بیش ان سب کا تعلق ان مشاعروں سے رہا ہے۔ یہ مشاعرے قریباً ہر کالج کی سالانہ تقاریب کا حِصّہ ہونے پر کالج سے ایک غزل اور نظم کے ساتھ اس میں حِصّہ لیتے۔ اوّل دوم سوم اور حوصلہ افزائی کے انعامات حق داروں میں تقسیم کئے جاتے، جو عام طور پر کپوں (Cups) کی صورت میں ہوتے۔ نظم اور غزل میں بہ حیثیت مجموعی اچھّی کارکردگی کرنے والے ادارے کو ٹرافی دی جاتی۔ اسلامیہ کالج سول لائینز میں شمع تاثیر کا مشاعرہ ایسی تقاریب کا سب سے نمایاں اور بار گاہ حِصّہ تھا۔ یہ ٹرافی معروف ادیب اے ڈی تاثیر کے نام سے جاری کی گئی تھی۔

اسی طرح پروفیسر منظور حسن شور کے نام سے گورنمنٹ کالج، فیصل آباد 'مینائے شور' کے نام سے ایک ٹرافی کا آغاز ہوا تھا۔ ان اداروں کے علاوہ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد، گورنمنٹ کالج ملتان، گورنمنٹ کالج جھنگ اور گورنمنٹ کالج جہلم کے مشاعرے بھی بڑی اہمیت کے حامل تھے۔

ریاض مجید نے ان مشاعروں میں غزلوں کے ساتھ نظمیں بھی پڑھیں ان کی نظم نگاری کا ابتدائی حِصّہ اُنھیں نظموں پر مشتمل ہے یہ نظمیں 'کالج نامہ ___ غزل' کے نام سے ریاض مجید کے آثار میں ملتی ہیں ان نظموں کے بارے میں چند باتیں نمایاں ہیں۔

۱۔ یہ نظمیں زیادہ تر پابند ہیں۔

۲۔ ان کی ہئیت مختلف میں غزل و قصیدہ کی ہئیت، مسدس کی ہئیت، قطعہ بار صورت

۳۔ یہ نظمیں طویل ہیں بیس بیس چالیس چالیس شعروں کی۔

۴۔ یہ موضوعاتی نظمیں ہیں جن کے عنوانات عام طور پر مظاہر فطرت یا موسموں کے بارے میں مثلاً چاندنی رات، خزاں، برسات، آب رواں وغیرہ۔

ریاض مجید کی نظم میں اِس خارج سے داخل کے سفر نے تجسس کی کیفیت پیدا کر رکھی ہے، جس کے تحت وہ اپنی ذات اور کائنات دونوں کا ادراک کرنے کا آرزومند ہے۔ ریاض مجید چوں کہ بیسویں صدی کے ربع آخر کا شاعر ہیں۔ اِس لیے اُن کا سب سے بڑا المیہ اس کے ادراک سے پیدا ہوا ہے۔ اس آشوب آگہی ک لیے اس نے اپنے وجود کو اہمیت دی اور وجود کی آشنائی کے لیے نسبتاً طویل سفر، پُر پیچ راستوں سے طے کیا۔ چناں چہ وہ اس صداقت کو آشکار کرنا چاہتا ہے، جو وجود تذکرہ آشنائی کا ثمرہ ہے۔ ریاض مجید نے نازک رشتوں، نازک لمحوں کو بڑی خوب صورتی سے اپنی نثری نظم میں سمو دیا ہے۔

ریاض مجید کو اپنی نظموں میں بھی بچھڑی ہوئی رفاقتیں اسے اپنے عمل اور اپنی شخصیت کے تجزیئے کے موضوع پر شدت سے یاد آئیں اور وہ رو دیا ہے اس کے شعر حسین ترین ٹکڑے وہ ہیں، جہاں اس نے گزرے ہوؤں کو یاد کیا۔ کالج نامہ کسی ایک کالج کے اولڈ سٹوڈنٹس کے نام ایسوسی ایشن کا خط نہیں۔ سب جدائی پکڑنے والوں کے دلوں کی آواز ان کے صدموں کی تصویر ہے۔

ریاض مجید نے قطعہ نگاری کے ضمن میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے قطعات کے دو مجموعے خبر اخبار اور ذکر اذکار کے نام سے منصّۂ شہود پر آچکے ہیں۔ اوّل الذکر مجموعے میں، اُنھوں نے بالترتیب یکم / اکتوبر ۲۰۱۵ء تا ۲۳/ ، جون ۲۰۱۶ء تک لکھے جانے والے ہر تاریخ کے مطابق تاریخ وار قطعات کو شامل کیا ہے۔ مؤخر الذکر مجموعے میں ریاض مجید کے تاریخ

وار بالترتیب ۱۶/ مارچ ۲۰۱۷ء تا ۳۱/ دسمبر ۲۰۱۷ء تک یومیہ بنیادوں پر تخلیق کردہ قطعات شامل ہیں۔ دونوں مجموعہ ہائے قطعات میں ریاض مجید نے اڑھائی اڑھائی سو کے تناسب سے کل پانچ سو قطعات تخلیق کرتے ہوئے نہ صرف مِعیار بل کہ مقدار کا بھی اعتبار قائم کیا ہے۔

ان قطعات کی خوبی یہ ہے کہ ریاض مجید نے اُن ایّام میں رونما ہونے والے تاریخی واقعات اور سال کے مخصوص ایّام کے تناظر میں رونما ہونے والے عالمی معاملات کو بھی نذرِ شعر کیا ہے۔ قطعے کی روانی اور موزونی کے باعث ریاض مجید کسی بھی موضوع پر فی البدیہہ قطعہ کہنے پر قادر ہیں۔ یہاں اُن کے کمالِ فن کے سامنے بڑے بڑے قادر الکلام شعرا سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ ریاض مجید نے حالاتِ حاضرہ سے لے کر زندگی کے تمام شعبہ جات میں طبع آزمائی کی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو گا ،جس ریاض مجید نے قلم نہ اُٹھایا ہو۔ اُن کے قطعات اُن کی بصیرت اور وسیع مطالعے کے ساتھ ذی رکی کا پتا دیتے ہیں۔

ریاض مجید حالاتِ حاضرہ اور عصری سیاست پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ جب سے اُنھوں نے تاریخ وار قطعات بندی کا اہتمام کیا ہے، شاید ہی کوئی ایسا سیاسی منظر نامہ ہو گا، جو ریاض مجید کے بیانیے سے دامن کشاں ہو سکا ہو گا۔ اُن کے دونوں مجموعوں میں کثیر تعداد میں سیاسی حوالے سے قطعات موجود ہیں، جو اُن کی سیاست پر گہری نظر کا بین ثبوت ہیں۔ وہ عدالتی نظام کی کمزوریوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے، حقیقی احتساب کی روح دیکھنے کے آرزو مند ہیں۔ وہ بلدیاتی نظام کے قائم کرنے کے لیے سیاسی رہ نماؤں کے تابڑ توڑ حربوں اور دوسروں کی چت کرنے کی ریشہ دوانیوں کا ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں بڑا کامیاب نقشہ اُتارتے ہیں۔ اُنھوں بڑے شیریں انداز میں سیاسی نمایندوں کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اُن کے اس قبیل کے قطعات زُبانِ خلق کا انداز رکھتے ہیں۔

متذکرہ بالا دورانیے میں ریاض مجید نے نو بہ نو موضوعات کو قطعات میں بیان کیا ہے۔ اس دوران میں رونما ہونے والے جُملہ واقعات کا ایک طرح سے اُنھوں نے تاریخ نامہ مُرتّب کر دیا ہے۔ اس پر مستزاد ان کا سادہ اور بے پیچ اُسلُوب ہے ،جس کے ذریعے سے وہ اپنی رائے کا اظہار بھی بڑی شیرینی اورر شگفتگی سے کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے مختلف شخصیات کو ان کے کارہائے نمایاں کی انجام دہی کی بدولت خراجِ تحسین بھی پیش کیا ہے۔ وہ قومی حیثیت کی حامل شخصیات کے سانحاتِ ارتحال پر اشک فشاں بھی ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں پاکستان میں اور بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے وقعات اور سانحات کو بھی ریاض مجید نے موضوعِ سخن بنایا ہے۔

ریاض مجید نے ملکی ضرورت کے پیشِ نظر بہت سے موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ چوں کہ وہ ان سب واقعات کے عصری گواہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے ان کی ذات رائے اور مشاہدات دیدنی ہیں۔ اُنھوں نے ان قطعات میں پاکستانیت اور جذبۂ حب الوطنی کی بات کی ہے۔ وہ پاکستانی اداروں کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کی ترقّی کو وہ پاکستان کی

ترقّی سے عبارت گردانتے ہیں۔ پاکستانی فوج کے کردار اور ملک سے دہشت گردی کے خاتمے کے حوالے سے ریاض مجید نے مسلسل لکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دور پاکستانی تاریخ میں دہشت گردی کے حوالے سے عروج پر تھا۔ اُنھوں نے ملکی سالمیت کے لیے اپنی قیمتی جانوں کی قربانی دینے والے شہدا کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

مذہب، صحافت، معاشرت، فنونِ لطیفہ اور کرکٹ کے حوالے سے ان کے قطعات بے لاگ تبصروں پر مبنی ہیں، جن میں ان کی ماہرانہ رائے وقعت رکھتی ہے۔ اُنھوں نے دہشت گردی کے حوالے سے بھارت کے مذموم عزائم اور نہتے کشمیریوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کو بھی بڑی شدو مد سے بیان کیا ہے۔ ان موضوعات کے علاوہ روزانہ کی بنیاد پر ایسے بے شمار موضوعات بھی ہیں، جن پر ریاض مجید نے خامہ فرسائی کی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ قطعہ نگاری کے باب میں بھی ریاض مجید غزل، نظم اور نعت کی طرح ایک مکمل شناخت اور پہچان و اعتبار رکھتے ہیں، تو یقینا درست ہو گا۔ اس حوالے سے بھی وہ اسی داد کے مستحق ہیں۔ ان کا یومیہ مُرتّب کیے جانے والا قطعات کا تاریخ نامہ واقعی ایک اہم کارنامہ ہے۔

ریاض مجید کا شمار اُردُو زُبان وادب کے ان معدودے چند شعرا میں ہوتا ہے، جنھوں نے تواتر سے نعتیہ کلام کی روایت کو برقرار رکھا ہے۔ اُنھوں نے نعتیہ پیرایے میں اپنی عاجزانہ تمنائیں پیش کی ہیں۔ ان کے نعتیہ مجموعہ ہاے کلام کی کلیات بھی منظرِ عام پر آچکی ہے۔ ریاض مجید کی نعت اپنے موضوعات کے اعتبار سے دیگر شعرا سے بڑی حد تک مماثل ہے، لیکن جو بات ریاض مجید کو اس قبیل کے شعرا میں انفرادیت عطا کرتی ہے، وہ ان کی ذاتِ مبارکہ سے خصوصی اور دلی موانست اور سپردگی کی کیفیت ہے۔ وہ فنِ نعت گوئی میں خود کو شاعر کے مقابلے میں حضورِ اکرم ﷺ کی امت کا ایک عاشق تصوُّر کرتے ہوئے معرضِ اظہار ہوئے ہیں۔

ریاض مجید عصرِ حاضر میں نعت کا ایک بہت بڑا نام ہیں۔ اُنھوں نے اپنے نعتیہ دیوان میں شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو گا، جس پر اپنی عاجزانہ تمناؤں کا اظہار نہ کیا ہو۔ ان کے نعتیہ دیوان میں اللھم صل علیٰ محمد، اللھم بارک علیٰ محمد، سیّدنا محمد ﷺ، سیّدنا رحیم ﷺ، سیّدنا کریم ﷺ جیسی نامی گرامی نعتیہ مجموعے شامل ہیں۔ علاوہ ازیں اُنھوں نے سیّدنا احمد ﷺ میں بھی نعتیہ کلام پیش کر رکھا ہے۔ ریاض مجید نے پنجابی زُبان میں بھی نعتیہ شاعری کی ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری میں ہمیں، جو موضوعات بطورِ خاص ملتے ہیں، ان میں مدینے کی تڑپ سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، جس میں وہ اڑ کر مدینے جانے کی تمنا کا اظہار کرتے ہیں۔ طیبہ میں حاضری ان کی زندگی کا حاصل ہے۔ وہ مدینے کی زیارت کے دوران میں وہ تمام مقامات بار بار دیکھ چکے ہیں، جہاں پر حضورِ اکرم ﷺ کی مَحبّت ان کے دل میں اور جاگزیں کر چکی ہے۔

ریاض مجید نے حج اور عمرے کی انجام دہی کے دوران میں جتنی بھی زیارتیں کی ہیں، ان سب کا برملا اظہار ان کی نعتیہ شاعری میں ملتا ہے۔ انھوں نے نعت میں ایک خاص عجُز نیاز کی کیفیت بیان کی ہے۔ ان کی نعت قلبی تڑپ سے

مملو ہے۔ اُنھوں نے نعتیہ شاعری میں نیرنگیِ بیان کا خصوصی اظہار کیا ہے۔ ان کی نعت کا ہر ہر شعر عقیدت مندی کا مظہر ہے۔ وہ بصد خلوص اپنا سب کُچھ نبیِ کریم ﷺ پر قربان کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ ان کی نعت میں ایک خاص وارفتگی کا سماں بندھا ہوا ہوتا ہے۔ ان کی نعت کی سب سے بڑی خوبی سادگیِ بیان کے ساتھ کیف و سرمستی ہے۔

ریاض مجید کی نعت حضورِ اکرم ﷺ سے قلبی ارادت اور داخلی کیفیات کا مکمل اظہار ہے۔ ان کی نعت میں کیفِ حضوری اور دربارِ رسُول ﷺ میں بار بار حاضری کے کامل رجحانات پائے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے اُمّتِ مسلمہ کی کسمپرسی اور ناگفتہ بہ حالت کا نوحہ بھی حضورِ کریم ﷺ کے دربار میں پیش کیا ہے۔ مدینے کی تڑپ ان کے وارداتِ قلبی کا مظہر ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری عطاے خداوندی سے سرفراز ہے، جس میں عجُز نیاز کی نیرنگی کارفرما ہے۔ ان کے نعتیہ بیان میں عقیدت مندی، جودتِ طبع اور ندرتِ بیان کی کرشمہ سازیاں ملتی ہیں۔ ان کی نعت کا روحِ رواں عشقِ رسُول ﷺ ہے۔ اُنھوں نے نعتیہ چمن کی آبیاری میں خونِ جگر تمام کیا ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری کے در پردہ ان کے دل کی دھڑکنیں واضح طور پر سنائی دی جا سکتی ہیں۔ وہ لفظوں میں جان ڈالنے کے ہنر سے بہرہ مند ہیں۔ اس لیے ان کی نعت کا لفظ لفظ بولتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نعت میں ایک کیف کا سماں بندھ جاتا ہے۔

ریاض مجید کی نعت وہ مینارۂ نور ہے، جس کی ضوفشانی اور تابندگی سے ایک عالم حیات افروز ہے۔ اُنھوں نے ہر مروجہ ہیئت میں نعت کہی ہے۔ اُنھوں نے غزل کے آہنگ میں بے مثال نعتیں کہی ہیں۔ غزلیہ نعت میں ریاض مجید ایک منفرد لہجے کے شاعر کے طور پر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کا پُر تاثیر لہجہ قاری کو کیف و سرور اور وجد میں لاتا ہے۔ ان کی نعتیہ ارادت بہت سوں کے لیے اشک فشانی کا سامان کرتی ہے۔ درج بالا اوصاف کی بدولت ریاض مجید نعتیہ شاعری کے باب میں اپنی واضح اور الگ تھلگ شناخت رکھتے ہیں۔ فنِ نعت گوئی میں ریاض مجید کا سفر ابھی جاری و ساری ہے۔

ریاض مجید نے پابند شاعری کا ایک مستند شاعر ہونے کے ناطے اظہار کے نئے امکانات کو بہ صد شوق قبول کیا ہے۔ ان کی وسعتِ نظری اور امکاناتِ شعری کی یہ ایک بڑی دلیل ہے کہ انھوں نے غزل، نظم، نعت اور قطعہ میں شاعری کے باوجود نثری نظم کو بھی اظہار کا ذریعہ گردانتے ہوئے دو اُمور انجام دیے ہیں ایک یہ کہ اُنھوں نے ہیئتوں کے اضافے کو کھلے دل سے نہ صرف قبول کیا بل کہ اس میں لکھنا بھی شروع کیا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ریاض مجید نے ان نو وارِدانِ شوق کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی ہے بل کہ ان کے مخالفین کے سدِ رہ بھی ہوئے ہیں۔ ایسا کرنے سے ان لکھاریوں کو، جو عروضی پیمانوں اور بحر و آہنگ کو شعر گوئی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے ان کے لیے بڑی حد تک امکانات کے در وا کیے ہیں۔

ریاض مجید نے نثم نگاری میں وہی موضوعات عمومی طور پر بیان کیے ہیں، جو پابند شاعری خصوصاً نظم نگاری میں رہے ہیں۔ اُنھوں نے نثم نگاری کی فضا کی بنت میں قابلِ قدر اضافے کیے ہیں۔ وہ بات کہنے کا ڈھنگ جانتے ہیں، اس لیے وہ یہاں بھی

نثری اسالیب میں بھی شعری حسن پیدا کرنے میں کامیابی سے ہم کنار ہوئے ہیں۔ نثم نگاری میں اُنھوں نے جارحانہ اُسلُوب کو بالکل جگہ نہیں دی۔ وہ بڑے لوچ دار اور دھیمے سروں میں بات کر گئے ہیں۔ ابتدا میں ان کی نثموں میں کہیں کہیں ہیجان انگیز فضا جھلکتی ہے، تاہم ان کی نثم نگاری میں بھی ایک باشعور فن کار کی طرح ارتقائی منازل طے ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اُنھوں نے کمال ہنروری سے نثموں میں انسانی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ وہ ہر کہانی کی بنت میں خود کو سامنے رکھتے ہوئے بات سے بات نکالتے چلے جاتے ہیں۔

ریاض مجید کی نثموں میں ہمیں قاری کے ساتھ ان کی ایک مخصوص ذہنی ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے۔ وہ بات کو شعری پیکر میں ڈھالنے اور فکری تسلسل کو قائم رکھنے میں فن کارانہ صلاحیّتوں سے درپردہ طور پر کام لے جاتے ہیں۔ یہ ریاضت ریاض مجید کی نصف صدی سے زائد عرصے کی شعری ریاضت کی دلیل ہے۔ اُنھوں نے نثم نگاری کے اُسلُوب کو بھی دیگر اسالیب سے مختلف روا رکھا ہے۔ یہی ان کے فن کا اعجاز بھی ہے اور انفرادیت بھی۔

ریاض مجید ادبی دنیا میں اظہار کے قرینوں کے حوالے سے ایک مستقل مقام اور شناخت رکھتے ہیں۔ اُردُو ادب کی شعری اصناف میں سے مروجہ ہیئتوں میں شاید ہی کوئی صنف اور ہیئت ہو گی، جس میں ریاض مجید نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ وہ اس میں ہر حوالے سے کامران رہے ہیں۔ ریاض مجید کی عروض دانی بھی شعری دنیا میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ نظم، غزل، نعت اور قطعہ نگاری کی دنیا میں اپنی صلاحیّتوں کا لوہا منوا کر داد پا چکے ہیں۔ اُنھوں نے اظہار کے نئے قرینے کا نثری نظم کے حوالے سے نہ صرف پذیرا اٹھہرایا ہے بل کہ اس کو یہاں تک اعتبار عطا کروایا ہے کہ نثری نظموں کا مجموعہ 'نثمیں' منظرِ عام پر لے آئے ہیں۔ یہ ان کی جدّت پسند طبیعت کا اعجاز ہے کہ وہ نئی چیزوں کو بڑی خوش دلی سے قبول کرتے ہیں۔ اُنھوں نے دوسرے شعرا کی طرح شعر کی یک جہتی بساط پر اکتفا نہیں کیا ہے۔ وہ اظہار کی رہ میں رکاوٹ ڈالنے والے عروضی پیمانوں کو ان لوگوں کے آزاد خیال کرتے ہیں، جو تخیّل کی بُلند آہنگی تو رکھتے ہیں، لیکن عروضی پابندیوں کی وجہ سے کُچھ کہہ نہیں پاتے۔ ریاض مجید نے ایسے شعرا کے جدّتِ خیال کو خوش آمدید کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مستند شاعر ہونے کے باوجود نثم نگاری کی طرف گامزن ہوئے ہیں۔ ان کی یہ کاوش جدید لکھنے والوں کے لیے مشعلِ رہ ثابت ہوئی ہے، کیوں کہ اب حضراتِ معترضین ان شعرا پر اعتراض نہیں کر پاتے، جو نثری نظم کو سرے سے شاعری ہی نہیں مانتے تھے۔ نثری نظم ہمارے دور کا تقاضا تھی، اس لیے ریاض مجید نے اسے خوش دلی سے نہ صرف قبول کیا بل ان کا ایک شعری مجموعہ بھی زیورِ طباعت سے آشنا ہو چکا ہے۔

اس بات کو سبھی شعرا اور مفکرین مانتے ہیں کہ خیال بنیادی شے ہے۔ اس کی ابدی حیثیت سے آج تک کسی نے انکار نہیں کیا۔ پھر بھی عجب بات یہ ہے کہ ہمارے بہت سے شعرا نثری شاعری کو سرے سے ماننے کے خلاف ہیں۔ حال آں

کہ اُردُو زُبان سے قطع نظر دنیا کی دیگر زُبانوں مثلاً: انگریزی، فرانسیسی، اطالوی اور جرمنی جیسی بین زُبانوں میں بھی اظہار کے نثری قرینوں کی مسلمہ صورتیں موجود ہیں۔ اُردُو ادب میں بھی نثری نظموں کا گزشتہ تین دہائیوں سے بڑی شدومد سے غلغلہ ہوتا آرہا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس کی شدید مخالفت کے باوجود مقتدر شعرا کا ایک جدّت پسند حلقہ نثری نظموں کی طرف راغب ہوا ہے، جس سے مخالفین کی بڑی حد تک زُبانیں بند ہوئیں ہیں۔

ریاض مجید نے اس کا نظم کی مناسبت سے مختصر نام رکھا ہے، جس کے اندر ایک شعری حسن بھی کار فرما ہے۔ یہ تو وقت ثابت کرے گا کہ کون سا نام زیادہ مقبول ہوتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ رواج پذیر ہوتا ہے۔ البتہ ان سب ناموں کی اپنی ایک شناخت اور تاریخی حیثیت مسلمہ رہے گی۔ بہت سے شعرا و ادبا ریاض مجید کے نام کو اسم با مسمٰی خیال کرتے ہوئے زیادہ معتبر جانتے ہیں۔ بہر حال نثم کی مقبولیت کی یہ بھی ایک دلیل ہے کہ مختلف نامیوں نے مختلف اوقات میں اس کے نام رکھے ہیں۔ یہی اس کو قبولیت کی ایک اہم دلیل ہے۔ ریاض مجید ایسے نابغۂ روز گار شاعر نے نثم کی طرف توجُّہ کر کے نئ غیر عروضی شعرا کے لیے ایک بڑا دروازہ کھولا ہے۔ ان جیسے شعرا کی پذیرائی کی بدولت نئ شعری اصناف شاعری کے دامن کا حِصّہ بنتی ہیں۔

نثم کہنا بھی کُچھ نہ کُچھ فنی تقاضوں پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے سارے فنی تقاضے بات کہنے کے اُسلُوب کے گرد گھومتے ہیں، جو شاعر بات کہنے کا جتنا اچھّا ڈھنگ رکھتا ہے، وہ اتنا ہی اچھّا نثم گو ہو سکتا ہے۔ ریاض مجید کی نثمیں بھی ان کے نادرہ کار اُسلُوب کا بین ثبوت ہیں۔ اُنھوں نے کمال ہنر وری سے نثم کو اس وقت برتنا شروع کیا ہے، جب ابھی پوری طرح اس کا اعتبار بھی قائم نہیں ہو پایا تھا، لہٰذا ریاض مجید ان شعرا میں سے ہیں، جنھوں نے اُردُو شاعری میں دیگر اصناف کی طرح نثم نگاری کو بھی رواج دیا ہے۔ ریاض مجید کے بارے میں یہ کہنا درست ہو گا کہ ان کی طبیعت ہر رنگ میں خود کو ڈھالنے اور جلدی مثبت اثرات قبول کرنے کی صلاحیّت رکھتی ہے۔ ان کو یہ کمال حاصل ہے کہ اُنھوں نے ہر صنف میں اپنے جذبوں اور آدرشوں کا اظہار کیا ہے۔ یہ ان کی ہمہ جہتی ذہنی صفت ہے، جو بہت کم لوگوں کے نصیب میں آتی ہے۔

ریاض مجید نے حرفِ آغاز کے نام سے ایسی موٴثر فضا پروان چڑھائی ہے کہ نثم کے دیگر شعرا کے ہاں ایسا اعجاز کہاں دست یاب ہے۔ اُنھوں نے صاحبِ شبِ اسریٰ کو ایک سلام میں خاص ارادت و عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے۔ نعت گوئی ریاض مجید کا ایک مستقل حوالہ ہے۔ نعت کی دنیا میں ریاض مجید اپنی ایک الگ تھلگ شناخت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا نعتیہ دیوان بھی منظرِ عام پر آ گیا ہے۔

ریاض مجید مختلف اصناف میں قومی شخصیات کو کارہائے نمایاں انجام دینے کی وجہ سے خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ اُنھوں نے نثری نظموں میں بھی ایسی شخصیات کو مقدور بھر خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ وہ قائدِ اعظم کی مسحُور کُن شخصیت اعلیٰ

سیاسی بصیرت اور قائدانہ صلاحیّتوں کے ہمیشہ سے قائل رہے ہیں، اسی صداقت کا اظہار اُنھوں نے ''مرے قائد'' نامی نثم میں بھرپور انداز میں کیا ہے۔

ان سطروں میں بیان کردہ حقائق میں ایک خاص انداز میں ممدوح کی مدحت سرائی بھی ہے اور شعریت بھی۔ ایسا کم ہی ہو سکتا ہے کہ نثری نظم کا شاعر موضوع کی مطابقت سے بیان پر کڑی نظر رکھتے ہوئے اشعار نشتر کرے کہ بات دل سے نکلے اور دل پر وارد کرے۔ یہ ریاض مجید ایسے شاعر ہی کا اعجاز ہو سکتا ہے کہ وہ نثری نظم میں بھی ایسا سماں باندھے رکھیں کی بات مکمل ہوئے بغیر قاری رہ نہ سکے۔ یہ سچ ہے کہ اگر شعری مزاج نہ ہو تو نثری شاعری بھی ممکن نہیں ہو سکتی۔ ایسی سیکڑوں مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں کہ مصرع سیدھے کرنے سے شاعری تھوڑی ہی ہو سکتی ہے۔ تک بندی کے لیے بھی معانی نہ سہی ٹوٹے پھٹے خیال کو آہنگ ضرور عطا کرنا پڑتا ہے، لہٰذا یہ بات ماننی پڑ جاتی ہے کہ شاعری اگر مزاج میں رچی بسی نہیں ہو گی، تو شعر نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات تو شعری دنیا میں مستند ہے ہی، شعر فہمی بھی ذوقی چیز ہے۔ اچھّے شعر پر واہ کہنے والا سخن سہی کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے تب ہی جا کر بات بن سکتی ہے۔ چہ جائے کہ نثری نظم ہی کہنے پر زور دیا جائے۔ بھلا کیسے ممکن ہو پائے گا۔ مراد یہ کہ شاعری بقولِ غالب بچّوں کا کھیل تھوڑا ہی ہوا کرتا ہے۔ اس میں جہانِ معنی کی کارفرمائی اور لفظوں کی کفایت اور پہچان وغیرہ ایسے عناصر ہیں، جن کے بغیر شاعری خواہ وہ نثری ہو یا آہنگ کے سامان کے ساتھ نبھائی جائے ممکن الوقوع ہو سکتے ہیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ نثم نگاری بھی کوئی بچّوں کا کھیل نہیں ہے اور ریاض مجید ایسے ثقہ شاعر کے نثمی کلام کو دیکھ کر ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آہنگ کے بغیر آہنگ کا کمال، یہ اِنھی جیسے شاعر کے بس کا روگ ہو سکتا ہے، سطریں سیدھی کرنے والے کا نہیں۔ کیوں کہ بقولِ غالب قدرے تصرف کے ساتھ، مدعا عنقا ہو جاتا ہے ایسے عالمِ تحریر کا۔

ریاض مجید علّامہ اقبالؒ کی شخصیت سے بھی مختلف حوالوں سے متاثر تھے۔ وہ ان کی قومی خدمات کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اقبال کی شاعری بھی ان کے لیے بطورِ شاعر ایک مثال رکھتی ہے۔ ان کی نظر میں اقبال ایک مجددِ عصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اقبال کی شاعری کو بار بار سراہتے ہیں۔ اُنھوں نے کئی بار اقبال کو شعری خراج پیش کیا ہے۔ ان کی غزل ہو یا نظم، قطعہ ہو یا آزاد نظم، وہ ہر صنف اور ہیئت میں اقبال کے فن اور فلسفے کے لیے رطبُ اللّسان رہے ہیں۔ نثری نظم میں ریاض مجید نے اقبال کی آفاقی شاعری کو ادب کی عُروقِ مردہ میں ایک تحرک پیدا کرنے کا آلہ کار بتایا ہے۔ اُنھیں اس بات کا بھی شدت سے احساس رہا ہے کہ ہم نے اقبال نے فلسفے کو محض گائیکی کی نذر کر رکھا ہے۔ پیامِ اقبال کی اصل روح سے ہمارے شعرا اور قارئین بالکل کور باطن اور تہی دست رہے ہیں۔ ورنہ اقبال جیسا شاعر اور فلسفی تو زندہ قوموں میں ہمیشہ باعثِ افتخار رہا ہے۔ وہ پاکستانی قوم سے اس حوالے بھی گلہ مند رہے ہیں کہ اقبال شناسی میں ہم نے اپنے آپ کو دوسروں کا محتاج بنا رکھا ہے۔ یہ امر بھی مبنی بر حقیقت ہے کہ ہمارے عہد میں ایسی بہت کم ہستیاں رہی ہیں، جو اقبال شناسی میں اہم نام تھیں، وقت نے اب ہمیں اقبال کے پیغام کو سمجھنے کے لیے اوروں کا محتاج کر دیا ہے۔ اقبال ناشناسی کی یہ روایت ہمارے لیے ایک بہت بڑے بحران کا

سامان کرتی جا رہی ہے۔ ریاض مجید ہمارے ان بزرگوں کی باقیات میں سے ہیں، جنھوں نے فکرِ اقبال کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی تھیں اور بہت سے افراد تو ایسے بھی ہو گزرے ہیں کہ جنھیں اقبال سے ملاقاتوں کا بھی شرف حاصل رہا ہے۔ اس حوالے سے ریاض مجید اقبال کے قریبی افراد کے ساتھ ملنے اور اقبالیاتی ادب پر بات کرنے کا شرف رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے اقبال کے فرزند ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کی وفات پر ایک قطعہ لکھا ہے، جس میں وہ اقبال شناسوں اور فکرِ اقبال کے حقیقی پیامیوں کی ایک ایک کر کے رخصت ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے، اقبالیاتی فلسفے سے اپنی قوم کے تہی دستی او کور باطنی کا گلہ کرتے ہیں۔ اُنھوں نے نثم میں بھی اقبال کی شاعری اور رفکر کو خراجِ تحسین پیش اپنے فرائض میں شمار کیا ہے۔

ریاض مجید ہمارے قومی ہیروز کی ارادت مندی کی طرح وطنِ عزیز پاکستان سے بھی دلی ارادت رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ملکِ پاکستان اسلام کا ایک مضبوط قلعہ ہے۔ یہ اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے، اس لیے وہ پورا یقین رکھتے ہیں کہ یہ اسلام کے نام کے ساتھ تا قیامت زندہ رہے گا۔ دنیا کی کوئی بھی طاقت اسے خواہ کتنی ہی اندرونی و بیرونی سازشیں کر لے، صفحۂ ہستی سے نابود نہیں کر سکتی۔ یقین کی اس قوت کے ساتھ ریاض مجید وطن دوستی کے گیت گاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آڑے سے آڑے وقت میں بھی ان کی شاعری اور پیام بری میں رجائیت کے علاوہ کوئی چیز نہیں دکھائی دیتی۔

اسلام اور پاکستانیت کے بعد دنیا میں اگر ریاض مجید نے کسی اور چیز کو قابلِ قدر اور قوعت پذیر جانا ہے، تو وہ ہماری قومی زُبان اُردُو ہے۔ اُنھیں اپنی قومی بان سے قوم اور ملک کی طرح پیار ہے۔ وہ اُردو زُبان کو پاکستانیت اور ملکی اِتّحاد کی ضمانت تصوُّر کرتے ہیں۔ وطن پرستی کی طرح اُردُویت پرستی بھی ان کے رگ وپے میں سرایت شدہ ہے۔ وہ اُردُو زُبان کو ایک چھت قرار دیتے ہوئے ان افراد کو پیغام دیتے ہیں کہ ہماری قومی زُبان ایک شیر ازے کا کام کرتی ہے۔ ریاض مجید کا یہ واضح پیغام ان افراد کے لیے تازیانے کی حیثیت رکھتا ہے، جو اُردُو زُبان کے مقابلے میں کسی بھی مقامی زُبان کو اوّلیت دینے کے درپے ہیں۔ اُنھوں نے بڑے خوب صورت انداز میں ایک تمثیل کے ذریعے سے اس حقیقیت کو واضح کیا ہے کہ عالی وقار چیزیں اپنی وقعت اور ارفعیت میں مقام نہیں کھتی۔ ان کے نزدیک اُردُو زُبان بھی دسری زُبانوں کے مقابلے میں یہی اِتّحادی عنصر رکھتی ہے۔ ان کی یہ پیغام رسانی ایک نصب العین اور واضح منشور کی حیثیت رکھتی ہے۔

ریاض مجید نے اپنی نثموں میں تشبیہ اور استعارے کے ساتھ علامتی انداز کو بھی بھرپور انداز میں برتا ہے۔ وہ تزئینِ شعر کی جُملہ نزاکتوں سے بہرہ مند تھے، اس لیے وہی شعری التزام نثموں میں بھی روا رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے اس حوالے سے کمال ہنروری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے مزاج میں نئے امکانات کی تلاش کا عنصر تو تھا ہی، لیکن اچھّی بات یہ ہے کہ وہ اظہار کے لیے استعمال ہونے والے وسیلوں کے بھی پارکھ واقع ہوئے ہیں۔ اُنھوں نے اس میدان میں بھی فکر و فن کو ایک خاص آنچ پر رکھ کر شاعری کو دو آتشہ کیا ہے۔ ان کی نثموں میں شعری لذّت کے عناصر کی کارفرمائی نے اُنھیں دوسروں سے الگ اور ممتاز

مقام عطا کر رکھا ہے۔ ریاض مجید نے نظم کے باب میں نئی لکھاریوں کے لیے ایسی رہ ہموار کی ہے کہ ہزار اختلافات کے باوجود اُنھیں ایک ایسا رہبر میسّر آیا ہے، جو ان کے، سامنے ایک ایسا تحفّظی بند باندھنے میں کامران رہے ہیں کہ حضراتِ معترضین سے ان کی گلوخلاصی یقینی ہوئی ہے۔ نئے لکھاری اس حوالے سے بامراد رہے ہیں کہ اُنھیں اس محاذ پر سنبھالا دینے والا ایک بڑا نام سامنے کھڑا ہر وار کا مردانہ وار جوب دیتا دکھائی دیتا ہے۔

ریاض مجید نے ایسے افراد، جو شعری ادب کے لیے پرانے خیالات کی خاطر سب کُچھ قربان کرنے کا عزم رکھتے ہیں، کو ایک واضح پیغام دیا ہے کہ اب پرانے خیالات بغاوت پر اترنے والے ہیں۔ شاعری اور شعر فہمی کا بستہ اب یکسر بدلنے والا ہے۔ اس تبدیلی کے قبول کیے بغیر اب چارہ کار نہیں ہی، لہٰذا پرانے خیالات اور روایت پرستی کو مثبت طور پر قبول کرنے کے ساتھ ساتھ نئے اظہار اور امکانات سے بھی کسی طور پر گریزپائی ممکن نہیں۔ کیوں کہ شاعری شاعر عوام کے لیے کرتا ہے اور فی زمانہ شعر فہمی کا ذوق اور مزاج بدل چکے ہیں۔ وہ پرانے ذوقی اب شعرا کو کہاں دست یاب ہوں گے، جو شعرا کی رُجعت پسندانہ فکر کے متعامل ہوں گے۔

اس حوالے سے ریاض مجید کا مؤقف صداقت پر مبنی ہے کہ نری رُجعت پسندی سراسر خرابی کا پیش خیمہ ہو گی، لہٰذا جن چیزوں کو زمانہ قبول کرنے کا مذاق رکھتا ہے، ان سے منحرف ہونا کہاں کہ عقل و دانش ہے۔ ان کے خیال میں شعرا کو بھی مذاقِ زمانہ کے ساتھ حالیؔ کی طرح ”چلو تم اُدھر ہوا ہو جدھر کی“ کے مصداق عمل پیرا ہونا چاہیے۔ اس بات سے کون انکار کرتا ہے کہ شعرا اپنی شاعری میں کلاسیکی آن بان کا خیال نہ رکھیں۔ یہ تو ہمارا ادبی ورثہ ہے، جس پر ہم جتنا فکر کر سکیں کم ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ رُجعت پسندانہ خیالات اور کلاسیکی آن بان میں فرق و امتیاز روا رکھا جائے۔

ریاض مجید نے اظہار کی نئی نزاکتوں کو برتنے میں شعرا کو ایک حوالے سے محاذ آرای سے باز رکھا ہے اور اُنھیں کھلے دل سے نئے اسالیب اور ذائقوں کی دعوت دی ہے۔ وہ اُنھیں یہ سمجھاتے ہیں کہ غالبؔ ایسا شاعر بھی اگر اس وقت منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ایک نو آموز زُبان میں اظہار کو کسرِ شان نہیں سمجھتا، تو اُنھیں بھی اسالیبِ نو کے ان سانچوں سے انکار نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ یہ وقت نے ثابت کرنا ہوتا ہے کہ کون سی صنف اور کون سا قرینۂ اظہار کس وقت کے ذوق کے ساتھ بلا کھاتا ہے۔ غالبؔ اپنے وقت میں جس چیز کو زُبان کے ذائقے بدلنے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے، وہ آج دنیا کی دوسری بڑی زُبان بننے کی دعوے دار ہے اور غالب کا وہی کلام آج ان کی انفرادیت کا ضامن ہے۔ اس سے بڑی اور دلیل کیا ہو سکتی ہے کہ رُجعت پسندی کسی بھی شخص کو انفرادی طور پر ایک خاص وقت کے لیے بند باندھنے پر تو مجبور کر سکتی ہے، لیکن طویل وقت تک اس پر کار بند رہنا مذاقِ زمانہ کے یقینا منافی ہے۔ وہ مختلف پیرایے میں شعرا کی رُجعت پسندانہ سوچ کے خلاف ایک واضح مؤقف رکھتے ہیں۔ اکبر جیسا شخص اکبر وقت کی رو کے خلاف اگر زیادہ دیر کے لیے بند نہیں باندھ سکا تو ہمارے عہد کے شعرا

شاید اس حوالے سے موئثر آواز پیدا نہ کر پائیں۔ وقت اپنا مزاج خود بھی متعین کر تا ہے۔ اس کی موافقت ہی لکھاریوں کو زیب دیتی ہے۔

ریاض مجید ایسے بے لگام جدّت پسندوں کو بھی رہِ راست اختیار کرنے کی صلاح دیتے ہیں۔ وہ بے جہت شعرا کی رنگینیِ بیان کو بھی اسی طرح قابلِ مذمّت قرار دیتے ہیں، جس طرح اُنھوں نے درج بالا نظم میں رُجعت پسندی کو مذاقِ زمانہ کے منافی قرار دیا ہے۔ اُنھوں نے ایسا کرنے والے ساتھوں کے بے وقوفانہ حماقتون کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ اُنھیں فطرت کے تقاضوں کی شناسائی کا درس دیتے ہیں تا کہ وہ اس خیالِ خام سے باہر نکلنے کی تلقین کرتے ہیں۔

ریاض مجید رُجعت پسندی اور بے جہت جدّت پسندی کو ایک جہت اور توازن عطا کرتے ہیں۔ اُنھوں نے نئے مذاقِ زمانہ کو اپنانے کے در پیش کسی مضائقے کے نہ ہونے کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ بات وہی ہے جس کا درج بالا اقتباسات میں وضاحت سے بیان ہو چکا ہے۔ چناں چہ وہ جدید شعرا کو ہیئتوں کے پرانے سانچوں سے آزاد کروانا چاہتے ہیں۔ وہ نئے زمانے کی نئی فضا میں تازہ سانسیں لینے کی ترغیب دیتے ہیں۔

نئے امکانات کی تازہ کاری اور موجودہ زمانی فضا کے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کرنے میں مضائقہ ہی کیا ہے۔ جدید شعرا ابھی تو پرانے سانچوں اور ہیئتوں کو نئے اسالیب کے ساتھ زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ریاض مجید ان میں تازہ روح پھونکنے کے متمنی ہیں۔ اُنھوں نے نئے کہنے والوں کے لیے ایک بہت بڑی بات کی ہے کہ زمین کے آبلے سخن وری کے سدِ رہ ہیں، ان کی دامن کشائی کے بغیر بہت سی نئی باتیں، جو ہر حوالے سے انسانیت کے جذبات کی حقیقی ترجمانی کرتی ہیں، رہ جاتی ہیں۔ کیوں کہ عروضی پیمانے ان کی راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں۔

ریاض مجید نے بڑے موئثر پیرایے میں اس نکتے کی صراحت کی ہے کہ ان کی شاعری کی وجودی حیثیت کیسے رونما ہوتی رہی ہے۔ وہ پابند شاعری کے پیکروں کی بابت بھی اپنا ایک نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ گویا ان کی غزل اور نظم شعری اُفق پر کسی طرح سے بے، جواز نہیں رہی ہے۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو ایک طرح سے ادبی کٹھرے میں ادب شناسوں اور ادب دوستوں کی عدالت میں کھڑا کرتے ہوئے اپنی شاعری کے، جواز میں دلائل بھری بحث خود کی ہے۔ اس حوالے سے ریاض مجید اپنی شاعری کے سب سے بڑے وکیل کے روپ میں ہمارے سامنے از خود آ جاتے ہیں۔ ان جیسی ذاتی وضاحت اور شعری، جواز کی کیفیت شاید ہی کسی شاعر نے پیش کر رکھی ہو۔ فی الحقیقت اُنھوں نے ادب کی عدالت میں یہ مقدمہ اس لیے لڑا ہے کہ وہ جدید تقاضوں کو نبھانے کے امکانات روشن کرنے کے خواہاں تھے۔

ریاض مجید کی شاعری میں بھی اُسلُوب سے قطع نظر خیال آرائی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ وہ تخیّل کو کسی صورت بھی لفظی قبول ورد کی نذر نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ ان جیسا نابغہ ٔروزگار شاعر ایسی سستی شہرت کا متعامل ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ اظہار کے

قرینے اور سلیقے سے اچھّی طرح باخبر ہیں۔ وہ اچھّی طرح جانتے ہیں کہ کون سی بات کس ہیئت اور فارم میں پیش کی جائے، تو زیادہ معنی خیز ہو گی اور زمانے کا مذاق بھی اسے کس نہج پر قبول کرے گا۔ گویا اُنھوں نے شعری پیکر کی اثر خیزی کا بہر صورت اہتمام کیا ہے۔ اُنھوں نے شاعری کے لیے بیان بازی کرنے والوں کو شایستگی کے دامن میں رہتے ہوئے گفت گو کرنے کی تلقین کی ہے۔ یہ امر مبنی بر حقیقت ہے کہ ایک شاعر کی زُبان یقیناً ایک پڑھے لکھے شخص کی زُبان ہوتی ہے، اس لیے کہ لوگ اس کی کہی ہوئی باتوں کو بطورِ مثال پیش کرتے ہیں۔ زمانے کا ادبی مذاق بھی ایسے شعرا کے فکر سے متعیّن ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ریاض مجید حق بہ جانب ہیں۔ اُنھوں نے ساری زندگی اچھّی شاعری پیش کی ہے۔ اس لیے وہ لفظوں کے حقیقی نبض شناس اور پارکھ واقع ہوئے ہیں۔ یہاں ہر صاحب ذی فہم، ان کی بات کا ہامی دکھائی دیتا ہے۔

کتابیات:

بنیادی مآخذ:

ریاض مجید، مُرتّب: نئی آوازیں، قرطاس پبلشرز، لائل پور، ۱۹۷۲ء

ریاض مجید، ڈوبتے بدن کا ہاتھ، قرطاس پبلشرز، لائل پور (فیصل آباد) ۱۹۷۳ء

ریاض مجید، گزرے وقتوں کی عبارت، قرطاس پبلشرز، لائل پور، ۱۹۷۳ء

ریاض مجید، پڑھ بسم اللہ، لوح و قلم پرنٹنگ پریس، فیصل آباد، ۱۹۹۱ء

ریاض مجید، حی علی الثنا، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۱۹۹۱ء

ریاض مجید، خودی تے بے خودی، مسلم پنجابی مجلس، فیصل آباد، ۱۹۹۳ء

ریاض مجید، اللّٰھم صلِ علیٰ محمد، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۱۹۹۴ء

ریاض مجید، رباعیات من فلسطین، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۲ء

ریاض مجید، سیّدنا محمد ﷺ، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۰۳ء

ریاض مجید، سیّدنا محمد ﷺ نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۰۳ء

ریاض مجید، اللّٰھم بارک علیٰ محمد، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۰۵ء

ریاض مجید، بے چہرہ کونپلیں، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۵ء

ریاض مجید، پس منظر، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۵ء

ریاض مجید، ثمیں، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۸ء

ریاض مجید، آس پاس، قرطاس، پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء

ریاض مجید، توے دے تارے قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۱ء

ریاض مجید، سیّدنا رحیم ﷺ نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۱۱ء

ریاض مجید، واچھٹر، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۳ء

ریاض مجید، واواں، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۳ء

ریاض مجید، انتساب، رفاہ انٹر نیشنل یونی ورسٹی، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء

ریاض مجید، خبر اخبار، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء

ریاض مجید، خاک، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء

ریاض مجید، حال احوال، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۷ء

ریاض مجید، سیّدنا کریم ﷺ نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء

ریاض مجید، ربنالک الحمد، نعت اکادمی فیصل آباد، ۲۰۱۸ء

ریاض مجید، ذکر اذکار، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء

ریاض مجید، وہ، مُرتّب: افشین شوکت، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۹ء

ریاض مجید، کُلیّاتِ نعت، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء

ریاض مجید، نعتیہ دیباچے (۱) نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء

ریاض مجید، نعتیہ دیباچے (۲) نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء

ریاض مجید، نعتیہ دیباچے (۳) نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء

ریاض مجید، نعتیہ مطالعات، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء

ریاض مجید، اُردُو میں نعت گوئی، نعت اکادمی فیصل آباد، ۲۰۲۰ء

ریاض مجید، آس پاس، قرطاس، پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء

ریاض مجید، سیّدنا احمد ﷺ نعت اکادمی، فیصل آباد، ۱۴۱۹ھ

ریاض مجید، قلمی بیاض نمبر ۱، غیر مطبوعہ

ریاض مجید، قلمی بیاض نمبر ۲، غیر مطبوعہ

ثانوی مآخذ:

آلِ احمد سُرور، پہچان اور پرکھ، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، ۲۰۱۲ء

آلِ احمد سُرور، مجموعۂ تنقیدات، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء

ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر، طور سے حرا تک، اُردو اکادمی، سندھ، س ن

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زُبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

ابُوسعید نور الدین، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات اُردو، حصّہ اوّل، مغربی پاکستان اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۷ء

ابُوسعید نور الدین، ڈاکٹر، تاریخِ ادبیاتِ اُردو، جلد: دوم، مغربی پاکستان اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۷ء

ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر، اصنافِ ادب: تفہیم و تعبیر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء

اسد اللہ خاں غالبؔ، میرزا، دیوانِ غالبؔ، خزینۂ علم وادب، لاہور، ۲۰۰۱ء

اعجاز حسین، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، طبعِ سوم، ۱۹۸۱ء

اعجاز حسین، ڈاکٹر، مذہب اور شاعری، اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۵ء

انور جمال، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء

انوار ہاشمی، تہذیب کی کہانی، جاوید پریس میکلوڈ روڈ، کراچی، طبعِ سوم، ۱۹۶۸ء

انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو، لاہور، ۲۰۰۶ء

انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تحریکیں، انجمنِ ترقّیِ اُردو پاکستان، کراچی طبع چہارم، ۱۹۹۹ء

برجموہن دتاتریہ کیفی، پنڈت، نئے الفاظ، اُردو نامہ، لاہور، س ن

بشیر احمد ڈار، تاریخ تصوّف، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۶۲ء

جابر علی سیّد، جدید شعری تنقید، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۰۲ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو، جلد: اوّل، مجلسِ ترقّیِ ادب، لاہور، طبعِ ہفتم، دسمبر، ۲۰۰۸ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادب اُردو، جلد: دوم، مجلسِ ترقّیِ ادب، لاہور، طبعِ ششم، اپریل، ۲۰۰۹ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادب اُردو، جلد: سوم، مجلسِ ترقّیِ ادب، لاہور، طبعِ دوم، اپریل، ۲۰۰۸ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادب اُردو، جلد: چہارم، مجلسِ ترقّیِ ادب، لاہور، فروری، ۲۰۱۲ء

جمیل الدین عالیؔ، اُردُو غزل چند مسائل، مشمولہ: سر سیّدین (پاکستانی ادب) جلد: پنجم، فیڈرل گورنمنٹ سر سیّد کالج، راول پنڈی، س ن

جیلانی کامران، نئی نظم کے تقاضے،، مکتبۂ معیار، لاہور، ۱۹۶۵ء

حامد حسن قادری، داستان تاریخ اُردو، اُردو اکادمی سندھ کراچی، ۱۹۶۶ء

حیدر دانش، صفی، تصوّف اور اُردو شاعری، سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور، ۱۹۴۸ء

خاطر غزنوی، جدید نظمیں، یونی ورسٹی بک ایجنسی، پشاور، ۱۹۷۶ء

خلیق احمد نظامی، تاریخِ مشائخ چشت، دائرۃ المصنفین، اِسلام آباد، ۱۹۵۲ء

راشد حمید، ڈاکٹر، گفت گو نما، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء

رام بابو سکسینہ، تاریخِ ادب اُردو، مترجم: محمد عسکری مرزا، نولکشور پریس، لکھنؤ، طبعِ سوم، س ن

رشید احمد صدیقی، جدید غزل، اُردُو اکیڈمی، سندھ، کراچی، ۱۹۷۹ء

ریاض احمد، ریاضتیں، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء

ریاض مجید، مُرتّب: سرِ دوشِ ہوا، از خلیق قریشی، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۱۹۹۴ء

ریاض مجید، صنفِ ہزار رنگ، مُرتّب: میرزا امجد رازیؔ، نعت اکادمی، فیصل آباد، ۲۰۰۹ء

زبیر رضوی، اُردُو نظم ۶۰ کے بعد، اُردُو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۵ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو زُبان کی مختصر ترین تاریخ، مقتدرہ قومی زُبان پاکستان، اسلام آباد، طبعِ دوم، ۲۰۰۲ء

شاہ معین الدین ندوی احمد ندوی، تاریخِ اسلام، جلد: اوّل، ناشرانِ قرآن، لاہور، س ن

شاہ ولی اللہ، تصوّف کے آداب و اشغال، مترجم: محمد سرور، سندھ ساگر اکادمی، لاہور، ۱۹۵۷ء

شمس الرحمان فاروقی، اُردُو غزل کی روایت اور فراق، مطبوعات رسالہ: نیادور، کراچی، ۱۹۸۳ء

شمیم احمد، ۲ + ۲ = ۵، تخلیق مرکز، لاہور، س ن

ضیاالحسن، جدید اُردُو نظم: آغاز وارتقا، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء

عابد علی عابد، سیّد، اُسلوب، مجلسِ ترقّیِ ادب، لاہور، ۱۹۹۶ء

عابد علی عابد، سیّد، اُصولِ انتقادِ ادبیات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء

عباد اللہ اختر، خواجہ، علمِ تصوّف، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۵۱ء

عبد الباری آسی، شرحِ دیوانِ غالبؔ، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور، س ن

عبد الصمد صارم، تاریخِ تصوّف، ادارۂ علمیہ، لاہور، ۱۹۶۹ء

عبد القیوم، تاریخِ ادب اُردو، کراچی، س ن

عبد اللہ، سیّد، ڈاکٹر، ولی سے اقبال تک، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء

علی، جواد زیدی، تعمیری ادب، ادارۂ انیس اُردو، الہ آباد، س ن

علی مجید، مُرتّب: ریاض مجید ایک مطالعہ، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۲۰ء

عنوان چشتی، ڈاکٹر، اُردُو شاعری میں جدیدیت کی روایت، دہلی، ۱۹۷۷ء

غلام حسین رضا، سیّد، نہج الاسرار: کلامِ معصومین، غازی پبلشرز، حیدر آباد، دکن، ۱۹۷۸ء

غلام حسین ذالفقار، ڈاکٹر، اُردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء

کلیم الدین احمد، اُردُو شاعری پر ایک نظر (حِصّۂ دوم) عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، س ن

محمد اقبال جاوید، پروفیسر، مُرتّب: نعت اور آدابِ نعت گوئی، مکتبۂ دانیال، کراچی، س ن

محمد اقبال، علّامہ، کُلیّاتِ اقبالؔ، اقبال اکادمی، لاہور، ۲۰۰۹ء

محمد حسن عسکری، آدمی اور انسان، لاہور، ۱۹۵۳ء

محمد زکریا، خواجہ، ڈاکٹر، اُردُو کی قدیم اصنافِ شعر، آئینۂ ابد، لاہور، س ن

محمد شمس الحق، پیمانۂ غزل، جلد: اوّل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اِسلام آباد، ۲۰۰۸ء

محمد شمس الحق، پیمانۂ غزل، جلد: دوم، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اِسلام آباد، ۲۰۰۹ء

محمد عظمت اللہ خاں، سُریلے بول، اُردُو اکیڈمی، سندھ، کراچی، ۱۹۵۹ء

نصیر الدین خیال، داستانِ اُردو، ادارۂ اشاعتِ اُردو، دکن، س ن

نظیر صدیقی، میرے خیال میں، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۸۷ء

نوازش علی، مُرتّب: پاکستان میں اُردُو ادب کے پچاس سال، گندھارا، راول پنڈی، ۲۰۰۲ء

نوازش علی، ڈاکٹر، فراق گورکھپوری شخصیت اور فن، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۱ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، نظمِ جدید کی کروٹیں، میری لائبریری، لاہور، ۱۹۷۴ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید اور احتساب، جدید ناشرین، لاہور، ۱۹۸۶ء

وزیر آغا، ڈاکٹر، اُردو شاعری کا مزاج، انجمنِ ترقّیِ ادب لاہور، طبعِ اوّل، مئی ۲۰۰۸ء

یحییٰ امجد، فن اور فیصلے، اظہار سنز، لاہور، ۱۹۶۹ء

یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرحِ دیوانِ غالبؔ، مکتبۂ تعمیرِ انسانیت، لاہور، س ن۔

رسائل و جرائد:

شاہ کار، فراق نمبر، ۱۹۶۵ء

لغات / قاموس:

اُردو انسائیکلوپیڈیا، مُرتّبین: احمد ندیم قاسمی، سیّد سبطِ حسن، فیض احمد، فیروز اینڈ سنز، لاہور، طبعِ پنجم، ۲۰۰۵ء

اسلامی انسائیکلوپیڈیا، جلد: اوّل۔ دوم، مولوی محبوب عالم، الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب، لاہور، نومبر، ۱۹۹۲ء

القاموس الجدید، مولانا وحید الزمان قاسمی کیرانوی، ادارۂ اسلامیات، لاہور،، جون، ۱۹۹۰ء

المنجد (عربی۔ اُردو)، لویس معلوف، مترجم: مولانا ابُو الفضل عبد الحفیظ بلیلاوی، خزینۂ علم و ادب، لاہور، س ن

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، مُرتّب: محمد یامین قریشی سہارن پوری، اسلامی کتب خانہ، لاہور، س ن

انسائیکلوپیڈیا آف پاکستانیکا، مُرتّب: سیّد قاسم محمود، الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب، لاہور،، جولائی، ۲۰۰۴ء

انسائیکلوپیڈیا معلوماتِ عالم، مُرتّب: ارشد رازی، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۲ء

بیسویں صدی کا انسائیکلومیڈیا، مُرتّب: اعظم شیخ، علم و عرفان پبلشرز، لاہور،، جولائی، ۲۰۰۰ء

تاریخِ عالم کا انسائیکلوپیڈیا، مُرتّب: زاہد حسین، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۴ء

جامع اُردو لُغات، سیّد شہاب الدین دسنوی، بک کارنر شوروم، جہلم پاکستان، س ن

دنیا کے تمام ممالک کا انسائیکلوپیڈیا، مُرتّب: مسعود مفتی، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، جنوری، ۲۰۰۴ء

شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا، مُرتّبین: مقصود ایاز، محمد ناصر، شعاعِ ادب، لاہور، طبعِ اوّل، ۱۹۷۸ء

فرہنگِ آصفیہ، مُرتّب: مولوی سیّد احمد دہلوی، جلد: ۱ تا ۴، اُردو سائنس بورڈ، لاہور، طبعِ پنجم، ۲۰۰۶ء

فرہنگِ جامع، مُرتّب: ڈاکٹر سیّد علی رضا نقوی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء

نورُ اللُّغات، مُرتّب: مولانا نور الحسن نیرّ، جلد: ۱ تا ۴، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبعِ سوم، ۲۰۰۶ء

فیروزُ اللُّغات (اُردو۔ فارسی) مُرتّب: مقبول بیگ بدخشانی، فیروز اینڈ سنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

فیروزُ اللُّغات، مُرتّب: حاجی مولوی فیروز الدین، فیروز اینڈ سنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

مذاہبِ عالم کا انسائیکلوپیڈیا، لیوس مور، مترجم: یاسر، جواد، سعدیہ، جواد، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء